

بہنوں کا اپنا مہنامہ

شعاع

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM





رکن آل پاکستان خواتین سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان خواتین سوسائٹی

MEMBER
APNS
CPNE

مستقبل کے

- | | | | |
|-----|--------------|-----|---------------|
| 284 | خالہ جمیلانی | 270 | رضیہ جمیل |
| 289 | ادارہ | 258 | سارہ غلام نبی |
| | | 281 | غزل متہ |
| | | 266 | خالہ جمیلانی |
| | | 262 | شگفتہ جاہ |
| | | 287 | امت الصبور |

جون 2009
جلد 23 شمارہ 10
قیمت 40 روپے

خط آپ کے
مُسکراہٹیں
آئینہ خانے میں
کھلتا کسی پیہ
یا تو لب سے خوشبو آئے
یا رخ کے چھوئے

ناولٹ

- | | | |
|-----|-------------|----------------|
| 134 | نثرہ بخاری | ہم سے ہر زمانہ |
| 230 | رخسانہ نگار | خالہ کھڑا |

افسانے

- | | | |
|-----|---------------|------------------|
| 78 | راحت جبین | کٹوری |
| 64 | راشدہ رفعت | تمت بالآخر |
| 222 | سدرہ سحر | دست طلب |
| 250 | مریم ماہ منیر | زندگی خوبصورت ہے |
| 154 | نعیمہ ستار | مہذب |

نظمیں و غزلیں

- | | | |
|-----|---------------|-----|
| 256 | عبدالحمید علم | غزل |
| 257 | شہزاد احمد | غزل |
| 257 | علی زریون | غزل |
| 256 | طالب انصاری | نظم |

ذو سلالہ بیکری رجسٹری
پاکستان (سالانہ) --- 500 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ --- 3500 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 4500 روپے

- | | | |
|----|----------------|--------------|
| 10 | رضیہ جمیل | پہلی شعاع |
| 11 | آغا سہیل صدیقی | حمد |
| 11 | زبیر کنجاہی | نعت |
| 12 | ادارہ | بچی کی باتیں |

انٹرویو

- | | | |
|-----|-------------|-------------|
| 26 | نثرہ احمد | رُوبرو |
| 278 | مرسنیہ خان | یادیں باتیں |
| 20 | شاہین رشید | دستک |
| 268 | سمیعہ لیاقت | شاعری |
| 18 | سعیدہ ربیعی | شادی مبارک |

ناول

- | | | |
|-----|-------------|-----------|
| 196 | عالیہ بخاری | دلوار شیب |
| 36 | راحت جبین | زر و موسم |

نسل ناول

- | | | |
|-----|-----------|--------------|
| 84 | نگہت سیما | پیل صراط |
| 158 | ام مریم | آباد شہر جاں |

اعتبار: ماہنامہ شعاع دوست کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔ پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، یا سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جاسکتا ہے، نہ کسی بھی وی جیمیل پر ڈرامائی شکل اور سلسلہ وار قطعے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جاسکتی ہے۔

رضیہ جمیل فلورنسن حسن پر مشنگ پر لیس سے چھپوا کر شائع کیا۔ - مقالہ شاعت: ادبی ذریعہ سہ ماہی سوسائٹی کراچی
Phone: 2721777, 2726617, 021-2022494 Fax: 0092-21-2766872
Email: info@khawateendigest.com, shuaamonthly@yahoo.com



ادفع میں بے مثال ہیں کیا حضور ہیں
پُر نور و مستنیر و احب الاحضور ہیں

تیری یاد کا جب پڑا دل پہ سایا
قلم میں نے تیری ثنا کا اٹھا آیا

دونوں جہاں کی رونقیں بس آپ ہی ہیں
کچھ شک نہیں ہے عورت والا حضور ہیں

ٹوٹ گئے ہیں گلستاں میں جلوہ نما ہے
یہ سچ ہے تو دونوں جہاں کا خدا ہے

جو تھے فقیر اُن کو تو نگر بنا دیا
ہر ایک بے نوا کا وسیلہ حضور ہیں

تیرا روپ تاروں میں ہر نغمیاں ہے
تیرا نور خورشید میں صنوفشاں ہے

میرا تو وردِ صبح و مسا اُن کا نام ہے
گو یا صد اذقوں کا خضر زینہ حضور ہیں

تو دشتِ جبل میں تو کوہِ دامن میں
معطر، معطر، گل میں، چمن میں

صحرا بنے ہیں آپ کی آمد پر مرغزار
ہر گل میں ہر شجر میں ہویدا حضور ہیں

عیماں ہر طرف ہے تیری کبریائی
ازل سے ہے قائم، تیری بادشاہی

میں ہوں زہیر اُن کے غلاموں کا بھی غلام
سب ہیں غلام اور شہنشاہ حضور ہیں

میرے سارے رنج و الم دور کر دے
میرا دل مسرت سے بھر لو کر دے

زہیر کججاہی

کہ شہزاد بہتا ہے تیری لگن میں
تیرا ذکر ہے اُس کے کام و دہن میں
آغا سہرا بے کدھیانہی

شعاع کا جون کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
پاکستان کی تاریخ کا سب سے اہم انسانی المیہ رونما ہو چکا ہے۔ زلزلہ تو قدرتی آفت ہے جس پر انسان
کا اختیار نہیں ہے نہ ہی ان کی پیش گوئی کی جاسکتی ہے لیکن اس آفت کو کیا کہا جائے کہ لاکھوں افراد اتہائی مختصر
نوس پورے گھر کر دیے گئے ہیں۔ اپنے ہی وطن میں در بدر ہیں۔ بھرے پڑے گھر، مال مویشی، پھلوں سے
لدے باغات اور تیار فصلیں چھوڑ کر آنے والے روٹی کے ایک لقمے اور پانی کے ایک گلاس کو ترس رہے ہیں۔
پتی، نا، عوار اور پتھر ملی زمین پر پا پیادہ سینکڑوں میل کا سفر طے کر کے آنے والے خوشگوار موسموں کے عادی گھٹے
آسمان تلے چلپاتی دھوپ میں قدرت کی نیرنگی کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔
یہ ہمارے اپنے ہیں۔ ہمارے ہم وطن، ہم مذہب ہیں۔ یہ پھول سے بچے، پردہ نشین عورتیں اور عینور مرد۔ جو
ہاتھ پھیلا ناموت سے بدتر سمجھتے ہیں، حالات کے ستم کا شکار ہیں۔

ایک بار پھر اسی جذبے کی ضرورت ہے جس کا مظاہرہ پوری قوم نے متحد ہو کر زلزلے کے وقت کیا تھا۔ یززلزلہ
سے بھی بڑی آفت ہے۔ اس مشکل وقت کا مقابلہ اسی طرح کیا جاسکتا ہے جب پوری قوم متحد ہو کر ان بے گھر، خانہ مال
برباد لوگوں کا ساتھ دے۔ ایک بہت چونا سا اور آسان کام، دن بھر میں کروڑوں روپے کے فضول سے ایس ایم ایس
کر دیے جاتے ہیں۔ ان متاثرین کے لیے سوات فنڈ میں ایس ایم ایس کریں تو شاید یہ چوٹا سا عمل چھوٹی سی
نیکی کسی کے لیے زندگی میں کچھ آسانی کا باعث بن جائے۔ اس مشکل گھڑی میں ان لوگوں کو احساس دلائیں کہ پوری
قوم ان کے ساتھ ہے اور ان کے لیے انفرادی اور اجتماعی سطح پر جو کچھ کر سکتے ہیں ضرور کریں۔

اس شمارے میں،

- ۱۔ نگہت سیمما کا مکمل ناول۔ پل صراط،
 - ۲۔ اہم مریم کا مکمل ناول۔ آباد شہر جاں رہے،
 - ۳۔ نمرہ بخاری اور دشنام نگار عدنان کے ناول،
 - ۴۔ عالیہ بخاری اور راحت جبین کے ناول،
 - ۵۔ راحت جبین، راشدہ رفعت، نعیمہ ناز، سندھ سحر عمران اور مریم ماہ منیر کے افسانے،
 - ۶۔ روبرو آپ کی پسندیدہ مصنفہ نمرہ احمد آپ کے روبرو،
 - ۷۔ فی دی فنکارہ مرینہ خان کی یادیں بائیں،
 - ۸۔ فی دی فنکاروں سے گفتگو کا سلسلہ دستک۔
 - ۹۔ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔
- شعاع کا یہ شمارہ ہم نے پوری محنت سے ترتیب دیا ہے۔ آپ کو کیسا لگا، ہمیں ضرور بتائیے گا۔ آپ کے
خطوط کے منتظر ہیں۔

پندرہویں باب

لعان کا بیان

حضرت سہل بن سعد سہمی رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت عومیر رضی اللہ عنہ حضرت عاصم بن عدی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا۔
”مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات پوچھ کر بتائی کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ کسی (غیر مرد کو) گناہ میں ملوث دیکھے اور (غصے میں آ کر) اسے قتل کر دے تو کیا اسے (قصاص میں) قتل کیا جائے گا؟ ورنہ وہ کیا کرے؟“

حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ (مسئلہ) دریافت کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اس قسم کے) سوالات کو ناپسند فرمایا۔ بعد میں حضرت عومیر رضی اللہ عنہ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ سے ملے تو ان سے دریافت کیا اور کہا۔

”تم نے کیا کیا؟“

انہوں نے کہا۔ ”ہوایا ہے کہ تجھ سے مجھے بھلائی نہیں پہنچی۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (مسئلہ) دریافت کیا تو آپ نے سوالات کو ناپسند فرمایا۔“

عومیر رضی اللہ عنہ نے کہا۔ ”اللہ کی قسم! میں ضرور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ بات پوچھوں گا۔“

چنانچہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو معلوم ہوا کہ آپ پر ان کے بارے میں وحی نازل ہو چکی ہے۔ آپ نے ان دونوں (میاں بیوی) میں لعان کرا دیا۔ عومیر رضی اللہ عنہ نے کہا۔

”اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اگر اب میں اس عورت کو (گھر) لے جاؤں تو اس کا مطلب ہے کہ میں نے اس پر جھوٹا الزام لگایا ہے۔“ چنانچہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم دینے سے پہلے ہی اس عورت کو طلاق دے دی پھر لعان کرنے والوں میں یہی طریقہ جاری ہو گیا۔

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”دیکھو! اگر اس عورت کے ہاں سیاہ فام، سیاہ آنکھوں والا، بڑے سرینوں والا بچہ پیدا ہوا تو میرے خیال میں اس (عومیر رضی اللہ عنہ) نے یقیناً سچ کہا ہے۔ اور اگر اس کے ہاں بیرہوئی جیسا سرخ بچہ پیدا ہوا تو میرے خیال میں اس (عومیر) نے ضرور جھوٹ بولا ہے۔“

راوی بیان کرتے ہیں۔ پھر اس عورت کے ہاں بری صورت والا بچہ پیدا ہوا۔

فوائد و مسائل : ○ مرد میں غیرت اچھی صفت ہے لیکن اس کی وجہ سے کسی کو قتل کرونا جائز نہیں۔ اگر کسی کو اپنی بیوی کے کردار پر قوی شک ہے تو اسے طلاق دے دے۔ ○ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سوال کو ناپسند کیا کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خیال میں اس قسم کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ اور محض شک کی بنیاد پر کسی کو سزا دینا ممکن نہیں۔ ○ اگر مرد بیوی پر بدکاری کا الزام لگائے تو عورت سے پوچھا جائے اگر وہ اقرار کر لے تو اسے رجم کر دیا جائے اس صورت میں مرد کو کوئی سزا نہیں ملے گی۔ اسی طرح اگر چار گواہ پیش کر دیے جائیں تو یہ عورت اور اس کا مجرم ساتھی سزا کے مستحق ہوں گے۔ ○ اگر

عورت الزام کو تسلیم نہ کرے تو مرد سے کہا جائے کہ الزام لگانا جرم ہے توبہ کرو۔ اگر وہ تسلیم کر لے کہ اس نے غلط طور پر الزام لگایا تھا تو اسے الزام تراشی کی سزا (حد تذف) کے طور پر اسے (80) کوڑے لگائے جائیں گے۔ اور عورت کو کوئی سزا نہیں ملے گی۔ ○ اگر مرد اس الزام کے سچا ہونے پر اصرار کرے اور عورت تسلیم نہ کرتی ہو تب لعان کرایا جائے گا۔ لعان کا طریقہ اگلی حدیث میں مذکور ہے۔ ○ بری صورت والے بچے سے مراد یہ ہے کہ وہ ایسی شکل و شہادت والا تھا جس سے عورت کا جرم ثابت ہوتا تھا لیکن اس کے باوجود اسے رجم نہیں کیا گیا کیونکہ لعان کے بعد نہ مرد کو تذف کی حد لگائی جاتی ہے نہ عورت پر بدکاری کی حد جاری کی جاتی ہے۔

لعان کا طریقہ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی بیوی پر شریک بن صحماء (رضی اللہ عنہ) سے طوٹ ہونے کا الزام لگایا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”گواہ پیش کرو ورنہ تمہاری پیٹھ پر (تذف کی) حد لگے گی۔“

حضرت ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ نے کہا، قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے، میں بالکل سچا ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ میرے معاملے میں ضرور (وحی) نازل فرماوے گا، جس سے میری پیٹھ (حد لگنے سے) بچ جائے گی۔“

تو راوی فرماتے ہیں کہ تب یہ آیات نازل ہوئیں۔
ترجمہ :-

اور وہ لوگ جو اپنی بیویوں پر تہمت لگاتے ہیں اور ان کے پاس اپنے سوا کوئی گواہ نہ ہوں تو ان میں سے ایک کی شہادت اس طرح ہوگی کہ چار بار اللہ کی قسم کھا کر کہے کہ بے شک وہ بچوں میں سے ہے ○ اور

پانچویں بار یہ کہے کہ اگر وہ جھوٹوں میں سے ہو تو اس پر اللہ کی لعنت ہو ○

اور عورت سے تب سزا ملتی ہے کہ وہ چار بار اللہ کی قسم کھا کر کہے کہ بلاشبہ وہ (اس کا خاوند) جھوٹوں میں سے ہے۔

○ اور پانچویں بار یہ کہے کہ اگر وہ (اس کا خاوند) بچوں میں سے ہو تو اس (عورت) پر اللہ کا غضب ہو۔“

نبی صلی اللہ علیہ وسلم لوٹے تو ان دونوں کو بلا بھیجا، وہ آگے تو ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر گواہی دی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے۔
”اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ تم میں سے ایک جھوٹا ہے تو کیا دونوں میں سے کوئی ایک توبہ کرتا ہے؟“

پھر خاتون کھڑی ہوئی اور اس نے گواہی دی (اور قسمیں کھائیں) جب وہ پانچویں (گواہی) کے وقت یہ کہنے لگی کہ اگر وہ جھوٹی ہو تو اس پر اللہ کا غضب نازل ہو۔ تو حاضرین نے اسے کہا۔

”یہ قسم (اللہ کے غضب کو) واجب کر دینے والی ہے۔“

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا (یہ سن کر) اس نے توقف کیا اور پچھتے ہی، حتیٰ کہ ہمیں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ (بے گناہ ہونے کے دعوے سے) رجوع کر لے گی پھر اس نے کہا۔

”قسم ہے اللہ کی! میں اپنی قوم کو ہمیشہ کے لیے بدنام نہیں کروں گی۔“

(اور پانچویں قسم بھی کھالی)۔ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”اس (کے ہاں ولادت ہونے) کا انتظار کرو۔ اگر اس نے سرنگیں آنکھوں والا بڑے سرینوں والا، موٹی پنڈلیوں والا بچہ بنا تو وہ شریک بن صحماء کا ہوگا۔“ (وقت آنے پر) اس کے ہاں ایسا ہی بچہ پیدا ہوا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”اگر اللہ کی کتاب کا حکم نازل نہ ہو چکا ہوتا تو میرا اس عورت سے (دوسرا) معاملہ ہوتا۔“

فوائد و مسائل : ○ حضرت ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ نے اللہ پر توکل کیا اور اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کیا تو اللہ نے ان کو بری کر دیا۔ اس سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایمان اور اللہ کی ذات پر اعتماد ظاہر ہوتا ہے۔ ○ پانچویں گواہی کے الفاظ پہلی چار گواہیوں سے مختلف ہیں۔ اس کا مقصد ضمیر کو بیدار کرنا ہے تاکہ فریقین میں سے جو غلطی برے وہ اپنی غلطی کا اقرار کر لے اور دنیا کی سزا قبول کر کے آخرت کے عذاب سے بچ جائے۔ ○ پانچویں قسم واجب کرنے والی ہے یعنی واقعی اللہ کی لعنت اور اس کے غضب کی موجب ہے، لہذا یہ سمجھ کر قسم کھائیں کہ جھوٹے پر واقعی اللہ کی لعنت اور اس کے غضب کا نزول ہو جائے گا۔ ○ قوم کی محبت و عصیت انسان کو بڑے گناہ پر آمادہ کر دیتی ہے لہذا ضروری ہے کہ اس محبت کو شریعت کی حدود کے اندر رکھا جائے۔ ○ بعض اوقات انسان کسی ذنبی مفاد کے لیے گناہ کا ارتکاب کرتا ہے جب کہ اس مفاد کا حصول یقینی نہیں۔ اس عورت نے خاندان کو بدنامی سے بچانے کے لیے جھوٹی قسم کھائی لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ علامت کے مطابق بچہ پیدا ہونے سے وہ غلطی ظاہر ہو گئی جس کو چھپانے کے لیے اس نے اللہ کے غضب کو قبول کیا تھا۔ ○ اس قسم کی صورت حال میں بچے کی شکل و شایستگی جرم کو ثابت کرتی ہے لیکن اگر قانونی پوزیشن ایسی ہو کہ سزا نہ مل سکتی ہو تو حج قانون کی حد سے تجاوز نہیں کر سکتا۔ ○ ارشاد نبوی "میرا اس عورت سے معاملہ (دوسرا) ہوتا ہے" یعنی اس عورت کا جرم دار ہونا تو یقینی ہے لیکن چونکہ لعن کے بعد سزا نہیں دی جا سکتی اس لیے اسے چھوڑ دیا ہے ورنہ اسے ضرور جرم کروادیا جاتا۔

مرتد ہو جانے والا

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص اپنا دین بدل ڈالے اسے قتل کرو۔" فوائد و مسائل : ○ دین تبدیل کرنے سے مراد اسلام چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرنا ہے۔ کسی یہودی کا عیسائی ہو جانا یا مجوسی کا یہودی ہو جانا اس میں شامل نہیں۔ ○ مرتد کے لیے توبہ کی گنجائش ہے۔ اگر وہ توبہ کر کے کافروں سے تعلق ختم کر لے تو اس کی توبہ قبول ہے، اس صورت میں اسے سزائے موت نہیں دی جائے گی۔

حدیں جاری کرنا

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اللہ کی مقرر کردہ حدوں میں سے ایک حد جاری کرنا" اللہ عزوجل کی زمین میں چالیس راتوں کی بارش سے بہتر ہے۔"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "زمین میں ایک (مجرم کو) حد لگانا زمین والوں کے لیے چالیس دن بارش برسنے سے بہتر ہے۔"

فوائد و مسائل : ○ "حد" سے مراد خاص جرائم کی وہ سزائیں ہیں جو اللہ کی طرف سے مقرر کر دی گئی ہیں۔ مثلاً "چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا یا قتل کی سزا قصاص۔ ان میں کمی بیشی جائز نہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے جرائم کی سزا "تعزیر" کہلاتی ہے، اس میں قاضی کی رائے کو دخل ہے وہ جرم کی نوعیت کے مطابق مناسب سزا دے سکتا ہے۔ ○ حدود و تعزیرات کا مقصد یہ ہے کہ دوسرے لوگ عبرت حاصل کریں اور اس جرم سے اجتناب کریں اس لیے حدود کے نفاذ سے معاشرے میں امن قائم ہوتا ہے اور ملک میں انصاف اور امن ہر قسم کی برکت کا باعث ہے۔ ○ برکت کو بارش سے تشبیہ دی گئی ہے جو عرب کے صحرائی علاقے میں بہت بڑی نعمت اور رحمت شمار ہوتی ہے۔ ○ مذکورہ دونوں روایتوں کو

ہمارے فاضل محقق نے سنداً "ضعیف کہا ہے جبکہ شیخ البانی رحمۃ اللہ نے دیگر شواہد کی بنا پر ان کو حسن قرار دیا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جس نے قرآن مجید کی ایک بھی آیت کا انکار کیا تو اسے قتل کرنا حلال ہو گیا۔ اور جس نے کہا۔ اکیلے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اس کا کوئی شریک نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں تو (اس اقرار کے بعد) کسی کو اس پر (قتل کرنے یا مال چھیننے کا) اختیار نہیں سوائے اس کے کہ وہ کسی حد والے جرم کا ارتکاب کرے تو وہ حد اس پر جاری کی جائے گی۔"

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اللہ کی حدیں قریب والے پر بھی نافذ کرو اور دور والے پر بھی۔ تمہیں اللہ (کے احکام کی تعمیل) کے بارے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت (ان پر عمل کرنے سے) رکاوٹ نہ بنے۔"

فوائد و مسائل : ○ قانون معاشرے کو صحیح رکھنے میں تب ہی کامیاب ہو سکتا ہے جب اس کا نفاذ ہر ایک پر یکساں ہو اور کوئی اس سے مستثنیٰ نہ ہو۔ ○ قریب اور دور سے مراد نسبی طور پر حکام سے قریب یا دور کا تعلق ہے۔ اسی طرح ہر وہ چیز جو اسلامی معاشرے میں کسی مجرم کو قانون کے شکنجے سے بچا سکتی ہے، اسلامی معاشرے میں وہ بے اثر ہو جاتی ہے، مثلاً "مال و دولت، یا عمدہ و منصب وغیرہ۔ ○ انصاف کرتے وقت اور مجرم کو سزا دیتے وقت صرف اللہ کی رضا پیش نظر ہونی چاہیے۔ یہ فکر نہیں ہونی چاہیے کہ لوگ رائے زنی، نکتہ چینی یا طعن و تشنیع کا نشانہ بنائیں گے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کا پردہ رکھے گا۔" فوائد و مسائل : ○ پردہ پوشی سے مراد کسی کے گناہ یا عیب کو ظاہر کرنے اور اس کی تشہیر سے اجتناب کرنا ہے۔ ○ کوئی انسان عیب اور غلطی سے پاک نہیں، لہذا دوسروں کو بدنام کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ ○ آخرت میں پردہ رکھنے کا مطلب اس کے گناہوں کی معافی ہے۔ ○ کسی پر احسان کرنے کا اچھا بدلہ دنیا میں بھی ملتا ہے اور آخرت میں بھی۔ انسان دوسروں سے جس قسم کا سلوک کرتا ہے، اللہ تعالیٰ بھی اس سے ویسا ہی سلوک کرتا ہے۔

بچاؤ کی کوشش

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جہاں تک حد لگانے سے بچاؤ کی گنجائش ملے حد رفع کرو۔"

فائدہ : مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق سمیت دیگر محققین نے ضعیف قرار دیا ہے، تاہم بعض علماء نے اس حدیث کا یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ حد اس وقت نافذ کرنی چاہیے جب جرم اس انداز سے ثابت ہو جائے کہ شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔ حضرت ماعز بن مالک اسلمی رضی اللہ عنہ سے زنا کا جرم سرزد ہو گیا تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر اعتراف کر لیا، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "شاید تو نے بوسہ لیا ہو گا، یا ہاتھ لگایا ہو گا یا نگاہ ڈالی ہو گی۔" جب انہوں نے صراحت سے اس غلطی کا اعتراف کیا، جس کی سزا رجم ہے تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں رجم کی سزا دی۔

پردہ فاش کرنا

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی برہنگی چھپائے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی برہنگی چھپائے گا اور جو شخص اپنے مسلمان بھائی کا پردہ فاش کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کا پردہ فاش کرے گا حتیٰ کہ اسے اس کے گھر کے اندر رسوا کر دے گا۔“

فوائد و مسائل : ○ مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ”ضعیف قرار دے کر کہا کہ حدیث نمبر 2544 اور 2255 اس سے کفایت کرتی ہیں علاوہ ازیں دیگر محققین نے بھی اسے صحیح قرار دیا ہے لہذا مذکورہ روایت سنداً ”ضعیف ہونے کے باوجود دیگر شواہد کی بنا قابل عمل اور قابل حجت ہے۔ ○ برہنگی چھپانے سے ظاہری معنی بھی مراد ہو سکتے ہیں کہ جس کو کپڑے کی ضرورت ہو اسے کپڑا پہنایا جائے اور کسی کو رسوا ہونے سے بچانا بھی مراد ہو سکتا ہے کہ اگر کسی کے عیب کا علم ہو جائے تو دوسروں کو بتانے کے بجائے اسے تنہائی میں نصیحت کی جائے تاکہ وہ باز آجائے۔ ○ کسی مسلمان کو ذلیل کرنے کی کوشش کرنے والا خود ذلیل ہو کر رہتا ہے۔ ○ عزت اور ذلت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ کسی کو رسوا کرتے وقت یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ مجھ میں یہ عیب نہیں اس لیے مجھے رسوائی کا اندیشہ نہیں۔ انسان کسی بھی لمحے اپنی کمزوری کا یا شیطان کے دوسوں کا شکار ہو کر گناہ کا مرتکب ہو سکتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ سے عافیت طلب کرنی چاہیے۔

حد سے بچاؤ کے لیے سفارش کرنا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔ ”قریش بنو مخزوم کی اس خاتون کے معاملے میں بہت فکر مند ہوئے جس نے چوری کی تھی۔ انہوں نے کہا۔ ”اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کون عرض کر سکتا ہے؟“ (آخر) انہوں نے کہا۔ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کے سوا اور کون یہ جرأت کر سکتا ہے؟“

چنانچہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”کیا تو اللہ کی ایک حد کے بارے میں سفارش کرتا ہے؟“ پھر آپ اٹھے اور خطبہ ارشاد فرمایا (خطبے میں) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”لوگو! تم سے پہلے لوگ اسی وجہ سے تباہ ہوئے کہ ان میں جب کوئی معزز (امیر) آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے تھے اور جب کوئی کمزور (غریب) آدمی چوری کرتا تو اسے حد لگا دیتے۔ قسم ہے اللہ کی اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی فاطمہ (رضی اللہ عنہا) بھی چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کٹھرتا۔“

راوی حدیث محمد بن رمح نے کہا ”میں نے امام لیث بن سعد رحمۃ اللہ کو فرماتے ہوئے سنا وہ بیان کر رہے تھے۔“

”اللہ تعالیٰ نے انہیں (حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو) چوری (جیسی نازیبا حرکت) سے محفوظ فرمایا تھا۔ اور ہر مسلمان کو یہی کہنا چاہیے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہ سے اس قسم کی غلطی کا صدور ممکن نہیں لیکن قانون اعلا اور ادنیٰ سب کے لیے برابر ہے۔“

فوائد و مسائل : ○ بنو مخزوم کی اس خاتون کا نام فاطمہ بنت اسود بن عبد الاسد تھا جو حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہا کی بیٹی تھیں۔ یہ ابو سلمہ رضی اللہ عنہ ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پہلے شوہر تھے۔ ○ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے منہ بولا بیٹا بنانے سے منع فرمادیا۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ ان کے بیٹے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ ○ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کرنے کے لیے خیال تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناراض نہیں ہوں گے کیونکہ وہ بچے تھے۔ ○ حدود کے نفاذ میں کسی کی ریت جائز نہیں۔ ○ قانون کے نفاذ میں امیر مکرور غریب میں فرق کرنا اللہ کے غضب کا موجب ہے کیونکہ اس سے قانون کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ ○ جس غلطی میں متعدد افراد شریک ہوں اس کی شناخت سب کے سامنے ذکر کر دینا چاہیے تاکہ دوسرے لوگوں کو بھی تنبیہ ہو۔ ○ اپنی بات میں تاکید پیدا کرنے کے لیے قسم کھانا جائز ہے اگرچہ کسی کو اس پر شک نہ ہو البتہ بلا ضرورت قسم کھانا مکروہ ہے۔ اور جھوٹی قسم کھانا حرام اور بڑا گناہ ہے۔

انصاف

حضرت مسعود بن اسود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔

جب اس عورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر سے کھل چرائی تو ہم اس معاملے میں بہت فکر مند ہوئے۔ وہ قریش کی ایک عورت تھی۔ ہم بات کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ہم نے کہا۔

”ہم اس کے جرم کے لیے چالیس اوقیے (چاندی) دے دیں گے۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”اس بچے کے لیے یہی بہتر ہے کہ اسے (سزا دے کر گناہ سے) پاک کر دیا جائے۔“

ہم نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نرم گفتگو سنی تو ہم نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور کہا۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ صورت حال دیکھی تو خطبہ دینے کھڑے ہو گئے اور فرمایا۔

”تم اللہ کی ایک حد (کے نفاذ کو روکنے) کے لیے اصرار کیوں کر رہے ہو جو اللہ کی ایک بندی پر آڑی ہے؟ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے! اگر اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی بھی یہ غلطی کرتی جو اس عورت نے کی ہے تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کا بھی ہاتھ کٹھرتا۔“

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”مجھ سے (اللہ کا حکم) حاصل کر لو۔ مجھ سے (اللہ کا حکم) حاصل کر لو۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ایک راستہ (اور قانون) مقرر کر دیا ہے۔ کنوارے لڑکے اور کنواری لڑکی کی (زنا کی) سزا سو کوڑے مارنا اور ایک سال کے لیے جلاوطن کرنا ہے اور شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت کی (زنا کی) سزا سو کوڑے مارنا اور سنگسار کرنا ہے۔“

فوائد و مسائل : ○ ارشاد نبوی۔ ”اللہ نے ان کے لیے ایک راستہ مقرر کر دیا ہے۔“ سے اس آیت مبارکہ کی طرف اشارہ ہے جس میں یہ حکم نازل ہوا تھا۔ ”تمہاری عورتوں میں سے جو بے حیائی کا کام کریں تو تم ان پر اپنے میں سے چار گواہ ٹھہرا لو پھر اگر وہ گواہی دیں تو ان عورتوں کو گھروں میں قید رکھو یہاں تک کہ موت ان کی عمریں پوری کر دے یا اللہ ان کے لیے کوئی اور راستہ نکال دے۔“ ○ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شادی شدہ زانیوں کو صرف سنگ ساری کی سزا دی، کوڑے نہیں لگوائے۔ جیسا کہ حدیث میں بیان ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوڑوں کی سزا سنگ ساری میں مدغم ہو گئی۔ ○ غیر شادی شدہ کی سزا سو کوڑے مارنا ہے اس کے علاوہ ایک سال کے لیے وطن سے دور بھیجنا ہے تاکہ ماحول تبدیل ہونے سے گناہ کی ترغیب ختم ہو جائے۔ آج کے دور میں سزائے قید کو جلاوطنی کا متبادل قرار دیا جا سکتا ہے بشرطیکہ جیل کا ماحول جرائم کی حوصلہ افزائی کرنے والا نہ ہو۔



نے اس کے چہرے پر خوب صورت رنگ بکھیر دیے تھے اس وقت میں نے دل سے اس کی آئندہ زندگی کی بھرپور خوشیوں کے لیے دعا مانگی۔

بارات آنے کے کچھ ہی دیر بعد نکاح کا فریضہ بھی انجام پا گیا۔ اس کے بعد طعام کا سلسلہ شروع ہوا اور پھر وقت ترخصتی بھی آ گیا۔ اس وقت خوشی و غم کی ملی جلی کیفیت سے دل بوجھل سا ہو گیا۔ وہ اپنے گھر کی ہو رہی تھی اس سے بڑی خوشی نہ تھی۔ وہ پرانی ہونے جاری تھی یہ دکھ بھی بے چین کر رہا تھا مگر بہر حال یہ تو دستور دنیا ہے ازل سے یہی ہوتا آ رہا ہے کہ حوا کو آدم کے لیے ہی بنایا گیا ہے۔

میرے بیٹوں کو بھی خالہ کی شادی کی بہت خوشی تھی بطور خاص کوٹ پینٹ کے سوٹ بنائے تھے۔ بیٹی عروبہ نے پشواڑ پتلی بھی سب کی دعاؤں اور محبتوں میں بالآخر وہ پیا دس سدھار گئی۔

ولیمہ کی تقریب بھی شاندار رہی۔ ایک بڑی بس میں سوار ہو کر سب ولیمہ میں شرکت کے لیے گئے۔ پر اعتمادی در شہوار اپنے بیٹے قاضی مقبول حسین کے ساتھ ہمارے سواگت کے لیے وہاں موجود تھے۔ بجلی کی آنکھ چمکی نے ولیمہ کی تقریب کو مون لائٹ بنا دیا کچھ اس طرح کہ صرف آرائشی قمقموں کی جگہ گاہٹ سے ماحول خوب صورت ہو گیا تھا۔ اس طرح در شہوار کی ہنگامی شادی اپنے انجام کو پہنچی اور دعا ہے کہ انجام بخیر رہے (آمین)

کو ہونے سے نہیں روک سکتی۔ میں نے بھی کچھ ماہ شادی آگے بڑھانے کی بہت کوشش کی مگر سسرال والوں کے اصرار کے سامنے ہار مانی پڑی یوں ایک ماہ میں جھٹ پٹ شادی کی تیاری ہوئی کچھ اس طور سے کہ ایک ماؤں گھر میں ایک شاپنگ سینٹر میں کبھی بچوں کے امتحانات کی وجہ سے ادھر توجہ تو کبھی در شہوار کی طرف دوڑے۔ اسی دوران بیٹی عروبہ کے میزک کے امتحانات بھی جاری تھے۔

اور مزے کی بات یہ کہ اسی روز یعنی ۱۱ اپریل کو عین شادی والے روز ہی میرے بیٹوں محمود سفیر اور محمد طحہ کو اسکول کی طرف سے شیڈ دینے کے لیے آڈیٹوریم میں مدعو کیا گیا تھا۔ ایک افزا تقریب ہی رہی۔ کدھرو دیکھوں کدھرو نہیں۔ یعنی سارے کام ہی ماہ اپریل کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ بالآخر یہ کڑا وقت بھی ٹل ہی گیا اور خدا تعالیٰ کی مہربانی سے ہر کام خیر و عافیت سے تکمیل پایا۔

مایوں کا بالخصوص زیادہ اہتمام نہیں کیا تھا لیکن در شہوار کی سہیلیوں نے بہت اہتمام سے اس کو مایوں بٹھایا۔ خوب ڈھونگی بجائی گانے گانے اور سب طرف ایک رونق بیا کر دی۔ دو لہا چولے جب بری لے کر آئے تو مایوں کا اقل رنگ نکھر کر سامنے آ گیا۔ ویسے بھی لڑکیوں کے ہرے پیلے جوڑوں نے مایوں کا حسن بڑھا رکھا تھا۔ آخر میں کباب پرائٹھے اور طلوہ پوری نے مایوں کا مزہ دہا کر دیا۔

بارات والے روز در شہوار بہت پیاری لگ رہی تھی مہنی چلبلی دوستوں کے جلو میں ہنستے مسکراتے شوخ نظروں



شادی مبارک ہو

در شہوار مہراہ قاضی مقبول حسین

سعایہ رحمتی

آج وہ دونوں اپنا پار لہ کامیابی سے چلا رہی ہیں اور سچ سچ کی دلنہیں تیار کر رہی ہیں۔

اور اب میں نے بھی بڑے عرصے بعد پھر ایک مڑیا کی شادی رچائی ہے مگر فرق یہ ہے کہ اب میں نے جیتی جاگتی مڑیا کی شادی کی ہے یعنی میری چھوٹی بہن در شہوار کی شادی ماہ اپریل 2009 میں قاضی مقبول حسین کے ساتھ بخیر و خوبی انجام پائی۔

اس موقع پر ہر لمحہ میری والدہ کی دعائیں میرے ساتھ رہیں جس کی وجہ سے میں نے یہ فریضہ حوصلے سے نمٹا دیا۔ اگر آج وہ حیات ہوتی تو بہت خوش ہوتیں۔

در شہوار کی شادی خانہ آبادی اچانک ہی طے پائی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ پیادیس سدھار گئی۔ خدا اس کو خوش رکھے (آمین) کہتے ہیں کہ نصیب جہاں لکھا ہوتا ہے وہیں ہر حال میں شادی ہوتی ہے پھر دنیا کی کوئی طاقت اس رشتے

بچپن میں کبھی کسی زمانے میں مجھے بھی مڑیوں کی شادی کا شوق تھا جو کہ عموماً لڑکیوں کو ہوا کرتا ہے اور میں اپنا یہ شوق وقتاً فوقتاً پورا کرتی رہتی تھی۔ مڑیا کے کپڑوں کے اہتمام کے علاوہ اس کا بیڈ روم سیٹ بھی لیا کرتی تھی جو کہ کھلونے والوں کی دکان سے با آسانی مل جایا کرتا تھا کبھی خود ہی گڈے مڑیا کو دو لہا دامن بنا کر شادی کی تقریب سجاتی تھی اور کبھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ مل کر بلکہ ایک مڑیا کی شادی تو مجھے اچھی طرح یاد ہے جو میں نے اپنی دوستوں نہت اور رفعت کے ساتھ باقاعدہ کی تھی۔

میری مڑیا رخصت ہو کر ان کے گھر چلی گئی تھی پھر گروش دوراں میں اس مڑیا کی تو کوئی خبر نہ رہی کیونکہ ہم سب اپنے اپنے کاروبار زندگی میں گم ہو گئے تھے مگر اب جب بھی میں اپنی دوستوں کے پار لہ میں جاتی ہوں تو اپنی سہیلیوں سے مڑیا کی شادی کی یاد ضرور تازہ کرتی ہوں۔



”تفریح کے لیے کون سے چینل دیکھتی ہیں اور گھومنے پھرنے کے لیے کہاں جاتی ہیں؟“

”تفریحی چینلز نہیں دیکھتی۔ زیادہ تر نیوز چینلز ہی دیکھتی ہوں تاکہ معاملات سے باخبر رہوں اور دیکھوں کہ کون سا چینل کیا نیوز دے رہا ہے۔ کبھی تفریح کرنے کو مل جاتا ہے تو پھر کوئی اچھی سی انڈین مووی دیکھ لیتی ہوں گھومنے پھرنے کے لیے تو اب کہیں بھی نہیں جاتی کیونکہ اب تو ہمارے ملک کے حالات اتنے خراب ہو گئے ہیں کہ کہیں بھی بے جھجک بندہ نہیں جاسکتا کہ نہ جانے کس وقت کیا ہو جائے اور کس حالت میں گھر واپس ہو۔“

”تم نے اپنے والدین کے مزاج کے بارے میں تو بتایا۔ اپنے بارے میں بھی کچھ بتاؤ۔“

”مجھے بھی غصہ آتا ہے مگر زیادہ نہیں۔ اور میں کبھی کسی پر اپنا غصہ نہیں نکالتی بلکہ خاموش رہتی ہوں اور ویسے ہی میں خاصی خاموش مزاج ہوں۔ مجھے غصہ اسی وقت آتا ہے جب کوئی میری ٹھیک بات کو بھی غلط کہے۔“



عادل مراد

”جی عادل مراد، کیا حال ہیں۔ کافی عرصے سے آپ سے بات نہیں ہوئی۔ کیا بہت مصروف رہتے ہیں؟“

مجھ میں ہمیشہ سے تھی کہ میں لوگوں میں جالی پہچانی جاؤں اور لوگوں میں میرا نام ہو۔“

”اور یہ سب کچھ پا کر کیسا لگ رہا ہے؟“

”مائے۔ بہت اچھا لگ رہا ہے۔ میں نے ایسا نہیں سوچا تھا کہ اتنی زیادہ عزت اور اتنی پذیرائی ملے گی۔ میں یہ سب کچھ پا کر بہت زیادہ خوش ہوں۔ میرے والد کہتے ہیں کہ والدین کے نام سے تو بچے پہچانے ہی جاتے ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے نئی بات تو یہ ہے کہ بچوں کی وجہ سے والدین پہچانے جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ”جب کسی محفل میں تقریب میں کوئی کہتا ہے کہ آپ شائستہ اقبال کے والد ہیں تو مجھے انجالی ہی خوشی ہوتی ہے لیکن میں آج جو کچھ بھی ہوں اپنے والدین کی بدولت ہوں۔“

”عام لوگ پہچان کر کیا کہتے ہیں؟“

”بڑا اچھا رسائس دیتے ہیں۔ تعریف کرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ اچھی اچھی خبریں پڑھا کریں۔ مگر ہم ان کو کیا کہیں کہ دل تو ہمارا بھی چاہتا ہے کہ خبریں اچھی ہوں لیکن ملک کے حالات اتنے خراب ہیں کہ ہمیں بری خبریں پڑھنا پڑتی ہیں۔“

”لوگ سیلبیری کو پہچان کر حیرت کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ تمہارے ساتھ کچھ ایسا واقعہ پیش آیا۔؟“

”واقعہ تو کوئی پیش نہیں آیا ہاں۔ حیرت کا اظہار ضرور کرتے ہیں اور بے ساختہ کہتے ہیں کہ ارے آپ تو اتنی چھوٹی سی ہیں مگر بی بی بڑی نظر آتی ہیں اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ہمیں دیکھ کر عجیب سا تاثر دیتے ہیں جیسے بتائیں کہ ہم کون کادینا کی مخلوق ہیں۔ بھئی ہم بھی آپ جیسے ہی ہیں۔ ہمیں پہچان کر ہم سے بات کریں کہ ہمیں بھی اچھا لگے۔“

”گھر میں ماحول کیسا ہے دوستانہ یا تھوڑا سخت۔؟“

”گھر میں ماحول دوستانہ ہی ہے۔ میرے والد بہت ٹھنڈے مزاج کے انسان ہیں۔ جب سے میں بڑی ہوئی ہوں مجھے نہیں پتا کہ میرے والد نے کبھی اوپر ہی آواز میں بات کی ہو یا کسی بچے کو زور سے ڈانٹا ہو یا اسے مارا ہو۔ تو جب ہمیں کوئی بات منوانی ہوتی تھی تو ہم اپنے والد سے ہی کہتے تھے سوہ ابھی بھی ایسے ہی ہیں البتہ ابی اور سخت مزاج کی ہیں۔ اس لیے ہم سب ان سے ڈرتے ہیں۔“

دستک دستک

شاہین رشید

شائستہ اقبال (نیوز کاسٹر)

”شائستہ! کیسی ہو اور بہت مبارک ہو تمہیں بہترین نیوز کاسٹر کا ایوارڈ ملا ہے۔“

”میں ٹھیک ہوں اور بہت شکریہ۔ یہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے کہ مجھے ”بے نظیر بھٹو“ ایوارڈ ملا ہے۔ آپ یقین کریں کہ میرے مقابلے میں اور بھی نیوز کاسٹرز کی نامزدگی ہوتی تھی لیکن ایوارڈ میرے حصے میں آیا۔“

”بات تو واقعی بہت اعزاز کی ہے۔ تمہیں امید تھی کہ تمہیں ہی ایوارڈ ملے گا؟“

”نہیں جی۔۔۔ مجھے بالکل بھی امید نہیں تھی کیونکہ میرے مقابلے میں جو نیوز کاسٹرز نامزد ہوئی تھیں وہ بھی ماشاء اللہ بہت اچھی ہیں۔ مگر بات وہی کہ ایوارڈ تو کسی ایک کو ہی ملنا ہوتا ہے۔“

”مگنیتز صاحب خوش ہوئے۔؟“

”بہت خوش ہوئے۔ اور کیوں نہیں خوش ہوں گے۔ یہ ان کے لیے بھی تو فخر کی بات ہے۔ میرے سسرال میں بھی سب بہت خوش ہوئے۔“

”تمہارے مگنیتز فریڈ ریڈس بھی اس چینل پر نیوز پڑھتے ہیں۔ ملاقات تو روز ہوتی ہوگی اور گپ شپ بھی؟“

”جی نہیں۔۔۔ ان کے ڈیوٹی کے اوقات کچھ اور ہوتے ہیں اور میرے کچھ اور اس لیے کبھی کبھار ہی ملاقات ہوتی ہے۔“

”دل نہیں چاہتا روز ملاقات ہو۔؟“

”میرے خیال میں شادی سے پہلے بہت زیادہ ملاقاتیں نہیں ہونی چاہئیں۔ اچھا نہیں لگتا۔ لوگ بھی باتیں کریں گے۔“

”شادی کب ہو رہی ہے؟“

”ان شاء اللہ عید الفطر کے بعد۔ آج کل تیاریوں میں سب لگے ہوئے ہیں اور آپ نے ضرور آنا ہے شادی میں۔ ابھی سے دعوت دے رہی ہوں۔“

”ہاں۔۔۔ ہاں کیوں نہیں۔ شادی کے بعد پہلا انٹرویو بھی مجھے ہی کرنا ہے تمہارا یہ بتاؤ کہ ”آج“ کے علاوہ بھی کسی چینل سے نیوز پڑھیں؟“

”ہاں جی۔۔۔ میں نے ”اے آر وائی“ سے کچھ عرصہ خبریں پڑھیں اور دینی جا کر بھی پڑھیں لیکن تین چار مہینے کے بعد ہی میں واپس کراچی آئی۔ کیونکہ دینی میں میرا دل نہیں لگا۔ اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ میں اپنی ماں کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں تو وہاں بہت بیمار ہوئی تھی۔“

”اچھا۔۔۔ جب شادی ہوگی تب تو امی ساتھ نہیں ہوں گی؟“

”ہنستے ہوئے۔۔۔ مگر ماں کراچی میں تو ہوں گی۔ جب دل چاہے گا ملاقات ہو جائے گی۔“

”سو تمہیں کیا یاد دیتے تھے؟“

”صرف رہائش دیتے تھے بس۔۔۔ تو اس سہولت کے ساتھ تو اکیلے رہنا بہت مشکل تھا۔ یہاں تو سب ہیں ماں، باپ، بہن بھائی، رشتے دار اور سب سے بڑھ کر اپنا ملک۔“

”ٹی وی اسکرین پر آنا تمہارا خواب تھا۔ یا اتفاقاً اس فیلڈ میں آئیں؟“

”کوئی خواب نہیں تھا۔ میں تو اتنی شرمیلی سی لڑکی تھی۔ جب کا ضرور سوچتی تھی مگر ٹی وی پر آنے کا نہیں۔ یہ تو میرے والد صاحب کی خواہش تھی اور ان ہی کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے میں ٹی وی اسکرین پر آئی۔ ہاں یہ خواہش

”شائستہ! کیسی ہو اور بہت مبارک ہو تمہیں بہترین نیوز کاسٹر کا ایوارڈ ملا ہے۔“

”میں ٹھیک ہوں اور بہت شکریہ۔ یہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے کہ مجھے ”بے نظیر بھٹو“ ایوارڈ ملا ہے۔ آپ یقین کریں کہ میرے مقابلے میں اور بھی نیوز کاسٹرز کی نامزدگی ہوتی تھی لیکن ایوارڈ میرے حصے میں آیا۔“

”بات تو واقعی بہت اعزاز کی ہے۔ تمہیں امید تھی کہ تمہیں ہی ایوارڈ ملے گا؟“

”نہیں جی۔۔۔ مجھے بالکل بھی امید نہیں تھی کیونکہ میرے مقابلے میں جو نیوز کاسٹرز نامزد ہوئی تھیں وہ بھی ماشاء اللہ بہت اچھی ہیں۔ مگر بات وہی کہ ایوارڈ تو کسی ایک کو ہی ملنا ہوتا ہے۔“

”مگنیتز صاحب خوش ہوئے۔؟“

”بہت خوش ہوئے۔ اور کیوں نہیں خوش ہوں گے۔ یہ ان کے لیے بھی تو فخر کی بات ہے۔ میرے سسرال میں بھی سب بہت خوش ہوئے۔“

”تمہارے مگنیتز فریڈ ریڈس بھی اس چینل پر نیوز پڑھتے ہیں۔ ملاقات تو روز ہوتی ہوگی اور گپ شپ بھی؟“

”جی نہیں۔۔۔ ان کے ڈیوٹی کے اوقات کچھ اور ہوتے ہیں اور میرے کچھ اور اس لیے کبھی کبھار ہی ملاقات ہوتی ہے۔“

”دل نہیں چاہتا روز ملاقات ہو۔؟“

”میرے خیال میں شادی سے پہلے بہت زیادہ ملاقاتیں نہیں ہونی چاہئیں۔ اچھا نہیں لگتا۔ لوگ بھی باتیں کریں گے۔“

”شادی کب ہو رہی ہے؟“



”اب تو حرا کا سارا ریحان ”مزل“ کی طرف ہو گیا ہوگا؟“

”ہاں۔۔۔ ایسا ہی ہے کیونکہ اسے تو سارا دن گزارنے کے لیے ایک کھلو نائل گیا ہے۔ خوب دل لگا رہتا ہے اس کا گھر میں۔“

”محبت تو بٹ گئی ہوگی؟“

”کیوں۔۔۔؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ میں شوہر ہوں اور وہ بیٹا۔ محبت تو بٹ ہی نہیں سکتی۔ ہاں تھوڑی توجہ بٹ گئی ہے۔“

”یہی تو ہم پوچھنا چاہ رہے تھے۔ حرا کی عادتوں میں کوئی تبدیلی آئی یعنی وہ پہلے تمہارے پروگرام نہیں دیکھتی تھی اور اب۔۔۔“

(فقہ) ”آپ کے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ وہ پہلے کبھی کبھار میرے پروگرام دیکھتی تھی مگر بیٹے کے آنے کے بعد وہ ان سے بھی گئی۔ اب یہ ہے کہ میں اپنے کرکٹ کے پروگرام جو کہ مجھے بہت پسند ہیں آسانی سے دیکھ لیتا ہوں۔“

”مزل میں فرق آیا؟“

”نہیں۔۔۔ مزل کی ہمیشہ کی طرح بہت ٹھنڈی ہے۔ اسے غصہ نہیں آتا۔ شادی سے پہلے غصے کی تیز گھی مگر زیادہ نہیں۔ اب تو مزل بہت ٹھنڈا ہو گیا ہے۔“

”حرا کو تم اپنے ساتھ پروڈکشن میں لانا چاہو گے؟“

”نہیں ابھی نہیں۔ کیونکہ ابھی تو ہمارا بیٹا اس دنیا میں آیا ہے۔ ابھی تو اسے ہماری خدمت خاطر کی ضرورت ہے۔ تھوڑا بڑا ہو جائے ڈرا سمجھ دیا ہو جائے تو ان شاء اللہ ضرور اسے اس فیلڈ میں لے کر آؤں گا۔“



”سولہ سال کے دوران آنا جانا تو لگائی رہتا ہوگا؟“

”بالکل جی۔ پاکستان اپنا ملک ہے اور اپنے ملک سے کے محبت نہیں ہوتی تو میں آتا جاتا رہتا تھا اور جب میں مستقل طور پر پاکستان آیا تو مجھے ذرا بھی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔ بلکہ اپنے ملک اور اپنے لوگوں میں آکر اچھا محسوس ہوا۔“

”مزل اجا کیسے ہیں؟“

”مزل ج تو میرا ٹھنڈا ہی ہے مگر غصہ بھی نیچل ہی ہوتا ہے غصہ آتا ہے مگر کبھی کبھار آتا ہے لیکن سخت آتا ہے۔ یہ شاید میری بری عادت ہے۔“

”عموماً جیسا ویس ویسا ہمیں۔“ والے محاورے پر ہمارے لوگ عمل کرتے ہیں۔ باہر کئی کئی سال گزارنے کے باوجود لوگ اپنے ملک میں وقت کی پابندی نہیں کرتے۔ آپ اپنے بارے میں کچھ بتائیں؟“

”آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے مگر جیسا ویس ویسا ہمیں۔“ باہر کے ملکوں میں وقت کی پابندی نہ کرنے والوں کو برا سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ پاکستان میں پابندی کرنے والے کو برا سمجھا جاتا ہے۔ میں تو کوشش کرتا ہوں کہ وقت کی پابندی کروں مگر وقت کی پابندی کرنے والوں کو ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔“

”آپ چاہیں گے کہ پڑوسی ملک کی فلموں میں کام کریں؟“

”ہرگز نہیں۔ کیونکہ میرے والد کو اس ملک نے بہت عزت و شہرت دی اور مجھے بھی جو کماتا ہوگا اپنے ملک میں رہ کر ہی کماتاں گا۔ مجھے کہیں اور نہیں جانا۔“



مافی

”کیسے ہو مافی۔۔۔ حرا اور تمہارا بیٹا کیسا ہے؟“

”جی ٹھیک ہوں۔ حرا بھی اور ماشاء اللہ بیٹا بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔“

”کتنا بڑا ہو گیا اور نام کیا رکھا ہے؟ گھر میں تو بہت رونق ہو گئی ہوگی؟“

”چار ماہ کا ہو گیا ہے۔ ”مزل“ نام رکھا ہے اور واقعی گھر میں بہت رونق ہو گئی ہے۔ جب میں رات کو گھر آتا ہوں تو اس کو دیکھ کر میری ساری تھکن دور ہو جاتی ہے۔“



”بالکل ہیں۔۔۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ میری ماں کی پسند ہے۔“

”آپ کتنے بڑے تھے جب آپ کے والد صاحب کا انتقال ہوا اور ان کے ساتھ گزارا ہوا وقت آپ کو یاد ہے؟“

”میں جب سات سال کا تھا تو میرے والد صاحب کا انتقال ہوا۔ کہنے کو تو یہ بہت چھوٹی عمر ہوتی ہے لیکن مجھے اپنے والد کے ساتھ گزارا ہوا وقت آج بھی یاد ہے۔ ان کے ساتھ کرکٹ کھیلتا، میری تفریح کرتا۔ بازار جانا۔ یہ سب کچھ اچانک مجھ سے چھن گیا اس لیے شاید مجھے سب کچھ یاد رہ گیا۔“

”کتنے سال امریکہ میں گزارے اور پاکستان آکر کیا محسوس کیا؟“

”میں امریکہ میں سولہ سال گزار کر آیا ہوں اور پاکستان آکر میں نے محسوس کیا کہ ہمارا میڈیا بہت ایڈوانس ہو گیا ہے اور خاص طور پر یہاں کی لڑکیاں۔ مجھے بہت حیرت ہوتی ہے یہاں کی لڑکیوں کو دیکھ کر کہ ان کے لباس کتنے مختصر ہوتے جا رہے ہیں۔ میں نے یہاں آکر کچھ ایسے فیشن بھی دیکھے ہیں کہ جو میں نے امریکہ جیسے ایڈوانس ملک میں بھی نہیں دیکھے۔ بس اس معاملے میں ہمارے ملک میں بہت تبدیلیاں آئی ہیں۔“

”الحمد للہ۔۔۔ میں ٹھیک ہوں۔ بس اتفاق سے کہ کافی دنوں سے بات نہیں ہوئی اور مصروفیات بھی کوئی اتنی خاص نہیں ہیں۔“

”آپ کا پروڈکشن ہاؤس کیسا چل رہا ہے؟“

”شکر ہے اللہ کا اچھا چل رہا ہے۔ کافی کام ہو رہا ہے ہمارے پروڈکشن ہاؤس کے تحت۔ فلم آرٹ انٹرنیشنل ہمارے پروڈکشن ہاؤس کا نام ہے اور ڈراموں کے اینڈ میں پاروگرام کے اینڈ میں آپ یہ نام ضرور پڑھتی ہوں گی۔“

”بالکل جی۔ بڑھتے رہتے ہیں۔ عادل! آپ نے امریکہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور خاصا وقت آپ نے ملک سے باہر گزارا۔ مگر شادی ماں کی پسند سے کی۔ کیا آپ کو کوئی لڑکی پسند نہیں آئی تھی؟“

”نہیں ایسی بات نہیں کہ لڑکی پسند نہیں آئی بلکہ میں نے ہمیشہ ہی سوچا تھا کہ جب بھی شادی کروں گا اپنی ماں کی پسند سے کروں گا کیونکہ والد صاحب (وحید مراد) کی وفات کے بعد میری ماں نے ہماری پرورش کی اور بہت قربانیاں دیں۔ تو انہی کا حق بنتا تھا کہ وہ میری شادی کریں۔ چنانچہ میں نے ماں کو اختیار دیا کہ وہ میری شادی اپنی پسند سے کریں اور ایسا ہی ہوا۔“

”بیگم آئیڈیل ہیں؟“

جویریہ عباسی

”کیسی ہیں آپ اور کافی عرصہ ہو گیا آپ سے کوئی انٹرویو نہیں کیا ہم نے۔ ٹائم دیں گی؟“

”میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں اور انٹرویو کے لیے تو معذرت۔ کیونکہ میرا ایک میک اپ آرٹسٹ کے ساتھ معاہدہ ہے کہ جب تک میں ان کے لیے کام کروں۔ کسی اخبار یا میگزین کو انٹرویو نہیں دوں گی۔ ورنہ آپ کو پتا ہے کہ میں نے آپ کو کبھی انکار نہیں کیا۔“

”ہاں بھئی مجھے معلوم ہے۔ یہ بتائیں کہ معاہدہ کتنے سال کا ہے؟“

”یہ بھی نہیں بتا سکتی۔ کیونکہ یہ بھی معاہدے میں شامل ہے۔ یہ بتائیں میرے سیریلز دیکھ رہی ہیں؟“

”کیوں نہیں۔۔۔ کون جانے کیا ہوتا ہے۔“ بہت اچھا جا رہا ہے۔ اس میں ایک سین تھا کہ جب آپ کا شوہر آپ کی ساڑھی کو آگ لگارتا ہے۔ بہت خطرناک سین تھا، کیسے کیا تھا؟“

”وہ سین واقعی بہت خطرناک تھا۔ شیفون کی ساڑھی تھی اور کسی وقت بھی کچھ ہو سکتا تھا۔ اس منظر کو بڑی مہارت کے ساتھ کیا ہم سب نے۔“

”فنکاروں کی کچھ سیکورٹی بھی ہوتی ہے؟“

”ہم جب اس سین کو کرنے لگے تھے تو ہر خطرے کے لیے سارے انتظامات کر لیے تھے کہ اگر ایسا ہو جائے گا تو یوں کرس گے اور ویسا ہو جائے تو اس طرح کریں گے، لیکن اللہ کا شکر ہے کہ سب ٹھیک ہو گیا۔“

”کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا تھا۔ میں نے دیکھا ہے کہ آپ دیگر فنکاروں کی طرح لباس نہیں پہنتی۔“

”نہیں اللہ کا شکر ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہوا تھا اور دیگر فنکاروں کی طرح لباس اس لیے نہیں پہنتی کہ مجھے اپنی فیملی کا خیال ہے۔ نی وی کے پروگرام نہ صرف میری فیملی بلکہ سب ہی دیکھتے ہیں پھر اچھا نہیں لگتا کہ کوئی باتیں کرنے لگے دیکھو اس کو۔ کیسی لگ رہی ہے۔“



ہم ایف ایس سی اسٹوڈنٹس سے زیادہ بہتر کون جانتا ہے کہ ایکز امز اور انٹری ٹیسٹ کے درمیان کے یہ تین چار ماہ کتنے مصروف اور نرف گزرتے ہیں۔ Nust کا انٹری ٹیسٹ بے حد قریب آچکا ہے، سیکنڈ ایمر کے پریکٹیکل بھی ابھی رہتے ہیں، اسی لیے میں نے چند ہفتے قبل امتل کو کما تھا کہ۔

”کیا خیال ہے، روبرو گول نہ کریں؟ میری طرف سے معذرت کر لیجئے گا کہ بڑی ہوں، وغیرہ وغیرہ“ مگر ان کے پاس چونکہ خطوط آرہے تھے، سو وہ مان کے ہی نہیں دے رہی تھیں، ان کا کہنا تھا کہ ”مسی کے بجائے جون کرو، مگر روبرو لکھنا ضرور ہے۔“

میرا ارادہ واقعی گول کرنے کا تھا، مگر آج جب مجھے آپ لوگوں کے خطوط ملے تو میں انہیں پڑھ کر مجبور ہو گئی ہوں کہ روبرو لکھوں اور ضرور لکھوں۔ حالانکہ آج میرا آخری تھیوری پیپر تھا، صبح چار بجے کی جاگی ہوئی ہوں۔ (تھینکس ٹو مومنہ اوبس) مگر پہلی دفعہ پیپر کے بعد والی دوپہر سو کر گزارنے کے بجائے، بے حد تھکاوٹ اور نیند کے باوجود یہ سب لکھ رہی ہوں، کیونکہ ان خطوط نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔

میں نے ہر خط بہت توجہ سے، بہت دھیان سے ایک دفعہ نہیں دو دو تین تین دفعہ پڑھا ہے اور شاید ہی میں بھی لفظوں میں آپ کو بتا سکوں کہ اس وقت میرے کیا احساسات ہیں؟ میں یہ تمام خطوط دیکھ رہی ہوں اور سوچ رہی ہوں کہ۔

آپ... آپ کہتے ہیں کہ میں خوبصورت لکھتی ہوں؟ ارے مجھ سے کہیں زیادہ خوبصورت تو آپ لوگ لکھتے ہیں۔ اتنے حسین الفاظ کا چناؤ، شدتوں بھری جذباتیت سے گندھے فقرے، اور ان فقروں کی بہت میں جزی آپ کی محبت، وہ خلوص، وہ عشق، جو ہر خط کے ایک ایک حرف سے چھلک رہا تھا، میں کیا کہوں؟

میں نے تو کبھی کسی کو اتنے خوبصورت خط نہیں لکھا! شکر یہ تو بہت چھوٹا لفظ ہے، میں تو اپنے جذبات کا اظہار بھی نہیں کر پاری۔ بس اتنا کہوں گی کہ یہ سب میری توقع سے کہیں زیادہ ہے۔ یا راتنی اچھی تو نہیں تھی کہانی بہت سی غلطیاں، کوتاہیاں اور جھول یقیناً رہ گئے ہوں گے، اس کے باوجود آپ کی بھیجی گئی یہ جہتیں یہ خلوص و جہالت بھرے سندیے میں یہ سب بھی بھلا نہیں سکوں گی۔

کہنے کو تو چار لفظ ہیں۔ ”تھینک یو سوچ۔“ مگر چونکہ دل سے لکھ رہی ہوں، سو وہ تمام بہت پیار کرنے والے دل جنہوں نے اپنے قیمتی وقت میں سے چند لمحے میرے لیے نکالے ہیں، ان کو یقیناً ”میرے جذبات سے آگاہی ہو جائے گی۔“

خطوط ڈھیر سارے ہیں، ان شاء اللہ سب کے باری باری جوابات دوں گی، ہر خط میں تقریباً ”پانچ“ چھ سوالات ہیں، جن میں سے چار سوال تو وہی ہیں، جو ہر خط میں دہرائے گئے ہیں، سو ہر خط میں سے نئے سوال کا جواب دے دوں گی، ہمیں تو نام تو ضرور لکھوں گی۔

پھر شروع کرتے ہیں۔ ”ترا قزم کا تاج محل“ سے۔ یہ ایک طویل کہانی تھی اور اس میں میں نے جو کچھ لکھا، وہ آپ نے چار ماہ میں پڑھا۔ اس کو میں نے ”کیسے“ لکھا، یہ اس سے بھی طویل اور بے حد مزاحیہ کہانی ہے، مگر چونکہ آپ کے خطوط پڑھ کر مجھے یہ اندازہ ہوا ہے کہ میری بہت اچھی قارئین مجھے بہت ذہین، بہت تاج والی، اور بے حد لائق فائق سمجھتی ہیں، تو میرا وہ تمام مزاحیہ قصے سنا کر اپنا ایجنڈا خراب کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ بس اتنا کہوں گی کہ میں نے، میرے کوراٹرز نے (جن میں ملکی وغیرہ ملکی کلا تمبرز شامل تھے) اور ان تم پروفیشنل ایکسپرس نے جو اس مسودے کی تکمیل میں شامل رہے تھے، ہم سب نے اس کا پلاٹ ڈسکس کرتے، ڈے ٹو ڈے اسکیچز بناتے، نقشے بنانا، ایک دوسرے کو نہ سمجھ میں آنے والی

باتیں سمجھاتے، اور صرف اس بات پر کہ ”را کا پوشی میں کیمپ میں برفانی نالہ ہے یا نہیں۔“ تین دن بحث کرتے، بہت انجوائے کیا۔ ہم سب بہت ہنسے تھے۔ (جبکہ قارئین کو بہت زلایا تھا۔) وہ تمام طویل بحثیں۔ مکالمے، مزاحیاں، اور وہ وقت جب کسی لائحہ عمل بحث کے اختتام پر ہم سب را کا پوشی سے ہوتے ہوئے ملا عمر تک پہنچ جاتے تھے۔

میں اپنے ریسرچ ورک کے ٹرانسکرپٹ نکال کر بڑھوں تو مجھے نے تماشا ہی آتی ہے۔ اور۔۔۔ اور آئی ایس بی آر کے ساتھ وہ تین چار ماہ کا ایک زبردست کو آرڈینیشن، کہ جتنی مدد میری ان ریل ٹائف کلا تمبرز نے کی اتنی ہی، بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ پاکستان آری نے کی تھی، اب اگر اس بارے میں لکھنے بیٹھوں گی تو بہت طویل ہو جائے گا، سو بہتر ہے کہ خطوط کی جانب بڑھتے ہیں۔

سہلا خط بے حد خوبصورت ہے۔ آمنہ امیر گوندل نے گوجرانوالہ سے لکھا ہے۔ ”آپ کی ریٹے تو ہر لڑکی کی نمائندہ ہے۔ ہر لڑکی میں ایسی قدر تو مشترک ہے، محبت ہونے پر ایک ہی فیملنگز، ناراضی پر ایک سا احساس، پھرنے کا ڈر، کھودینے کا کھنکا، گھروا آپ نے تو سب کچھ ہی بیان کر دیا۔ مجھے آپ پر فخر ہے۔“

اور آمنہ! مجھے آپ پر فخر ہے۔ بلکہ تھوڑی سی جیلسی بھی ہے کہ یا راتنا خوبصورت خط تو میں نے بھی زندگی بھر کسی کو نہیں لکھا۔ میں کیسے آپ کو شکر یہ کہوں؟ آگے آمنہ نے میرے ناول کی روح اور اس کا نچوڑ بیان کر دیا ہے کہ ”کوہ پیا اور بری کی کہانی تو صدیوں پرانی ہے۔ ان کا ساتھ تو ازل سے قائم ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ آپ نہیں ایک کر دیں گی، کیونکہ اگر انہیں ملنا نہ ہوتا تو وہ ایک دوسرے سے کیوں ٹکراتے؟“ افق کیوں پریشے کو ایولانج کے بعد زندہ مل جاتا؟

یہی تو میری کہانی کا اصل پوائنٹ تھا کہ اگر افق اور پریشے نے ملنا نہ ہوتا، اور دور دور ہی رہتا ہوتا، جیسا کہ وہ آغاز میں تھے تو پھر مجھے کہانی لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ آمنہ کا دوسرا سوال۔ ”اس کہانی کا پس منظر؟“ اس کا پس منظر اس سے تھوڑا سا مختلف تھا جو میں نے لکھا، جیسے وہ لڑکی (پریشے) پاکستانی نیشنل نہیں ہے۔

(پاکستانی نژاد ہے۔) جیسے افق ارسلان اس آخری حادثے میں زخمی ہوا تھا، نہ اسے ستارہ ایثار ملا تھا اور نہ وہ دونوں کبھی پہاڑوں میں دوبارہ جانے کا عزم لیے ہوئے ہیں۔

اختتام کی جو سطر تھی یہ وہ سطر تھی جس نے مجھ سے یہ ناول لکھوایا تھا۔ میں دو ایسے لوگوں کی کہانی لکھنا چاہتی تھی جو پوری کہانی یہی کہتے رہیں کہ ”اب آخری دفعہ ہے، ہم پھر کبھی پہاڑوں میں نہیں آئیں گے۔“ اور ایک مقام پر آکر ان کو اتنے دکھ ملیں کہ وہ ہالیوڈ میں کبھی واپس نہ جانے کا عزم کر لیں، مگر پھر مارگلہ کی پہاڑیوں کی ایک جھلک دیکھ کر وہ بالکل آخر میں اپنا فیصلہ بدل ڈالیں۔

جی کہانی کہتے ہوئے صرف آخر میں، آخری سطر میں رکی تھی اور ایک مہم انجام کیا، جس کو میری توقع سے زیادہ پسند کیا گیا، جس میں آپ سب کی شکر گزار ہوں۔ اب میں آپ کو تفصیل سے بتاتی ہوں کہ آخری سطور کے علاوہ میں نے کیا تبدیل کیا، زیادہ کچھ نہیں کیا۔

ناول شروع ہونے سے قبل پچھلے صفحے پر میرا ایک نوٹ تھا، جو میں نے ناول مکمل کر کے لکھا تھا، اس کے آخر میں لکھے ایک روسی گائیڈ اناتولی بوکریف کے قول کی آخری سطر تھی۔

”ان دوستوں کو مت بھولنا جو چوٹیوں سے لوٹ کر نہیں آئے۔“ یہ کہانی کا بنیادی نکتہ تھا۔ یہ ان دوستوں کی کہانی تھی جن کو میرے ہیرو اور ہیروئن نے پہاڑوں میں کھویا تھا۔ مجھے ایک کلا تمبر نے بتایا تھا کہ ان کے 52 ساتھی کلا تمبرز پہاڑوں میں ہلاک ہو چکے ہیں۔ میں اس بات سے بہت متاثر ہوئی تھی، اور مجھے ان بہت اچھے دوستوں کی کہانی۔ بلکہ تھی جو پہاڑوں میں حادثاتی موت کا شکار ہوتے ہیں۔

بعض قارئین کو شکایت ہے کہ شروع میں لگا کہ افق نے مر جانا ہے، مگر بعد میں وہ زندہ رہا۔ قارئین کے کہنے پر اینڈ تبدیل کر دیا گیا ہے؟

تو جناب! یہ تو کسی رائٹرز کی خوبی ہوتی ہے کہ وہ ہر صفحے پر قاری کی سوچ کے برعکس موڑ لیتا رہے، یہ ”سربراہ“ اینڈنگ ”تو ادب کی دنیا میں بہت بڑی خوبی سمجھی جاتی ہے۔“ افق نے آخر میں مرنا تھا یا نہیں؟ اس سوال کا جواب کامن سینس میں پنہاں ہے اور بہت آسان ہے۔ ”نہیں۔“

میں نے اسے زخمی حالت میں کئی روز ایک برفانی غار میں باتیں کرنے کے لیے تو نہیں زندہ رکھا تھا یا اگر اتنی کو مسلسل بچایا جا رہا تھا تو کامن سینس کی بات ہے اس نے نہیں مرنا تھا یہ تو افسانے کے لحاظ سے بھی غلط تھا۔ پہلی قسط میں اتنی پری کو ایک ڈیر دیتا ہے کہ تم مجھے اپنے صدر سے کوئی ایوارڈ دلوانا اس کا وہی فقرہ مجھے آخری سین میں پری کے لبوں سے لوٹنا تھا۔ پہلی قسط میں بارہا یہ بتایا گیا تھا کہ کیپ جینک کی تھی۔ آخر اس کا کوئی تو مقصد تھا۔ اور پری کے کیچر کا پتھر ڈھیلا تھا اس کے درمیان خراش بھی اس لیے تھی کہ جب وہ خیمے میں گرے تو اتنی اسے شناخت کر لے پہلی قسط میں پری بار بار یہ سوچتی ہے کہ ایک بار گرنے کی دیر ہے اور یہ پتھر الگ ہو جائے گا۔

اب میرے موقف کا سب سے بڑا ثبوت میری ان بیماری قارئین کے لیے ہے کہ جن کا خیال ہے کہ تیسری قسط لکھتے ہوئے میں اتنی کو مار چکی تھی اور چوتھی میں اسے دوبارہ زندہ کیا تو جناب! میں آپ سب سے گزارش کروں گی کہ تیسری قسط کا سینڈ لاسٹ صفحہ کھول لیں جہاں پری کو ہیلی کاپٹر سے اسپتال لایا جاتا ہے سوئی کی نوک اس کی جلد میں چبھتی ہے اس سے آگے غنودگی میں اسے محسوس ہوتا ہے کہ کوئی اس کے قریب بیٹھا کچھ کہہ رہا ہے۔ الفاظ کا چناؤ ہی اس ”کوئی“ کے خاص ہونے کا اشارہ دیتا ہے۔ اگر اتنی کو مار دیا تھا تو وہ کون تھا جو پریشے کے قریب بیٹھا اس سے کچھ کہہ رہا تھا؟ یعنی تیسری قسط کے آخر میں بھی اتنی زندہ تھا۔

ایک اور بات کہ میں نے یہ ناول سات ماہ رسرچ کے بعد آٹھ ماہ میں مکمل کیا تھا۔ اب صرف دس بارہ دن میں اس کی قسط کیسے لکھ سکتی تھی۔

نہ میں اتنی ایکٹو ہوں اور نہ ہی اتنی اچھی بچی کہ دو چار لوگوں نے کہا کہ اینڈ بدل ڈالو اور میں نے بدل دیا؟ لاجول ولا قوت۔

پچھلے برس نومبر میں جب ناول بھجوا یا تو اعلیٰ نے کہا تھا ”ارسہ اور امت کو مارو۔ اور اتنی کا پاؤں مت کاٹو یہ بہت دکھی ہو جائے گا۔“

مگر میں نے کہہ دیا تھا کہ ”سوری“ میں ایک لفظ بھی چنچ نہیں کروں گی۔“

مجھے اس کردار میں کوہ پیماہ کا جذبہ اور شوق دکھانا تھا اس کا پاؤں کٹ جانے کے باوجود اس کا کوہ پیماہی نہ چھوڑنے کا عزم دکھانا تھا۔ سو میں نے دکھایا۔ ویسے اس کی ایک مثال تو وہ بلنڈر ہے جو میں نے چوتھی قسط میں کیا اور جب نومبر میں ناول بھجوانے کے بعد اپریل میں اسے پڑھا تو مت پوچھیں میری کیا حالت تھی اس وقت سے میں اور حاجرہ خود کو موش باقی کی ملازمت کے لیے تیار کر رہے ہیں۔

پریشے ایک سین میں ماجر عاصم سے پوچھتی ہے کہ ”وائف اور بچے کیسے ہیں؟ تو ماجر عاصم کہتے ہیں کہ ”موش ٹھیک ہے۔“ ”آف یار! میں کیا بتاؤں؟ یہ مکالمے پری اور ماجر ہلال کے تھے کیونکہ موش باقی ماجر ہلال کی بیوی ہیں مگر دانستگی میں مجھ سے اتنا بڑا بلنڈر ہوا کہ اب مجھے بہت ڈانٹ پڑے گی اور صرف مجھے نہیں حاجرہ کو بھی کیونکہ ہم دونوں موش باقی کی ڈانٹ ہیٹھ آگئے کھاتے ہیں۔ اگر جو میں نے ایک دفعہ بھی ناول واپس منگو کر اینڈ پڑھانے کے بہانے ہی دوبارہ پڑھا ہوتا تو اتنی ”نازک“ بلنڈر تو ٹھیک کر ہی لیتی نا!

ویسے فرینکلے اسپیکنگ اب مجھے سبق مل گیا ہے۔ میں تو آئندہ سچی کہانی بتانے کی غلطی کبھی نہیں کروں گی ورنہ بڑا براہم ہو جاتا ہے یارا!

اچھا اب ایک اور دلچسپ بات جو سامنے آئی ہے۔ حالانکہ آغاز میں بتایا تھا کہ جن کرداروں کے نام بدلے جا چکے تھے ان کے بدلے ڈالے ہیں۔ اس کے باوجود چند لڑکیوں نے انٹرنیٹ پر اتنی ارسلان کو ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی۔ ان کو ایک فٹ بالر ایک ترک سنگر اور ایک آنجمنی انجینئر اس نام کال بھی گیا اب وہ مجھے بہت پریشاں سے اسی میل کرتی ہیں کہ فٹ بالر تو ذرا بھی ہینڈ سٹم نہیں ہے اور انجینئر مرچکا ہے تو ”ہمارا“ اتنی کون سا ہے؟

میری بیماری ریڈرز میں نے آغاز میں بتا دیا تھا کہ نام اور سیننگ مکمل طور پر تبدیل کر دی ہے کیونکہ اسی پرسنٹ کہانیاں اصل ناموں سے نہیں لکھی جاتیں اتنی پریشے ”امت“ نشاء ارسہ کے نام فرضی تھے بعض حقیقتیں تھی تھے جیسے مصعب، حبیب، البر تو ماجر ہلال، ماجر عاصم، کیپٹن بشیر، کمینین جینک، شغال۔ (حالانکہ وہ بہت برا لگتے ہیں) اور بہت اچھی سلٹی۔ ہیرو کے اصلی نام

سوال ہی نہیں پیدا ہوا تھا وہ اتنا بڑا کلا بھر کر آپ پر اعتماد کرتے ہوئے شخص دوستی اور مروت میں آپ کو اپنی کہانی لکھنے کی اجازت دے دیتا ہے تو کم از کم آپ سے اتنی سمجھ داری کی توقع تو رکھتا ہے کہ آپ نام مقام اور تاریخیں بدل ڈالیں گے۔ میرے کردار آپ کو ان فرضی ناموں کے ساتھ نہیں رکھیں گے۔ وہ فٹ بالر وہ سنگر اور آنجمنی یہ لڑکیں انجینئر ان میں سے کوئی بھی آپ کا اتنی ارسلان نہیں ہے۔

فٹ بالر اور سنگر کو تو رہنے دیں مگر اس انجینئر نے تھوڑا سا براہم یہ کیا کہ اس کا تعلق ترکی سے تھا اور اس کو بھی جنرل مشرف نے صدر ترقی ایوارڈ سے نوازا تھا ہماری چند قارئین تو پر یقین ہیں کہ یہی وہ انجینئر ہے جس کی کہانی میں نے لکھی تو میرے پاس اس کا ساہ سا جواب ہے کہ جس کی کہانی میں نے لکھی ہے وہ کلا بھر ہے۔

ناول لکھتے ہوئے میرے علم میں یہ تھا کہ ستارہ ایثار حاصل کرنے والوں میں ایک اتنی ارسلان بھی تھا مگر اس کے باوجود میں نے اپنے ہیرو کا نام نہیں بدلا کیونکہ اس کی کئی وجوہات تھیں میں ہیرو ہیروں کے نام بہت سہل مگر خوبصورت رکھنا چاہتی تھی کیونکہ ڈائجسٹ میں چھپنے والے ”زائر حاقانی اور حریدہ نوزان“ ایسے تمام جتانی نام جو بے شک نئے ہوں مگر مذاق بن چکے ہیں ان کو خلق سے اتارنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

پریشے بہت کامن تو نہیں ہے مگر ”پری“ ساہ اور کامن ہے تو رکھ لیا۔ ہیرو کے نام کے لیے میں نے سلٹی سے پوچھا تھا کہ ”ترکی میں سب سے کامن نیم کون سا ہے؟“ تو اس نے سانس لیے بغیر کہا تھا۔ ”اتنی ارسلان۔“ ”اس کے علاوہ؟“

”جینیک یقین“ امت عبد اللہ۔“ مجھے اب ہیرو کا نام ان چار ناموں میں سے منتخب کرنا تھا۔ ارسلان، میرے چھوٹے بھائی اور ”ارسلان بھٹی“ نشاء کے چھوٹے بھائی کا اصرار تھا کہ ہیرو کا نام ارسلان ہو۔ بلکہ ارسل بھٹی کو تو ضد تھی کہ اگر حبیب کا نام پوز ہو رہا ہے تو اس کا بھی ہونا چاہیے۔ میری اس کہانی کے کئی نام ان بچوں نے رکھوائے ہیں سو ان دونوں کے لیے میں نے ہیرو کا نام اتنی ارسلان منتخب کیا۔ مگر پھر سلٹی سے پوچھا بھی کہ اتنی کے بجائے کچھ اور کر لوں مگر اس کا کہنا تھا کہ ترکی میں ”اتنی ارسلان“ اکٹھا ہوتا ہے اور عموماً ”حسن حسین

ارسلان کا بیٹا اتنی ارسلان ہی ہوتا ہے۔ (جیسے ہمارے ہاں بڑے بھائی کا نام علی اکبر اور چھوٹے کا علی اصغر ہوتا ہے۔) ایسے ہی ہر ملک کے ان کے رواج ہوتے ہیں۔

اب اگر وہ مر جانے والے انجینئر میں سے ایک کا نام اتنی ارسلان تھا تو میرے لیے یہ حیرت کی بات نہیں تھی کہ ترکی میں آپ ایک پتھر اٹھاؤ تو تین چار اتنی ارسلان نکلتے ہیں جس فرم میں اتنی ارسلان کام کرتا تھا میری اس کے ایک عہدیدار سے بات ہوئی تو اس نے کہا۔

”ہمارے ہاں چھ اتنی ارسلان اور پانچ جینیک یقین کام کرتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”اتنی ارسلان“ سن آف حسن حسین ارسلان؟“ انہوں نے کہا۔ ”مادام ہمارے چھ میں سے تین اتنی ارسلان کے والد کا نام حسن حسین ارسلان ہے۔ آپ کوئی اور نشانی بتائیں؟“ (میں مذاق نہیں کر رہی آپ مجھ سے اس فرم کا نمبر لے کر کال کر کے خود معلوم کر سکتے ہیں۔)

جو ہمارا کوہ پیماہ ہے وہ چھٹ گرنے کے حادثے میں زخمی نہیں ہوا تھا وہ معجزانہ طور پر بالکل محفوظ رہا مگر کہانی میں اگر معجزے لکھے جائیں تو ریڈرز زمانہ کرتے ہیں سو تھوڑا سا ٹریجک فیچر دینے کے لیے میں نے اسے زخمی کیا۔ بہر حال اسے ستارہ ایثار نہیں ملا تھا یہی وہ دو تین چیزیں تھیں جو میں نے خود سے ایڈ کی تھیں اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ نسیم حجازی کی مثال لے لیں ہم ان کے ناول کو سچا کہتے ہیں جبکہ سوائے بنیادی ڈھانچے کے سب خود ساختہ ہوتا ہے مگر پھر بھی ہم انہیں سچا کہتے ہیں۔

ہاں ایک بات ہم نے make sure کی تھی کہ ہمارے کوہ پیماہ کا پاکستان آکر کام کرنے کا کوئی ریکارڈ تو نہیں ہے کیونکہ وہ زخمی نہیں ہوا تھا سو اس کو میڈیا کو راج نہیں ملی تھی اور نہ ہی اب بی بی وی کے پاس وہ ڈاکو منتری رکھی ہے جس کا ذکر سلٹی نے آخری سین میں کیا تھا۔ میں نے آپ کو کہا تھا نا جب آئی ایس بی آر کو وہ ڈاکو منتری نہیں ملی تو پھر کسی کو بھی نہیں ملے گی آئی ایس بی آر نے ہیمنکس کو کرٹل عتیق بہت کوشش کی مگر انہیں وہ نہیں ملی اور یہ کنفرم کرنے کے بعد ہی میں نے ناول لکھا تھا ویسے کرٹل عتیق نے مجھے منع کیا تھا کہ یہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کہانی سچی ہے مگر مجھ پر چونکہ ایمان

داری کا بھوت سوار تھا سو میں نے یہ بتانے کی بے وقوفی کر دی۔ اگلی دفعہ یہ غلطی نہیں دہراؤں گی میری تویار سات نسلوں کی توجہ ہے۔

تسلی رکھیے ہمارے دونوں کردار زندہ ہیں اور یورپ میں ہیں ہاں ممکن ہے حقیقی زندگی میں وہ آتے خوش نہ ہوں جتنا میں نے دکھایا تھا۔

چلیں آمنہ آپ کے ایک سوال کے جواب میں میں نے 70 فیصد سوالات کے جوابات تو دے ہی دیے ہیں کیونکہ زیادہ تر کے سوالات یہی تھے۔

آمنہ کا اگلا سوال۔ ”سچ بتائیے۔ کیا آپ بھی اس کہانی کے کرداروں میں خود کو پاتی ہیں؟ کیا تیسری قسط لکھتے ہوئے آپ کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری نہیں ہوئے؟“

بہت خوبصورت لفظ لکھنے والی آمنہ تیسری قسط کے آخر میں جب ہیلی کا پڑری کو لے کر جا رہا تھا اور وہ ایک دم چیخنے لگتی ہے اور ان کو ہیلی کا پڑروکنے کا کہتی ہے وہ لکھتے ہوئے تو نہیں مگر سوچتے اور بعد میں پڑھتے ہوئے میں بھی آپ کی طرح روئی تھی لکھتے ہوئے میں نہیں روئی البتہ کوئی ہنسنے والی بات ہو تو خوب ہنستی ہوں۔ جیسے پیٹر آنسرز والا سین لکھتے ہوئے میں اکیلی بیٹھی ہنس رہی تھی اور میرے چھوٹے مجھ پر ہنس رہے تھے۔

آمنہ آپ کے میرے سوال کا جواب آگے جا کر دوں گی اتنے پیارے خط کا ایک دفعہ پھر شکریہ۔ اگلے خط میں سحرش مہرین نے سرائے عالمگیر سے افق ارسلان کا اصلی نام پوچھا ہے۔

سحرش ڈیر یہ سوال دوسری بہت سی قارئین نے بھی کیا تھا میں نام تو بتا دوں مگر پھر جب اس بہت پاپولر کلا بئیر کو نیٹ پر سرچ کیا جانے لگے گا اور پھر اس کی پرسنل لائف کی کھوج اس سے بہت سے لوگوں کی زندگی ڈسٹرب ہوگی ویسے بھی افق ارسلان کا کردار کسی نہ کسی حد تک میرا تخلیق کردہ کردار بھی بن گیا ہے کیونکہ کچھ چیزیں تو میں نے اپنے پاس سے بھی ایڈ کی تھیں ویسے سحرش! آپ کا خط بہت بہت اچھا ہے آئندہ بھی لکھتی رہے گا۔

سیدہ نور العین تو اب شاہ سے پوچھتی ہیں کہ ”میں نے ریٹے کو اصل میں دیکھا ہے کیا؟“ آگے آپ پوچھتی ہیں۔ ”کیا پری اور افق حقیقت میں بھی اتنے ہی لونگ ہیں؟“ اس سوال کا جواب بہت تفصیلی ہے جو میں آگے اس سوال کے ساتھ ملا کر دوں گی جو بہت سے لوگوں نے کیا ہے

کہ ”کیا پریٹے حقیقت میں اتنی ہی حسین ہے؟“ اگلا سوال۔

”ارسہ جینیٹک اور احمیت کی موت لکھتے وقت آپ کے کیا تاثرات تھے؟“

اب نور کہیں گی کہ میں ان کے سوالات کو فیکس منٹہ پر ڈالے جا رہی ہوں مگر یا زور سلی اس سوال کے جواب میں میں آپ کو ایک طویل قصہ سنانا چاہتی ہوں۔ نیکسٹ منٹہ ہی بہتر رہے گا یہ نکتہ میں اس دفعہ زیادہ سے زیادہ خط لینا چاہ رہی ہوں۔ کوہ پیما کی تاریخ کے دکھی قصے ان شاء اللہ پھر سہی۔ دعاؤں میں یاد رکھئے گا۔

حمیرا انور بہت بہت اچھی لکھائی میں لکھے خط کے ساتھ کراچی سے آئی ہیں۔ اتنے پیارے خط کا بہت بہت شکریہ حمیرا! آپ لوگوں نے میرا مان بہت بڑھایا ہے۔ حمیرا کا پہلا سوال۔ ”کیا یہ سب میری ذاتی مانج میں تھا؟“

”جی حمیرا! یہ سب میری ذاتی مانج میں تھا“ آگے یہ جاننا چاہتی ہیں کہ ”کیا آپ خود کوہ پیما کا شوق رکھتی ہیں؟“

”نہیں حمیرا! ایڑیج کوئی خاص شوق نہیں ہے۔ ہاں ٹولڈ اور ٹریکنگ کا شوق ہے اور الحمد للہ بہت کی ہے۔“ حمیرا نے ترک زبان کے الفاظ اور گیت وغیرہ کی تعریف کی ہے تمہیک یو یار! مگر ترک الفاظ کے لیے سلیمنی زندگی یاد ترک گیت (لبلی مجنوں) کے لیے انٹرنیٹ زندہ یاد اور اس ترک نظم کے لیے جو افق نے پری کو وائٹ پیس میں سنائی تھی ”نمرہ زندہ باد“ کیونکہ وہ میں نے خود بہت جلدی میں لکھی تھی شروع میں احمیت ادمت کی ایک نظم کا ترجمہ لکھنے کا ارادہ تھا مگر وہ کہانی کے تھیم کے ساتھ سچ نہیں کر رہی تھی۔

اور ہاں حمیرا! ایولانج کے معنی اردو میں ”لانی“ ہیں ڈکشنری میں برف کا ڈھیر وغیرہ لکھا ہے مگر یہ بالکل برعکس معنی نہیں ہیں میں نے یہ کہا تھا کہ مجھے مناسب لفظ نہیں ملا غیر مناسب الفاظ تو بہت سے مل گئے تھے ہاں ”لانی“ ایک پروپر لفظ تھا مگر ”ایولانج“ جو بے شک ایک ملٹری ٹرم ہے سے زیادہ کامن نہیں تھا سو میں نے ایولانج ہی استعمال کیا۔

ارم خالد لاہور سے اس یقین کے ساتھ آئی ہیں کہ افق مرد کا ہے مگر امید ہے کہ اوپر دی گئی وضاحتوں کے بعد ارم

ساگرہ منانا ہوگا۔ اپنی ساگرہ پر خوش ہوا کریں۔
اب میری سب سے کیوت فین فریال کا خط شامل محفل ہے۔ فریال ڈیر: آپ کے دونوں خطوط مل گئے ہیں اور معذرت کی کوئی "نوٹ" نہیں ہے، اس اوکے۔ اور یہ بات بہت اچھی ہے کہ آپ اپنی اردو امپروو کر رہی ہیں دیکھیں یہ سلی گڈ (بیسے گامت ہم انگریزی کے عادی لوگ اردو کی

دنیا بھر سے منتخب معیاری ادب

عمران ڈائجسٹ

جون 2009 کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

Email: id@khawateendigest.com

- ☆ "بیماری" شیطان کے چنگل میں پھنس کر اورانی طاقت حاصل کر کے اپنی ناسودہ خواہشات کی تکمیل کرنے والے ایک شخص کا ناجرا۔ شائستہ وحید کے قلم سے،
- ☆ "کاروان" دو خاندانی دقار رکھتا تھا، وہ نا تجربے کا تھا، مگر معاشرے نے اسے بہت کچھ سکھایا، از غدی کی بیچ راہوں کے مسافر کی تلخ و شیریں داستان، ایم اے راحت کے قلم سے،

- ☆ "اورخان" اس تاریخی کہانی میں جہاں جنگوں کا احوال ملے گا، وہیں محبت کی لازوال داستان بھی نظر آئے گی۔ اسلم راہی کے قلم سے تاریخ کے اوراق،

- ☆ "دو کون تھی" آخری صفحات پر ایم اے راحت کی معاشرتی تحریر،
- ☆ نکی وغیر کی ادب سے انتخاب،

تازہ شمارہ آج ہی خرید لیں

میری ایف ایس سی ہے۔ مزاجیہ تحریر کے بارے میں ابھی تو کوئی ارادہ نہیں۔ لکھنے کے لیے مجھے بس تھمائی اور موڈ درکار ہوتا ہے، لکھتا تو ویسے بھی موڈ کے ساتھ ہوتا ہے۔ آج صبح کی رائٹرز ہمت اچھا لکھ رہی ہیں ماشاء اللہ۔ کم از کم مجھ سے تو سب اچھا ہی لکھ رہے ہیں۔ باقی رہا تعریفیں سن کر مغرور بننے کا سوال، تو جس دن میں مغرور ہو گئی اس روز میرا یہ زخم تم ہو جائے گا۔ دماغ آسمان پر پہنچے گا تو ظاہر ہے میں زمین پر بغیر دماغ کے رہوں گی اور بغیر دماغ کے لکھنے کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو جائے گا کہ رائٹرز مغرور ہو گئی ہے۔ اللہ نہ کرے ایسی نوبت آئے۔"

عزیزین و سیم کا بہاؤ پورے سوال ہے کہ "آپ کی عمر؟" "اٹھارہ سال، آٹھ ماہ۔"

آگے یہ مشاغل اور پڑھائی وغیرہ کے متعلق پوچھ رہی ہیں تو عزیزین ڈیر: مجھ سے بہت سے دوسرے لوگوں نے بھی پوچھا کہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ لکھنے کو کیسے۔ نتیجہ کرتی ہو، تو جناب! بتاتی چلوں کہ میں پڑھائی کے ساتھ صرف لکھنے کو ہی manage نہیں کرتی بلکہ میں ایک نجی تجزیاتی ادارے میں بطور reserch analyst جاب بھی کرتی ہوں۔ ٹائم مینجمنٹ اس طرح بھی ہو جاتی ہے کہ میری آفس جانے والی جاب تو ہے نہیں۔ ہمارا آفس چکالہ میں ہے، عمریہ الگ بات ہے کہ مجھے آفس کی ریکورڈر شکل دیکھنا نصیب نہیں ہے۔ پر پوری ان شاء اللہ چند ماہ تک شاید میں آفس جو ان کر لوں، مگر assignments تو گھر پر ہی کرتی رہتی ہوں۔ ویسے بھی میری یہ پارٹ ٹائم جاب صبح پانچ سے رات ڈیڑھ بجے تک چلتی رہتی ہے۔ شاید اسی لیے میں ناؤڑ کے لیے ریسرچ ورک بہت زیادہ کر لیتی ہوں۔"

شائفہ (لاہور) کے جوابات حاضر ہیں۔
"شائفہ! میں خود کلائمنگ نہیں کرتی، البتہ ٹور ازم بہت کیا ہے۔ یہ ناول ان شاء اللہ دو تین ماہ تک کتابی شکل میں آجائے گا اور حاجرہ نے مصعب عمر کے کردار کی بات کی تھی۔ (حاجرہ تمہیں تو بیٹھے بٹھائے میری ریڈرز میں مشہور ہو گئی ہوں)!"

شائفہ! آپ کی طرح میرے ایک چچا کی ساگرہ بھی 8 اکتوبر کو ہوتی ہے مگر ہم اسے مناتے ہیں کیونکہ دن کوئی بھی برا نہیں ہوتا۔ ہم بس زلزلہ زدگان اور اب سوات وار کے متاثرین کی مدد کرتے رہیں یہ بھی ایک طرح سے

پاس بیڈ پر بیٹھا بھی تھا۔
آپ کا اگلا سوال "افتق نے پہاڑوں پر دوبارہ کیوں جانا چاہا؟"

میں تو میرے کہانی لکھنے کی اصل وجہ تھی۔ درحقیقت افتق کو پہاڑوں سے نفرت نہیں ہوئی تھی، وہ صرف ایسا سمجھتا تھا۔ اس نے کئی ماہ نارمل انسانوں کی طرح رہنے کی کوشش کی، مگر مارگہ کی پہاڑیوں کی ایک جھلک نے ہی اسے اپنی ذات میں موجود ادھورے پن کا راز بتا دیا کہ وہ ادھور اپن جو پری اور وہ دونوں محسوس کرتے تھے، صرف اور صرف کہ پتیلی ترک کر دینے کے باعث تھا۔ آخر میں دونوں کو احساس ہوتا ہے کہ ان کا خمیر ہمالیہ سے اٹھا تھا، وہ پہاڑوں میں ہی خوش رہ سکتے تھے ان کو پہاڑوں سے نفرت ہوئی نہیں سکتی تھی۔

ویسے بھی یہ ناول پاکستان میں ٹور ازم اور کوہ پیمائی کے فروغ کے لیے لکھا تھا، مگر لکھتے لکھتے وہ ایسا بن گیا کہ جو جانے کا سوچ رہے ہوں، وہ بھی کانوں کو اٹھ لگائیں تو آخر میں حقیقت سے ہٹ کر یہ کرنا میرے لیے اس لیے بھی ضروری تھا کہ میں نہیں چاہتی تھی کہ قارئین پہاڑوں کا ڈراؤنا سا بیج لے کر جائیں۔

رمشہ ارشد کا خط بہت دلچسپ ہے۔ "کاش! افتق میرا بھائی ہوتا!"

"بھائی؟ سیرسلسی رمشہ؟ یا ر! ایک دفعہ پھر سوچ لیں!"

رمشہ! افتق اور پری نے کوہ پیمائی چھوڑ دی تھی۔ وہ دوبارہ ہمالیہ کلائمنگ کے لیے نہیں گئے۔ اجنت اور جینک کی مسز کی آپ نے بات کی تو رمشہ، جینک کی مسز نہیں تھیں، ایک فیائسی تھی جس نے بعد میں شاید شادی کر لی تھی، مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔ آخر میں آپ نے جس موضوع پر لکھنے کی بات کی وہ بلاشبہ ایک عمدہ موضوع ہے۔ اللہ نے چاہا تو ضرور لکھیں گے۔

صبا طارق گوجرانوالہ کے سوالات کے جوابات حاضر ہیں۔

- 1- "جی، صبا! مجھے بچپن سے لکھنے کا شوق تھا مگر بچوں کے کسی رسالے کے لیے نہیں لکھا۔"
- 2- "کہانی کی اصلاح بس امنل ہی کر دیتی ہیں۔"
- 3- "میں بہت بہت سوشل ہوں۔ میرا سوشل سرکل ماشاء اللہ اتنا بڑا ہے کہ اسے سنبھالنا مشکل ہے۔ ایجوکیشن

کی کنفیوژن دور ہو گئی ہوگی۔
ان کا پہلا سوال۔ "کیا افتق ارسلان حقیقت میں بھی اتنا ہی پنڈ سم ہے؟"
"اس سے بھی زیادہ 'ارم'!"

اب میری طرف سے تمام قارئین سے درخواست ہے کہ ارم کے ایگزامز کے لیے خوب ڈھیر ساری دعا کریں، تاکہ وہ بہت اچھے نمبروں سے کامیاب ہو جائیں۔ (آمین) فوزیہ صادق کسوال سے ایک بہت خوبصورت خط کے ساتھ شریکو محفل ہیں۔ ان کا پہلا سوال۔ "یہ ناول لکھنے کا خیال کیسے آیا؟"

"فوزیہ! قصہ یوں ہے کہ میں "سلطنت" کے عنوان سے ایک دو سرائل لکھ رہی تھی، اس کے ایک سین میں دو کردار چلتی چیئر لفٹ سے نیچے برف پر اتر جاتے ہیں۔ جب میں برف والا سین لکھنے لگی تو میری خواہش تھی کہ وہ دونوں برف میں کچھ ایسا بنا کر جائیں جسے آنے والے کئی سالوں تک یاد کریں، مگر اس طرح کی چیز ناول کی ٹون سے میچ نہیں کر رہی تھی۔ سو اس پوائنٹ پر آکر میں نے سلطنت کو چھوڑ کر ایسی کہانی لکھنے کا سوچا جس میں برف زاروں کا ذکر ہو۔ قراقرم کا تاج محل کا جو پہلا مکالمہ میرے ذہن میں آیا تھا وہ پریشے نے افتق کا مظہر برف میں دباتے وقت بولا تھا۔ وہ میری پسندیدہ سطور ہیں۔"

اور پیاری فوزیہ! یہ ناول میں نے اس سے وابستہ تمام لوگوں کی اجازت سے لکھا ہے، وعادوں میں یاد رکھیے گا۔
ثمینہ ناز، کلاکوٹ سے پوچھ رہی ہیں کہ مصعب عمر کا کردار مجھے کیوں اتنا پسند ہے؟ ہوتھینہ! اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مجھے اس پوری دنیا میں سب سے زیادہ عزیز مصعب ہے اور وہ دنیا کا سب سے ہنڈ سم لڑکا ہے (مصعب کی اماں سے درخواست ہے کہ وہ اس لفظ پر ہنسنے سے گریز کریں۔) بائی گلو! اس دنیا میں مصعب سے زیادہ اچھا کوئی نہیں ہے) آگے لکھتی ہیں "مارچ والی قسط میں ڈاکٹر صاحب افتق کے لیے died کا لفظ کیوں استعمال کرتے ہیں؟"

"ثمینہ! ڈاکٹر صاحب نے افتق کے لیے نہیں 'ارم' کے لیے کہا تھا ان کے فقرے سے جنس یا نام وغیرہ واضح نہ تھا۔ پری سمجھی کہ وہ افتق کی بات کر رہے ہیں مگر پھر نشاء کے بتانے پر اس نے بہت relieved ہو کر سوچا تھا کہ "تو ڈاکٹر ارم کی بات کر رہا تھا۔" اور جناب! افتق جو تھی قسط میں زندہ نہیں ہوا تھا، وہ میری میں بھی زندہ ہی تھا، پری کے

تعریف بھی انگریزی میں ہی کرتے ہیں۔)
ہری پور سے نور اور بنتِ آس ڈھیر ساری پر خلوص
چاہتوں کے ساتھ آئی ہیں اور پوچھ رہی ہیں کہ اتنی ساری
معلومات کا ذریعہ کیا تھا؟

تو جناب اس کا جواب ایک ہی فقرے میں دوں گی کہ
”پاک فوج زندہ باد“ الیائن کلب پائندہ باد!
اور تمام واقعات انگریز کنسٹی انسی جگلوں پر پیش نہیں
آئے تھے جہاں میں نے لکھے۔ بے شک خیال بہت خوب
صورت ہے مگر مجھے اپنی وادیوں کا حسن پر وجیکٹ کرنا تھا۔
یہ ایک خود غرضانہ سی محب الوطنی تھی۔
شہلا رجانہ کا ٹوبہ ٹیک سنگھ سے سوال ہے کہ کیا تمام
کردار حقیقی تھے؟

”جی شہلا! تمام کردار (سوائے ارسہ کے) حقیقی تھے،
یہاں تک کہ وہ پور ٹرک شغالی بھی۔“
اتنی بہترین کاوش کی پذیرائی پر میں کیسا محسوس کرتی
ہوں تو جناب کاوش تو عام سی تھی مگر سپانس الحمد للہ مجھے
توقع سے بڑھ کر ملا جس کے لیے میں آپ کی ہمدردی سے
مشکور ہوں۔ دعاؤں کے لیے جزاک اللہ اللہ آپ کو اجر
دے۔

یہ اگلا خط ہے پڑھتی ہی جا رہی تھی مگر جب آخر میں نام
دیکھا تو بے اختیار لبوں سے ”ارے یہ تو لاریب کا خط
ہے“ نکلا یہ میری سب سے پیاری ریڈر ہیں۔ آپ کا پھلا
خط مجھے مل گیا تھا اور اس کی طرح وہ بھی بہت اچھا تھا۔
”لاریب فرام ملتان نے پوچھا ہے ”مس
جینٹس“ یہ ”برو“ کیا ہے اور اسے پڑھتے کیسے ہیں؟“

”مس جینٹس۔ کا جواب یہ ہے کہ راکا پوشی کے پہاڑ
پر یا کسی بھی دوسرے پہاڑ پر جو گلیشیر جمے ہوتے ہیں ان کو
ان کی ساخت اور پہاڑ کے رخ (face) کے اعتبار سے ہم
classify کر لیتے ہیں۔ راکا کے تین مختلف faces پر
تین گلیشیر ہیں۔ ایک ”جگلوں کوہ“ گلیشیر دوسرا ”سپان“
گلیشیر اور تیسرا ”برو“ گلیشیر۔ برو راکا پوشی کے شمال مغربی
رج کے قدموں میں جی برف (گلیشیر) کا نام ہے۔ اس کو
پڑھتے ہوئے ”ب“ پر پیش اور ”ر“ پر بھی پیش لگاتے
ہیں۔

اور لاریب ڈیوار راکا پوشی کو اس کے دو تین راستوں
سے ڈھیروں لوگ سر کر چکے ہیں مگر اس کے شمال مغربی

رج (ڈھلوان) سے اسے کسی نے آج تک سر نہیں کیا۔
اسی ڈھلوان کی کہانی ہم نے آپ کو سنائی تھی۔ پہاڑ کے دو
faces میں بھی اتنا فرق ہوتا ہے کہ اگر آپ نے ہنزہ
سے راکا پوشی کے جگلوں کوہ والی طرف جانا ہے تو آپ
دس پور ٹر اور پانچ گدھے لے کر جاتے ہیں، لیکن اگر راکا
پوشی کے ہی برو گلیشیر والے faces تک جانا ہے تو آپ
ڈھیروں پور ٹر لیتے ہیں، مگر گدھے نہیں لیتے کیونکہ وہ
راستہ اتنا پرتج سے کہ وہاں گدھے نہیں جاسکتے۔ اس سے
آپ اندازہ کر لیں کہ ایک ہی پہاڑ کے دو مختلف faces
بھی کتنے مختلف ہوتے ہیں۔

اور جناب! اگر موسم ٹھیک ہو، مطلع صاف ہو تو ہر پہاڑ
کی چوٹی سے دوسرے تمام پہاڑ دکھائی دیتے ہیں۔
23 سال پہلے میرے ایک کوراٹر blanchard
barry نے راکا کو سر کیا تھا اس نے چوٹی سے پورا
کنکور ڈیا اور بلتور رو دیکھا تھا۔

اس کہانی کو لکھنے کا خیال تو ایک دوسری کہانی کے برف
والے سین کے باعث آیا تھا، مگر بنیادی محرک تو ماژکا
ریسکیو آپریشن بھی تھا۔ اور بیسی بی لیسنڈ برتھ ڈے
کاروبار خوش رہے اور اتنے اچھے خط لکھتی رہے۔

ان تمام خطوط میں جو سوالات تھے وہ تمام سوال چند اور
قارئین نے بھی اپنے خطوط میں پوچھے ہیں۔ جواب تو دے
چکی ہوں، مگر پھر بھی ان کا نام لکھ رہی ہوں۔ بشری
حسن شہو احمد بیٹ، پتوکی رضوانہ ناز، فائزہ جاوید خان پور،
ماہن شاہ سکرند، صبا ناز کراچی، ثوبہ شمرین ڈی جی خان، نازیہ
اسلم چکوال اور نخری بی فتح جنگ۔ آپ سب کے خطوط بھی
بہت اچھے تھے اور ان سب نے میرا حوصلہ اور مورال
بہت بڑھا دیا ہے۔

چند خطوط جو میں اس ماہ شامل کرنا چاہتی تھی، جیسے
عاصمہ (خانیوال) سے اور اسپیشلی نمن اور عائشہ کا
نشر، ملتان سے، مگر جگہ کم ہے۔ نمن آپ کا خط بہت اچھا
تھا، مگر سو سو ری میں اس ماہ نہیں شامل کر سکی۔ ان شاء اللہ
نیکسن مننتہ آپ دونوں کے خطوط سے آغاز کریں گے۔
قارئین سے درخواست ہے کہ میرا جون کے آخری
عشرے میں NUST کامیڈیکل انٹری ٹیسٹ ہے، دعا کیجئے
گا مجھے اس میں ایڈمیشن مل جائے۔ اور نہیں تو بس آمین
ہی کہہ دیجئے۔

(باقی آئندہ)

راحت جبین

دردِ دل

ڈاکٹر شہروز کے اور حرنے کے جوڑے کو پورے خاندان میں اسٹیبل حیثیت حاصل ہے۔ ڈاکٹر شہروز ایک نیک دل اور منجھے ہوئے سائیکالوجسٹ ہیں جبکہ جراتمائی کا لچ میں اکتائس کی نیکواری ہے۔ عمرا اور عادل کی خوبصورت تلقاریاں ان کے گھر کی رونق ہیں۔ ڈاکٹر شہروز کے پاس ایک مشکل لیکن دلچسپ کیس آتا ہے۔ وہ اس عورت کو پہچان جلتے ہیں۔ انہوں نے اسے ایک بار پارک میں دیکھا تھا اور اس کی عجیب و غریب حرکتوں نے انہیں چونکا یا تھا۔ یہ کیس ایک ایسی عورت کے متعلق ہے جس کی دیگر گون حالت ادمائے دن پڑنے والے دھندلے دل نے اس کے شوہر کو پریشان کر رکھا تھا۔ اس عورت کا رویہ پہلے سیشن میں خاصا نرم و ملنسار رہتا ہے لیکن ڈاکٹر شہروز کی کوشش سے وہ ان پر اعتماد کر لیتی ہے اور پرت و پرت اپنے ماضی کے واقعات بیان کرتی ہے۔

دقارالحسن اور مارالنے محبت کی شادی کی تھی۔ دقار احمد کی یہ دوسری شادی تھی۔ پہلی بیوی مہرالنسا سے جو دقار کی خالہ زاد بیوی ہے۔ مہرالنسا کی زبان دلازی اور بدتریزی کی وجہ سے اس کے پہلے شوہر نے اسے طلاق دے دی تو دقار کی ماں نے دقار کو مجبور کیا کہ وہ مہرالنسا سے شادی کریں لیکن دقار کے ساتھ بھی اس کی نہ بن سکی۔ دقار نے مارا سے شادی کر لی تو مہرالنسا دیکھ کر جل گئی۔ مارا کے ہاں ایک بیٹی ایمین پیدا ہوئی۔ دقار بہت خوش تھے لیکن اپنا ک سال کا انتقال ہو گیا۔ ایمین ماں کی کمی بہت محسوس کرتی ہے۔ اس کی خندقی طبیعت دقارالحسن کو بے حد پریشان رکھتی ہے، اسے سنبھالنے کے لیے دقار نے خدیجی کو اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے جو ان کی رشتہ دار ہیں اور اپنے بیٹے، ہوسے ناراض ہو کر ان کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ دقارالحسن کی مستقل پریشانی کو دیکھتے ہوئے خدیجی انہیں مہرالنسا کو لانے کا مشورہ دیتی ہیں جس پر وہ ایک لمحے کو چپ رہ جلتے ہیں۔

ایمین کی بگڑتی ہوئی عادت دقارالحسن کو خدیجی کا مشورہ مان لینے پر مجبور کر دیتی ہے۔ مہرالنسا سے ان کی دو بیٹیاں موجود ہیں جو حرنے کے ایک بیٹا اور ایک شوہر سے ہے۔ مہرالنسا دقارالحسن کے ساتھ آجاتی ہے۔ وہ دقارالحسن کے سامنے مارا سے اپنی بیٹیوں سے بڑھ کر اچھا سلوک کرتی ہے۔ دقارالحسن مہرالنسا کی قربانیوں کو تہ دل سے تسلیم کرنے لگتے ہیں، اس لیے مہرالنسا کے پہلے شوہر کے بیٹے بار کو بھی اپنے گھر لے آتے ہیں اور اپنے بچوں کے اچھے مستقبل کے لیے ایسا ہوا ہوا ہونے لگے۔ مہرالنسا کے حوالے کر کے بہر دل ملک چلے جلتے ہیں۔ دقارالحسن کا جانا ایمین کے لیے افراتوں کے نئے باب کا آغاز ثابت ہو رہا ہے۔ تمام معاملات جو ایمین کو باپ کی موجودگی میں حاصل تھے، چھین کر، گھر کے کاموں کی ذمہ داری اس کے سر ڈال دی جاتی ہے۔ ایمین، مہرالنسا کے رویے کی اس تبدیلی پر بے حد



www.paksociety.com

”چاچی صدقے۔ اتنی کمزور سی ہے اور صبح سے چولہا سنبھال کر کھڑی تھی، چکر تو آتا ہی تھے۔ پتا نہیں، خود ڈھنگ سے کھانا بھی کھایا تھا یا نہیں۔“ چاچی داری صدقے جانے لگیں۔ چاچے کی جیب سے روپے نکلا کر وارے۔

”نگ بھی تو کتنی پیاری رہی تھی۔ ضرور کسی کی نظر لگ گئی ہے۔“ سدرہ نے اپنا بچہ سنبھالتے ہوئے خیال آرائی کی۔

”اللہ خیر لے، کس کی نظر لگتی تھی۔ سب اپنے ہی تو ہیں۔“
 ”چاچی، پیار کی نظر تو پہلے لگتی ہے۔“ سدرہ نے سرسری طارق کو دیکھ کر شرارتی انداز میں کہا۔ وہ جو بڑی تشویش سے ایمین کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ ایک دم سنبھلا، پھر مسکرایا۔

”میں اب ٹھیک ہوں۔“ سب اس کے سر پر سوار تھے، ایمین کو الجھن سی ہونے لگی۔ اس کے اعصاب ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھے اور وہ اس وقت مکمل تنہائی کی خواہاں تھی۔ چاچی اس کا سروبار ہی تھیں، تو سدرہ ہاتھ سہلاری تھی اس نے اپنا بچہ ایمین کے ساتھ ہی لٹا دیا تھا، جو غول غول کرنا خواجوا کھلکھلائے جا رہا تھا۔
 ”آپ لوگ چائے وغیرہ پیئیں۔“

”بے جھلی! ہماری چلنے کی اتنی فکر اور اپنی پرواہی نہیں، کوا چھی بھلی چلتی پھرتی کھڑی کھلوتی کر گئی۔“ چاچی نے یار سے ڈپٹا اور ساتھ ہی اک آہ بھری۔ اگر طارق آن ہی واپس نہ آیا ہوتا تو وہ خوش خبری ہی سمجھتیں۔
 ”تھوڑی دیر آرام کروں گی تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔“

”پہلے کاکو کچھ کھلا پلا دے، ضرور صبح سے بھوکی ہوگی۔“ لاؤنج سے چاچا کی گونج دار آواز ابھری۔ وہ اور طاہر سدرہ نہیں آئے تھے، ایمین کے نانا کرنے کے باوجود سب نے اسے جوس پلایا۔ سیب کھلایا، ایمین کا جی چاہتا تھا کہ وہ سب کو یہاں سے دفع ہو جانے کے لیے کہے، مگر لب سلی ہی رہے، پھر سدرہ ہی کو ترس آیا۔
 ”ہم باہر چلتے ہیں، تم آرام سے آنکھیں موند کر ریلیکس کرو۔“

وہ سب کو باہر لے گئی، کمرے میں خاموشی کی وہیز چادر تن گئی۔ اس خاموشی میں وہ اپنے دل کی دھڑکن، بخوبی سن تی تھی، جو چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔
 وہ لہجہ، وہ آواز اجنبی نہ تھی۔
 کون تھا؟

”اگر طاہر محمود تھا تو اس نے مجھ سے بات کیوں نہیں کی۔“
 اگر وہ نہیں تھا تو دل کیوں پاگل ہو رہا ہے؟

ہند آنکھوں سے گرم سیال بہہ نکلا۔ طارق نے بہت نرمی سے ان آنسوؤں کو چن لیا، ایمین نے احساس سے آنکھیں میچ لیں، وہ طارق کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔
 ”کیوں رو رہی ہو؟“

”میں بہت تھک گئی ہوں۔“
 ”کس نے کہا تھا۔ خود کو اتنی تکلیف دے۔ اتنے سارے نوکر کس لیے ہیں؟“
 ”میں سونا چاہتی ہوں۔“
 ”سو جاؤ، میں تمہیں تنگ نہیں کروں گا۔“ وہ کہہ کر چپکے سے باہر نکل گیا۔

بہت اچھا تو لگتا ہے
 اچانک اس طرح دل کا محبت آشنا ہونا
 دوبارہ بتلا ہونا۔“

ایمن کے اک اک سام سے پسینہ بہہ نکلا۔
 وہ کیسے بھول سکتی تھی۔

آواز کاہ رد ہم۔
 لہجے کی گھبیرتا۔
 الفاظ میں چھپی محبت کی وارفتگی۔
 وہی تو تھا۔

”زندگی جس کے تصور میں گنوا دی ہم نے“
 ”طاہر! ایمین کے لب کپکپائے۔“

”طاہر! وہ چیخ اٹھی۔“

دوسری طرف اک سرو آہ بھری گئی اور رابطہ منقطع ہو گیا۔ ایمین کا پورا وجود زلزلوں کی زد میں تھا۔ وہ ایک بل بھی اپنے قدموں پر کھڑی نہ رہ سکی تھی۔ بے دم سی ہو کر گری۔ ریسیور اب بھی اس کی بھیگتی ہتھیلی میں جکڑا تھا۔ مگر دوسری طرف اک جامد سناٹا تھا۔ اس نے کئی بار کریڈل پر ہاتھ مار کر یو اے ڈی وارپکارا۔
 ”طاہر! خدا کے لیے میرے ساتھ ایسا نہ کرو۔ اگر یہ تم ہو تو مجھ سے بات تو کرو۔“

طارق جو آج پروانے کی طرح اس کے ارد گرد منڈلا رہا تھا، اس کے کافی دیر غائب رہنے پر ڈھونڈتا ہوا لاؤنج آیا۔ وہ فون اسٹینڈ کے پاس قالین پر بیٹھی تھی، ریسیور اس کے دونوں ہاتھوں میں جکڑا ہوا تھا۔
 ”کیا ہوا؟“ ایمین نے سر اٹھا کر خالی خالی نظروں سے طارق کو دیکھا۔

”کیا بات ہے، کس کا فون ہے؟“ وہ بے اختیار اس کے قریب بیٹھا۔ ایمین نے غیر محسوس انداز میں بے ہاتھوں کے ساتھ ریسیور کریڈل پر ڈالا۔ اس کے کان ابھی تک سامنے سامنے کر رہے تھے۔
 جسم بے جان ٹھنڈے پسینے اس نے چاہا کہ کچھ بولے، مگر زبان تالو سے چپک گئی۔ طارق نے نجائے کو آواز دے کر پانی لانے کو کہا۔ آن واحد میں سب اس کے گرد اکٹھے ہو گئے۔
 ”کیا ہوا؟“

”طبیعت کیسے خراب ہو گئی؟“
 ”اسے اندر تو لے کر جاؤ۔“

سب ایک ساتھ بول رہے تھے۔ طارق کے ہاتھ سے دو گھونٹ پانی پینے کے بعد ایمین نے بمشکل سنبھالنے کی سعی کی۔ طارق اور سدرہ نے سارا دے کر کھڑا کیا۔ ساڑھی الگ مصیبت بن رہی تھی۔ ان کے سارے وہ بیڈ تک آئی۔

”کچھ نہیں، مجھے صرف چکر آ گیا تھا۔“ سب تشویش ناک انداز میں اسے دیکھ رہے تھے، ایمین کو بولنا ہی
 ”تم لیٹ جاؤ۔“ سدرہ نے اسے لٹا کر عقب میں تکیے رکھے۔
 ”فون کس کا تھا؟“ طارق نے پوچھا۔
 ”پتا نہیں میں سن نہیں سکی۔“ ایمین نے نظریں چرائیں۔

ایمن کو نیند نہیں آتی تھی۔
وہ صرف رونا چاہتی تھی۔



طارق کے پاس ایمن سے کرنے کے لیے بہت سی باتیں تھیں اور اسے خوشی اس بات کی تھی کہ پہلے نسبت اب ایمن اس کی باتیں سنتی تھی۔ اگرچہ وہ محسوس کرتا تھا کہ ایمن اب بھی ہوتی ہے مگر طارق کے لیے یہ بات نہ تھی یہ ابھی ابھی ایمن ہمیشہ سے اس کے ساتھ بھی شادی کے اول دن سے اب تک وہ اس ابھی نہیں کا نہ ڈھونڈ سکا تھا اور طارق کو ضرورت بھی نہ تھی ایمن کا ماضی جو بھی تھا اب وہ طارق کا آج تھا۔ اسے یقین تھا وہ اپنے کیپٹن منگیتر کو اب تک نہ بھولی تھی جو اسے دعا دے گیا تھا۔

اور اب طارق خوش تھا کہ وہ اسے بھولی تھی یا نہیں، بہر حال وہ طارق کو غیر محسوس انداز میں توجہ دے رہی تھی چاہا چاہی ایک دن رک کر واپس چلے گئے سردہ ننھے سے بچے اور مصروف میاں کے ساتھ روز روز نہیں آتی تھی فون پر خیریت دریافت کر لیتی، البتہ فرحت و دن شام کو آتی رہی پھر ایمن کی طبیعت بحال ہوئی تو اسے تم اپنے میاں کے ساتھ وقت گزارو کہہ کر دوبارہ نہیں آتی۔ کچھ دن تو اس فون نے ایمن کو بے حد مضطرب رکھا وہ شعوری اور نا شعوری طور پر منتظر تھی کہ وہ دوبارہ فون کرے گا مگر اس کا انتظار انتظار ہی رہا اب تو اسے لگتا تھا

کوئی واہمہ ہی ہے شاید وہ فون کسی اور کے لیے تھا اور غلطی سے لائن ادھر مل گئی مگر وہ لہجہ مگر وہ انداز میں اس کی نیند ٹوٹ جاتی تو ساری رات کروٹیں بدلتے گزرتی چاندنی کھلے درتے سے اندر در آتی اور اس کے

میں چپکے سے گنگاتی۔
وہ مضطرب سی ہوا تھی ایسے میں طارق کی آنکھ کھلتی تو حیران ہو کر پوچھتا۔

”میں ایمن نہیں آ رہی؟“

وہ خاموشی سے نفی میں سر ہلا دیتی۔

”اوہ میں سلاتا ہوں۔“

وہ چپکے سے اس کے بازو پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیتی طارق کو اس کی یہ فرمانبرداری بہت اچھی لگتی اس انگلیاں ایمن کے ریشمی بالوں کو سہلانے لگتی ایمن کو نیند تب بھی نہ آتی مگر وہ طارق کو جھانسنے دینے کے سوتی بن جاتی اور یونہی جھانسنے دیتے دیتے نیند کب مہراں ہوتی خود اسے بھی خبر نہ ہوتی اور نہ یہ کہ طارق محویت سے اس کے خوابیدہ نقوش دیکھا کرتا اسے اب بھی حیرت تھی کہ ایسی خوبصورت اور کومل سی لڑکی اس کا نصیب بن گئی وہ بدل رہی تھی تو اور بھی پیاری لگنے لگی تھی۔ اس کا دل چاہتا وہ اسے بازوؤں میں چھینچ کر میں چھپالے۔ وہ ایمن کو خوش دیکھنا چاہتا تھا بہت خوش اور مطمئن وہ اس کے گھر کے کاموں میں انوالوومنٹ خوش تھا وہ ہر معاملے پر نظر رکھتی بالکل ویسے جیسا کہ طارق چاہتا تھا۔

”کیا کر رہی ہو؟“

وہ صفری کے ساتھ مل کر رات کا کھانا پکا رہی تھی جب طارق کچن میں چلا آیا۔

”سورہی تھی۔“ ایمن نے سادگی سے کہا تو صفری ہنس دی۔

”اب جاگ جاؤ۔“ وہ اس کے ہاتھ سے چھری لے کر ایک طرف رکھتے دوسرے ہاتھ سے کھینچ کر باہر

گیا۔

”مجھے ہاتھ تو دھونے دیں پیاز کی بو آئے گی۔“

بنایا۔ "وہ کہنا چاہتا تھا کہ بہت جلدی فراٹس کا خیال آگیا، لیکن اس کا موڈ خراب نہ ہو اس لیے بات بدل دی۔
 "یہ بہت عجیب بات ہے۔"
 "ہاں یہ بہت عجیب بات ہے۔" وہ بلاوجہ ہنسا۔ "شاید اس لیے کہ یہاں ایک شتراوی نے آکر بسنا تھا، میں تمہیں شتراوی کہا کروں گا۔"
 "میرا نام ایمن ہے۔" وہ ناک چڑھا کر بولی۔
 "لیکن حرکتیں تو شتراویوں والی ہیں، وہی غرور، وہی طنز۔"
 "اندر چلیں۔ کھانا بن گیا ہو گا۔"
 "تمہیں بھوک لگ رہی ہے؟"
 "ہوں۔" ایمن نے قدم بڑھائے۔
 "ٹھیک ہے چلتے ہیں۔"
 وہ لاؤنج میں تھے، جب فون کی بیل بجی تو ایمن کا دل زور سے دھڑکا اور ایسا ہر بیل پر ہوتا تھا، اس سے قبل کہ طارق اٹھاتا اس نے لپک کر ریور اٹھالیا۔ پھر قدرے مایوس سے طارق کی طرف بڑھا دیا۔
 "آپ کا فون ہے۔"
 طارق نے اس کا لپکنا اور مایوس ہونا پوری طرح محسوس کیا تھا۔



کالج کا گٹ کھلا، بھانت بھانت کی لڑکیاں سیلابی ریلے کی طرح باہر نکلیں، چھوٹی، موٹی، بلی، چادر اوڑھے، کچھ نیچے سر کالج بیگ کندھوں سے لٹکائے، قاتلیں ہاتھوں میں لیے خوبصورت، کم صورت بد صورت الغرض کہ ہر قسم کی صورت اپنے اپنے رکشوں، ویگنوں، گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں کی طرف لپک رہی تھیں، ہر طرف پلی۔ پلی۔ پال۔ پال۔ کا شور تھا۔ وہیں سڑک کے پار ٹائلی کے جھنڈ کے نیچے وہ چاروں اپنی اپنی بانیک پر بیٹھے تھے۔
 "وہ کیسی ہے؟" ایک نے دوسرے کو ٹھوکا دیتے ہوئے پوچھا۔ جس نے تیز نارنجی شرٹ پہن رکھی تھی۔
 "کون۔۔۔"
 "جو گیٹ والی زنجیر کے پاس کھڑی ہے، نیلے دوپٹے والی، جو بھٹہ کھا رہی ہے۔" رش اب کم ہونے لگا تھا، سو فوراً بھٹہ کھاتی لڑکی نظروں میں آگئی۔
 "بے کار ہے۔"
 "اس کے بارے میں کیا خیال ہے۔" اس نے پاس سے گزرتی لڑکی کو دیکھ کر ٹھوکا دیا۔ نارنجی شرٹ والے نے سیاہ گلاسز کے عقب سے لڑکی کو غور سے دیکھا جو نظریں جھکائے، بے نیازی سے گزرتی چلی گئی۔
 "اپنے ٹائپ کی نہیں۔"
 "مجھے بہت پتا ہے۔" ایک نے چڑ کر کہا۔
 "لڑکی کی ایک جھلک دیکھ کر بتا سکتا ہوں۔" اس نے فخریہ انداز میں کہا۔
 "بڑھکیں کم ہارا کر۔"
 "اوسے تیری تو۔"
 "لڑنے کی کیا بات ہے، اپنا یا سب سے زیادہ ایکسپریمنٹ۔ بندہ ہے، بانی داوے کتنوں کیس ہے؟"
 "تعدا دیا تو نہیں رہتی۔" اس نے بے نیازی بوکھالی۔

"یہ پیاز وغیرہ صغریٰ سے کٹوایا کرو۔" طارق نے بازو نہیں چھوڑا۔
 "آپ تو بیوی دیکھ رہے تھے۔" ایمن جھنجھلائی۔
 "میں یہاں بیوی دیکھنے نہیں آیا۔" طارق نے جتایا۔
 "تو کیا کرنے آئے ہیں۔" ایمن نے بازو چھڑانے کی سعی ترک کر دی۔ "اپنی خوبصورت بیوی کے ساتھ وقت گزارنے، جو سارا دن کچن میں تھسی رہتی ہے۔"
 "اچھا۔ جب کام نہیں کرتی تھی تب بھی اعتراض تھا۔" وہ آرام سے اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی، تب ہی طارق نے اس کا بازو چھوڑ کر کندھے پر ہاتھ رکھ کر خود سے قریب کر لیا۔
 "میرے جانے کے بعد بھلے دیکھیں چڑھاتی رہتا، تھوڑے سے دن ہیں، میرے پاس رہا کرو، میری نظروں کے سامنے۔"
 "لوگ زن مرید کہیں گے۔" وہ ہنسی روکتے ہوئی بولی۔
 "کتے رہیں، میری ذاتی بیگم ہے۔" وہ کچھ زیادہ ذاتیات پر اتر آیا۔ ایمن نے غصے سے گھورا۔
 "راہداری میں کھڑے ہیں۔"
 "تو۔ میں کون سا ہسانی سے عشق لڑا رہا ہوں۔" طارق نے دھٹائی سے کہا۔
 "یہ شوق بھی پورا کر لیں۔" ایمن آگے آگے چلنے لگی۔
 "تمہیں ہی اعتراض ہو گا۔"
 "نہیں، مجھے اعتراض نہیں ہو گا۔"
 "جاننا ہوں۔" طارق کا لہجہ بد ہم ہو گیا، ایمن ایک دم رکی، پھر پلٹ کر اسے دیکھا۔
 "تم کون سا مجھ سے پیار کرتی ہو۔"
 "بھی تو صرف تمہیں تسلیم کر رہی ہوں، پیار کی منزل تو بہت دور ہے۔ اور کون جانے یہ منزل آئے گی بھی یا نہیں، تقدیر نے میری زندگی سے یہ صفحہ ہی پھاڑ ڈالا، تمہارے حصے میں کیا آئے گا، جو مل گیا ہے اسی کو غنیمت سمجھو۔"

ایمن کو خود نہیں پتا تھا کہ یہ نظریہ ضرورت ہے یا طارق کا اچھا سلوک کہ وہ خود کو بدل بیٹھی۔
 "میں گھر میں کچھ نئی چیزیں لائی تھی، کچھ نئے پودے، کچھ۔" وہ سر جھٹک کر موضوع بدل گئی، طارق نے اک طویل سانس لے کر اس کا ہاتھ تھام لیا، مختلف کمروں سے گزرتا ساری بتیاں جلا گیا، سارا گھر چکر چکر کرنے لگا، چیزوں کی اہمیت و قیمت واضح ہونے لگی، جو ابتری آج تک اس گھر کا حصہ رہی تھی، اب کہیں نہ تھی، ہر چیز سلیقے و طریقے سے صاف ستھری جگہ گارہی تھی، کہ ابتری گھر میں نہیں آئی، اس کی ذات میں تھی، وہاں سدھار کا عمل شروع ہوا تو ہر چیز اپنے اپنے ٹھکانے پر آنے لگی، وہ چلتے پھرتے لان میں نکل آئے، وہاں مصنوعی روشنی کم تھی، نیم تاریکی میں انواع و اقسام کے پھولوں کی خوشبو میں۔ ہم کلام تھیں۔
 یہ بہار کا عروج تھا۔
 یہ ان دونوں کی زندگی میں بہار کا نقطہ آغاز تھا۔
 "میں نے اک مکان بنایا تھا، تم نے اسے گھر بنا دیا۔" طارق اس کا ہاتھ تھامے کہہ رہا تھا۔
 "یہ میرا فرض تھا۔" وہ رخ بدل کر چنبیلی کے پھولوں کو دیکھنے لگی۔
 "پتا ہے ایچی! مجھے کبھی بھی بڑے گھر اچھے نہیں لگے، لیکن جب میں نے اپنے لیے گھر بنایا تو بہت بڑا اور کھلا

”اچھا۔۔۔ وہ تیرے والی ابھی تک باہر نہیں آئی۔“
 ”بھی آجائے گی۔“ رش بتدریج کم ہوتا جا رہا تھا ان کی متلاشی نگاہیں گیٹ پر جمی تھیں اور جو کیدار مشکوک
 نگاہوں سے بار بار انہیں دیکھ رہا تھا۔ تب ہی وہ دونوں آپس میں باتیں کرتی باہر آئیں۔
 ”وہ رہی۔۔۔“ نارنجی شرٹ والا ایک دم پر جوش ہوا۔
 ”یہ بلبل۔۔۔“

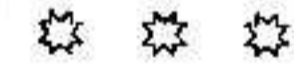
”تمیں یا رساتھ والی۔۔۔“
 ”یہ۔۔۔“ تینوں کی نظریں آپس میں ٹکرائیں۔ ”یہ تو اس ٹاپ کی نہیں لگتی۔“ میرون دوپٹہ سلیقے سے اوڑھے وہ
 ٹشو سے ماتھے پر آیا پینڈ صاف کرتی اپنی سہیلی سے غالباً ”اوو اعلیٰ کلمات ادا کر رہی تھی۔“
 ”تو بکتا ہے یہ وہ نہیں ہے۔“

”ابھی دیکھو۔۔۔“ اس نے برامانتے ہوئے جیب سے موبائل نکالا لڑکی کو نظروں میں رکھتے ہوئے نمبر مایا سب
 نے دیکھا وہ باتیں کرتی کرتی ایک دم چونک کر خاموش ہوئی پھر بیک کے اندر ہاتھ ڈالا موبائل باہر نکالے بغیر نمبر
 دیکھا اس کی سہیلی بھی اس کے بیک پر جھک آئی اس نے ہنستے ہوئے کچھ کہا ”جو ابابا“ اس نے نفی میں سر ہلاتے
 موبائل آف کر دیا۔

”دیکھا۔۔۔“ اس نے نفاخر سے دوستوں کو دیکھا۔
 ”مان گئے استاد پر اسے کہاں تک لے جاؤ گے۔“
 ”جہاں تک چاہوں۔۔۔“ وہ معنی خیز ہنسی بنسا۔
 ”نہیں یا ر! بس فون تک رہے گی۔“

”تم دیکھنا۔ وہ میری خاطر گھر سے بھاگے گی میں جسے چاہوں اپنی انگلیوں پر نچالوں۔ وہ کٹھ پتلی ہے اور اس کی
 ڈور میرے ہاتھ میں ہے۔“ اس نے انگلیاں نچائیں اس کے لہجے میں وہی سفاکی اور ڈھٹائی تھی جو عادی مجرموں
 کے لہجے میں ہوتی ہے۔
 ”شرط لگا لو۔“

”اوکے۔۔۔“ ٹابلی کی ٹھنڈی چھاؤں کے نیچے چار شیطانوں نے کسی کی بربادی پر شرط باندھی تھی۔



طارق کو کہیں جانا تھا اس نے کہا کہ وہ اسے میکے چھوڑ دے گا واپسی پر یک کر لے گا۔ پاکستان آنے کے بعد وہ
 ایک آدھ پار مختصر وقت کے لیے مہرائساء سے ملنے گیا تھا، میکے لفظ پر ایمین کو ہنسی آگئی۔
 ”میں نے کوئی لطفہ سنایا ہے۔“ طارق برامان گیا۔
 ”نہیں۔۔۔ پونسی ہنسی آگئی۔“

”اس میں ہنسی والی کوئی بات تو نہیں تھی۔ یا خوش زیادہ ہو گئی ہو۔“
 ”مہکمہ والدین سے ہوتا ہے۔ ماں میری ہے نہیں باپ پردیس میں ہے۔“ ایمین نے سنجیدگی سے جواب
 دیا۔

”اور پالنے والی کا کوئی حق نہیں؟“ طارق نے جرح کی۔ وہ ڈرنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا کنگھی کر رہا تھا۔
 جبکہ ایمین بیڈ پر نیمہورازاک رسالہ کھولے ہوئے تھی۔
 ”مجھے مہرائساء نے نہیں پالا۔“

”اچھا۔۔۔ خود بخود اتنی بڑی ہو گئی تھیں۔“

”مجھے خدیجہ بی نے پالا تھا۔ ہماری دور رے کی عزیز۔ ان کے جانے کے بعد تو۔۔۔“ اس نے دانستہ خود کو کچھ
 بھی کہنے سے روکا وہ جانتی تھی طارق مہرائساء کی لگتی عزت کرتا ہے۔
 ”تم مہرائساء آپا کے بارے میں بہت غلط سوچتی ہو۔ میرے نزدیک وہ ایک سمجھ دار خاتون ہیں۔“
 طارق نے ہمیشہ کی طرح مہرائساء کی حمایت کی۔ ایمین تھملا گئی۔ نجانے اس عورت نے کیا کھول کر پلایا تھا
 جبکہ طارق مزید کہہ رہا تھا۔

”انہوں نے کبھی مجھ سے تمہارے خلاف کوئی بات نہیں کی جبکہ تم ہمیشہ ان کے خلاف برا ہی بولی ہو۔“ اس
 نے ریفریوم اٹھا لیا۔

”آپ انہیں جانتے ہی کتنا ہیں، اور وہ بھی محض چند سالہ جان پہچان۔ میں انہیں بچپن سے جانتی ہوں۔“
 ”گویا آخری بات یہ کہ تم وہاں نہیں جانا چاہتیں۔“ طارق کی تیاری ختم ہو گئی۔ ایمین کا بے اختیار دل چاہا کہ وہ
 تھوڑا ریفریوم اس پر بھی چھڑک دے مگر طارق جیسے بندے سے ایسی رو مہینٹک حرکت کی توقع ہی فضول تھی اسے
 ریفریوم واپس رکھتے دیکھ کر ایمین باپوس سی ہو گئی۔

”ایسی بھی کوئی بات نہیں، آخر وہ میرے باپ کا گھر ہے، میرا بھی اتنا ہی حصہ ہے جتنا مہرائساء کی اولاد کا۔“
 ایمین کو یہ خبر نہ تھی کہ وقار الحسن یہ گھر بہت پہلے مہرائساء کے نام کر چکے تھے جس طرح طارق نے اپنا گھر
 ایمین کے نام کیا تھا۔

”چلو۔۔۔ ٹھیک ہے اب ذرا جلدی تیار ہو جاؤ مجھے دیر ہو رہی ہے۔“
 ”آخر اتنی تیاریوں کے ساتھ جا کہاں رہے ہیں؟“ ایمین نے اٹھتے ہوئے اس کی تیاری کو غور سے دیکھا۔
 ”ہک۔۔۔ ہا۔۔۔ پہلی بار کوئی بیویوں والا سوال کیا ہے۔“

ایمین چڑ کر وارڈروب کھول کر سوٹ نکالنے لگی۔ اس نے عقب سے آکر وارڈروب کے کھلے دروازوں پر ہاتھ
 رکھ کر رستہ مسدود کیا۔ وہ پٹی تو اس سے نکر گئی۔
 ”آؤ۔۔۔ ہٹیں۔۔۔“ ایمین نے غصے سے کہا اور ساتھ ہی اسے دھکیلنا چاہا۔
 ”لگاؤ زور۔۔۔ ذرا دیکھو کتنا دم ہے۔“ طارق ہنسا۔

”ساری تیاری دھری کی دھری رہ جائے گی۔“ ایمین کو تاؤ آگیا۔
 ”اؤئے۔۔۔ باپ رے تیرے تو بڑے خطرناک ارادے ہیں کئیے۔“ وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ ایمین
 ڈرنگ روم کے دروازے تک جا کر رکی اور طنزاً ”مسکرائی۔“
 ”بس اتنا ہی دم تھا۔“

”ہوں۔“ وہ ٹھنکا پھر دانستہ پٹیں کر لولا۔ ”رات میں پوچھوں گا۔“
 ”میں رات وہیں رکوں گی۔“ ایمین نے اندر جاتے ہوئے مزید دھمکایا۔
 ”ہرگز نہیں۔۔۔ جب تک میں یہاں ہوں ایک بار بھی نہیں۔“ طارق نے زور سے کہا تھا۔



”میں نے۔۔۔“ اس نے حیرت سے پوچھا۔
 ”بال۔۔۔ چھٹی کے بعد جب میں کالج گیت سے باہر نکل رہی تھی تب۔۔۔“ مول نے زور دے کر کہا۔
 ”اؤ۔۔۔ تو تم نے اس لیے مجھے فون کیا ہے اور میں سمجھا کہ۔۔۔“ اس نے اک سر آہ کھینچی۔

”زیادہ خوش گمان مت ہو مجھے اور بھی کام ہوتے ہیں۔“
 ”لیکن مریض عشق کے پاس تو کوئی اور کام نہیں۔ اک دروہے اور ہماری ہائے۔ ہائے۔“ وہ عاشقانہ انداز میں گویا ہوا۔

”میرے پاس یہ سب سننے کا بالکل وقت نہیں۔ میں نے صرف یہ کہنے کے لیے فون کیا ہے کہ مجھے وقت بے وقت فون مت کیا کرو۔ تمہارا کیا جائے گا۔ مرنے کی تو میں۔۔۔“ مومو دل ہی دل میں اترا تری نرٹھے پن سے بولی۔
 ”مریں تمہارے دشمن۔ فرشتہ اجل آیا تو تمہاری جان کی جگہ اپنی جان پیش کروں گا۔“
 جتنا اس نے سوچا تھا کہ فوراً سرزنش کر کے فون بند کرے گی اتنا ہی اس کی باتوں کے سحر میں جکڑتی جا رہی تھی۔

”اتنی محبت کرنے لگے ہو۔“ مومو کا لہجہ و آواز خود بخود ہم ہو گیا۔
 ”کاشق کوئی پیمانہ ہوتا۔۔۔ سمندروں کی گہرائی یا آسمان کی وسعت۔۔۔ سدا سے عاشقوں کا یہی المیہ ہے۔ بس ایک طریقہ ہے۔“
 ”کیا؟“

”دل چیر کر دکھا دوں۔۔۔ اک جان ہی جائے گی۔ لیکن تمہیں تو اعتبار آجائے گا۔“
 ”پلیز۔ ایسی باتیں مت کرو۔“ مومو نے بے ساختہ ٹوکا۔
 ”یہی بے خودی کا عالم ہے کہ کال کسی اور کو ملتا رہا تھا کہ انگلیاں تمہارا نمبر ملا۔ بیٹھیں۔“
 ”پلیز آئندہ احتیاط کرنا اب رات کو بات کروں گی کوئی آجائے گا۔“ اس کی باتیں لمبی ہو رہی تھیں۔ مگر مومو کو وقت کی نزاکت کا احساس ہو گیا اسے خبر نہ تھی کہ کسی نے اس گفتگو کا ایک ایک حرف سنا تھا۔ وہ موبائل لیوں سے لگائے کسی گہری سوچ میں تھی۔ جب ایمین نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ بری طرح اچھلی موبائل چھوٹ کر نیچے جا کر اور کھل گیا۔

”یہ تمہارے پاس تھا؟“
 مومو نے جلدی جلدی موبائل اکٹھا کیا اور دراز میں ڈال دیا۔ وہ بہت زیادہ پرل ہو رہی تھی۔
 ”کب سے یہ سلسلہ چل رہا ہے؟“ ایمین بند پر بیٹھ گئی۔
 ”تم کب آئیں؟“ وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔
 ”جب تم نے نمبر ملایا۔“ ایمین نے اطمینان سے مومو کو دیکھا۔ اس کے زرد چہرے اور اپنی حاوی ہوتی پوزیشن نے اسے کھینسی سی خوشی دی۔
 ”گویا کھینسی نے اک اک لفظ سن لیا۔ کیسے لمبی کی چال آئی ہے۔“
 ”دروازہ تو بند تھا۔“
 ”نہیں تھا۔“

مومو کا جی چاہا کس کر ایک تھیرانے کال برارے۔ مہرا لستاء نے کہا تھا وہ ذرا اوپر کے لیے پڑوس میں جا رہی ہیں وہ دروازہ اچھی طرح بند کر کے پہلے ان کا آکلو تا گھر تھا مگر اب ارد گرد پوری کالونی بن چکی تھی سو اس پڑوس میں جان پہچان بھی بڑھ گئی۔ مہرا لستاء بھی کبھار کسی نہ کسی کام کے لیے چلی جاتیں ساتھ والی نوریں کے پاؤں کی آپریشن ہوا تھا۔ جو جو چار بجے گھر آئی تو مہرا لستاء انہیں تاکید کر کے چلی گئیں کہ وہ بس پندرہ منٹ میں آجائیں۔ جو جو جو گری میں تھکی ہاری آئی تھی مومو سے کہہ کر خود نما نے چلی گئی۔ اور مومو نے ان پندرہ منٹ کو غنیمت جانا کیا معلوم تھا کہ یہ بلا نازل ہو جائے گی۔

”طارق بھائی نہیں آئے۔“ وہ خواجہ سوال جواب کر رہی تھی۔ ایمین کو ہنسی آنے لگی۔
 ”باہر سے چھوڑ کر چلے گئے۔ رات کو لینے آئیں گے۔“ ایمین نے سابقہ اطمینان سے جواب دیا جبکہ اس کی معنی خیز نظریں مومو کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ وہ اس کی نگاہوں سے خائف ہو کر انگلیاں بچکانے لگی۔

”رات کب۔۔۔ یہ تو خوشی کی بات ہے۔“
 ”ارے۔۔۔ واقعی۔۔۔“ ایمین دوبارہ ہنسی۔
 ”ایمن! تم۔۔۔“

”میں نے پوچھا کب سے یہ سلسلہ چل رہا ہے؟“
 ”کافی دن ہو گئے بس اچانک ہی۔۔۔“ مومو نے پسپائی اختیار کی۔
 ”مجھے دیکھ کر عبرت نہیں پکڑی۔“
 ”ضروری تو نہیں سب کا نصیب ایک سا ہو۔“
 ”ارے۔ گویا معاملہ بہت آگے جا چکا۔“
 ”ایمن اپلیز تم می سے۔۔۔“ مومو نے ملتی انداز میں ایمین کو دیکھا۔ ”تم چاہو تو اپنا موبائل واپس لے لو۔“
 ”اچھا۔ پھر تم کیا کرو گی؟“

مومو لا جواب سی ہو گئی۔ ایمین نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کے اندر کی خود غرض اور منتقم مزاج لڑکی انگڑائی لے کر بیدار ہوئی۔

”مجھے آوارہ کہنے والی مہرا لستاء بیگم! تمہارا غرور ٹوٹنے کا وقت آپہنچا۔ کیسے نظریں ملاؤ گی۔۔۔ جب معلوم ہو گا کہ تمہاری اپنی بیٹی ان ہی راہوں کی مسافریں چکی ہے۔“
 ”ای کی! تم کیا سوچ رہی ہو؟“ مومو کو بے چینی لاحق ہوئی۔ کاش وہ ایمین کی سوچیں پڑھ سکتی۔
 ”یہی کہ تم کب واپس آئیں گی؟“ ایمین نے سادگی سے جواب دیا۔
 ”ایمن! تم۔۔۔“ مومو کی آنکھیں لبالب بھر آئیں۔ ”تم تو می کو جانتی ہو وہ مجھے زندہ دفن کر دیں گی۔“
 ”نہیں۔ اپنی اولاد کو زندہ دفن کرنا آسان نہیں۔“ ایمین کھڑی ہوئی پھر اس کے قریب آئی۔
 ”اگر ہمت نہ تھی تو ایسا کام کیا ہی کیوں؟“

”یہ اپنے بس میں تو نہیں۔ تم تو اچھی طرح جانتی ہو۔“
 ”ہاں۔۔۔“ ایمین کے لبوں پر آہ ٹوٹ کر بھری۔ ”ہاں یہ بچے ہنسی کی منزل ہے۔۔۔ فکر نہ کرو اتنی بھی کم طرف نہیں ہوں۔“

”ایمن۔۔۔“ مومو نے اختیار اس سے لپٹ گئی تب ہی جو جو چلی آئی اس کے بال تو لیے میں لپٹے تھے۔
 ”ارے۔ ایمن! تم کب آئیں؟“
 ”ابھی۔۔۔“ وہ جو جو سے ملتے لگی۔

”میں تمہارے لیے جو س لاتی ہوں۔“ مومو جلدی سے باہر نکل گئی۔
 ”اگے لاؤن میں چلتے ہیں میں نے تو ابھی کھانا بھی نہیں کھایا۔“
 جو جو اسے لے کر لاؤن میں آئی۔ جب مہرا لستاء واپس آئیں تو ایمین جو جس سے اور جو جو کھانے سے فارغ ہو چکی تھی۔ صوفے پر اتنی پالتی مارے کشن گود میں رکھے وہ بے تکلفانہ انداز میں مومو اور جو جو کو بتا رہی تھی کہ اس نے اپنے گھر کے لان میں کون کون سے نایاب پودے منگو کر رکائے ہیں۔ اس کے لہجے میں واضح تقاضا چھلکتا تھا۔ مگر جو جو کو اسی بات کی خوشی تھی کہ کم از کم ایمین نے اسے اپنا گھر تو تسلیم کیا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ پریم کوالٹی، نارل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرتک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ام ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”نہیں آئیں؟“
”گلتا ہے۔ آپ کو اب اپنے گھریار کی زیادہ پروا نہیں رہی۔“
مہر النساء کو سلام کر کے بعد ایمین نے کہا۔ اس کے لہجے میں کچھ تو ایسا تھا کہ جہاں مہر النساء چونکیں، وہیں مومو کا دل دھک سے رہ گیا۔

”کیوں؟“
”طابق پوچھ رہے تھے؟“ اس نے لاہروائی سے کہا تو مومو کی جان میں جان آئی۔

”دور کا نہیں؟“ مہر النساء سامنے بیٹھ گئیں۔

”گھر میں کوئی تھا نہیں۔ کس لیے رکھے؟“

”میں بڑوس میں تو گئی تھی ابھی آجاتی۔ تم نے طارق کو بتایا نہیں؟“ انہوں نے مومو کو دیکھا۔ وہ متذبذب سی لہجہ کو دیکھنے لگی۔ وہ تو خود طارق سے نہیں ملی تھی۔

”شام میں آجائیں گے، بلکہ شام تو ہو گئی، رات کا کھانا پیس کھائیں گے۔“

مہر النساء کو ایمین کے انداز و اطوار بدلنے بدلے سے لگ رہے تھے۔ وہ بڑے مطمئن اور آسودہ سے انداز میں بات کر رہی تھی، خاص طور پر طارق کے لیے وہ جتنے عزت بھرے لہجے میں بات کر رہی تھی وہ مہر النساء کے لیے نیا ہی تھا۔

”ابھی مجھے چہ بچے اکیڈمی جانا ہے۔“ جو جو نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

”ہاں۔ ہاں۔ تھوڑا وقت ہے تم آرام کرو، میں جاتی ہوں تمہاری روٹین خاصی ٹف ہے۔“ ایمین نے جلدی سے کہا۔ ”مجھے کہنی دینے کے لیے می اور مومو ہیں نا۔“

جو جو ایک بار پھر معذرت کرتی چلی گئی۔

”جاؤ مومو! فریج میں دیکھو کیا کچھ ہے؟ کچھ منگوانا ہو تو اسٹ بنا دو۔“ مہر النساء نے کہا تو وہ کھڑے ہوتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”مئی! کیا بیانا ہے؟“

”کوئی نئے اور سنڈھی بریانی۔“ جو جو ایمین نے دیا۔ مہر النساء نے چونک کر اسے دیکھا پھر مسکرائیں۔

”اس کی پسند و ناپسند کا خوب خیال رکھنے لگی ہو۔“

”طارق کہہ رہے تھے مومو آپا کے ہاتھ کی یہ دونوں چیزیں کھانے کے لائق ہیں۔“ اس نے لاہروائی سے اضافہ کیا۔ مومو باہر چلی گئی تب مہر النساء نے اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”گلتا ہے تمہیں عقل آگئی۔“

ایمین ٹورا، یہی ان کی بات کی تہہ تک پہنچ گئی۔

”مومو! سوچا، اتنی عیش و عشرت کی زندگی چھوڑ کر کیوں سراپوں کے پیچھے بھاگوں، اتنا پیسہ محبت کرنے والا شوہر جو میرے ماضی کی ہر بات بھلا کر مجھ پہ جان دیتا ہے، اپنی نیند سونا اپنی مرضی سے کھانا، قیمتی سے قیمتی زیور، کام کاج کے لیے نوکر چاکر، نہ سسرال کا جھجٹ، نہ کوئی اور خفا منانے سے چاچا، چاچی، جو ہو کے ماتھے کی تیوری دیکھ کر ہی سسم جاتے ہیں، جب رانی بن کر عیش کر سکتی ہوں تو وقت ضائع کرنے کا فائدہ۔“

ایمین کو پتا تھا اسے کس جگہ مہر النساء کو کس طرح جلانا ہے۔ وہ حقیقتاً ”مہر النساء کی ہنس شناس تھی۔“ مہر النساء واقعی پہلو بدل کر رہ گئیں، ایمین کا لہجہ مہر النساء سے صاف کہہ رہا تھا کہ تم جو مرضی کر لو، میری زندگی سبک خرام زندگی کی طرح سہل اور رواں ہے۔

بارے میں مشہور تھا کہ وہ آسیب زدہ ہے، جہاں اسٹوڈنٹس اور ٹیچرز تو ایک طرف، کبھی نوکر بھی نہ جاتے تھے۔
 ”اور اس کا کیا بنے گا؟“ مومو کا اشارہ اس کے سابقہ ایفیزر کی طرف تھا۔
 ”بھاڑ میں جائے۔۔۔ صرف باتیں۔۔۔ باقی سب باپ کا۔۔۔ مہینے کے مہینے جیب خرچ لینے والا، مجھے کیا دے گا۔“
 وہ کندھے اچکا کر لاپرواہی سے بولی، پھر مات بدل کر پوچھنے لگی۔
 ”میں بازار کے لیے کپڑے لے لیے؟“
 ”بہت ہیں ان ہی میں سے کوئی پسن لوں گی۔“
 ”مجھے تو مراد شاپنگ کروائیں گے۔ شہر کی سب سے بڑی بوتھک سے۔“
 ”واؤ۔“ مومو نے رشک سے اسے دیکھا۔
 ”اسی لیے تو کہتی ہوں بندہ ہاتھ مارے تو کسی اونچی جگہ پر۔“ اس نے مومو کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ ”تمہاری طرح نہیں کہ پہلی بار میں ہی لڑھک گئے۔“
 مومو دھیرے سے ہنس دی۔ اس نے ٹائٹن کی ایسی باتوں کا جواب دینا چھوڑ دیا تھا۔ اسی رات جب فون آیا تو باتوں باتوں میں اس نے پوچھا۔
 ”تمہارے کالج میں مینا بازار ہے؟“
 ”تمہیں سب خبریں ہوتی ہیں۔“
 ”کون سے رنگ کے کپڑے پہنوں گی؟“
 ”کون سے رنگ کے کپڑے پہنوں۔“ مومو نے برہتہ پوچھا۔
 ”پنک۔“ اس نے فوراً جواب دیا۔
 ”تم نے مجھے دیکھا ہے؟“
 ”میں تمہیں ہر روز دیکھتا ہوں۔ جس دن نہ دیکھوں۔ اس دن کو اپنی زندگی میں شمار نہیں کرتا۔“ مومو کچھ دیر کے لیے کچھ بھی نہ بول سکی۔
 ”سنو اس دن کہیں باہر ملیں۔“
 ”نہیں۔“ مومو بولو کھلا گئی۔
 ”بس ذرا دیر کے لیے۔ کہیں آئس کریم کھاؤں گے پندرہ بیس منٹ میں واپس۔“ اس نے اصرار کیا۔
 ”پلیز۔ میں یہ کبھی نہ کر سکوں گی۔“ مومو نے قطعی لہجے میں کہا۔
 ”اوکے۔ میں مجبور نہیں کروں گا۔“ اس کے لہجے میں مایوسی سی در آئی۔
 ”میں مجبور ہوں۔“ مومو کو اس کا لہجہ برداشت نہ ہوا۔
 ”ٹھیک ہے مومو۔ میں تمہیں دیر ہی سے دیکھ کر آنکھوں کی پیماس بجالاؤں گا۔“ اس نے نرم لہجے میں کہا۔
 ”اور میں۔۔۔ میں کیسے پہچانوں گی۔“ مومو نے جھکتے ہوئے اپنی درپردہ خواہش کا اظہار کیا۔ وہ ہنس دیا، پھر معنی خیز لہجے میں بولا۔
 ”اس کے لیے تو کہیں باہر ملنا پڑے گا۔“
 مومو چپ کی چپ رہ گئی۔
 ”پاکل مذاق کر رہا ہوں۔“ وہ پھر سے ہنسنے لگا۔
 مومو کے پاس گلانی لباس نہ تھا۔ مگر اب ناممکن تھا کہ وہ مینا بازار میں کوئی اور رنگ پسن کر جاتی۔ اس نے مہر النساء سے کہا تو پاس بیٹھی جو فوراً بول اٹھی۔

”بہت جلدی خیال آ گیا۔“ مہر النساء نے طنز سے کہا۔
 ”دیر آید درست آید۔“ ایمین نے لاپرواہی سے کندھے اچکائے۔
 ”جھا۔ اگر جو طارق کو پتا چلے کہ باقی میں تمہارے ایک نہیں دو دو معاشرے چلے ہیں اور ایک کی خاطر گھر سے بھاگنے سے لے کر خودکشی تک کر چکی ہو تب تمہارے پیش و آرام کا کیا ہوگا؟“
 فطرتاً دونوں ہی ایک جیسی تھیں، منتعم مزاج، دو سروں کو نچا دکھانے کی خواہش مند، کم ظرف۔
 ”کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں اس سے یہ سب کہہ چکی ہوں۔“ ایمین نے قدرے جھوٹ سے کام لیا۔ مارے حیرت کے مہر النساء کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ایمین نے ان کی حالت سے خاصا مزالیا۔
 ”بڑا ہی بے غیرت نکلا۔ تمہارے باپ نے تمہارے لیے ٹھیک کاٹھ کا لٹو ہونڈا ہے۔“ مہر النساء نے تھوڑی دیر کے بعد خود کو سنبھال کر کہا۔
 ”آپ یہ سوچیں کہ آپ کہاں سے ایسا کاٹھ کا لٹو ہونڈیں گی۔“
 ”کیا مطلب اس بات کا؟“
 ”طارق نے مومو کو بہت اونچے سنگھاسن پر بٹھا رکھا ہے، اپنے بارے میں آپ کے خیالات پتا چلے تو برداشت نہ کیا۔“ ایمین نے اس کی بات کا جواب نہ دیا۔
 ”اگر وہ گھبرا گیا تو یہ بھی سہ لے گا۔“
 ”تب ٹھیک ہے۔ ڈیڈی کب تک آرہے ہیں۔“
 ایمین نے اک دم بات پلٹ کر دوستانہ انداز میں پوچھا تھا۔



ایمین والے واقعہ نے مومو کو کچھ اور محتاط کر دیا۔ اب وہ آدھی رات کے بعد بات کرتی رات کا پہلا حصہ انتظار میں گزرتا، دو سرباتوں کے فسون میں تیسرے پھر سوتی، صبح مہر النساء کی ڈانٹ سنتی اور کالج میں اوتھتی رہتی، کلاسز میں حاضری نہ ہونے کے برابر تھی، ٹائٹن کا اپنا ایفیزر آج کل عروج پر تھا اور وہ خاصی سنجیدہ بھی تھی۔
 ”مراد نے ساتھ دیا۔ تو میں فیصلہ کر لوں گی جاگیر دار ہے، ساری زندگی ٹیچس میں گزرے گی، نئے نئے کے لیے ترستا تو نہ پڑے گا۔“
 ”مگر اس کی بیوی بچے۔ جو ملی والے تو بہت تنگ نظر ہوتے ہیں، بیویوں کو سات پردوں میں چھپا کر رکھتے ہیں۔“ مومو کو مراد کچھ زیادہ پسند نہیں آیا تھا، اگرچہ وہ اس سے کبھی ملی نہ تھی، مگر وہ باتوں سے ہی عیاش طبع لگتا تھا، کئی بار اس کا ڈرائیور ٹائٹن کو کالج سے پک کرنے آیا، بقول ٹائٹن، مراد اسے پی۔ سی میں لے جاکر روانے لے جاتا ہے۔
 ”مگر تمہاری اور اس کی عمروں میں بہت فرق ہے۔“
 ”بے وقوف، ایسے مرد بیویوں کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔“
 ”اس نے تم سے شادی کی بات کی؟“
 ”بھی تک تو نہیں۔ مگر جب بھی کی میں فوراً ہاں کہہ دوں گی، مشروانی کو ٹھی حق مہر میں لکھوا لوں گی۔“ اس کے لیے چوڑے بلان تھے۔
 ”اور تمہارے گھر والے مان جائیں گے؟“
 ”مجھے ان کی پروا نہیں۔“
 دونوں کالج کے پچھلے گراؤنڈ میں درختوں کے جھنڈ کے عقب میں سر جوڑے باتیں کرتی رہتیں۔ جس کے

”تم میرا نیا سوٹ پہن جاؤ۔“
مومو نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔ اس سبز سوٹ کو آگ لگانے کو دل چاہا، جو کل ہی سل کر آیا تھا۔ اوپر سے مہر النساء نے بھی کہہ دیا۔

”ہاں۔ ہاں وہی پہن جاؤ۔ جب ٹاپ تم دونوں کا ایک ہی ہے۔“
”مٹی! ہم سب یعنی ہمارا گروپ پنک سوٹ پہن کر آ رہا ہے۔“

”ایک تو تم لوگوں کے چونچلے۔ کل چلنا بازار۔“ مہر النساء نے کہا، ”تو وہ خوش ہو گئی۔ مگر بازار میں اس نے مہر النساء کو خاصا زچ کیا، کوئی سوٹ پسند جو نہ آتا تھا، پتا نہیں اسے خریدنا کیا تھا، ہر ڈیزائن ہر پرنٹ میں نقص۔“
”بس یہ آخری سوٹ ہے، خریدنا ہے تو خریدو۔ ورنہ اسی طرح واپس جاؤ گی۔“

مہر النساء نے اسے دکاندار کے سامنے ہی ڈانٹ دیا، پھر اسے خریدنا پڑا۔ مینا بازار والے دن وہ گھر سے تو صرف سوٹ ہی پہن کر گئی، مگر کالج جا کر خوب اچھی طرح میک اپ کیا، ٹائٹ تو یوں بھی میک اپ ایکسپرٹ تھی، مہنوں میں اس کے نقوش کو نکھار کر رکھ دیا، اسے مینا بازار میں کوئی دوپٹا نہ تھی، اسٹالز میں کیا تھا۔ ورائٹی پروگرام، جھولے، اسے تو صرف وقت گزارنا تھا، مینا بازار کی وجہ سے گیٹ کھلا تھا، لڑکیاں آزادی سے آ جا رہی تھیں، وہ اور ٹائٹ وین آنے سے بیس منٹ قبل ہی باہر نکل آئیں، وہاں لینے کے لیے آنے والوں کا خاصا رش تھا، بظاہر وہ وین کی تلاش میں نظریں دوڑا رہی تھی، مگر وہاں اتنے لڑکے تھے، جو اپنی اپنی بہنوں کو لینے آئے تھے، ہر آنے والی لڑکی کو دیکھتے بھی تھے، وہ کچھ بھی نہ اخذ کر پائی، مگر اسے لگتا تھا، یونسی کھڑے کھڑے بے چینی سی لاق ہوئی، اسے لگتا تھا وہ کسی کی نظروں کے حصار میں ہے، کوئی ہے جو اسے مسلسل دیکھ رہا تھا، نجانے کیوں اس کے ماتھے پر پینہ سا گیا۔

وہ بزل سی ہونے لگی۔
”مہیں کیا ہوا ہے؟ اتنی سرخ کیوں ہو رہی ہو۔“ چوٹم چباتی نائن نے اسے بے حد حیرت سے دیکھا۔
”گرمی لگ رہی ہے۔“ اس نے بیگ سے رومال نکالنا چاہا، تب ہی اس میں موجود موبائل کی اسکرین روشن ہو گئی۔

اک نیا SMS اس کا منظر تھا۔
”تم جس رنگ کا کپڑا پہنو وہ موسم کا رنگ۔“
وہ بیس تھا اور اسے دیکھ رہا تھا۔ مومو کو نجانے کیا ہوا؟ یکدم مڑ کر کالج کے اندر چلی گئی۔



چاروں ہاتھ پر ہاتھ بنا کر بیٹھے۔
”کیسا؟“ اس نے فخریہ انداز میں باقی تینوں کو دیکھا۔
”زبردست۔“

”یہ کوئی بڑی کامیابی نہیں۔“ ایک نے منہ بنا کر کہا۔
”کیوں؟“ اسے غصہ سا گیا۔

”مزا تو جب ہے، جو یہاں بائیک پر تمہارے ساتھ بیٹھے۔“

”یار! شریف گھر کی لگتی ہے پتا نہیں تجھ جیسے گھامڑکی باتوں میں کیسے آگئی۔“

”جس پر ہماری نظر کرم ہو، وہ ہمارے پیچھے نہ آئے۔“ وہ فخریہ انداز میں بولا۔ ”دیکھنا ایک دن یہاں بھی آئے گی۔“ اس نے بائیک پر ہاتھ مارا۔

”صرف اس سے کیا ہو گا۔ مزا تو تب آئے جب وہ۔“ ایک نے انتہائی بے ہوش بات کی۔ اتنی کہ سب خاموش ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے، شاید اس انتہا پر جا کر کسی نے بھی نہ سوچا تھا۔
”تو اس مت کرو۔ ہمارا مقصد صرف انجوائے منٹ ہے۔“ ان میں سے ایک نے قدرے سنبھل کر کہا۔
”میں بھی انجوائے منٹ کی بات کر رہا ہوں۔“ اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔
”لیو دس ٹاپک۔“ ایک نے بے زار ہو کر کہا۔

”آج تو یہاں زمین پر اتر آئی ہیں۔“

اب گزرتی لڑکیوں پر تبصرہ کرنے لگے۔ مگر وہ خاموش تھا، اس کا ذہن کچھ سوچ رہا تھا، نگاہ میں گلابی پیراہن سرسرا رہا تھا۔



سمجھوتے کی راہ گزر پر قدم رکھے تو زندگی سہل سی ہو گئی۔ ایمین نے بہت کچھ فراموش کر کے خود کو مصروف کر لیا۔ اگرچہ کرنے کے لیے بہت کچھ نہ تھا، پھر بھی وہ کچھ نہ کچھ کرتی رہتی، گھر اور گھر کے معاملات، اس بڑوس میں ملاقات۔ اسے احساس ہونے لگا، ہر کوئی کہیں نہ کہیں اپنی خواہشوں کو پس پشت ڈال کر سمجھوتے سے کام لیتا ہے، تب ہی سکھ کی زندگی مقدر ہوتی ہے، لوگ اس سے پیار سے ملتے، عزت سے پیش آتے اور وہ سوچتی۔
”یہ سب ایمین کی نہیں، ایمین طارق کی عزت کرتے ہیں۔“ وہ شخص اس کا نام اس کا حوالہ ایمین کو معتبر کر گیا تھا۔

خود طارق بھاگ بھاگ کر پاکستان آتا۔ آتا تو جانے کا نام نہ لیتا، چلا جاتا تو واپس آنے کے لیے بے تاب رہتا۔
”تم بڑھالی دوبارہ شروع کرو۔“ جو جو نے کئی بار مشورہ دیا۔
”چھوڑو یار۔ اب بڑھانا نہیں جائے گا۔“ وہ ہمیشہ آلکسی سے جواب دیتی۔
وقت کا کام گزرتا تھا، سو گزرتا چلا گیا۔
یہ اس کی شادی شدہ زندگی کے تیسرے سال کا آغاز تھا۔
جب وقار الحسن اس کے گھر آئے۔

ایمین کو خبر بھی نہ تھی کہ وقار الحسن پاکستان آئے ہیں یا آنے والے ہیں۔
وہ تو مالی کے ساتھ مل کر سمار کی آمد سے قبل نئے پھولوں کی پیٹری لگو رہی تھی۔ جو کیدار بیگم صاحبہ کے والد کو روک تو نہ سکتا تھا، سو وہ آرام سے اندر آگئے، اب وہ غور سے اپنی بیٹی کو دیکھ رہے تھے، وہ بیٹی باجس سے وہ دنیا میں سب سے زیادہ پیار کرتے تھے۔ اور کتنا عرصہ ہوا وہ اس سے تمام رابطے توڑے ہوئے تھے، اور وہ بھی تو آخر ان ہی کی بیٹی تھی، مجال ہے جو ایک بار بھی ان سے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی ہو۔
اب وہ اپنی بیٹی کو غور سے دیکھ رہے تھے۔
لبے بال، چوٹی میں گندھے، ہاتھ پاؤں مٹی میں اٹے، وہ کس انتہاک سے کیاری میں کھا دلا رہی تھی، اور مالی ہاتھ روکے وقار الحسن کو دیکھ رہا تھا۔

”بچہ ہونے کے لمحے عرصے بعد پھول آجائیں گے؟“
اس نے ہاتھ کی پشت سے سامنے آجانے والے لبے بال پیچھے کرتے ہوئے سوال کیا۔
”نئے بچہ ہوو گی تو نئے پودے سرائٹھائیں گے، تو ان پر پھول بھی نکلیں گے۔ ہمارا کام بیج بونا ہے، باقی کام قدرت کا ہے۔ یہی زندگی کا چلن ہے۔“

ایمین نے جھٹکے سے گردن موڑ کر انہیں دیکھا، پھر تیزی سے کھڑی ہو گئی۔

”ڈیڈی۔۔۔“ اس کی آنکھیں لبالب پانیوں سے بھر آئیں۔ وہ لاکھ کہتی رہے کہ اسے وقار الحسن سے نفرت ہو گئی ہے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ اس کی زندگی میں بہت برا خلا پیدا کر گئے تھے۔ تھوڑی دیر میں وہ ان سے لپٹ کر دھواں دھار رو رہی تھی۔ خود ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

”تم نے میرے سارے کپڑے خراب کر دیے۔“ بہت دیر کے بعد انہوں نے ضبط کرتے ہوئے کہا۔ وہ شرمندہ ہو کر پیچھے ہٹی۔ واقعی ان کے کپڑوں پر مٹی لگ گئی تھی۔

”اوہ۔ سوری۔“ اس نے جلدی جلدی مٹی جھاڑنے کی کوشش میں ان کی شرٹ اور بھروی۔

”تم اب بھی بڑی نہیں ہوئیں۔“ وقار الحسن نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

دونوں ایک ساتھ ہنس دیے۔

”آئیں آندر چلیں۔“

اس نے جوتے لائی میں ہی چھوڑ دیے۔

”آپ کیا پئیں گے۔“ انہیں لاؤنج میں بٹھا کر اس نے پوچھا۔

”پہلے اپنا حلیہ درست کرو۔ اور میرا بھی۔“

تب ہی صغریٰ چلی آئی۔

”صغریٰ! پہلے الماری سے طارق کا کوئی کرتا نکال کر دو۔ پھر یہ شرٹ دھو کر سکھا دو۔“ وہ خود بھی جلدی جلدی کپڑے بدل کر فریش ہو کر آئی۔ تو وقار الحسن پینٹ پر طارق کا کرتا پہنے، جو انہیں قدرے تنگ تھا۔ سگریٹ سلگا رہے تھے۔

ایمن نے دیکھا وہ آج بھی اتنے ہی گریں فل اور پیارے تھے۔

صغریٰ ان کے سامنے جوس کا گلاس رکھ گئی۔

”میں چائے کے لیے۔“

”نہیں اور کچھ نہیں۔ تم میرے پاس بیٹھو۔“ انہوں نے رسائیت سے منع کرتے ہوئے کہا تو ایمن کٹن صوفے کے پاس گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ انہوں نے سلگایا ہوا سگریٹ بنا کش لیے ایش ٹرے میں مسل دیا اور سرسری انداز میں پوچھا۔

”آج کل کیا ہو رہا ہے؟“

”کچھ خاص نہیں۔“

”خوش ہو؟“ ان کا انداز ہنوز سرسری تھا مگر وہ بغور اسے دیکھ رہے تھے۔

ایمن متذبذب سی چپ ہو رہی، اب جب بھی کوئی یہ سوال کرتا، وہ یونہی خاموش ہو جاتی، گویا سمجھ نہ پا رہی ہو کہ کیا جواب دے۔ وقار الحسن نے اس کا سر اوپر اٹھایا۔

”تمہیں اب بھی یہی لگتا ہے کہ میں نے تمہارے لیے غلط فیصلہ کیا ہے؟“

”میں سب بھول جانا چاہتی ہوں۔“ ایمن نے ایک نظر باپ کو دیکھ کر چہرہ جھکا لیا۔

”اچھی بات ہے۔“

کچھ لمحے فضا میں خاموشی سی چھائی رہی۔ وہ خاموشی سے لاؤنج کا اور گلاس وال کے دوسری طرف نظر آتے لان کا جائزہ لیتے رہے۔ پھر ستائسی انداز میں بولے۔

”تم نے گھر بہت اچھے طریقے سے سجا رکھا ہے؟“

”میرے پاس کرنے کے لیے یہی ایک کام ہے۔“ وہ بلاوجہ ہنس۔

”مجھے طارق نے بتایا تھا۔“ انہوں نے جوس کا گلاس اٹھایا۔

”کیا؟“

”یہی کہ تم خیال رکھتی ہو، گھر کا بھی اور۔۔۔ اس کا بھی۔“

”اچھا۔“ وہ قالین پر بنے ڈیزائن پر انگلی پھیر رہی تھی۔

”اپنا بھی رکھا کرو۔“

”اب ایک وقت میں بندہ کیا کیا کرے؟“ ایمن مسکرائی۔

”میری بہت خواہش تھی۔“ انہوں نے جوس کا گلاس اٹھا لیا۔ ”اپنی زندگی میں تمہیں یوں اپنے گھر میں رچا بسا دیکھ سکوں۔ آج میری بے سکونی کا خاتمہ ہو گیا۔ میں نے ہر نماز کے بعد صرف تمہارے لیے دعا کی تھی۔“

”میں نے آپ کو بہت تنگ کیا۔“

”میں سب بھول چکا ہوں۔“ انہوں نے برجستہ کہا۔ ”اسی دن، جس دن میں نے طارق کی آنکھوں میں تمہارے ذکر پر سچی خوشی اور آسودگی چھلکتی دیکھی۔ مجھے اسی دن کا انتظار تھا۔ اس کا اب وہاں دل نہیں لگتا، کام پر بھی توجہ نہیں دیتا، پاکستان آنے کے لیے بے چین رہتا ہے، کل میں نے اسے بہت ڈانٹا۔ کہ اگر کماؤ گے نہیں تو میری بیٹی کو کھلاؤ گے کہاں سے؟“

”آپ اسی لیے مجھ سے ملنے آئے ہیں، ورنہ ہمیشہ یونہی چلے جاتے تھے۔“ ایمن نے شکوہ کیا۔

”میں تمہیں وقت دینا چاہتا تھا، تاکہ تم خود جائزہ لو، نتیجہ نکالو اور اس کے مطابق اپنا مستقبل پلان کرو۔“ انہوں نے صاف گوئی سے کہا۔ ”مجھے خوشی ہے کہ تم نے غلطیوں سے سیکھنا شروع کر دیا ہے۔“

”ڈیڈی! کیا ہم صرف اسی موضوع پر بات کریں گے؟“

”نہیں! ہم آئندہ اس موضوع پر بھی بات نہیں کریں گے۔“ انہوں نے خوشگواریت سے کہا۔ وہ اس کے پاس کافی دیر تک بیٹھے، اور ادھر ادھر کی چھولی چھولی باتیں کرتے رہے۔ چائے پی کر کھانے کے لیے منع کر دیا۔

”چلو میرے ساتھ کچھ دن وہاں چل کر رہو۔“

”آپ کتنے دنوں کے لیے آئے ہیں؟“

”ایک ہفتہ ہے۔“

”گھر آکیا کیسے چھوڑ جاؤں۔“ ایمن نے عذر پیش کیا۔

”لڑکیاں میکے جا کر نہیں رہتیں۔“

”وہ اور بات ہے، یوں سارا گھر نوکریوں کے سپرد نہیں کر سکتی۔ آپ ملنے آجایا کریں۔“ وقار الحسن کو خوشی ہوئی، وہ اب مثبت انداز میں سوچنے لگی تھی۔

”مومو اور جو جو سے کہوں گا، کبھی کبھی تمہارے پاس آجایا کریں۔“

”مئی نہیں آنے دیں گی۔“ ایمن کا لہجہ مدہم اور چہرہ تاریک سا ہوا۔

”کیوں؟“

ایمن چپ ہو گئی، وقار الحسن نے بھی بات بدل دی۔ لیکن وہ جتنے دن پاکستان میں رہے، متواتر شام کو اس سے ملنے آتے رہے۔





گلابی جاڑے کا اک اداس دن تھا۔ اس اداس دن کے دامن کو خاموش بارش کی پھوڑا لالا۔ بارش نے نچے نچے مندور خستوں، کٹھنی کی بانٹوں، ننھے پودوں، خالی کھاریوں کو چھوٹی زرد سبز گھاس میں گم ہو رہی تھی۔ بارش، بوشیے کی دیوار پر موتیوں کی صورت برس رہی تھی۔

وہ اسی دیوار کے پاس ایزی چیئر پر ٹانگوں کو گلابی کمبل میں چھپائے بہت دیر سے بارش کا خاموش منظر دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے آنکھیں موند لیں۔

بارش کے ساتھ اس کا رشتہ ہمیشہ ہی بہت عجیب رہا۔ اس نے ہمیشہ ایمن کی جھولی میں وحشت، خوف، تنہائی اور اداسی ہی ڈالی تھی۔ آج بھی بہت سی اداسی اپنے اندر جذب کر کے اس نے دھیرے سے آنکھیں موند لیں۔

بند آنکھوں میں بھی وہی منظر تھا۔ مگر اس منظر میں کچھ انجانی آہٹیں بھی تھیں۔ جنہیں وہ پوری طرح محسوس کر رہی تھی۔ یوں لگتا تھا اس کے اندر اک سبز کونسل پھوٹی ہے۔ جس کی تروتازہ مہک سے اندر باہر سب تبدیل ہو رہا تھا۔

وہ کسی سے شیر کرنا چاہتی تھی۔

مگر کس سے؟

کچھ سوئی جاگی سی کیفیت تھی۔ جب کسی نے دھیرے سے نرم انگلیوں کے ساتھ اس کی پیشانی کے بال سمیٹے ایمن نے تیزی سے آنکھیں کھولیں۔ طارق کو دیکھ کر اک عجیب سی خوشی من میں جاگی۔ اب وہ ہمیشہ بنا بتائے پونہی اچانک اس کے سامنے آجاتا تھا۔

”ارے آپ تو بارش میں بھیگ گئے ہیں۔“

اس نے ٹانگوں سے کمبل نوجا۔

”کہاں جا رہی ہو۔۔۔ پر کسی سے کوئی سلام دعا۔“ طارق نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

”سر دیوں کی بارش ہے۔ بیمار شمار ہو گئے تو۔۔۔“

وہ جلدی سے تویہ لے آئی۔ وہ اس کی جگہ پر بیٹھ چکا تھا۔

”صاف کرو۔۔۔“ مزے سے فرمائش کی۔ ایمن عقب میں کھڑی ہو کر تویہ لے سے اس کے بال خشک کرنے لگی۔

”اس بار تو بہت جلدی چکر لگایا۔“ جب طارق بالکل فریش ہو گیا۔ تب اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے ایمن نے کہا۔

”واپس چلا جاؤں؟“

”میں نے یہ کب کہا۔۔۔؟“ ایمن نے خفاسی نظروں سے اسے دیکھا۔

”تم نے انتظار کیا۔۔۔؟“

ایمن نے جواب نہیں دیا۔ صرف سر جھکا کر مسکرا دی۔

”تم وہاں رہنے ہی نہیں دیتیں۔ اس لیے میں نے بھی سوچ لیا ہے۔ یہاں کاروبار شروع کروں۔ اس بار جلدی کے لیے آیا ہوں۔ کچھ لوگوں کے ساتھ بات چیت کرنا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“

”ہاں۔۔۔ اچھی بات ہے۔“

کر دیں گے۔ تم میری ماں کو نہیں جانتے۔ وہ ہم سے بہت پیار کرتی ہیں۔ مگر بہت سخت ہیں۔“ وہ بے چارے کہہ رہی تھی۔

”اچھا۔؟“ وہ کسی سوچ میں ڈوبا۔ ”میں تمہیں کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ لیکن تمہارے کالج کے پرنسپل فونو اسٹیٹ کی دوکان ہے۔ وہاں تو مل سکتی ہو۔ محض دو منٹ کی واک ہے۔“

”کسی نے دیکھ لیا تو۔۔۔“

”وہ میرا دوست ہے۔ دوکان کی پچھلی طرف اک چھوٹا سا کیمبن ہے۔ سامنے بروہ ہے۔ تم فونو اسٹیٹ کے بھانے آجانا۔ بس پانچ منٹ بیٹھیں گے۔ کوک پیئیں گے اور واپسی۔ وہاں تو کسی جھانے کا ڈر نہیں۔ اس کے لیے اس خلتے پھرتے اشتہار کو لے کر مت آنا۔ زہر لگتی ہیں مجھے ایسی بولڈ اور بے باک لڑکیاں۔ جو اپنی ہر بات میں دعوت دیتی محسوس ہوں۔“

”کون تائیں۔؟“

”ہاں لڑکیاں تو تم جیسی اچھی لگتی ہیں۔ چھوٹی موٹی، ڈھکی چھپی۔ جسے دیکھیں تو مزید دیکھنے کی ہڑک مس بیدار ہو۔“

مومو کا ذہن اس حد تک جا ہی نہیں سکتا تھا۔ جس حد پر جا کر وہ اپنی خواہش کا اظہار کر رہا تھا کہ بہر حال اس کی اپنی زندگی خاصی محدود اور محفوظ گزار رہی تھی۔

وہ اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا۔

اس سے پہلے صرف باپ اور بھائی سے واسطہ تھا اور اک غیر مرد کی ڈیمانڈز کیا ہوتی ہیں۔ وہ سمجھ ہی نہ تھی۔ وہ صرف اس کے پار بھرے لفظوں اور خوب صورت لہجے پر اعتبار کر رہی تھی۔ اس خوب صورتی کے چھپی ہوئے ہوس تک پہنچ ہی نہ سکی۔

مومو اچ تو یہ ہے کہ تمہیں مجھ پر اعتبار ہی نہیں ہے۔“ وہ ایک دم بھڑک اٹھا۔

”ایسی بات نہیں ہے۔“ مومو چھنس گئی۔

”ایسی ہی بات ہے۔۔۔ ورنہ اب تم مجھے ٹالتی ناں۔ کیونکہ تم نے مجھ سے محبت کی ہی نہیں۔“ وہ جذباتی لگا۔ ”مومو! تم نے مجھے بہت ہرٹ کیا ہے۔ مجھے کیا سمجھتی ہو۔ غنڈہ بد معاش۔“ اس کے پاس ایک سوا ایک تھے اور وہ پہلے رہی زیر ہو گئی۔

”خدا کے لیے ایسی باتیں مت کرو۔ مجھے تم پر اعتبار ہے۔ خود سے بھی برہم کہ۔“

”تو اس اعتبار کا اظہار کرو۔“ وہ منتظر تھا۔

وہ متذبذب۔

ایک تقدیر اٹل ہوتی ہے جسے کوئی نہیں بدل سکتا۔

مگر ایک تقدیر وہ ہوتی ہے جس میں انسان اپنی مرضی سے کمی بیشی کر سکتا ہے۔

وقت دم سادھے منتظر تھا کہ وہ اپنی تقدیر میں کیا رقم کرنے جا رہی ہے۔

یہ مول و قار الحسن کی زندگی کا ٹرننگ پوائنٹ تھا۔

جو اسے تباہی کی طرف لے جا بھی سکتا تھا اور بچا بھی۔

فیصلہ اس کے اپنے ہاتھ میں تھا۔

اور وہ فیصلہ کر چکی تھی۔

طارق حیرت بے یقینی اور خوشی کے طے جلے تاثرات کے ساتھ بہت دیر تک کچھ بھی نہ بول سکا۔

بات ہی ایسی تھی کہ سب ہی خوشی سے نہال تھے۔ خود وہ بھی جس نے پہلی بار اس خوشی کا گلا اپنے ہاتھوں سے کھوٹا تھا۔ اکثر رات میں نرم تکیے کو بازوؤں میں بھینچ کر سو جاتی۔ وہ ننھا سا کیسا ہو گا۔ جو اس کے وجود کی تکمیل کرے گا۔ اس خوشخبری نے طارق کے واپسی کے فیصلے پر مہر لگادی تھی۔

”سب بہت جلد واپس آوں گا۔ یہاں پر محنت کروں گا۔ اپنے بچے کو زندگی میں وہ سب کچھ دوں گا۔ جس کے لیے میں ترسا۔ اسے بہت سا بڑھاؤں گا۔“

اس کے پاس اپنے بچے کے لیے بہت سے پلانز تھے۔ وہ مسکراہٹ و باقی سنتی رہی۔ گاؤں سے چاچا چاچی نے بہت سی سوغاتیں بھیجیں۔ اسے سب سے زیادہ وقار الحسن سے شرم آتی۔ جنہوں نے اپنے طویل فون میں اسے ان ڈائمنڈ کٹلی اپنی صحت کا بہت سا خیال رکھنے کی تاکید کی۔ اس نے اگر کسی کو نہیں بتایا تھا تو وہ صغریٰ تھی۔ جس کی جہاندیدہ نگاہیں یہ بات بہت پہلے سے بھانپ گئی تھیں۔

زندگی میں اک خوشگوار تبدیلی عود کر آئی تھی۔ وہ ہفتے کا دن تھا۔

طارق دو دن قبل واپس جا چکا تھا۔ اسے ایک دو چھوٹی موٹی ذاتی استعمال کی کچھ چیزیں خریدنا تھیں۔ قریبی مارکیٹ دو سڑکیں چھوڑ کر ہی تھی۔ وہ اکیلی واک کرتی وہاں تک چلی آئی۔ مطلوبہ اسٹور کے سامنے رک کر اس نے پرس میں روپے چیک کیے کہ آنے سے قبل وہ پرس میں روپے رکھنا بھول گئی تھی۔ مگر اتنے روپے ابھی موجود تھے کہ وہ اپنی مطلوبہ اشیاء خرید سکے۔ وہ مطمئن سی ہو کر اندر چلی آئی۔ اسی عرصے میں سڑک کے دوسری طرف آئس کریم پارلر سے باہر نکلتا شخص ٹھنک کر رکا۔ اس کی نگاہیں اسٹور کے اندر جاتی ایمین پر جم گئی تھیں۔

کچھ لمحے متذبذب سا اسٹور کے گلاس ڈور کے دوسری طرف نظر آتی ایمین کو دیکھتا رہا۔ پھر اس کے قدم فیصلہ کن انداز میں اٹھے۔ تیزی سے خالی سڑک کو پار کر کے وہ اسٹور میں داخل ہوا ایمین اپنی اشیاء نکلا رہی تھی۔ وہ اک بڑے سے ریک کے پیچھے کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ ایمین نیل پالش کے شینڈل چیک کر رہی تھی۔ اس نے سبز روپے اڈھر رکھا تھا اور وہ اس کی آڑ سے اس کا آدھا چہرہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ لبوں کا کٹاؤ وہی خمدار پلکیں۔ وہ اک طویل سانس بھر کر رہ گیا۔

ایمین نے اشیاء والا اشارہ اٹھایا۔ بے منٹ کی اور برس سنبھالتی واپس پٹی۔ اسے اس ریک کے پاس سے گزرتا تھا۔ وہ سیدھا ہو گیا۔ ایمین اپنے آپ میں گپاس سے گزری تو اس نے آہستگی سے بازو تھام لیا۔ ایمین اچھل پڑی۔ دوسرے پل اس کے ہاتھ سے شاپر اور پرس نیچے جا پڑا۔ وہ مگر ٹکر اپنا بازو پکڑنے والے کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

اس نے آہستگی سے بازو چھوڑا۔ نیچے گری اس کی چیزیں اکٹھی کیں پھر سیدھے ہو کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ایمین ان تمام لمحوں میں نہ پلکیں جھپک سکی نہ منہ سے کچھ بول سکی۔

”واک معمول کی طرح اس کے ساتھ کھینچی چلی گئی۔“

باقی آئندہ سہ ماہی میں

”ہر وقت تمہارے سر پر سوار رہوں گا۔ برداشت کر لو گی۔“ وہ اس کی سمت جھکا۔

”کرنا پڑے گا۔“ ایمین نے آہ بھر کر جواب دیا۔

”کیا۔؟“ وہ یکدم چیخا۔ ”کڑے تو میری غیرت نول لنگار یا اسے ٹھہرا۔“

وہ اٹھ کر بگسٹ انڈر کی طرف بھاگی۔

اگلے دن اک نکھری سٹھری صبح ان کی منتظر تھی۔

ایمین نے اسے صبح صبح ہی جگا دیا۔

”واک کے لیے چلیں؟“

”اتنی سردی میں۔ دباغ خراب ہے۔“

”پلیز روز میں اکیلی جاتی ہوں۔“

”آج بھی اکیلی جاؤ۔“ طارق نے سر تک کبل تان لیا۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ غصے سے اکیلی ہی چلی گئی۔ مگر واپس اکیلی نہ تھی۔ تیمور اور سکندر اس کے ساتھ تھے۔ طارق جاگ چکا تھا۔ مگر بستر پر تھا۔

”اؤئے۔ یہ بھالو کون ہیں۔؟“ شوخ آونی لباس میں سر ٹوپیاں لیے وہ صبح بچ بھالو لگ رہے تھے۔

”میرے دوست ہیں۔“ ایمین نے فخر سے بتایا۔ وہ دونوں اکثر ہی دادا جان کے ساتھ واک کے لیے نکلتے تھے۔

”واہ۔ بڑے کڑیل جوان دوست ہیں۔“ طارق ہنس دیا۔ پھر بچوں کو پاس بلا کر باتیں کرنے لگا۔ ایمین اس کے لیے چائے بنا لائی۔ تب تک طارق کی ان کے ساتھ کئی دوستی ہو گئی تھی۔

”میں انہیں چھوڑ کر آتی ہوں۔ چلو بچو! ماما انتظار کر رہی ہوں گی۔“

ایمین نے کہا تو دونوں شرافت سے اٹھ گئے۔ ایمین انہیں گھر چھوڑ کر اور فرحت سے پہلو ہائے کر کے لول

طارق لان میں تھا۔ وہ بھی اس کے قریب آئی۔

”ناشتے میں کیا لیں گے؟“

”بہت پیارے بچے تھے۔“ اس نے گویا ایمین کی بات سنی ہی نہ تھی۔

”ہاں۔ پیارے تو ہیں۔“

”مہی! تمہیں بچے اچھے لگتے ہیں۔“ طارق نے کھوئے کھوئے سے انداز میں پوچھا۔

”لگتے ہیں۔ اسی لیے تو دوستی کی ہے۔“ وہ اس کی کیفیت سے بے خبر لاپرواہ سے انداز میں بولی۔ طارق گھر

اس کے سامنے آیا۔

”تمہیں نہیں لگتا۔ ہماری زندگی میں کسی چیز کی کمی ہے۔“

ایمین اسی پل بات کی تہہ تک پہنچ گئی۔

”ہوں۔“

”تمہیں اولاد کی خواہش نہیں ہوتی؟“

”اب ہوتی ہے۔“ ایمین نے سر جھکا کر ایمان داری سے کہا۔ تو طارق نے طمانیت کے احساس کے

دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھے۔

”تب مجھے یقین ہے خدا بہت جلد ہم پر مہمان ہو گا۔“

ایمین نے دو چہرے سے پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”اور مجھے لگتا ہے کہ خدا ہم پر مہمان ہو چکا ہے۔“

ترسیاں

موسم بہار کے اولین دن تھے اور ایک مدت بعد ایسی فراغت بھری بہار میسر آئی تھی۔ چوبیس سال تک بغرض تعلیم اسکول، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی خاک چھاننے کے بعد آخر کار، آخری مادر علمی سے معقول سی ڈگری حاصل کر کے ہم نے ان سے اور انہوں نے ہم سے جان چھڑائی تھی اور اب ہمارے لیے راوی، ستیج، چناب غرض ہر کوئی چین ہی چین لگہ رہا تھا۔ نوکری کی تلاش میں جو تیاں چٹانے کا سلسلہ ہنوز شروع نہیں ہوا تھا کہ سیفی کہتے تھے، ابھی ہم کچھ عرصہ آرام کر کے بیٹے برسوں کی تھکن اتاریں گے، سیفی کو تھکن اتارنے کا بہت شوق تھا حالانکہ وہ ہر کام بہت آرام سے کرنے کے عادی تھے پھر بھی جانے کیوں تھکن ان پر حاوی آجاتی تھی۔

سولہ جماعتیں پاس کرنے میں انہوں نے انیس برس لگا دیے تھے۔ ہر چار سال بعد وہ اتنا تھک جاتے کہ اگلی جماعت میں جانے کی ہمت نہ رہتی، مجبوراً ممتحن ترس کھا کر انہیں اسی جماعت میں رکھ لیتا۔ یوں وہ تعلیمی سفر جو سیفی نے ہم سے تین برس پہلے شروع کیا تھا وہ ہمارے ساتھ ہی اختتام پذیر ہوا۔

اپنے متعلق کچھ بتانے سے پہلے ضروری ہے کہ آپ کا سیفی سے تعارف کروا دیا جائے۔ جب میں نے اس دنیا میں پہلا قدم رکھا تو سیفی اس دن دنیا میں اپنے پہلے قدم کی چوٹھی سالگرہ منا رہے تھے۔ سیفی اپنی سالگرہ بہت دھوم دھڑکے سے منانے کے عادی تھے۔ میرے والد محترم جو سیفی کے چھوٹے چچا کے رتبے پر

فائز تھے، سیفی سے پہلے ہی وعدہ کر چکے تھے کہ اس سالگرہ پر وہ انہیں بہت پیار سا تحفہ لاکر دیں گے۔ اس تحفے کو لانے کی غرض سے والدہ محترمہ کو تین دن ہسپتال میں داخل رہنا پڑا۔ سیفی کی سالگرہ والے روز شام کو والد اور والدہ کے ساتھ کبیل میں لپٹا ہوا میرا وجود گھر میں داخل ہوا تو سیفی سالگرہ کا کیک کاٹ کر دھڑا دھڑا غبارے پھوڑ رہے تھے۔ داوی نے مجھے اپنی آغوش میں لے کر سیفی کو اپنے پاس کھینچا۔

”دیکھ تو سبیاں! تیرے چچا تیرے لیے اصلی گڈا لے آئے ہیں۔“ انہوں نے سیفی کے اندر اشتیاق جگانے کی کوشش کی۔ سیفی نے ذرا سا اچک کر مجھے دیکھا پھر کچھ براسا منہ بنا کر بیچھے ہٹ گئے۔

”میرا خیال تھا، چچی جان اس دفعہ ہسپتال سے واپسی پر گڑیا لائیں گی۔“ انہوں نے اپنے خیال کو دل میں رکھنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ سب لوگوں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور سب لوگ اس ٹھنڈی آہ کے بھرنے میں حق بجانب بھی تھے کہ امی، ابا ہسپتال سے واپسی پر مسلسل تیسری بار گڈا اٹھالائے تھے۔ میں اپنے گھر کا تیسرا اور خاندان کا ساتواں گڈا میرا مطلب ہے لڑکا تھا۔

غصہ مجھے ٹھنڈی آہ بھرنے پر نہیں آیا بلکہ سیفی کے احساس دلانے پر آیا تھا۔ وہ یہ طعنہ دیتے اس وقت اچھے لگتے جب خود ایک لڑکی ہوتے۔

خیر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سیفی سے ہمارے سفارتی تعلقات بہتر ہوتے گئے حالانکہ اصولاً

میں مجھ سے بڑے عاصم یا باسط سے دوستی کرنی چاہیے تھی۔ مگر ان کی عیار آنکھوں نے بھانپ لیا کہ مجھ سے بہتر دوست انہیں کوئی اور نہیں ملے گا۔ سو عمروں کے تفاوت کو نظر انداز کرتے ہوئے انہوں نے مجھے اپنی دوستی سے سرفراز کر دیا اور میں جو گھر کا مسلسل ساتواں لڑکا ہونے کی وجہ سے کسی کا بھی زیادہ لاڈلا نہیں بن پایا تھا۔ ان کی دوستی پا کر پھولے نہ سما۔ وہ اگرچہ بڑھائی میں مجھ سے تین برس آگے تھے مگر ان کے اُدھے سے زیادہ ہوم ورک کی ذمہ داری میرے ناتواں کندھوں نے اٹھارکھی تھی۔ اکثر تو وہ اسکول میں بریک کے دوران ہی اپنی کاپیاں اٹھا کر میری کلاس میں آجاتے۔

”گھر جا کر تو تم اپنا ہوم ورک کرو گے۔ میرے کام کے لیے فالتو میں رات کو جاگنا پڑے گا۔ یہ بات مجھے ہرگز اچھی نہیں لگے گی، تم یوں کیوں نہیں کرتے کہ میرا سوشل اسٹڈی کا کام ابھی کرو۔“

وہ اتنی اپنائیت سے کہتے کہ میں جھٹ سر ہلا دیتا اور میں سوشل اسٹڈی کی کاپی پر لائنیں کھینچنے لگتا، اتنے میں سیفی میرے بیگ کی تلاشی لے کر لٹچ باکس برآمد کر کے اس میں موجود چکن سینڈویچ سے انصاف شروع کر دیتے۔

”یہ لو اپنا چکن سینڈویچ چچی نے اتنا بڑا سینڈویچ بنا کر روے دیا تھا۔ تم سے تو کھایا بھی نہ جاتا پھر واپس بچا کر لے جاتے تو چچی سے ڈانٹ الگ پڑتی۔ میں نے آدھا کھالیا ہے اب باقی آدھا تم کھا لو۔“

ان کے کہنے کا انداز ایسا ہوتا کہ مجھے احسان مانے بنا چارہ نہ ہوتا تھا۔ مگر سیفی کی چالاکیاں زیادہ عرصے میری نگاہوں سے اوچھل نہ رہ سکیں۔ لیکن اب مسئلہ یہ تھا کہ میں کب سے جان چھڑوانا چاہتا تھا مگر کب میری جان چھوڑنے پر آمادہ نہ تھا۔ میں جس کسی کی طرف بھی دوستی کا ہاتھ بڑھاتا اور میان میں سیفی اپنی ٹانگ اڑا دیتے۔ اپنی طوطے جیسی ناک اور انتہائی عیار آنکھوں کے باوجود وہ اپنی ظاہری شخصیت میں کچھ ایسی کشش رکھتے تھے کہ ہر بندہ ان سے متاثر اور مرعوب ہو جاتا۔

تین تین میرا ہر دوست کچھ عرصے بعد ان کے حلقہ احباب میں شامل ہو جاتا۔ جب ان کا حلقہ احباب ضرورت سے زیادہ وسیع ہو گیا تو میں نے نئے دوست بنانا ترک کر دیے۔ کیونکہ اکثر وہ بستران کے دوستوں کی خاطر ہدایت کا بوجھ میری ہی ناتواں جیب پر پڑتا تھا۔

خیر یونہی وقت گزرتا گیا۔ لیکن اب جب ہم فراغت کے مزے لوٹ رہے تھے تو کچھ مرتبہ لوٹنے کے بعد ہی یوں لگا جیسے وقت ٹھہر گیا ہے۔ دل و دماغ پر عجیب سی بوریٹ طاری ہونے لگی پھر ایک صبح سیفی تسماتے چہرے کے ساتھ آن موجود ہوئے۔

”تم کئی دنوں سے بوریٹ، بوریٹ کا راگ الاپ رہے تھے نا میرے ذہن میں ایک خیال آیا ہے، کیوں نہ ہم کچھ دنوں کے لیے نواب بہادر علی خان کی جاگیر پر جا کر وقت گزاریں۔“ انہوں نے پر جوش انداز میں اپنا آئیڈیا پیش کیا۔

”کون نواب بہادر علی خان؟ کیسی جاگیر اور ہم کیوں جانے لگے وہاں؟“ ہم نے ان کے جوش و خروش کو نظر انداز کرتے ہوئے اچھبے سے دریافت کیا۔

”ارے تمہیں یاد نہیں؟ وہ دادا جان کے بھائی کے بیٹے کے صاحب زادے ہیں دادا جان اپنی زندگی میں ان لوگوں کا کتنا تو ذکر کرتے تھے۔“ سیفی نے ہمیں یاد دلانا چاہا۔

”افوہ! آپ رشتوں کو چھوٹم کی طرح کھینچ کیوں لیتے ہیں۔ آپ یوں بھی کہہ سکتے تھے کہ وہ دادا جان کے بھائی کے پوتے ہیں۔“ ہم نے اکتاہٹ سے ان کی بات کالی۔

”چھا بابا! تم جو مرضی کہہ لو، بس یہ بتاؤ کہ شام کی گاڑی سے ہمارے ساتھ چل رہے ہو یا نہیں؟“

”نہیں۔“ میں نے قطعیت سے انکار کیا۔

”چلو ٹھیک ہے پھر جلدی سے بیگ وغیرہ تیار کر لو، وہ پھاڑی علاقہ ہے موسم قدرے ٹھنڈا ہو گا، دو سو میٹر ضرور رکھ لیتا۔“

”دو سراسر لیے؟“ میں نے اچھبے سے ان کی بات کالی۔

”ہذا اس کا مطلب ہے تم جا رہے ہو۔“ وہ دانت نکوستے ہوئے بولے۔ میں بھنا کر رہ گیا۔

”جی نہیں ہم ہرگز وہاں نہیں جا رہے۔“ اس بار میں نے چڑ کر دو ٹوک انداز میں جواب دیا۔

”تو یہ تھا کہ سیفی کی زبردستی اور ہونسن اب ہمیں قطعاً چلانی نہ لگتی تھی۔ سیفی ہمارے کورے جواب پر منہ لٹکا کر چلے گئے۔ لیکن شام کو جب ہم ٹینس کھیل کر کلب سے واپس گھر لوٹے تو ہماری الماری کسی نے بری طرح پھولی ہوئی تھی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ سیفی ہمارے بہترین سوٹ سمیت ٹائیوں کے ہمارے ہی بیگ میں ڈال کر اسٹیشن روانہ ہو چکے ہیں۔

وہ ہمیشہ یوں ہی کرتے تھے۔ ہمارے خریدے گئے سامان کو بہت مزے سے برت کر اپنی نوری بناتے تھے۔ غصہ تو ہمیں بہت آیا لیکن پھر خس کم جہاں پاک کہتے ہوئے سکون کا سانس لیا۔ سیفی کی زبردستی کی سنگت سے چند روز الگ گزارنے کا خیال ہی بہت سکون افزا تھا۔ ورنہ وہ ہمارے ہر معاملے میں دخل ہونا اپنا حق سمجھتے تھے لیکن پھر غیر محسوس طریقے سے ہم سیفی کو یاد کرنے لگے سچ تو یہ تھا کہ ہم ان کے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ اب ان کے بنا وقت گزارنا مشکل کام لگنے لگا تھا اور پھر جس سکون کی خاطر ہم نے گھر پر رکنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اتفاقاً آنے والے مہمانوں کی آمد کے بعد وہ سکون بھی رخصت ہو گیا۔ ہم بنیادی طور پر گوشہ نشین قسم کے شخص واقع ہوئے تھے۔ مہمانوں اور مہمان داری وغیرہ کے سلسلے میں ہماری جان جاتی تھی۔

اب ہمیں سیفی کے ساتھ نہ جانے کے اپنے فیصلے پر افسوس ہو رہا تھا۔ سیفی نے وہاں جا کر خیریت سے کچھنے کا صرف ایک فون کیا تھا اس کے بعد چپ ساڑھی تھی۔ آخر ہم سے رہا نہیں گیا۔ چوتھے دن ہم نے انہیں خود ہی فون چھلایا تھا۔ فطری جھجھک تھا کہ آخر سیفی نواب صاحب کی جاگیر پر کیسے وقت گزار رہے ہیں۔ سیفی نے میری آواز سن کر ایک لمبی سی ٹھنڈی سانس بھری تھی۔

”تم اچھے رہے جو یہاں نہیں آئے۔ میں تو یہاں

”آکر بری طرح پھنس گیا ہوں۔“

”کیوں کیا نواب چچا کی جاگیر بسند نہیں آئی؟“ ہم نے حیرت سے دریافت کیا۔

”کیسی جاگیر کہاں کی جاگیر نواب چچا کی جاگیر محض ان کی ایک بیگم، دو بیٹوں، تین بہنوں اور چار کتوں پر مشتمل ہے اور ایک بیگم کو چھوڑ کر باقی ساری جاگیر کا انتظام ہمارے ناتواں کندھوں نے سنبھال رکھا ہے۔“ انہوں نے دکھڑا رویا تھا۔

”کیا مطلب آخر نواب چچا کہاں گئے؟“ ہمیں سیفی کی بات سن کر حیرت ہوئی تھی۔

”نواب چچا اپنی بیگم کے پیچھے پیچھے گئے ہیں۔“ انہوں نے ایک اور ٹھنڈی آہ بھری۔

”اور بیگم کہاں گئیں؟“ ہم نے مزید حیرت سے اگلا سوال کیا۔

”اب ہم تمہیں کیا بتائیں، نواب چچا نے اوھیڑ عمری میں جا کر بیاہ رچایا۔ بیگم ماشاء اللہ جوان ہیں۔ دونوں کی عمروں میں تو کافی فرق ہے۔ مزاجوں میں بھی زمین آسمان کا فرق ہے۔ بس چھوٹی چھوٹی باتوں پر بیگم صاحبہ کلپارہ چڑھ جاتا ہے اور وہ ناراض ہو کر میکے کا رخ کر لیتی ہیں۔ بے چارے نواب چچا انہیں منانے کے

خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے
بہنوں کے لیے ایک اور ناول

بن روئے آنسو

فرحت اشتیاق

قیمت --- /- 200 روپے

منڈوانے کا پتہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37- اردو بازار، کراچی۔

لے پیچھے پیچھے دوڑے جاتے ہیں۔ جس دن ہم یہاں پہنچے بس اسی صبح بیگم صاحب روٹھ کر میکے چل گئیں۔ دوپہر کو نواب صاحب بچوں سمیت ساری ذمہ داری ہمیں سونپ کر ان کے پیچھے روانہ ہو گئے۔ اوہران کا روٹھنا منانا ہی ختم نہیں ہو رہا اور یہاں ہم گھریاں سنبھالنے میں بری طرح ہلکان ہو رہے ہیں۔ اول درجے کے شرارتی بچے ہیں نواب چچا کے۔ ہمیں سختی کا ناچ نچا کر رکھ دیا ہے اور رات تو پھر بھی سکون سے گزرتی ہے لیکن دن۔ خدا کی پناہ سارا دن اختر شماری کی نذر ہو جاتا ہے۔

سیفی نے کہا تو ہمیں بے اختیار ان پر ترس آ گیا۔ ان کی اردو اتنی کمزور تو نہ تھی لیکن بے چارے وہاں جا کر چکر کر رہ گئے ہیں۔ ہم نے ان کی صفحہ کرنا چاہی کہ اختر شماری رات کو تمکن ہوتی ہے لیکن اگلے ہی پل انہوں نے جملہ عمل کر کے ہماری غلط فہمی دور کر دی۔

”صبح سات بجے اختر نامی گوالا دودھ دینے آتا ہے، پونے آٹھ بجے ایک اور اختر کوڑے کا ڈرم لینے کے لیے دروازہ بجاتا ہے۔ اخبار دینے والا اختر تھیک سوا آٹھ بجے آتا ہے۔ اس کے بعد آخری اختر کا انتظار شام تک کے لیے موقوف ہو جاتا ہے۔ آخری اختر شام پانچ بجے منے کی پیا نوکی کلاس لینے آتا ہے۔“ انہوں نے صورتحال کی وضاحت کی تھی۔

”تو آپ بھاڑ میں ڈالتے ساری موت اور لحاظ نواب صاحب کو فون پر بتا دیجئے کہ وہ کھر آئیں نہ آئیں آپ پہلی گاڑی سے گھر واپس جا رہے ہیں۔“ سیفی کی حالت پر ترس کھاتے ہوئے ہم نے انہیں مشورہ دیا تھا۔

”نہیں خیر اب اتنا بھی بے موت نہیں ہوں کچھ دن اور انتظار کر لیتا ہوں۔ نواب چچا کی بھی مجبوری ہے اب انہیں اپنی سالی صاحبہ کی نسبت طے ہونے تک وہیں رکنا ہے۔ بس جیسے ہی وہ لوٹے ہیں میں بھی واپسی کے لیے رخت سفر باندھ لوں گا۔“

سیفی نے کہا تو ہم چپ ہو گئے۔ ہم سے بہتر کون

جاننا تھا کہ ان سے بڑھ کر بے موت اور طوطا چشم کون تھا۔ خیر وہاں کی آب و ہوائے اگر ان میں تھوڑی سی موت اور جذبہ احساس بیدار کر ہی دیا تھا تو ہم کون ہوتے تھے انہیں کسی قسم کی خود غرضی کا مشورہ دینے والے سو نیک تمناؤں کا اظہار کر کے رابطہ منقطع کر دیا لیکن چشم تصور سے سیفی کی حالت کا مشاہدہ کیا تو ان پر بے پناہ ترس آیا۔ بے چارے اپنی بوری ت دور کر گئے تھے اور وہاں جا کر پھنس کر رہ گئے تھے آج تک سیفی کی ہر مشکل میں نہ چاہتے ہوئے بھی ہمیں ان کے شانہ بشانہ کھڑا ہونا پڑا تھا اور یہ عادت اتنی پختہ ہو گئی تھی کہ اب انہیں وہاں کے حالات سے اکیلے نہ آزمایا ہوتا سن کر مجھ سے رہا نہیں گیا اور اگلی صبح کی ٹرین میں بیٹھ کر ہم بھی نواب چچا کی جاگیر کو روانہ ہو گئے۔

”ارے تم یوں اچانک؟“ سیفی ہمیں دیکھ کر ایسے گڑبڑائے کہ ہمیں کسی گڑبڑ کا احساس ہونے لگا۔

”لگتا ہے آپ ہمیں دیکھ کر خوش نہیں ہوئے۔“ ہم نے انہیں ٹٹولنا چاہا۔

”ارے نہیں کیسی باتیں کرتے ہو تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ تمہیں یوں اچانک دیکھ کر ہمیں کس قدر خوشی ہوئی ہے۔ اکیلے رہتے رہتے ہم بری طرح اکتا گئے تھے۔“

انہوں نے لہجے میں گرجوٹی پیدا کرنا چاہی۔ یہ اور بات کہ ان کے چہرے کے تاثرات ان کے لہجے سے مطابقت نہ رکھتے تھے لیکن ہم اتنا تھک چکے تھے کہ ان کے لہجے اور تاثرات پر غور کرنے کے بجائے آرام کرنے کو ترجیح دی اور لمبی ٹان کر جو سوئے تو صبح تڑکے ہی آنکھ کھلی تو نواب صاحب کے دونوں صاحب زاوے جنہیں سیفی نے ننھے شیطانوں کا نام دے رکھا تھا ہم سے بڑی تیز سے ملے اور ہمیں تو دونوں بچے بہت معصوم اور پیارے لگے۔

ناشتے کا مینو زبردست تھا اور ناشتے کے بعد دونوں بچے ہمیں علاقے کی سیر کروانے لے گئے۔ آس پاس کا

علاقہ قدرتی حسن کا شاہکار تھا۔ طبیعت ہشاش بشاش تھی۔ اب ہمیں سیفی کے اس بیان میں رتی برابر بھی صداقت نظر نہیں آ رہی تھی کہ وہ یہاں پور ہو رہے ہیں۔ وہ یہاں خوب مزے میں تھے لیکن انہیں ہم سے غلط بانی کی ضرورت پیش کیوں آئی یہ عقدہ شام کو کھلا۔ آج سارا دن اختر شماری کی ذمہ داری سیفی نے ہمارے سپرد کر رکھی تھی۔ آخری اختر منے کو پیا نو سکھانے تھیک پانچ بجے آگئے تھے منے کو ان کے سپرد کر کے ہم باہر نکلے تو بونہی شملتے شملتے باغیچے میں چلے گئے۔ سیفی وہاں پر پہلے سے ٹھل رہے تھے ہمیں دیکھ کر گڑبڑا گئے۔

”کتنے مجھڑ ہیں یہاں۔ چلو اندر ہی چلتے ہیں۔“ انہوں نے نا دیدہ چھروں کو ہاتھ سے بھگاتے ہوئے کہا۔ اور اتنے میں ہی نواب صاحب کے چھوٹے صاحبزادے ایک دو شیزہ کی انگلی پکڑ کر خراں خراں تشریف لے آئے۔ سیفی اور دو شیزہ میں آواب و تسلیمات کا تبادلہ ہوا۔

”آپ لوگوں کا آج کیا پروگرام ہے؟ پہلے آپ لوگ باتیں کریں گے اور بعد میں مس مجھے پڑھائیں گی یا پہلے مس مجھے پڑھائیں گی اور بعد میں آپ لوگ بیٹھ کر باتیں کریں گے؟“

گھلو سے بیلو نے بڑی متانت سے دریافت کیا۔

سیفی گڑبڑا کر رہ گئے۔

”شرر کہیں کا پڑھائی سے جان چھڑا کر بھاگنا چاہتا ہے۔ جاؤ جا کر کتابیں لے آؤ۔“ سیفی نے ہولے سے ان کا کھن موڑا تھا۔ وہ سیفی پر ایک تیکھی ناراض نگاہ ڈال کر اندر کتابیں لینے چلا گیا اور تب سیفی کو ہمارے تعارف کا خیال آیا۔

”یہ بیلو کی سحر مس صوفیہ ہیں۔ اسے سیمتھس پڑھائی ہیں۔“ سحر مس صوفیہ نے ایک مختصر سی مسکراہٹ میری جانب اچھالی تھی۔

”اور مس صوفیہ! یہ آفاق ہیں ہمارے چچا زاد بھائی۔“

”بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“

مس صوفیہ نے رسمی جملہ بولا جو اکثر ایسے موقعوں پر بولا جاتا ہے۔ ہم بھی خندہ پیشانی سے مسکرا دیے۔ البتہ دل ہی دل میں سیفی پر خوب تاؤ آ رہا تھا۔ کیا خوب صورت مصوفیت ڈھونڈ رہی تھی سیفی نے نواب صاحب کے گھر میں اور گھنے اتنے کہ منہ سے بھاپ تک نہیں نکالی تھی۔

”یہ بیلو کہاں رہ گیا۔ ذرا دیکھنا جا کر۔“ سیفی نے تعارف کے مرحلے تک تو ہمیں برداشت کر لیا تھا لیکن اب صاف ظاہر تھا کہ ہمیں منظر سے ہٹانا چاہ رہے ہیں۔ اتنے میں ہی بیلو بستہ سنبھالے خراں خراں تشریف لے آئے۔ مس صوفیہ پہلے ہی بید کی کرسی سنبھال چکی تھیں۔ دوسری کرسی پر بیلو میاں دھپ سے بیٹھ گئے۔ بانی بچی ایک کرسی اس پر سیفی براجمان ہو گئے۔

”آج ذرا اس بیلو کے کان کھینچنے گا۔ پڑھائی پر بالکل توجہ نہیں دیتا۔ نواب صاحب کا کل بھی فون آیا تھا۔ اسی کے متعلق زیادہ فکر مند ہو رہے تھے۔“ سیفی نے مس صوفیہ کو مخاطب کیا۔

”ہاں یہ واقعی بہت نکما ہو گیا ہے۔ پرسوں میں نے اسے تقسیم کا قاعدہ سمجھایا اور کل اس نے تقسیم کے سارے سوال غلط کر رکھے تھے۔“

”وہ مجھے سفیان بھائی نے کروائے تھے۔“ بیلو نے بلبلا کر وضاحت دی۔

”وہ دراصل لائٹ گئی ہوئی تھی۔ لیمپ کی روشنی میں رقمیں صحیح نظر نہیں آئیں اور شاید میں نے عینک بھی نہیں لگائی ہوئی تھی۔“ سیفی نے کھسیا کر وضاحت دی۔

”آج تو آپ نے عینک لگائی ہوئی ہے نا اور ابھی دن کی روشنی بھی باقی ہے، آج بیلو کے ساتھ آپ بھی ریاضی سمجھیں گے۔“ مس صوفیہ نے انہیں شوخی سے مخاطب کیا۔

”ضرور ضرور۔“ سیفی نے سر تسلیم خم کیا اور ہم جو ابھی تک بے وقوفوں کی طرح منہ اٹھائے کھڑے تھے ایک دم اپنی نامناسب پوزیشن کا خیال آیا۔ مس صوفیہ

سے تو تعارف ہوئے دیر ہی کتنی ہوئی تھی۔ سیفی نے بھی ہمیں قطعاً نظر انداز کر دیا تھا۔ یہ ان کی پرانی عادت تھی۔

ہم غصے کے گھونٹ پیتے اندر چلے گئے۔ ایسے طوطا چشم اور بے مروت دوست کی تمنا کا خیال کر کے ہم دوڑے دوڑے یہاں چلے آئے تھے۔ غصہ ہمیں سیفی سے زیادہ خود پر آ رہا تھا۔ بیلو صاحب تو تھوڑی دیر میں پڑھ کر واپس آ گئے تھے۔ البتہ سیفی اور مس صوفیہ شام ڈھلنے تک وہاں بیٹھے رہے۔ گھر والوں نے سات بجائے تو سیفی نے اندر آ کر جھانکا۔

”ہم مس صوفیہ کو ان کے گھر چھوڑنے جا رہے ہیں۔ تم کھانے پر ہمارا انتظار مت کرنا ہو سکتا ہے ہمیں کچھ دیر ہو جائے۔“ وہ کہہ کر پھر غائب ہو گئے۔ ”بھاڑ میں جا میں آپ اور آپ کی مس صوفیہ۔“ ہم صرف دانت چکچکا کر رہ گئے اور رات کو سیفی دیر سے ہی لوٹے تھے۔ ہم ان کے آنے پر جاگ رہے تھے مگر پھر بھی سوتے بن گئے۔

جانتے تھے کہ اس وقت انہیں اپنے تازہ ترین افیئر کی تفصیلات بتانے کی بے چینی ہو رہی ہوگی۔ سیفی کی یہ پرانی عادت تھی۔ اپنے ہر افیئر کو وہ حتی الامکان مجھ سے چھپانے کی کوشش کرتے۔ شاید وہ سمجھتے تھے کہ میں ان سے کم عمر اور زیادہ اسمارٹ ہوں۔ اسی لیے وہ مجھ سے کچھ خائف رہتے تھے لیکن سچ تو یہ تھا کہ میں اپنی اسمارٹ نہیں کے باوجود لڑکیوں کو اتنا متاثر نہیں کر پاتا تھا جتنا سیفی اپنی چرب زبانی سے کر لیتے تھے اور جب سیفی سمجھتے تھے کہ لڑکیاں ان کی شخصیت کے سحر میں پوری طرح گرفتار ہو گئی ہیں تب وہ مجھے شروع سے آخر تک کی ساری تفصیل مزے لے لے کر بتاتے اور جلاتے کھلاتے اور آج میرا جلنے کھلنے کا بالکل موڈ نہیں ہو رہا تھا اس لیے ان کے شانہ بھلا کر مجھے جگانے کی کوشش کے باوجود میں کوٹ بدل کر سوتا بن گیا۔

صبح میری آنکھ بہت جلدی کھل گئی تھی۔ سیفی گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے۔ آج میرا اختر شماری کا کوئی

ارادہ نہ تھا۔ سیفی کی ذمہ داریاں انہی کو مبارک میں نے سونے ہوئے سیفی پر ایک نگاہ ڈالی اور جاگ رز کس کر باہر نکل آیا لیکن شوٹنی قسمت گھمٹکتے ہی ہمارا پہلا سامنا آخری اختر سے ہو گیا۔ مطلب سے پیا نو سکھانے والے اختر جاکت ٹریک پر سے نکلے۔ وہ ستائیس اٹھائیس برس کے نوجوان تھے۔ وراز قد، گندی رنگت اور غلامی آنکھیں۔ انہیں دیکھ کر خوش دلی سے مسکرائے۔

”بھئی اختر صاحب! کہیے کہیے مزاج ہیں۔“ ہم نے رسماً ان کا حال احوال دریافت کیا۔ ”اچھا ہوں۔“ انہوں نے بھی مسکرا کر جواب دیا لیکن اس مسکراہٹ میں عجیب سی اداسی جھلک رہی تھی بلکہ ان کی پوری شخصیت کا ہی ایک عجیب سی اداسی اور پشیمانی نے احاطہ کر رکھا تھا۔ چونکہ ہم نے پی اے میں اختیاری مضمون کے طور پر نفسیات رکھی تھی اس لیے مختلف لوگوں کی نفسیات اور نفسیاتی الجھنوں کو سمجھنا ہمارا اچھا خاصا مشغلہ بن چکا تھا۔ لیکن اختر صاحب سے ہماری کوئی اتنی بے تکلفی تو تھی نہیں کہ ہم ان سے اس خوب صورت اور دلچسپ موضوع کے باوجود چہرے کی آزرگی کا سبب دریافت کرتے البتہ شام کو جب وہ منے کی پانوں کی کلاس لینے آئے اور ایک انتہائی افسردہ دھن چھیڑ کر ماحول کو انتہائی اداس بنا دیا تو ہمارا فطری تجسس انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا۔ ہم نے تہہ کر لیا کہ آج ان سے ان کی اداسی کا سبب دریافت کر کے رہیں گے۔

خیر اداس تو آج ہم بھی بہت تھے۔ باہر حسب معمول سیفی اور مس صوفیہ کی محفل جمی ہوئی تھی۔ جانے ہر خوب صورت لڑکی ان پر ہی فریفتہ کیوں ہو جاتی ہے۔ یہ فریفتگی ہی ہماری دل گرفتگی کا باعث تھی اور سے اختر صاحب کی ماہرانہ انگلیاں پانوں سے رنج و الم کا ایسا نغمہ تخلیق کرنے میں مصروف تھیں کہ پورے ماحول کو سو گوارا نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پانوں کی کلاس لے کر اختر صاحب اپنا کوٹ کندھے پر ڈال کر آہستہ روی سے جانے لگے تو ہم نے انہیں

دوک بیا۔ ”بلتر چائے لے کر آ رہا ہے اختر صاحب! چائے پی کر چاہیے۔“ ”نوازش، لیکن ہم پہلے ہی سوختہ جگر لیے گھوم رہے ہیں۔“ ”چائے گرم چائے سے اجتناب ہی کرتے رہو۔“ ”شش سنگی سے معذرت کرتے ہوئے چلے گئے۔ ہم ان کی شخصیت کے اسرار میں کھوسے گئے۔

”جگ میں بلتر چائے لے آیا تھا۔“ ”چلے گئے نا اختر میاں مجھے پہلے ہی پتا تھا۔“ ”ادھیڑ بھر بلتر چائے کی ٹرے میز پر سجاتے ہوئے تاسف سے بولے۔

”اختر صاحب پیا نو بہت اچھا بجاتے ہیں لیکن جانے کیوں اتنی اداس ذہنیں تخلیق کرتے ہیں۔“ میں نے خود کلامی کی۔ ”محبت کا روگ لگا بیٹھے ہیں اختر میاں۔ دکھ دل سے ساز بجائیں گے تو ایسی ہی ذہنیں نکلیں گی۔“ ”خوب ہمیں بھی شک تھا کہ یہ محبت میں ناکامی والا ہی معاملہ ہوگا۔“ اپنے اندازے کی درستی پر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

”بعض لوگوں کے ہاتھوں میں محبت کی لکیر ہی نہیں ہوتی۔ اختر میاں بھی ایسے ہی شخص ہیں۔“ بلتر نے گہری سانس لیتے ہوئے خود کلامی کی۔ ”آپ کیا جانتے ہیں اختر صاحب کے متعلق؟“ ہمیں فطری تجسس ہوا۔

”کیا بتائیں میاں، بہت بھلے مانس شخص ہیں اختر احمد! نیک طبیعت، شریف النفس اور خاموش طبع، بھری دنیا میں بالکل اکیلے ہیں۔ والدین بچپن میں ایک حادثے میں جدا ہو گئے لیکن اتنے دکھوں نے اختر میاں کا دل گداز کر دیا۔ ایسے شخص کا ساتھ ٹھکر کر صوفیہ بی بی بچھتا میں گی۔ یہ تو ان کا دامن محبتوں سے بھر دیتے۔ ایسے پر خلوص، نیک دل اور بے ریا آدمی اب کہاں پائے جاتے ہیں۔“

”کون صوفیہ بی بی؟“ ہم نے بلتر کی بات تیزی سے کٹے۔ وہ جواباً ہماری لاعلمی پر طنزیہ سے انداز میں

مسکرائے۔

”صوفیہ بی بی جو اپنے بیلو میاں کو ریاضی پڑھاتی ہیں۔ اختر میاں کی کزن ہیں۔ اختر میاں ان ہی کے ہاں ہیں۔ بڑھ کر جوان ہوئے۔ بے چارے کب سے صوفیہ بی بی کی خاموش محبت سینے میں چھپائے اظہار کے لیے مناسب وقت کا انتظار کرتے رہے اور کوئی دوسرا موقع سے فائدہ اٹھا گیا۔“ بلتر عبد الکریم کا لہجہ طنز اور کٹنی سے بھر پور تھا۔ ہم قصور وار نہ ہوتے ہوئے بھی چور سے بن گئے۔

”کہیں آپ کا اشارہ سیفی کی جانب تو نہیں؟“ ہم نے دبے دبے لہجے میں استفسار کیا۔

”چھوٹی بے صاحب، چھوٹا منہ بڑی بات، آپ لوگ نواب صاحب کے مہمان ہیں اور مہمانوں کا اکرام، ہم پر واجب ہے۔ وہ تو اختر میاں میرے بیٹے کے دوست ہیں اور مجھے بھی اپنے بیٹوں کی طرح عزیز ہیں بس اسی لیے ان کے دکھ پر دل بھر آیا۔ ورنہ جو کچھ ان کے ساتھ ہوا وہ انہونی بات تو نہیں۔ دنیا صاف شفاف اور بے ریا دل میں جھانکنے کا تردد کب کرتی ہے۔ ظاہری شخصیت کی چکا چوند پر ہی مرثی ہے اور صوفیہ بی بی بھی تو آخر اسی دنیا کا حصہ ہیں۔“

”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے عبد الکریم! سیفی اور صوفیہ میں محض بے ضرر سی بے تکلفی ہے۔ سیفی یہاں سے چلے جائیں گے تو یہ دوستی بھی قصہ پارسی بن جائے گی۔“ ہم نے ان کی تشفی کے لیے یقین دہانی کر دی۔

”غلط فہمی مجھے نہیں آپ کو ہے۔ آپ کے سیفی صاحب کو آج کل صوفیہ بی بی کے ہاں مکتہ دامادوں والا پروٹوکول مل رہا ہے۔ جانے کیا کچھ وعدے وعید ہو چکے ہیں دونوں کے درمیان۔“

بلتر عبد الکریم نے گویا ہماری معلومات میں اضافہ کیا۔ ہم گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ سیفی کی دل لگی کسی کی دل کی بربادی کا سبب بن رہی تھی اور یہ ہمیں ہرگز گوارا نہ تھا۔ عبد الکریم چلے بھی گئے۔ مگر ہم ہنوز اسی پوزیشن میں بیٹھے سیفی کی توجہ صوفیہ سے ہٹانے

کے لیے کوئی ترکیب سوچتے رہے اور ہم اپنے خیالوں میں اتنے گمن تھے کہ سیفی کی آمد کا پتا بھی نہ چلا وہ تو جب انہوں نے ایک شوخ گانے کی دھن پر سیٹی بجانا شروع کی تو ہم چونک کر ان کی جانب متوجہ ہوئے۔ وہ بہت خوشگوار موڈ میں تھے۔

”چلی گئیں مس صوفیہ؟“ ہم نے سرسری سے لہجے میں دریافت کیا۔

”ہاں ابھی ابھی گئی ہیں۔ ویسے کیا حسین خاتون ہیں۔ بلکہ ان کی شخصیت حسن اور نہایت کا خوب صورت امتزاج ہے۔ باتیں کرتے ہوئے وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا۔“ سیفی کے کہنے پر ہم مسکرائے۔

”زہین تو یقیناً ہوں گی اور شاید خوب صورت بھی مگر حسین کتنا زیادتی ہو گا۔“

”تم نے صوفیہ کو غور سے نہیں دیکھا اس لیے یہ کہہ رہے ہو۔“ سیفی نے بھی جیسے ہمارا مذاق اڑایا تھا۔

”ہم نے تو مس صوفیہ کو غور سے دیکھا ہے لیکن شاید آپ نے زہرہ جیوں کو نہیں دیکھا۔ آپ انہیں دیکھتے تو پتا چلتا کہ حسن کس چیز کا نام ہے اور واقعی حسین شخصیت کھلانے کا مستحق ہے۔“

”کون زہرہ جیوں؟“ سیفی کے کان یکدم کھڑے ہوئے تھے۔

زہرہ جیوں، صولت پھوپھو کی نند کی صاحب زادی لیکن آپ کو وہ کہاں یاد ہوں گی۔ آپ نے تو شاید انہیں ایک آدھ بار پچھن میں ہی دیکھا ہو گا۔“

”تو تم نے کب اور کہاں دیکھ لیا؟“ سیفی نے تیزی سے میری بات کالی۔

”ہم آپ کو بتانا بھول گئے تھے۔ زہرہ جیوں آج کل اپنی والدہ کے ساتھ ہمارے گھر رہنے آئی ہوئی ہیں۔ جس روز آپ یہاں پہنچے تھے اس سے اگلے دن ہی تو وہ پہنچی تھیں۔ ہم ہی انہیں اسٹیشن سے لے کر آئے تھے۔ خوب صورتی، نزاکت اور نفاست ختم ہے زہرہ جیوں پر، ہم تو انہیں دیکھ کر اتنے مرعوب ہو گئے کہ

مخاطب کرنے کی جرات ہی نہ کر سکے ورنہ ہم بہت ہنس کھ پائی ہے انہوں نے۔ چند گھنٹوں میں سب گھر والوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔“

”تم سے گاڈوی اور چند شخص نے ان سے کہا ہو کر کرنا بھی کیا تھا۔“ سیفی نے ہمارا دستبردار ہونے کا قطعاً برائہ مانا۔

”البتہ ان کی والدہ ہمارے ساتھ بہت شفقت پیش آئیں۔ امی جان سے ہماری فرماں برداری خوب تعریف کی۔ ہم دو تین بار انہیں اور زہرہ جیوں لے کر بازار گئے تھے۔ کسی شادی کے لیے خرید کرنا بھی انہیں اور آپ کو تو پتا ہے گھر میں کوئی کماں ڈرائیونگ کے فرائض ہمیں ہی انجام دینا پڑتا تھا۔“

”تم شکل سے لکتے بھی تو ڈرائیور ہی ہو۔“

”چھپا چھوڑے اس ذکر کو۔ آپ یہ بتائیے کہ صوفیہ سے آج کی نشست میں کیا باتیں ہوئیں۔ تو تھوڑی دیر میں پڑھ کر آگئے تھے۔ آپ مس صوفیہ کے ساتھ بہت دیر تک بیٹھے رہے۔ ان کے قدموں کی گونج یہاں تک سنائی دے رہی تھی کہ کوئی دلچسپ موضوع چھیڑا ہو گا آپ نے۔“

زیر لب مسکراتے ہوئے انہیں مخاطب کیا۔

”ہاں پتا نہیں کیا بات تھی۔ ویسے صوفیہ قہقہے بہت بلند لگاتی ہے۔ ہم بھی ان کے قہقہوں پر مزہ ہورہے تھے لیکن مروت کے مارے ٹوٹ سکے۔“

”نہ صرف قہقہے بلند لگاتی ہیں بلکہ ہمیں تو آواز بھی بہت چبھتی ہے عجیب سی کڑھکی سے آواز میں۔ ہم اسی لیے تو آپ کی محفل میں محفل ہوتے۔ سماعت کو ایسی کراہی آواز ناگوار گزرتی ہے ایک زہرہ جیوں ہیں کیا نغمہ سنی پائی جاتی ہے آواز میں۔“ ہمیں پھر زہرہ جیوں کی یاد سنائی تھی۔

”چھپا تم یہ بتاؤ رات کے کھانے کے لیے خانہ کو کیا ہدایت دی ہیں۔ ہمیں بہت بھوک لگی ہے۔“

سیفی نے یکدم موضوع بدلا، ہم نے بھی فی الحال تھوڑے بہت جانا اور سیفی کی بات کا جواب دینے لگے۔

سیفی کی بات کا ہمیں بخوبی اندازہ تھا۔ انہوں نے بہت ہرجالی طبیعت پائی تھی اور ہمیں ان کی اسی فطرت کا فائدہ اٹھانا تھا۔ اگلے دو دن تک ہم گاہے گاہے زہرہ جیوں کا ذکر کر کے ان کے آتش شوق کو بجھاتے رہے اور اب ان کی مس صوفیہ سے دلچسپی کم ہوتے ہوتے نہ ہونے کے برابر رہ گئی لیکن اب مسئلہ یہ تھا کہ وہ کب چھوڑنا چاہتے تھے مگر کب انہیں چھوڑنے پر تیار نہ تھا۔ انہوں نے کبھی مس صوفیہ کی زلفوں کی تعریف کی تھی اور اب مس صوفیہ انہیں عمر بھر کے لیے اپنی زلفوں کا اسیر بنانا چاہتی تھیں۔ چند

دندے جو سیفی انجانے میں ان سے کر بیٹھے تھے اب ان کی جان کا عذاب بن گئے تھے۔ سیفی کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ صوفیہ سے جان کیسے چھڑائیں۔ اور سے ہم وقتاً فوقتاً انہیں اپنی واپسی کا مزہ سناتے رہتے۔

”ہمارا یہاں بالکل جی نہیں لگ رہا۔ ہم آج شام کی ٹرین سے واپس جا رہے ہیں۔“

اور یہ سنتے ہی سیفی کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ ہرگز نہ چاہتے تھے کہ ہم اکیلے گھر واپس جا کر زہرہ جیوں یا ان کی والدہ کو متاثر کر دیں۔ البتہ اپنی شخصیت پر انہیں خاصا زعم تھا کہ ان کی موجودگی میں وہاں ہماری دال نہیں گلے گی۔ اسی لیے وہ ہر ممکن طریقے سے ہمیں روکنا اور صوفیہ صاحبہ سے جان چھڑانا چاہ رہے تھے، کیونکہ نواب صاحب کی واپسی تک وہاں رکنا ان کی مجبوری تھی۔

اس ساری صورتحال کا نتیجہ ان پر طاری شدید ترین جھنجھلاہٹ کی صورت میں نکل رہا تھا اور ہم تھے کہ ساری صورتحال سے خوب لطف اٹھا رہے تھے۔ اس روز بھی جب مس صوفیہ پیلو کو پڑھانے آئیں تو سیفی ان سے ملنے کے بجائے اندر ہی بیٹھے رہے۔

ذرا دیر بعد مس صوفیہ پیلو کی معیت میں خراہاں خراہاں اندر تشریف لے آئیں۔ ہم ساتھ والے کمرے میں کھڑکی کے برے گرا کر بیٹھ گئے تاکہ دونوں کی گفتگو یا آسانی سن سکیں۔

”پیلو بتا رہا تھا کہ آپ کی طبیعت کچھ نامساز ہے۔ کل بھی آپ ہماری آمد کے باوجود اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلے کیا ہوا؟ کیا طبیعت زیادہ نامساز ہے؟“ مس صوفیہ نے انتہا درجے کا فکرمند چہرے پر طاری کرتے ہوئے پوچھا۔

”بس کچھ فلو ہے اور موسمی بخار۔“ سیفی نے تڑھال سے لہجے میں جواب دیا اور پھر ثبوت کے طور پر تین عدد چھینکیں بھی مار دیں۔ مس صوفیہ نے اپنے ننھے سے پرس میں سے رومال نکال کر انہیں تھمایا جو سیفی نے باطل خواستہ تمام لیا اور پھر پیلو کو مخاطب کیا۔

”تم کہاں کھسک رہے ہو جاؤ اپنا بستہ لے کر آؤ۔ آج اچھی طرح بڑھنا ہے۔ ہم فی الحال دوسرے کمرے میں جا کر آرام کر رہے ہیں۔ رات کو تمہارا ٹیسٹ لیں گے۔“

”آج اتوار ہے سفیان بھائی! مس صوفیہ صرف آپ کا حال پوچھنے آئی ہیں۔“ پیلو نے انہیں آگاہ کیا اور مزے سے رنو چکر ہو گئے۔ سیفی انہیں پیچھے سے پکارتے ہی رہ گئے۔ مس صوفیہ انہیں شکوہ گمناں نگاہوں سے گھورنے لگیں اور وہ اس گھورنے میں حق بجانب بھی تھیں کہ پچھلے تین دنوں سے سیفی ان سے کتنی کتراتے تھے۔ سیفی کو ان کی نگاہوں کا احساس ہوا تو کچھ شرمندہ سے ہو گئے۔

”دیکھیں۔ کیا ٹلائف لڑکا ہے فوراً نو دو گیارہ ہو گیا۔“ انہوں نے کھیانی ہنسی بٹھتے ہوئے صوفیہ کو مخاطب کیا۔ وہ اب بھی خاموشی سے انہیں دیکھتی رہیں۔

”یہ نو دو گیارہ ہی کیوں ہوتے ہیں؟ کبھی یہ سننے میں کیوں نہیں آیا کہ آٹھ چار گیارہ ہو گیا۔ ان کی خاموشی سے خائف ہو کر سیفی نے بلاوجہ کاٹکتے اٹھایا۔ ”کیونکہ آٹھ چار گیارہ نہیں ہوتے۔“ وہ اپنی ننھی

سی ناک سکوڑ کر نخوت سے بولیں۔
 ”اوہ سوری! میرا حساب کچھ کمزور ہے۔“ ذرا دیر
 بعد سیفی کی سمجھ میں اپنا ہی جملہ آیا تو مزید شرمندہ
 ہو گئے۔
 ”اور حساب میری کمزوری ہے۔“ وہ کچھ خفگی
 جتاتے ہوئے بولیں۔
 ”یعنی آپ کی اور ہماری شادی نہیں ہو سکتی۔“
 سیفی سے اندرونی خوشی چھپائے نہ چھپی۔
 ”دیکھیے ہونے کو تو ہماری بات چیت بھی نہیں
 ہو سکتی مگر ہو رہی ہے۔“
 ”یعنی؟“ سیفی نے ناک پر پھسلتی عینک کو اپنی جگہ
 پر جما کر تجاہل عارفانہ اختیار کیا۔
 ”یعنی یہ کہ آپ پہلی فرصت میں اپنے والد
 صاحب کو یہاں لے کر آئیں اور میرے والد صاحب
 کے پاس بھیجیں۔“ مس صوفیہ نے بھی اب صاف
 صاف بات کرنے کی ٹھالی تھی۔ سیفی ان سے اتنی دو
 ٹوک بات کی توقع نہیں کر رہے تھے اس لیے بوکھلا کر
 رہ گئے۔
 ”دیکھیں صوفیہ! ہم نے دنیا جہان کے معاملات
 ڈمکس کر لیے لیکن کچھ اہم باتیں ایسی ہیں جو میں
 آپ کو ابھی تک نہیں بتلایا ہوں اور مجھے لگتا ہے کہ
 اب میری کسی مذاق میں کی گئی بات کو زیادہ ہی سیریس
 لے لیتے ہیں۔ حالانکہ ہم دونوں کے درمیان
 محض۔۔۔“
 ”آپ مجھے صرف یہ بتائیے کہ آپ اپنے والد کو
 میرے والد کے پاس کب بھیج رہے ہیں؟“ مس
 صوفیہ نے برہمی سے ان کی بات کاٹی تھی۔
 ”میں اپنے والد کو آپ کے والد کے پاس نہیں بھیج
 سکتا البتہ آپ کے والد کو اپنے والد کے پاس بھیج سکتا
 ہوں اور آپ چونکہ اپنے والد کی واحد وارث ہیں اگر
 مجھے معاف کر بھی دیا تو شاید میں سزائے موت سے تونچ
 جاؤں مگر عمر قید تو کاٹنی پڑے گی۔“
 ”مطلب؟“ صوفیہ اس طویل اور لالچانی بات سن کر
 چکرائی تھیں۔

”مطلب یہ کہ میرے والد دوسرے جہان
 ہیں۔“ سیفی نے قدرے چڑ کر بتایا۔
 ”اوہ بہت افسوس ہوا۔“ انہوں نے زبرد
 تاسف چہرے پر طاری کیا اور ایسا کرنے کی کوشش
 وہ ضرورت سے زیادہ احمق لگیں اتنی احمق کہ
 اپنی ہنسی پر قابو نہ رکھ پائے۔
 ”آپ ہنس کیوں رہے ہیں۔“ وہ ناراض ہو کر
 ”جب بھی ڈیڈی کا ذکر آتا ہے مجھے ہنسی آ
 سکتی ہے۔ دراصل ان کی آخری وصیت تھی کہ بیٹا
 کھلتے زندگی گزارنا۔“ ان کے خطرناک تیوروں
 گھبرا کر سیفی نے مسکراہٹ کو فوری بریک لگا کر
 وجہ گھڑی۔
 ”تو پھر اپنی والدہ کو میرے والد کے پاس بھیج
 وہ تو حیات میں تھیں؟“ انہوں نے اس بار احتیاطاً
 لیا۔ جواباً ”سیفی نے اتنی ٹھنڈی آہ بھری کہ کمر
 درجہ حرارت تک سخت کئی سینٹی گریڈ نیچے گر گیا۔
 ”وہ میری پیدائش سے ڈیڑھ سال قبل ہی دنیا
 پاگئی تھیں۔“ چند منٹوں کی سوگوار خاموشی کے
 انہوں نے رقت بھرے انداز میں بتایا۔
 ”یعنی یعنی آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ کی
 آپ کی پیدائش سے ڈیڑھ برس پہلے وفات
 تھیں۔“ وہ قدرے چپختے ہوئے بولیں تو سیفی کو اندازہ
 ہوا کہ والدہ کی رحلت کی ٹائمنگ میں کتنی خطرناک
 غلطی کا ارتکاب کر چکے ہیں۔
 ”اب آپ یہ کہیں گے کہ آپ کی پیدائش بھی
 بالائے میں ہوئی ہے۔ براہ کرم یہ بھی بتا دیجئے کہ
 شریف آوری کیسے ہوئی۔ پارش کے ساتھ
 شہاب ثاقب کی طرح ٹھاہر کر کے زمین پر گرے۔
 وہ اس قدر غصے میں تھیں کہ سیفی کو ان کے
 کے آس پاس باقاعدہ چنگاریاں پھوٹتی ہوئی نظر آئیں
 ”وہ دراصل والدہ کے انتقال کے بعد مجھے
 اپنی پھوپھی کے ہاں پیدا ہونا پڑا۔“ بہت پہلے کسی
 نگار کا لکھا ہوا فقرہ انہیں بروقت یاد آیا تھا۔
 ”آپ کیا اول فول ہانک رہے ہیں۔“ مس صوفیہ

ہمیں اپنے دوست کی وقتی افسردگی اور پڑمردگی پر افسوس تو ضرور ہے لیکن اس کہانی میں اپنے ادا کیے ہوئے کردار پر کسی قسم کا کوئی پچھتاوا نہیں۔ ہماری نظر میں یہ ہر لحاظ سے ایک بہترین اختتام ہے۔ کیا آپ ایسا نہیں سمجھتے؟

چہ لال بھجو کا ہو رہا تھا۔ ہم نے انہیں دور سے دیکھا اور رنو چکر ہو گئے۔ وہ یقیناً ہماری گردن مروڑنے کے لیے ہماری تلاش میں تھے۔ شاید انہیں پتہ چل گیا تھا کہ یہ دھڑا دھڑ شاپنگ زہرہ جیوں کی شادی خانہ آبادی کی سلسلے میں ہی کی جا رہی ہے۔ اگرچہ بعد میں ہم نے انہیں تین دلائے کی بہت کوشش کی کہ ہم اس بات سے بالکل لاعلم تھے لیکن سینفی ہمارے بارے میں ایک عرصے تک مفلوک ہی رہے۔

زہرہ جیوں اور ان کی والدہ اپنے آبائی شہر سدھار گئی تھیں۔ ہم بھی اپنی ساری غیر سنجیدگی ترک کر کے سنجیدگی سے نوکری تلاش کرنے لگے۔ سنجیدگی تو اب سینفی پر بھی طاری رہنے لگی تھی۔ وہ بیٹھے بیٹھے کھوسے جاتے۔ ہم ان کی دلی کیفیت سمجھ سکتے تھے، ان کے ساتھ نہ خدا ہی ملانہ وصال صنم والا معاملہ درپیش تھا۔ ہر دفعہ حسیناؤں سے جی بھرنے پر وہ انہیں چمکے دے کر جان چھڑاتے تھے۔ اس دفعہ چمکے دیتے دیتے وہ میرے دیے گئے چمکے کا شکار ہو گئے تھے۔

اور ایک شام جب ایک جگہ انٹرویو دے کر ہم گھر لوٹے تو سینفی اپنے کمرے کی بتیاں گل کیے دروازہ بھینٹے بیٹھے تھے۔ گھر والوں نے بتایا کہ ڈاکیا کوئی چٹھی دے گیا ہے، جب سے سینفی کمرے میں ہی بند ہیں۔ اگلی صبح ہم نے ان کی غیر موجودگی میں کمرے کی تلاشی لی تو دروازے سے مس صوفیہ اور آخری آخری شادی کا کارڈ مل گیا۔

ہم کارڈ واپس رکھنے ہی لگے تھے کہ مس صوفیہ کے دیے گئے رومال پر نظر پڑ گئی۔ اس رومال پر جا بجا آنسوؤں کے نشانات تھے۔ ہم اپنی جگہ ساکت رہ گئے۔ کیا التواقت گزرنے کے بعد سینفی مس صوفیہ کی محبت میں مبتلا ہو گئے تھے۔ یقین نہ آتا تھا مگر قرآن کی تار ہے تھی۔ ہمیں جو دکھ تو ہوا کیونکہ سینفی سے اس درجے حساسیت کی ہمیں ہرگز توقع نہ تھی لیکن ہمیں قوی امید ہے کہ سینفی بہت جلد اپنے آپ کو سنبھال لیں گے۔ بس کسی اور اچھے سے چہرے کے ملنے کی دیر ہے۔

کروٹے ہیں۔" سینفی نے پھر انٹ شنفٹ رکا۔
"توہ! آپ کی باتیں سن کر میں پاگل ہو گئی ہوں۔ وہ غرائی۔

"سوری میں ایک پاگل سے شادی نہیں کر سکتا۔ سینفی نے کہتے کے ساتھ ہی بھاگ لیتا۔ مناسب سمجھا اور مس صوفیہ ناقابل یقین نگاہوں سے کمرے کے چلتے ہوئے پردے کو دیکھتی رہیں پھر انتہائی کھچے تھکے انداز میں انہیں اور خاموشی سے اٹھ کر چل پڑیں۔ اسی لمحے آخری آخر بھی پانوں کی کلاس لے کر باہر نکلے تھے۔ ہم کمرے کی کھڑکی میں کھڑے ہو کر دونوں کو جاتا دیکھتے رہے۔ چند قدم کا فاصلہ طے کر کے آخر صوفیہ کے ہم قدم ہو گئے تھے۔ چند مزید قدم طے کرنے کے بعد انہوں نے اپنا رومال صوفیہ کو پیش کیا تھا۔ شاید وہ رو رہی تھیں اور اس سے پیشتر وہ اگلے مرحلے میں اپنا کندھا بھی انہیں پیش کرتے، ہم نے کھڑکی کے پٹ بند کر دیے۔

اگلے دن نواب صاحب کی واپسی متوقع تھی لیکن ہم ان کا انتظار کیے بغیر ہی اپنے شہر روانہ ہو گئے۔ گھر پہنچنے کی بے تالی ہم سے بھی زیادہ سینفی کو تھی۔ وہ جلد از جلد زہرہ جیوں سے مل کر ہمارے بیان کی صداقت کو برکھنا چاہ رہے تھے اور جب سینفی نے زہرہ جیوں کو دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے۔ وہ بلاشبہ بلا کی حسین تھیں۔ سینفی کے مطابق ہم نے ان کا حلیہ کھینچنے میں مبالغے کے بجائے کسرتی سے کام لیا تھا۔ سینفی ان پر دل و جان سے فدا ہو گئے تھے۔

زہرہ جیوں اور ان کی والدہ کی شاپنگ کا سلسلہ ہمارے جانے کے بعد ٹھپ پڑا تھا اور سچ تو یہ تھا کہ اس جبری ڈرائیونگ کے باعث ہی ہم سینفی کے پیچھے نواب صاحب کی جاگیر کو بھاگے تھے لیکن اب ہماری واپسی پر گھر کے بنوں نے دوبارہ ڈرائیونگ کی ذمہ داری ہمیں سونپنا چاہی جو سینفی نے ازراہ ہمدردی اپنے سر لے لیں۔

اگلے دن صبح سے شام تک سینفی انہیں شاپنگ کروانے میں ہلکان ہوتے رہے۔ شام کو وہ گھر لوٹے تو

غصہ اب جھنجلاہٹ میں بدل رہا تھا۔
"دراصل میری پھوپھی کے سات بیٹے ہیں سب سے آخری والا میں ہوں۔ انہوں نے اپنے بھائی یعنی میرے والد کی بے رونق زندگی کا خیال کر کے مجھے ان کی گود میں ڈال دیا۔" اب سینفی کا اعتماد بحال ہو رہا تھا۔
"تو آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ آپ کی حقیقی والدہ حیات ہیں۔" مس صوفیہ کو اس سارے قصے میں واحد کام کی بات یہی پتا چل سکی۔

"لیکن میں انہیں اپنی پھوپھی ہی سمجھتا ہوں۔" وہ دوبارہ دفاعی پوزیشن پر آکھڑے ہوئے، سو ہکلاتے ہوئے وضاحت دی۔

"بس پھر آپ اس سٹڈے کو انہی والدہ آئی میں اپنی پھوپھی کو ہمارے ہاں لے کر آ رہے ہیں، ہم اکٹھے ڈنر کریں گے۔" مس صوفیہ فیصلہ کن انداز میں بولیں۔
"ڈنر تو ہم اکٹھے کر لیں گے۔" سینفی کو ان کا خانہ ماں یاد آیا تو فوراً "سر ہلا دیا۔" لیکن میری پھوپھی آپ کے ہاں آکر وہ والی بات ہرگز نہیں کریں گی۔ یہ میں آپ کو پیشگی بتا رہا ہوں۔"

"کون سی والی بات؟" مس صوفیہ نے ابرو چڑھائے۔

"آپ کی اور ہماری شادی والی بات۔"
"آخر کیوں؟" وہ چیخ پڑیں سینفی تصور میں ان کے ہاتھ اپنی گردن سے چند انچ کے فاصلے پر دیکھ سکتے تھے۔
"کیونکہ وہ میری شادی اپنی بیٹی سے کرنا چاہتی ہیں۔" وہ اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے ہکلائے۔
"آپ کی شادی اپنی بیٹی سے؟ ان کی بیٹی آپ کی بہن ہوئی۔" وہ چپا چپا کر بولیں۔

"نہیں آپ غلط سمجھیں۔" درااصل ان کی اپنی کوئی بیٹی نہیں۔ انہوں نے بیٹی کی کمی پوری کرنے کے لیے اپنے دیور کی بیٹی گود لی ہوئی ہے۔" سینفی کا ذہن بہت تیزی سے چل رہا تھا۔

"آخر آپ کے خاندان میں اتنے بچے گود کیوں لیے جاتے ہیں۔" وہ جھنجلائی۔
"کیونکہ وہ گود سے اترتے ہی شرارتیں شروع

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنفہ	قیمت
زندگی ایک روشنی	رخسانہ نگار عدنان	500/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رخسانہ نگار عدنان	200/-
شہر دل کے دروازے	شازیہ چودھری	400/-
تیرے نام کی شہرت	شازیہ چودھری	200/-
دل ایک شہر جنوں	آسیہ مرزا	450/-
آئینوں کا شہر	فاخرہ انصار	450/-
پھلاں دے رنگ کالے	فاخرہ انصار	200/-
میں سے عورت	غزالہ مزین	150/-
دل اُسے ڈھونڈ لایا	آسیہ رزاقی	350/-
بکھرنا جاسیے خواب	آسیہ رزاقی	200/-
خواب درپے	سعدیہ کاشف	150/-
امانت کا چاند	جزیری سعید	200/-
رنگ خوشبو ہوا ہا دل	انشاں آفریدی	450/-
درد کے قاصدے	رضیہ جمیل	400/-
آج سگن پر چاند نہیں	رضیہ جمیل	180/-
درد کی منزل	رضیہ جمیل	200/-

ناول نگاروں کے لئے نئی کتاب ڈاک خرچ - 30/- روپے
نگاروں کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار، کراچی۔
فون نمبر: 2216361

چاندنی کی کہانی

کے بچوں کی بہتات تھی، عبدالغفور صاحب اور کسی معاملے میں خود کفیل ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں، اولاد کے معاملے میں ضرور تھے۔ اور گھروہی برسوں پرانا، سبز رنگ لگا لوہے کا دروازہ، چوں، چال کی آواز سے کھلتا، تو اکھڑی اینٹوں والی نیم تاریک ڈیوڑھی سامنے آجاتی، جہاں برسات میں پانی بھرتا تو اینٹوں کا رستہ بن جاتا، اسی کمکشاں پر چل کر ڈیوڑھی ختم ہوتی تو سامنے صحن، برآمدہ، آگے پیچھے تین کمرے، چھوٹا سا کچن اور ڈیوڑھی کے اختتام پر موجود غسل خانہ، سب

کچھ ایک دم سامنے آجاتا، پلستر اکھڑی، سیلن زد دیواریں، کالی جے پینڈوں والے گھرے، ہر کمرے میں کئی کئی نفوس اور ہر نفس کی زبان پر ایک ہی آواز۔

”ریبا! کپڑے دھل گئے۔“

”ریبا! اپنا کھانا دو۔“

”اسیہ بیٹی، ادائیگی کو کھانسی کی دوا دے دی۔“

”اری ریبا، یہ چھوٹا کیوں رو رہا ہے؟“ چھوٹو کا بھونپو اور کسی کو نے کھدروں سے اماں کی صدا سنیں۔

”ریبا! آج کھانا ملے گا یا بھوکا ہی دکان پر چلا جاؤں۔“ بڑے بھیا چلاتے۔

”تیا، میری اچھی تیا، سختی پر پورے ڈال دو۔“ مننی کندھے پر لٹک کر سختی ناک میں گھسارتی۔

”سارے مل کر تیا کے گلے پہ چھری پھیر دو، اس عید پر قربانی تیا کی کرویتا۔“ اس کی خوش نصیبی تھی یا

بد نصیبی کہ وہ گھر کی بڑی بیٹی تھی اور بڑی بیٹی اس طبقے میں کولہو کا تیل کبھی جاتی ہے، اس سے بڑے

ٹوٹی پھوٹی اینٹوں والی گلی، قطار در قطار مکانوں کا سلسلہ، پکی نالیاں جو اوپر سے بھی ڈھکی ہوئی تھیں، بارش کے دنوں میں بھی زیادہ مسئلہ نہ ہوتا اس گلی میں کوئی خصوصیت تھی تو یہ کہ ہر گھر کے سامنے شہتوت کا ایک درخت ضرور موجود تھا، جہاں اسکول آتے جاتے بچے، کالے، جامنی شہتوت چن چن کر اپنی جو میٹری اور لچ بکس بھر لیتے، کبھی کبھار گلی سنسان دیکھ کر کلج کی لڑکیاں بھی موج میں آجاتیں۔ شہتوت چنتی، بلاوجہ کھلکھلائی جاتیں۔ اسی مناسبت سے یہ گلی شہتوت والی گلی کہلاتی تھی۔

اسی گلی کے عین درمیان میں آمنے سامنے دو گھر تھے، کچھ سال پہلے تک دونوں گھروں کا اندرونی دیرونی نقشہ ایک سا تھا، جب عبدالرحمن مرحوم نے اپنے دو مکان دونوں بیٹوں کے نام کیے اور بڑھتے ہوئے خاندان کے پیش نظر عبدالقدوس سامنے والے گھر میں منتقل ہوئے، تو سال بھر میں گھر کا اندرونی دیرونی حال بدل کر رہ گیا، ٹوٹے پھوٹے دروازے کی جگہ براؤن گیٹ، صحن سے کمروں تک ٹائلیں، جدید اسٹائل کا کچن، دیواروں پر وال گرائی، حالانکہ یہی عبدالقدوس تھے، جو گھر میں خرچہ دیتے، سو سو روٹے روتے، یہ چھپا خزانہ کہاں سے نکلا ہے، کوئی نہ جانتا تھا۔

تبدیلی کا یہ عمل صرف گھر تک محدود نہ رہا، بلکہ دیواریں میں بھی در آیا۔ چنانچہ بے بے نے عبدالغفور کے ساتھ رہنا منظور کیا، جہاں پہلے ہی انواع و اقسام

صرف بھیا تھے، جو سب پر رعب جمانا اپنا پیدائشی حق سمجھتے۔

”اری ربا! ذرا دکھنا، تمہارے ابا گوشت لائے تھے، کہیں کھلی باہری تو نہیں بیخ گئے۔“

اس نے عصر کی نماز پڑھ کر ابھی سلام پھیرا ہی تھا کہ اماں کی وہائی شروع ہو گئی، اس کا کتنا دل چاہتا تھا کہ وہ اللہ میاں سے لمبی لمبی دعائیں مانگے، تیا عبد القدوس جیسا گھر، اسنی بھیا جیسی گاڑی، آبی عافیہ جیسے کپڑے اور کچھ نہیں کونے والی فاطمہ سمیم جیسا لبا خوبصورت محبت کرنے والا شوہر۔ اللہ اتنی ساری دعاؤں میں سے کوئی ایک دعا تو قبول کرے گا ہی، اور اس کی خواہش تھی کہ یہ قبول ہونے والی دعا آخری ہو، مگر اماں کو اس کی لمبی لمبی دعا میں ایک آنکھ نہیں بھاتی تھیں، خواہ مخواہ بے چین ہونے لگتیں۔

”اری بس کر، فرشتے بھی تھک گئے دعائیں لکھتے، اٹھ کر ہانڈی چڑھا، روٹی کی فکر کر، مغرب کے ساتھ سب کو کھانا چاہیے۔“

اب بھی یہی ہوا، اس نے جھنجھلا کر جائے نماز لیٹی اور کچن میں آگنی، ابا نے سنبھال کر تھیلی فرنگ میں رکھی تھی۔

”اب آج گوشت کے گے گا۔“ چھوٹو موٹو صحن میں تاپنے لگے۔ ”میں بڑی بولی لوں گا۔“

”ہاں آیا کہیں کاشاہ رخ خان۔“ وہ پھرتی سے پیاز کاٹنے لگی گوشت دھو کر ککر میں ڈالا، اور ک، لسن، پھیلا، کونا، تھوڑی دیر میں سارے گھر میں ککر کی شوں، شوں ہونے لگی۔

”اور ک، لسن ڈال کر خوب اچھی طرح بھونو، عبد الغفور کے لیے مسالے والی بولی نکال لو۔“ بے بے چنارہ سالے کر کہتیں۔ ”اس سے پانی والی بولی حلق سے نہیں اترتی۔“

”ہاں، اس کو مسالے والی بولی کھلاؤں اور باقیوں کو۔“

”ریوود آوڈال لیٹا، ورنہ پورا نہیں پڑے گا۔“ اماں چمک کر کہتیں تو بے بے کو عصہ آجاتا۔

”سارا دن ہڈیاں گھسائے اور دو بوٹیوں کا حق نہیں۔“

ربا کلاں لپیٹ کر اپنا کام کیے جاتی، اس نے کمرے والے شور بے بھی بنایا اور ابا کے لیے مسالے، تین بوٹیاں بھی الگ کر کے چولہے کے نیچے گھسائیں، گرم مسالے اور ہراو حنیا ڈالا تو خوشبو سارے گھر پھیل گئی، تب ہی بے بے اپنے پنک سے اتر کر ہونے ہوئے چلتی ہوئی کچن میں آئیں۔

”بن گیا سالن؟“ کتے کتے ربا کے ہاتھ سے ڈوٹی لے لی۔ ربا کا دل چاہا کہ بے بے کے ہاتھ سے ڈوٹی چھین لے، انہیں کچھ سخت بنا کر سماں سے جانے پر مجبور کر دے، لیکن وہ مجبور تھی، اپنی مروت بھری طبیعت اور اس محبت کے ہاتھوں جو اسے اپنی بے بے سے تھی، لیکن یہ محبت اس محبت سے کہیں کم تھی، بے بے کو عبد القدوس سے تھی۔

بے بے کو پتا تھا، ربا انہیں گھور رہی ہے، تلو کھا رہی ہے، پھر بھی انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے الماری سے چاندی کی کٹوری نکالی، سالن اس میں ڈالا، پھر تھالی سے ڈھک دیا۔

”کوئی اچھی چیز کچے تو دو سروں کا حصہ بھی نکالنا چاہیے۔“

انہوں نے مخصوص جملہ کہا، ربا کا دل چاہا، وہ انہیں بتائے کہ جن لوگوں کا حصہ وہ نکالتی ہیں، وہ اس سے کہیں اچھا کھاتے ہیں، مگر انہیں کبھی تو متفق نہیں ہوتی کہ ان لوگوں یا کم از کم بے بے کا حصہ ہی نکال دیں، اسے کٹوری لے کر جانا ہی تھا، وہ نہیں چاہتی تھی کہ بے بے وہ سب دیکھیں یا سنیں، جو وہ دیکھتی یا سنتی تھی، وہ یہ کٹوری کسی نیچے کے ہاتھ بھی بھجوا سکتی تھی، مگر وہی ہوتا کہ وہ اگر سب من و عن بے بے سے کہہ جاتا، اور ربا بے بے کے چہرے پر پھیلی مایوسی نہیں دیکھ سکتی تھی۔

”جا عبد القدوس کھانا کھالے گا۔“

اس نے اک طویل سانس لے کر دوپٹہ ٹھیک کیا، کٹوری ہاتھ میں لی۔

”روٹی اگر پکاتی ہوں۔“

ایسا ہمیشہ ہی ہوتا تھا، جب بھی اس گھر میں کوئی اچھی چیز پکتی، بے بے عبد القدوس کا حصہ ضرور نکالتیں، خواہ انہیں اپنا حصہ کیوں نہ دینا پڑے، پچھلے دنوں وہ کھیر لے کر گئی تھی، سب گھر والے ایک جگہ بیٹھے تھے، نقل کا بڑا سا بادل درمیان میں بڑا تھا۔

”چھا کھیر ہے، بے بے تو تاق زحمت کرتی ہیں، بھلا اب یہ کم دودھ اور زیادہ چاولوں والا ملغوبہ کون کھائے گا، تیلیم نے آج فروٹ ٹرا نقل بنایا ہے، بہت مزے کا ہے، تم کھاؤ گی؟“

”جی نہیں۔“ شکر بے کے الفاظ ابھی ربا کے لبوں میں پھڑ پھڑاتے کہ تالی اگلی بات شروع کر دیتیں۔ وہ ہونقوں کی طرح پلیٹ ہاتھ میں لیے ان کی شکلیں دیکھ رہی ہوتی، آخر تیا کو مروت بھانا یا یاد آتا۔

”ہاں، ہاں، کچن میں رکھ دو، میں بعد میں کھاؤں گا، آخر میری بے بے نے بھجوائی ہے۔“ حالانکہ ربا کو یقین تھا کہ وہ یہ کھیر کبھی نہیں کھائیں گے۔

”بے بے کو میرا سلام کہنا۔“

گویا اب وہ جاسکتی تھی، وہ پلیٹ کچن میں رکھ کر مرے مرے قدموں سے لوتی۔

”عبد القدوس نے کھالی۔“ بے بے نے اشتیاق سے پوچھا۔

”جی، مزے سے۔“ اس نے تھوک نکل کر بمشکل کہا تھا، بے بے کی بوڑھی آنکھیں چمکنے لگیں، اسے ٹھنڈی ٹھنڈی نقل یاد آئی، کیا بے بے چند نیچے کی حق دار بھی نہ تھیں۔

وہ کچی عبور کر کے سامنے والے گھر کے گیٹ پر کھڑی تھی۔

اور اس سے پچھلے پختے جب وہ آلو قیمہ کا سالن لے کر گئی تھی، تو سب کے ایف۔ سی جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

آج دروازہ احسن نے کھولا۔ ”ربا آبی آئی ہیں۔“ کتابا ہری بھاگ گیا، وہ اندر آتے ہی چکر آگئی، کچن میں خاصا رش تھا، انواع و اقسام کی خوشبوئیں۔

سارے گھر میں چکراری تھیں۔ وہ کچن کے دروازے میں ششدر رہی کھڑی تھی، کڑاہی میں مچھلی شوں، شوں کر رہی تھی، تو توے پر کباب فرمائی ہو رہے تھے، مختلف اقسام کے سلاہ بن رہے تھے، بڑے بڑے پیٹلوں میں کیا تھا، وہ بنا ڈھکن اٹھائے بنا سکتی تھی، بریانی، کڑاہی گوشت، گونٹے۔

اپنی کم مائیگی کے احساس سے ربا کی آنکھیں بھر آئیں، ہاتھ میں وہ کٹوری لرز گئی، جس میں شور بے میں دو بوٹیاں اور چند آلو ڈوبے تھے۔

یہ ان کے گھر کا اچھا کھانا تھا۔

”ای، ایہ لیس آکس کم اور رس ملانی، یہ پیسی کے خار لیٹر بیک، اب اگر کچھ منگوانا ہو تو احسن کو بھیجے گا، کیسی ہو ربا؟“

اسنی بھیا نے سالن حفسہ کے ہاتھ میں تھمایا اور بنا اس سے جواب لیے واپس مڑ گئے، تالی نے اسے یوں دیکھا، جیسے کہتی ہوں۔

”تم پھر آگئیں۔“

اس نے جلدی سے کٹوری میز پر رکھ دی۔

”بے بے سے کہو۔ خواہ مخواہ زحمت مت کریں، کوئی کھانا تو ہے نہیں۔“ تیا تو تھے نہیں، سوانہوں نے آرام سے کہہ دیا، وہ بس اثبات میں سر ہلا کر مڑ گئی۔

”مکن سویاں لینے کی عادت ہے، کسی نہ کسی ہمانے بھیج دیتی ہیں۔“ ان کی بڑبڑاہٹ ربا نے پوری طرح سنی۔ ”پتا چل گیا ہو گا کہ آج میرے میکے کی دعوت ہے۔“

”اب اس فقیروں والے سالن کا کیا کرنا ہے؟“

ربا کے قدم دانستہ آہستہ ہوئے، سماعتیں چوکنا ہو گئیں۔

”کسی فقیر کو دے دینا یا نوکرانی کو۔“

”ہو نہ ہو۔ ایسا کھانا تو نوکرانی بھی نہ کھائے۔“

چاندی کی کٹوری پختی گئی۔ اریبہ بھاتی ہوئی گھر کا دروازہ عبور کر گئی، جکے سے آکر کچن میں پیڑے بنانے لگی، شور بے والے گوشت کی خوشبو نے سب کی بھوک جگا دی، لیکن اریبہ کی بھوک نجانے کیوں مر گئی تھی، اس

کے پیچھے ہلکی سی کھٹ پٹ ہوئی۔
”ریو! عبد القدوس نے کھانا کھالیا۔“ لرزتی ہوئی
آواز آئی۔

”جی بے بے بہت شوق سے۔“ اس نے سرخ بدل
لیا، آنسو اک تو اتر سے گالوں پر بہنے لگے تھے۔



سنی پتا نہیں کیسے سیڑھیوں سے پھسل گیا، اس کی
چینوں نے سارے گھر کو ہلا دیا، سب ہی کھانا کھا رہے
تھے، سنی ان کی بہن کا بیٹا تھا، بلا کا شرارتی، اچھی بھلی
دعوت چل رہی تھی، سب کی تعریفیں سن سن کر دل
شاہو ہو رہا تھا، اگرچہ کھانا تو لڑکیاں بھی بنا سکتی تھیں، مگر جو
ذائقہ خود ان کے ہاتھ میں تھا، وہ بیٹیوں میں نہ آیا، سو
شارجہ سے آئے بہن اور بہنوئی کی دعوت میں انہوں
نے زیادہ چیزیں خود ہی بنائیں، اسی شہر میں موجود اپنے
دیگر بہن بھائیوں کو بلاتے ہوئے انہیں ایک بار بھی
خیال نہ آیا کہ سامنے والے گھر میں بھی بلاوا بھجوا
دیں۔ جب یہ خیال عبد القدوس کو نہ آیا تو انہیں کیا

ضرورت تھی، سنی ماڈل ٹاؤن والی بہن کا سب سے
چھوٹا لڑکا تھا۔

”مجھے تو لگتا ہے، ٹخنہ اتر گیا ہے۔“ بچے کی چینوں
سے یہی لگ رہا تھا، اسنی نے جلدی سے گاڑی نکالی،
بہن کی نسلی کے لیے وہ بھی ساتھ بیٹھ گئیں۔ ڈاکٹر کے
پاس لے جانے اور ٹریٹ منٹ میں خاصی رات
ہو گئی۔

اسنی، ہمیں تو اب گھر ہی اتار دو۔“ بہن نے کہا تو
انہیں ماڈل ٹاؤن ڈراپ کر کے رات گئے گھر لوٹے،
اسنی مردوں کے ساتھ ہی کھانا کھا چکا تھا، جبکہ انہوں
نے صرف پکایا ہی پکایا تھا، اس وقت مارے بھوک کے
پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے، سرالگ چکرا رہا تھا،
سب مہمان کھاپی کر بڑے کمرے میں جمع تھے، آکس
کریم اور چائے کا دور چل رہا تھا۔

”سب نے کھانا ڈھنگ سے کھالیا۔“ انہوں نے
تھکے تھکے لہجے میں حفسہ سے پوچھا، جو کچن سمیٹ

رہی تھی۔
”جی، کھالیا، توبہ امی! آپ کے میکے والے
کھاتے ہیں، سب جیٹ کر گئے، ایسا لگتا تھا، زندگی میں
پہلی اور آخری دعوت کھا رہے ہیں۔“
”بگو اس مت کرو، اور کھانا دو، اب تو سر میں
شروع ہو گیا ہے۔“ وہ وہیں ٹیبل پر بیٹھ گئیں۔
”ارے آپ نے کھانا نہیں کھایا تھا۔“ وہ چونک کر

مڑی۔
”مہمانوں کو کھلاتی یا خود کھانے بیٹھ جاتی۔“ انہوں
نے چڑ کر کہا۔

”اب تو سب ختم ہو گیا، جو تھوڑا بہت بچا میں نے
رضیہ کو دے دیا، سارا دن کام کرواتی رہی، کہہ رہی تھی
گھر میں بچے بھوکے ہیں۔“
”ہیں، سب کا سب مچھلی، چاول، گوشت۔“ وہ
فریج کی طرف لپکیں۔

”شکر کریں، پورا ہو گیا، بے عزتی نہیں ہوئی، فریج
میں انڈے بڑے ہیں، وہ بنا دیتی ہوں۔“ حفسہ
نجانے کس کے لیے چائے لے کر باہر نکل گئی،
اوندھے سیدھے بڑے خالی قیلے، بھائیں، بھائیں کرنا
فریج، چھوڑی ہوئی ہڈیاں، مچھلی کے کانٹے، روٹی کے
ٹکڑے۔

”کبجنت، کینے، سب کے سب خود غرض، ماں پکا
پکا کر پھاوی ہو گئی، انہیں اتنا خیال نہ آیا کہ میرے لیے
کھانا بھی رکھنا ہے۔ سب ٹھونس ٹھانس گئے۔“ ان
کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ ہائے وہ کراری مچھلی،
خوشبودار بریانی، کینوں نے ایک کباب بھی نہ چھوڑا۔
ہاٹ پائٹ میں ایک ڈیڑھ روٹی پڑی تھی۔

”بگ ہا چار کے ساتھ ہی کھانوں۔ پیتلیوں میں پانی
ڈال دیا تھا، ورنہ لگا لگا کر ہی کھالیتی، تب ہی آنسوؤں کی
دھند کے پار کارنس پر بڑی چاندی کی کٹوری دکھائی دی،
انہوں نے لپک کر اٹھائی، سالن موجود تھا، دھنیے اور
گرم مسالے کی خوشبو سے پیٹ میں دوڑتے چوہے
دھالیں ڈالنے لگے، انہوں نے کٹوری سامنے کی اور
مزے سے شور بے میں روٹی ڈبو ڈبو کر کھانے لگیں۔



نیگہت بیگم

پل صراط

صراط سے نہ گزرتا پڑتا۔ سوچتا ہوں میرے ساتھ
انہوں نے اچھا نہیں کیا یا پھر شاید اچھا کیا۔
لیکن جس راستے پر وہ مجھے ڈال گئے ہیں۔ وہ بڑا
مشکل راستہ ہے۔ پل صراط۔
پل صراط کیا ہے پل سے زیادہ باریک اور تلوار سے
زیادہ تیز اور اس پل کو عبور کر کے ہی جنت میں جلیا
جاسکے گا۔

دادی کہتی تھیں ”اس کے نیچے آگ دکھتی ہوگی۔
جنہم کی آگ اور گناہ گار اس پل صراط کو پار نہ کر سکیں
گے اور آگ میں گر جائیں گے اور نیک لوگ آرام

اور یہ میں ہوں اسید عبدالرحمن میں اپنی کہانی
کہاں سے شروع کروں میری سمجھ نہیں آ رہا۔ وہاں
سے جب میں نے اس دنیا میں آنکھ کھولی تھی یا وہاں
سے جب میرا دل پہلی بار آمنہ کے نام پر دھڑکا
تھایا وہاں سے جب وہ میری زندگی میں داخل ہوئے
تھے وہ جو میرے کوئی نہیں تھے بلکہ جو میری زندگی کا
اہم سنگ میل تھے۔

”کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کاش وہ مجھے نہ ملے
ہوتے تو میری زندگی بہت آسان ہوتی۔ میں ایک عام
آدمی کی طرح زندگی گزار کر چلا جاتا۔ یوں ہر لمحہ پل

مکمل ناول



سے پل پار کر جائیں گے اور میرا چھوٹا بھائی کتا تھا کہ ”داوی اجو لوگ قربانی دیتے ہیں وہ تو اپنے اپنے قربانی کے جانوروں پر بیٹھ کر پل صراط پار کر لیں گے۔“ ”جھلا نہ ہو تو۔“ داوی ہنس پڑتی تھیں۔ ”پلے میں کوئی عمل نہ ہو تو خالی خولی قربانی کے جانور کس کام کے۔“

لیکن یہ پل صراط جو پل سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے اگر دنیا میں ہی اس سے واسطہ پڑ جائے تو آدمی کیا کرے۔ ہر لمحہ یوں لگے جیسے آدمی تے ہوئے رستے پر چل رہا ہو میں بھی اس پل صراط سے گزر رہا ہوں مسلسل چھ سال سے اور ہر لمحہ یہ خوف کہ ذرا سی بے احتیاطی ذرا سی لغزش نیچے آگ کے دہکتے گڑھے میں گرا دے گی اور اس خوف کی کیفیت میں زندگی گزارنا کیسا ہے؟ کوئی مجھ سے پوچھے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب ان کی وجہ سے ہے۔ آفتاب حسین کی وجہ سے۔ جب تک وہ میری زندگی میں نہیں آئے تھے میری زندگی بہت سکون اور آرام سے گزر رہی تھی اور آئندہ بھی گزرتی رہتی ایسے ہی جیسے میرے جیسے ہر متوسط گھرانے کے لڑکے کی گزرتی ہے۔

میں اسید عبدالرحمن نے ایک متوسط گھرانے میں جنم لیا۔ میرے والد محکمہ زراعت میں کلرک تھے جبکہ میرے دادا پرانمری اسکول ٹیچر تھے اور جب میں نے ہوش سنبھالا تو وہ ریٹائر ہو چکے تھے۔ شاید اس لیے میرا بچپن اور لڑکھن ابا کے بجائے دادا کی نگرانی میں زیادہ گزرا۔ میری والدہ بھی جب میرا چھوٹا بھائی چھ سال کا تھا وفات پا گئی تھیں یوں والدہ کی جگہ دادی نے ہماری پرورش کی تھی۔ اور ہم چاروں بھائی ہی دادا دادی کے زیادہ قریب تھے لیکن میں چونکہ بڑا تھا۔ اس لیے دادا کی مجھ پر خصوصی توجہ تھی اور میں خود بھی دادا کی ذہانت سے متاثر تھا۔ دادا نہ صرف یہ کہ حساب کے سوال منہوں میں کر لیتے تھے بلکہ ان کے پاس بے تحاشا تلخ تھی۔ وہ ہمہ وقت کچھ نہ کچھ پڑھتے رہتے تھے

بڑے کریمے میں تین الماریاں ان کی کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اس لیے جب میں چھوٹا تھا تو سونہ تھا کہ میں دادا کی طرح استاد بنوں گا۔

دادا کے پرانے شاگرد جہاں کہیں بھی دادا سے ملنے کا بے حد احترام کرتے تھے۔ محفل میں ہوتے تو دادا کو دیکھ کر کھڑے ہو جاتے اور مجھے یہ سب بہت اچھا لگتا تھا۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ آدمی کی ترجیحات بدل جاتی ہیں۔ میں بھی جب ذرا بڑا ہوا تو مجھے کتابوں کا چسکہ بڑ گیا۔ شروع میں دادا نے مجھے چھوٹی چھوٹی کہانیوں کی کتابیں پڑھنے کے لیے دیں تاکہ میری اردو اچھی ہو جائے لیکن جب میں ہائی کلاسز میں پہنچا تو دادا نے مجھے اجازت دے دی کہ میں ان کی کتابوں میں سے جو کتاب بھی چاہوں لے کر پڑھ لوں۔ یوں کتابیں میرے لہو میں داخل ہو گئیں۔

دادا کے پاس بے شمار اچھی اعلیٰ پائے کی ادبی کتابیں بھی تھیں۔ جب دادا نے وہ کتابیں خریدی تھیں تو ان کی قیمت بہت کم تھی بڑی بڑی ادبی کتابوں کی قیمت پڑھ کر مجھے ہنسی آتی تھی۔ چار آنے دو آنے مجھے آنے ”غبار خاطر“ ابو الکلام آزاد کی یہ کتاب غالباً میں نے چھٹی جماعت میں پڑھی تھی اور مجھے یاد ہے اس کی قیمت چھ سات آنے ہی تھی۔ میں ہنستا تو دادا سمجھاتے۔

”یار! اس وقت روپے کی قیمت تھی۔ جانتے ہو میری ننھا چالیس روپے ماہوار تھی۔ میں ہر ماہ دس روپے گاؤں اپنی ماں کو خرچ بھیجتا تھا اور تیس روپے میں تمہاری دادا کی کتابیں اور پھوپھی اچھا خاصا گزارا کر لیتے تھے بلکہ ہر ماہ دو تین روپے کی کتابیں خریدنے کی عیاشی بھی کر لیتا تھا۔ دادی کی الماری میں اس زمانے کے مشہور رسالے بھی جلد کیے ہوئے بڑے تھے مثلاً ”ہماہوں“ نیرنگ خیال، ساقی، قوس و قزح اور رسالے ہی نہیں اپنے زمانے میں نکلنے والے ہفت اخبار مثلاً ”اودھ پنچ وغیرہ کی فائلیں بھی موجود تھیں تو یوں یہ کتابیں پڑھتے پڑھتے جب نے میرا

پاس کیا تو میں استاد بننے کا ارادہ موقوف کر چکا تھا۔ اور میں نے سوچا تھا میں یا تو ادیب بنوں گا یا صحافی۔

”ادیب پیدائشی ہوتا ہے میری جان!“ دادا نے میری بات سن کر کہا تھا۔ ”یہاں کسی کانچ یا یونیورسٹی میں ادیب بننے کی تعلیم نہیں دی جاتی۔ ہاں تم ادیب بن سکتے ہو انگریزی ادب، اردو ادب، فارسی ادب، تعلیم تمہاری صلاحیتوں کو بالمش ضرور کر دے گی لیکن ہمیں ادیب نہیں بنانا سکے گی اگر تمہارے اندر پہلے سے ہی ٹیلنٹ موجود نہیں ہے۔ تم صحافت پڑھ لو۔“ انہوں نے مشورہ دیا۔

”تو ٹھیک ہے میں جر ٹلزم لوں گا۔“ میں نے سوچ لیا تھا حالانکہ ابا چاہتے تھے کہ میں ڈاکٹریا انجینئر بنوں اور انہوں نے اس سلسلے میں تھوڑی سی جذباتی بلیک میلنگ سے بھی کام لیا یعنی یہ کہ تمہاری مرحومہ ماں کی خواہش تھی۔ ممکن تھا کہ میں اس جذباتی بلیک میلنگ کا شکار ہو جاؤں گا کہ دادا نے ابا سے کیا۔

”اس کا راستہ نہ رو کو اور اس پر زبردستی نہ کرو۔ اس کا مزاج نہیں ہے سائنس پڑھنے کا۔ تمہارے کہنے پر لے تو لے گا لیکن چل نہ سکے گا۔“

اور ابا نے کبھی دادا کی بات نہیں ٹالی تھی اور یوں میں نے آرٹس لی اور لی اے کے بعد جر ٹلزم میں داخلہ لے لیا۔ زندگی یوں ہی گزر رہی تھی بڑے سکون سے کہ احمر کولڈ کینسر ہو گیا۔ احمر ہمارے ڈپارٹمنٹ کا سب سے ذہین لڑکا تھا اور میرا گہرا دوست۔ احمر میری ہی طرح ایک متوسط گھرانے کا لڑکا تھا لیکن اس کے آدھ بہت بلند تھے۔

وہ اونچے اونچے خواب دیکھتا۔ اس ملک کو بدل دینے کی باتیں کرتا تھا۔ کبھی کبھی میں اس کی باتیں سن کر حیران رہ جاتا تھا۔ پتا نہیں وہ کون سی دنیاؤں کی بات کرتا تھا۔ اس نے اپنی ایک یونیا تخلیق کر رکھی تھی۔ ایک ایسا پاکستان جس کا ہر فرد ریاست سے مخلص تھا۔

جہاں کرپشن نہیں تھی۔ جہاں انصاف تھا۔

میں ساکت سا ہو کر اس کی باتیں سنتا رہتا تھا۔ لیکن پھر وہ اپنی تمام خوب صورت سوچوں اور اعلا اونچے نصب العین کے ساتھ منوں مٹی تلے سو گیا۔ احمر نوید جب بیمار ہوا اور ہمیں پتا چلا کہ اسے بلڈ کینسر ہے تو ہم دوستوں نے اس کے لیے پیسے اکٹھے کرنے کا پروگرام بنایا۔ وہ ذہین، خوب صورت لڑکا ہماری آنکھوں کے سامنے تیزی کے ساتھ موت کے منہ میں جا رہا تھا اور ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اسے موت کے منہ میں جانے سے روک نہیں سکتے تھے لیکن اس کی ازیت کم کر سکتے تھے علاج اور دواؤں سے اسے سکون دے سکتے تھے، کئی لوگوں نے مدد کی۔ کئی لوگوں نے نر خا دیا۔ بہت سے ایسے لوگ بھی ملے جن کے پاس پیسوں کی فراوانی تھی لیکن جن کے دل اتنے تنگ تھے کہ ان کی جیبوں سے ایک روپیہ بھی نہیں نکلا تھا۔ اس روز ”صبح نو“ کے دفتر کے پاس سے گزرتے

ہوئے میں بلا ارادہ ہی اندر چلا گیا تھا۔ میری معلومات کے مطابق اس اخبار کا مالک جرم اور نا انصافی کے خلاف جنگ کر رہا تھا اور ایک مخیر شخص تھا اور پھر جیسا میں نے سنا تھا ویسا ہی پایا۔ میں نہ صرف یہ کہ آفتاب حسین کی شخصیت سے متاثر ہوا بلکہ میں نے اپنے دل میں ان کے لیے بڑی اپنائیت بھی محسوس کی۔ گو میں نے پہلی بار آفتاب حسین کو دیکھا تھا تو سوچا تھا کہ دنیا میں اگر آفتاب حسین جیسے چند لوگ بھی ہوں تو یہ دنیا رہنے کے قابل جگہ ہے۔ میں نے سب ہی دوستوں سے ان کا ذکر کیا حتیٰ کہ احمر کے پاس بیٹھ کر میں نے کتنی ہی بار آفتاب حسین کو سراہا۔ یہ دو تین دن بعد کی بات تھی جب میں نے احمر کے دادا ابو کو بتایا کہ آفتاب حسین نے کہا ہے کہ اگر احمر کو باہر بھجوانا پڑا تو وہ پوری مدد کریں گے۔

”یہ آفتاب حسین کون ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔ اور جب میں نے بتایا ”صبح نو“ کا مالک تو وہ چونک

پڑے۔
 ”حسین احمد کامیٹا۔“
 ”ہاں شاید یہی نام ہے ان کے والد کا۔“ مجھے یاد آیا تھا کہ ”صبح نو“ کے پہلے طے پر مالک کا نام یہی لکھا ہوتا ہے۔
 وہ کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے اضطراب سے پہلو بدلتے ہوئے پھر بے چینی سے پوچھا۔
 ”کیا اس نے بھی تمہاری مدد کی ہے؟“
 ”جی ایک لاکھ کا چیک دیا ہے۔ ابھی ہمارے پاس ہی ہے کل احمر کو ہسپتال میں لے جائیں گے تھراپی کے لیے تو۔۔۔“
 ”نہیں۔“ وہ یکدم کھڑے ہو گئے تھنہ ر قم اسے واپس کر دینا!“
 ”لیکن کیوں دادا جان!“ (احمر کی طرح ہم سب دوست بھی انہیں دادا جان کہنے لگے تھے) ”آپ جانتے ہیں علاج کس قدر منگاہے ایک ایک انجکشن بہت قیمتی ہے۔“
 ”جانتا ہوں پھر بھی آفتاب حسین کی رقم تم واپس کرو۔ میں نے نوید کی وفات کے بعد بہت محنت کی ہے۔ سب کو رزق حلال کھلایا ہے اب اس کے آخری لمحوں میں اس کے خون میں رزق حرام شامل کر لیں۔“
 ان کا انداز حتمی تھا۔
 ”لیکن دادا جان! اور جن جن لوگوں نے مدد کی ہے ان کے متعلق بھی تو ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ رقم جائز ذریعے سے کمائی گئی ہے یا ناجائز۔“ میرے ایک دوست نے کہا تھا۔
 ”آپ صحیح کہتے ہو بیٹا! لیکن میں ان کے متعلق بے خبر ہوں۔ جانتے ہو جتھے میں حرام کی آمیزش نہیں کر سکتا۔“ انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔
 ”حسین احمد میرا ہم جماعت تھا اور ہم ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔ جو شخص اب اس دنیا میں نہیں رہا، میں اس کے متعلق کوئی بات نہیں کروں گا سوائے اس

کے کہ اس نے یہ سب ناجائز طریقوں سے کمایا ہے۔ اور اس کا یہ بیٹا اسی کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ میں حسین احمد کو اتنا جانتا ہوں جتنا شاید آفتاب حسین بھی نہیں جانتا ہوگا۔“
 انہوں نے مزید بات نہیں کی تھی اور اٹھ کر اندر چلے گئے تھے۔
 ”اس وقت اس طرح کی غیرت دکھانا بے وقوفی ہے۔“
 ایک دوست نے تبصرہ کیا تھا۔ تب احمر نے اپنی ہنڈ آکھیں کھولی تھیں۔
 ”مجھے اپنے دادا پر فخر ہے اسید! پلیز جو دادا نے کہا ہے وہی کرو۔“
 دوسروں کی نظر میں وہ بے وقوف ہی سہی لیکن میری نظروں میں ان کا قد بڑھ گیا تھا۔ یہ بڑے حوصلے کی بات تھی۔ اور ایسا ہر کوئی نہیں کر سکتا۔ یہ احمر ہی کر سکتا تھا اس کے دادا جان۔
 آفتاب حسین کا بت میرے اندر ٹوٹ کر کچھ کر چکی ہو گیا۔ یہ بت اگرچہ دو دن پہلے ہی تو میرے اندر بنا تھا لیکن اس کی کڑیوں نے مجھے زخم زخم کر دیا تھا۔ پتا نہیں کیوں۔ دو تین دن تک میں عجیب حزن کی کیفیت میں گھرا رہا پھر احمر کا علاج شروع ہو گیا اور مصروفیت بڑھ گئی۔
 انجکشن تھراپی ایک تکلیف دہ عمل اور زندگی کی امید صفر پھر بھی آدمی آخری سانس تک کوشش تو کرتا ہے۔ سو ہم بھی کر رہے تھے۔ طلباء لکھول کر ڈنیشن دے رہے تھے۔ اور امید تھی کہ ہم احمر کو باہر بھیجا سکیں گے۔
 میں ذرا سنبھلا تو آفتاب حسین کو چیک واپس دینے چلا گیا۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگا جیسے آفتاب حسین کا چہرہ جگہ جگہ سے جھج رہا ہو اور وہ کسی اذیت سے گزر رہے ہوں۔ مجھے خیال گزرا تھا کہ کہیں دادا جان کو غلط

نہیں ہوئی۔ یہ شخص ایسا لگتا تو نہیں ہے۔ میں نے ان کے چہرے سے نظرس ہٹائی تھیں۔ اس سے ان کے چہرے پر بکھر اسوز اور گداز مجھے پکھلا دے رہا تھا۔
 میں تک دم ہی ان کے دفتر سے نکل آیا تھا۔ میں آؤ گیا تھا لیکن مجھے لگا تھا جیسے میں نے ان کے ساتھ زیادتی کر لی ہو۔ میں نے اچھا نہیں کیا۔ ضروری تو نہیں کہ جیسا بھی باپ جیسا ہو۔ اور پھر اس طرح کے لوگ تو پیسے کی ہوس میں جھٹلا رہتے ہیں۔ یہ لوگ تو ایک روپیہ بھی خرچ نہیں کرتے۔
 پھر میں نے آفتاب حسین کے متعلق جاننے کی کوشش شروع کر دی۔
 آفتاب حسین ایک بڑا ادیب ایک سچا کالم نگار کھرا صحافی آفتاب حسین ایم بی اے ایک بلیک میلر دوغلا کسی انڈر گراؤنڈ تنظیم کا بگ باس ان انکشافات نے مجھے گہری اذیت سے دوچار کر دیا۔ بہت دن لگے مجھے خود کو یقین دلانے میں کہ ایسا ہی ہے۔
 یہ دنیا ہے۔ یہاں لوگوں نے ایک چہرے پر کئی چہرے اوڑھ رکھے ہیں۔
 اور میں نے آفتاب حسین کا خیال ذہن سے جھٹک لیا۔ یوں بھی احمر کی طبیعت کافی خراب تھی۔ پہلی تھراپی کے بعد وہ بے حد دیک ہو گیا تھا اور میں یونیورسٹی کے بعد روزی اس کی طرف چلا جاتا تھا۔
 ”کاش میں کچھ دن اور جی سکتا۔“ مرنے سے چند دن پہلے اس نے کہا تھا۔ ”مجھے لگتا ہے میں زیادہ دن دنیا نہ سکوں گا۔“ زندگی کی پھرت اس کی آنکھوں میں شہر کی گئی تھی۔
 ”میرے بعد میرے بابا جان اکیلے ہو جائیں گے اسید! تم کبھی کبھار ان کے پاس آتے رہنا اور کبھی کبھی۔۔۔ لہلہ سے بھی مل لیا کرنا۔“

میں نے بنا کچھ کہے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ مجھے لگا تھا میں آکر بولا تو حلق میں جمخ ہو جانے والے آنسو آنکھوں سے بہہ نکلیں گے۔
 ”میں نے سوچا تھا میں۔۔۔“
 پھر ایک گہری سانس لے کر وہ خاموش ہو گیا۔ میرا ہاتھ اب بھی اس کے ہاتھ پر تھا۔
 ”اسید!“ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ”میرا جی چاہتا ہے میں اپنے سارے خواب تمہیں منتقل کروں۔ تم جانتے تو ہو نا میرے خواب۔“
 میں نے اب بھی بنا بولے اثبات میں سر ہلادیا۔
 ”دعہ کرو اسید عبدالرحمن! ہمیشہ جھوٹ کے ظلم کے نا انصافی کے خلاف جنگ جاری رکھو گے جب قلم اٹھاؤ گے تو اس کی حرمت کبھی نہیں پتھو گے۔ ہمیشہ سچ لکھنا میرے دوست!“
 اس کے سفید ہو جانے والے ہونٹوں پر ایک حسرت بھری مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہو گئی۔
 ”میں نے سوچا تھا کہ میں صحافت کی تاریخ میں ایک نیا باب رقم کروں گا۔ میں اپنے قلم کی طاقت سے ملک کی تاریخ بدل دوں گا۔ تمہارا پوانے کا خواب۔“
 وہ ہولے سے ہنسا تھا ایسی ہیسی جس میں ہزاروں

خواتین ڈائجسٹ
 کی طرف سے
 بہنوں کے لیے ایک اور ناول
تھوڑی دور ساتھ چلو
 آسیہ سلیم قریشی
 قیمت --- / 400 روپے
 منگوانے کا پتہ
 مکتبہ عمران ڈائجسٹ
 37- اردو بازار، کراچی۔

حسرتوں کی کڑیاں تھیں۔
 ”پتا ہے اسید! باباجان اکثر کہتے ہیں۔
 یہ شہادت گمہ الفت میں قدم رکھنا
 لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا“
 اسے اقبال سے عشق تھا اور اسے اقبال کے
 سینکڑوں اردو اور فارسی کے شعریاد تھے اور اکثر وہ ہمیں
 یہ اشعار سناتا رہتا تھا۔ صرف اقبال کے نہیں اور بھی
 شعرا کے شعر۔ آج بڑے دنوں بعد اس نے کوئی شعر
 سنایا تھا۔
 ”سنو“ یہ واقعی مشکل راہ ہے لیکن راہ حق کے
 دیوانے راہ کی صعوبتوں سے ڈرتے نہیں ہیں۔ میں
 سوچتا تھا۔
 میرا ملک
 میرا پاکستان
 اقبال کا خواب
 جناح کی کوششوں کا حاصل
 میں اس کے لیے تن من و مہن و اردوں گا۔ میں ان
 سانچوں بچھوؤں کا سر کچل ڈالوں گا جو اس کی جڑوں کو
 کھوکھلا کر رہے ہیں۔ میں ان سب ملک دشمن لوگوں
 کے خلاف اپنی آخری سانس تک قلم سے جہاد جاری
 رکھوں گا۔ لیکن آہ میں اپنا مشن شروع کرنے سے
 پہلے ہی چھوڑ کر جا رہا ہوں۔“
 پھر وہ کتنی ہی دیر تک مجھے دیکھتا رہا۔ خاموش۔
 چپ چاپ۔ اس کے لب ایک دوسرے سے جڑے
 ہوئے تھے لیکن اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔
 ”سنو اسید! عید الرحمن! عید کرتے ہو کہ میرا
 مشن جاری رکھو گے؟“
 اور میں نے اس کی آنکھوں کی گفتگو سے گھبرا کر
 اس کے ہاتھ پر رکھے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کا دباؤ بڑھا دیا۔
 ”ہاں میں اسید عبد الرحمن وعدہ کرتا ہوں کہ میں
 تمہارا احمر نوید کا خواب پورا کرنے کی کوشش کروں
 گا۔“
 احمر کے ہونٹوں پر بڑی آسودہ سی مسکراہٹ بکھر گئی
 تھی اور آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔

”مجھے لگتا ہے، میں اس بار تھراپی کی اذیت
 برداشت نہ کر پاؤں گا۔“ اس نے آنکھیں بند کیے کیے
 کہا تھا۔
 ”لیکن مجھے یقین ہے تم یہ تکلیف برداشت کر
 گے اور مجھے تو یہ بھی یقین ہے ایک روز ہم دونوں قدم
 سے قدم ملائے اور کندھے سے کندھا جوڑے اس
 مشن کو شروع کریں گے اور ایک دن ان سارے
 سانچوں اور بچھوؤں سے اپنے ملک کو صاف کر دیں
 گے۔“
 وہ بولا نہیں تھا لیکن مجھے لگا تھا جیسے وہ میری خوش فہمی
 پر دل ہی دل میں ہنسا ہو۔
 ”ہاں۔ تم یہ مشن ضرور جاری رکھنا اور سنو۔“ اس
 کی آنکھوں میں یک دم جیسے روشنیاں سی کوندی تھیں
 اور زرد چہرے پر رنگ سے بکھر گئے تھے۔
 ”وہ ہے ناصدف، میری کزن!“
 ”کیا صرف کسی کا نام لینے سے ہی چہرے پر یوں
 رنگ اتر آتے ہیں؟“ میں نے حیران ہو کر اسے دیکھا
 تھا۔
 ”وہ بھی کہتی تھی کہ وہ میرا ساتھ دے گی۔ وہ بھی
 ظلم اور نا انصافی کے خلاف جنگ کرنا چاہتی ہے۔ اسید
 وہ۔“
 اس کی آنکھوں کی روشنیاں ماند پڑ گئیں اور چہرے
 کے رنگ مدھم ہو گئے۔ ”اگر کبھی اپنے مشن کے لیے
 تمہیں کسی مخلص ورکر کی ضرورت پڑے تو اسے اپنے
 ساتھ شامل کر لینا۔ میں نے ایسی بہادر اور چچی لڑکیاں
 ہی دیکھی ہیں۔“
 ”وہ۔ کیا تم اور وہ۔؟“ میں کچھ پوچھتے پوچھتے
 جھجک گیا۔
 ”ہاں۔ لیکن اب کیا فائدہ۔ پتا نہیں کیسے
 برداشت کر پائے گی وہ میری موت کو۔ بہت بچپن میں
 ہی خالہ اور امی کے درمیان یہ طے پا گیا تھا۔“
 ”فار گاڈ سیک احمر! تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔ تم ٹھیک
 ہو جاؤ گے ان شاء اللہ اور پھر دیکھنا، ہم سب نے تم سے
 ٹرسٹ لینی ہے زبردست سی۔ چھپے رستم ہو بتایا تم

نہیں۔ خراب ساری کسر نکال لیں گے۔“



لیکن میرا یقین مجھ پر ہنستا ہی رہ گیا اور وہ چلا گیا۔
 بہت سارے دن میں آپ سیٹ رہا۔ بہت سارے دن
 میں سوچتا رہا اسے سچے کھرے محب وطن لوگ دنیا سے
 چلے جاتے ہیں اور آفتاب حسین جیسے بلیک میل زندہ
 رہتے ہیں۔ کیا تھا اگر احمر نوید کے بجائے آفتاب
 حسین مرتاے۔ میں نے کئی بار سوچا تھا پتا نہیں کیوں
 میں آفتاب حسین کو بھلا نہیں سکا تھا۔ شاید اس لیے
 کہ آگے چل کر انہیں میری زندگی میں ایک اہم کردار
 کرنا تھا۔

احمر نوید۔

اور آفتاب حسین، احمر نوید سے بالکل مختلف۔

ایک رزق حلال پر پلنے والا۔

دوسرا جس کی رگوں میں دوڑتے لہو میں حرام شامل
 تھا لیکن دونوں نے ہی جاتے جاتے مجھے ایک ہی عہد
 میں باندھا تھا۔

قلم کی حرمت برقرار رکھنے کا عہد۔

سچ کے پرچار کا عہد۔

اور میں ان دو بندوں کے عہد سے بندھا چھ سال
 سے پل صراط پر چل رہا ہوں۔

اس روز جب میں چیک واپس کر کے ان کے دفتر
 سے نکل رہا تھا تو میرے وہ ہم دو گمان میں بھی نہیں تھا کہ
 میں کبھی پھر اس شخص سے ملوں گا بلکہ میں زندگی میں
 پھر بھی انہیں دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن ہوا یوں کہ
 وہ بار بار مجھ سے ٹکرانے لگے۔

حتیٰ کہ وہ میرے گھر تک پہنچ گئے۔

بہن کی داوی سے ملنے کا بہانہ۔

بھی اب اور داوی کی خبر سے یہ معلوم کرنے کا جواز۔
 کیوں آخر کیوں وہ یہاں آتے ہیں۔ میں الجھ رہا تھا
 لہذا میرے خاندان کے لوگ ان کے اخلاق کے اسیر
 ہو رہے تھے داوی نے تو جھٹ سے انہیں بیٹا بنا لیا تھا۔
 میرے گھر کے چھ کے چھ فزوان کے اخلاص و محبت

کے گمن گاتے تھے۔

”داوا! کیا آپ کو بھی لگتا ہے کہ آفتاب حسین
 اچھے آدمی ہیں کیا ان کا باطن بھی ان کے ظاہر جیسا
 ہے۔“

”کسی کے باطن کے متعلق ہم کیا کہہ سکتے ہیں
 بیٹا۔ وہ جیسے بھی آدمی ہیں لیکن تمہا نہیں۔ گھر کے ماحول
 اور اپنوں کی محبتوں کو ترسے ہوئے۔ وہ ہم سے کچھ
 طلب نہیں کرتے پھر تم کیوں چاہتے ہو کہ وہ یہاں نہ
 آیا کریں۔ اگر ہماری ذات سے انہیں چند لمحوں کی
 خوشی مل جاتی ہے تو ہمارا کیا جاتا ہے بیٹا! وہ بھی تمہاری
 طرح بچپن میں ہی ماں کی محبت سے محروم ہو گئے
 تھے۔“

داوا مجھے وہ سب بتا رہے تھے جو آفتاب حسین نے
 انہیں اپنے متعلق بتایا تھا۔

میں داوا سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا لیکن انہیں تو
 روک سکتا تھا اور میں نے ایسا ہی کیا۔ مجھے لگا جیسے وہ
 کسی اذیت سے دوچار ہو گئے ہوں۔ ان کا چہرہ ان کی
 آنکھیں سب ظاہر کر رہی تھیں کہ کوئی گہرا درد ان کے
 دل کو چھیل رہا ہو۔ میں نے نظریں چرائیں۔ میں کمزور
 نہیں پڑنا چاہتا تھا حالانکہ میں اندر سے کمزور ہو رہا تھا۔
 وہ مجھے بتا رہے تھے کہ میں ان کے بھائی تایا ب سے
 مشابہ ہوں اور یہ مشابہت انہیں میری طرف کھینچتی
 ہے اور تب میں بے اختیار اس خواہش کا اظہار کر بیٹھا
 جو کبھی کبھی میرے دل کے اس چور حصے سے ابھرتی
 تھی جہاں آفتاب حسین قبضہ جمائے بیٹھے تھے۔

”تپ اس دلدل سے نکل کیوں نہیں آتے سرا!“
 اور انہوں نے بس ایک نظر اٹھا کر مجھے دیکھا تھا۔ کیسی
 بے بسی اور حسرت سی تھی ان نظروں میں کہ میرا دل
 پھسل کر پانی ہونے لگا تھا۔

اس رات میں نے نہ صرف خود ان کے لیے دعا کی
 بلکہ بیٹا اور داوی سے بھی دعا کے لیے کہا اور اب پتا
 نہیں یہ ہماری دعا میں تھیں یا پھر ان کی تقدیر میں پہلے
 سے ہی رقم تھا کہ اپنے آخری دنوں میں وہ اس دلدل
 سے نکل آئیں گے جب انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ اس

دلیل سے نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں تو میں نے حیرت اور خوشی سے ان کی بات سنی تھی۔

ان دنوں میں فری لانسری حیثیت سے مختلف اخباروں میں لکھ رہا تھا۔ میرے کالم اور میرے آرٹیکل دونوں ہی پسند کیے جا رہے تھے۔ اور ایک اخبار کے سنڈے ایڈیشن میں معاشرتی مسائل پر یہ آرٹیکل چھپ رہے تھے، جب مختلف معاشرتی مسائل پر لکھتے لکھتے میں نے منشیات پر لکھنا شروع کیا تھا۔ میں نے گلیوں، قبرستانوں، پارکوں اور ویران زیر تعمیر عمارتوں میں گرے نشے میں دھت سترہ اٹھارہ سالوں کے بچوں کے بارے میں لکھ رہا تھا۔

”وہ منشیات کہاں سے حاصل کرتے ہیں۔ انہیں یہ لت کیسے پڑی؟“ ننھے معصوم بچے کیسے نشے کی عادت میں مبتلا ہوتے ہیں۔

ہر ٹاپک پر لکھنے سے پہلے اس کی اچھی طرح سے تحقیق کرنا تھا اور پھر ایک روز مجھ پر جو انکشاف ہوا، اس نے مجھے اندر تک ہلا کر رکھ دیا۔ مجھے یقین نہیں آیا۔

میں نے آفتاب حسین کی کہانیاں پڑھی تھیں۔ میں نے ان کے آرٹیکل اور کالم لائبریریوں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھے تھے کہ لوگ کہتے تھے کہ میری تحریر میں آفتاب حسین کی تحریر کی سی کاٹ ہے۔ میری لفظوں سے آفتاب حسین جھلکتا ہے۔

لوگوں کی کمزوریوں کو کھوج کر انہیں بلیک میل کرنے والے شخص کو تو میں نے اپنی طرف سے بشری کمزوری کا مارجن دے کر معاف کر دیا تھا لیکن ایک ایسی تنظیم کے پاس کو میں کیسے معاف کر سکتا تھا جو میرے ملک میں زہر پھیلا کر میری نسل کو تباہ کر رہا تھا۔ نہیں میں ان سب چیزوں کو بے نقاب کروں گا۔ میں نے خود سے عہد کیا تھا لیکن اس رات پتا نہیں کیوں ڈھیروں آنسو بلاوجہ ہی میری آنکھوں میں چلے آئے تھے۔

انہوں نے کہا تھا۔

”تم میرا لحاظ نہ کرو اور بھول جاؤ کہ کبھی تم مجھ سے

ملے تھے۔ تم وہی کرو جو تمہارا ضمیر کہتا ہے۔ ایک صحافی کبھی اپنا قلم نہیں بیچتا۔“

”تو؟“ ”میرے لبوں سے بے اختیار اٹھتا تھا۔“ ”تو؟“ وہ مسکرائے تھے۔ ”تمہاری جسمیں سرے جہاں تک جاتے ہیں وہاں تک ضرور جاؤ گے۔“

میری ساری بات سن کر انہوں نے کہا تھا۔ اور اس رات میں نے جب اپنا آرٹیکل مکمل میری آنکھوں کے گوشے کیلے ہو رہے تھے لیکن میں اپنے آفس جاتے ہوئے وہ مضمون اخبار کے میں دینے کے لیے رکاوٹ ایڈیٹر نے معذرت کر لی۔

”سوری مسٹر اسید! ہم مضامین کا یہ سلسلہ جاری نہیں رکھ سکتے۔ آپ پلیز کسی معاشرتی مسئلے لکھیں۔“

”لیکن سر! کیا یہ معاشرتی مسئلہ نہیں ہے۔“ ”تم اس موضوع پر بہت لکھ چکے ہو، لوگ ہو گئے ہیں پڑھ پڑھ کر وہ اب کچھ نیا چاہتے ہیں۔“

”لیکن سر! اس قسط میں تو بڑے بڑے انکشافات کیے ہیں میں نے۔ آپ حیران ہوں گے کتنے بڑے لوگ ملوث ہیں اس کا رونا پار میں۔“

”ایسے کاموں میں بڑے لوگ ہی ملوث ہوتے ہیں۔“

میری جان! وہ دہرانہ انداز میں مسکرائے تھے۔

”بہر حال مجھے آپ کے نئے آرٹیکل کا انتظار رہے گا۔ کل تک لکھ لیں گے نا آپ۔“

”لو کے سر!“ میں سمجھ گیا تھا جو لوگ مجھ پر دباؤ دے رہے تھے ان کی رسائی یہاں بھی تھی میں آفس باہر گیا اور سوچا گوئی تو ہو گا ایسا جی وار جو یہ چھاپ دے دوسرے اخبارات سے بات کروں گا یا کسی میگزین سے۔



مگر پھر ان کا فون آگیا۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں ان کے حوالے کی خبر پڑھی تو تھی لیکن مجھ سے

تھا کہ وہ ساری کشتیاں جلائے کہیں لے سفر فرما جانے کو تیار بیٹھے ہیں۔ میرا دل جیسے ڈوب سا گیا اور کچھ دیر بعد میں ان کے پاس بیٹھا تھا۔

”میں نے کہا تھا نا آپ سے کہ مجھے زیر بار نہ لیں۔ میں ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیے بیٹھا ہوں۔“ ”کی آواز میں نہ جانے کہاں سے آکر بہت سا راز شامل ہو گیا تھا۔“

”لیکن یار! میں نے کہاں زیر بار کیا ہے تمہیں۔“ ”میں ان سے کیا کہتا کہ اور کیسے زیر بار کرتے ہیں۔“ ”تم اپنے قلم کا کبھی سووانہ کرنا اسید!“

وہ مجھ سے عہد لے رہے تھے اور میں اثبات میں سر ہلاتا رہا تھا۔ ایک عہد میں نے اصرار سے کیا تھا اور اب ایک عہد میں آفتاب حسین سے کر رہا تھا۔

بجائے کہ اسے نبھانا کتنا مشکل ہو گا کہ میں ہانپ ہانپ جاؤں گا۔ میں نے جو انہیں پہلی نظر میں پسند کیا تھا اور میں نے شاید ان سے نفرت بھی کی تھی لیکن میں جو ان کا کوئی بھی نہیں تھا، ان کے آخری لمحوں تک ان کے ساتھ تھا جب انہوں نے آخری سانس لی تو ان کا سر میری گود میں تھا اور سامنے بیچ پر بیٹھے دادا مسلسل

یا سلام کا درد کر رہے تھے اور نہ جانے کیا کیا پڑھ کر ان پر پھونک رہے تھے۔ آخری لمحے میں انہوں نے آنکھ کھول کر پہلے مجھے اور پھر دادا کی طرف دیکھا تھا۔ ان کے لبوں پر بڑی آسودہ سی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہو گئی تھی اور پھر انہوں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

داؤی کہتی تھیں۔ بیماریاں انسان کے گناہوں کو جھاڑ دیتی ہیں اور پھر توبہ کرنے والے کی توبہ قبول ہو جاتی ہے، جب وہ سچے دل سے توبہ کر لے۔

ان کی بند آنکھوں پر دھرے میرے ہاتھوں میں لٹک رہی تھی اور میرا دل چاہ رہا تھا۔ میں دھاڑیں مار مار کر روتی لیکن مجھے ابھی خود کو سنبھالنا تھا۔ میں نے اس کی سے ان کا سر تکیے پر رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

دادا ان کی نبض دیکھ رہے تھے جب میں ڈاکٹر کو بلانے کے لیے کمرے سے باہر نکلا لیکن جانے والا

جا چکا تھا۔ اپنے آخری چار دنوں میں جب میں ان کے پاس رہا، انہوں نے مجھ سے اپنے متعلق بہت باتیں کی تھیں انہوں نے مجھے فاطمہ کا بتایا تھا اور ایک کہانی بند لگانے میں مجھے دی تھی کہ یہ میں فاطمہ کو دے دوں۔ انہوں نے فاطمہ کا نمبر مجھے لکھواتے ہوئے تاکید کی تھی کہ میں ان کی موت کی اطلاع فاطمہ کو ضرور دوں۔ انہوں نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ تم بس کبیر کو فون کر دینا۔ وہ سب سنبھال لے گا۔

میں نے کبیر کو اطلاع دے دی تھی۔ میں نے فاطمہ کو بھی فون کر دیا تھا۔ میں نے کبیر کو بتا دیا تھا کہ میں انہیں گھر لا رہا ہوں۔ ایسوی لینس میں ان کے پاس بیٹھا تھا۔ ایک بار انہوں نے کہا تھا۔

”میرا جی چاہتا ہے تمہیں کسی روز اپنے گھر لے جاؤں۔ تمہیں سنی بابا کا نیا باب کا کمرہ اور ان کی تصاویر دکھاؤں۔ تم دیکھنا اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی سب کچھ ویسا ہی ہے۔ تمہیں لگے گا جیسے نیا باب ابھی

ابھی کمرے سے باہر نکلا ہو۔ میں نے اس کے تکیے کے پاس اوندمی پڑی کتاب کو بھی کبھی سیدھا نہیں کرنے دیا۔ تاکہ جب میں اس کے کمرے میں جاؤں تو لگے جیسے ابھی پڑھتے پڑھتے وہ اٹھ کر باہر گیا ہے۔“

اور اب میں ان کے گھر جا رہا تھا لیکن اس طرح کہ میں انہیں ان کے گھر لے جا رہا تھا۔

ان کے گھر کے باہر بہت سارے لوگ جمع تھے۔ ان کے اخبار کے ورکرز صحافی اور نہ جانے کون کون کبیر نے لان میں ٹینٹ لگوا دیے تھے۔ اندر لاؤنج میں بھی سب تیار تھا۔ ہم انہیں لاؤنج میں لے کر گئے تھے۔ وہاں دادی اور پھوپھی کے علاوہ اس وقت صرف

پاس پڑوس کی چند خواتین تھیں۔ غالباً دادا پھوپھی کو بھی ساتھ لائے تھے۔ باہر لایا اور تینوں بھائیوں کے ساتھ وہ خود موجود تھے۔ ہم انہیں اندر چھوڑ کر باہر

آئے تو میں نے دیکھا۔ صرف دادی تھیں جو رو رہی تھیں۔ لوگ آہستہ آہستہ اکٹھے ہونے لگے تھے۔ خود بخود ہی لوگ دادا ابابا اور میرے پاس آنے لگے تھے۔ جو بھی آتا۔ وہ دادا اور ابابا کو پرستتا۔ میرے ساتھ

افسوس کرتا۔ لوگوں نے خود ہی تصور کر لیا تھا کہ ہم ان کے اپنے ہیں۔ ان کے جنازے کو کندھا دینے والے بھی ہم چاروں بھائی تھے۔ وہاں آنے والے کئی صحافیوں نے مجھے پہچان لیا۔

”ارے اسید آپ!“
”اچھا تو آفتاب حسین آپ کے کوئی عزیز تھے۔ کوئی قریبی عزیز تب ہی آپ کی تحریروں میں ان کی تحریر کا رنگ جھلکتا ہے۔“
”سچ بتائیے، کہیں آپ کے پردے میں وہ خود تو نہ تھے۔“

”اور ہاں یہ یکایک انہوں نے اخبار کیوں بند کر دیا؟“
مجھے ایسی باتوں سے کوفت ہو رہی تھی۔ اندر ایک شخص کی میت پڑی تھی اور یہ لوگ پتا نہیں کیسے غیر متعلق باتیں کر رہے تھے۔

ان کا حلقہ احباب وسیع تھا۔ آنے والوں میں ہر طرح کے لوگ تھے۔ جھنڈے والی گاڑی میں بیٹھ کر آنے والے بھی تھے۔ سیاست دان بھی تھے اور پوریو کریٹ بھی۔ بزنس میں بھی تھے اور صحافی بھی۔ لیکن سب کے سب کلف لگے مصنوعی لوگ۔ میں خاموشی سے ایک طرف بیٹھا اپنے دل میں اس دکھ کو پھیلتے محسوس کرتا رہا جو کسی اپنے کے بچھڑ جانے پر ہوتا ہے۔

اندر لاؤنج میں بھی عورتیں اکٹھی ہو گئی تھیں۔ ماڈرن اور قیمتی ملبوسات میں لپٹی ہلکے میک آپ کے ساتھ اور ہلکی پھلکی جیولری پہنے وہ یہاں پر سہ دینے آئی تھیں۔

یہ سب آفتاب حسین کی ملنے والیاں تھیں۔ اندر بھی سب خواتین داوی سے ہی افسوس کر رہی تھیں۔ تیسرے دن لوگوں کی آمد کا سلسلہ موقوف ہوا تو میں نے کبیر سے کہا۔

”اب کل سے ہم نہیں آئیں گے۔“
”ہاں ٹھیک ہے۔“ کبیر چونکا۔ ”اب کس نے آنا ہے اور یہ مکان تم جانتے ہونا کس۔“

”جی۔“ میں کھڑا ہو گیا اس وقت وہاں صحن میں اور کبیر تھے۔ اندر لاؤنج میں داوی تھیں اور کوئی آس پاس کے گھر سے آئی ہوئی خواتین نہ تھیں۔
”ابا! آپ نیکی دیکھیے۔ میں داوی کو لانا۔“
کبیر نے میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں ہلکی سرخی تھی۔ وہ نہ جانے کب سے شاید حسین کے زمانے سے ہی ان کے ساتھ تھا۔ اسے آفتاب حسین کے یوں اس طرح چلے جانے کا دکھ تھا۔ نے کئی بار ان تین دنوں میں اسے آنسو پونچھتے رہا تھا۔

”نہیں ڈرائیور چھوڑ آتا ہے اسید! آپ کچھ رک جائیں۔ آفتاب صاحب کی خواہش تھی کہ ذاتی چیزیں آپ دیکھ لیں۔ دو تین روز تک سب یہ ہو جائیں گی اور پھر کل تک میں سب ملازمن کو فائل کروں گا۔“

”یہ لوگ کہاں جائیں گے؟ شاید برسوں سے ہی سروٹ کو ارنڈرز میں رہ رہے ہیں۔“ ابا نے بے ساختہ کہا تھا۔ ”ایک غریب ہی دوسرے غریب کو مجبور یوں کو سمجھ سکتا ہے۔“

کبیر کے لبوں پر افسردہ سی مسکراہٹ ابھری۔ ”عبدالرحمن صاحب! آفتاب صاحب نے کے لیے بندوبست کر دیا تھا۔ بڑے دل والے اور بڑے آوی تھے۔ انہیں سب کا احساس تھا۔“

کبیر انہیں تفصیل بتا رہا تھا۔ میں ہولے ہولے قدم اٹھا تا ڈرائنگ روم سے باہر نکلا اور ٹی وی کے میں چلا گیا۔ نیچے کارپبیٹ بر داوی کے پاس ان کے پر ہاتھ رکھے کوئی خاتون بیٹھی تھیں اور خاتون کے ایک کم عمری لڑکی ادھر ادھر لاؤنج میں نظریں دوڑاتی تھی۔

”داوی!“
میں نے وہیں کھڑے کھڑے انہیں پکارا تو وہ وہ خاتون دنوں ہی مجھے دیکھنے لگیں۔ خاتون کی آنکھوں کے گوشے نم تھے اور ان آنکھوں کی سرخی شدت کا ہتارے رہی تھی۔

”آجاؤ بیٹا! داوی نے دوپٹے کے پلو سے اپنی نم آنکھوں کو پونچھا تھا۔“
”داوی! میں آپ کو لینے آیا ہوں۔“
”جھا!“ وہ کھڑی ہو گئیں اور پھر قریب بیٹھی خاتون کی طرف دیکھا۔

”بیٹا! یہ فاطمہ ہے۔ تیار ہی تھی کہ تم نے فون کر کے اطلاع دی تھی مابلی بیٹے کی۔“
میں چونکا۔ ان تین دنوں میں ایک بار بھی فاطمہ کا خیال میرے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ مجھے تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ وہ آج آئی تھیں یا اسی روز آئی تھیں اور پھر ان کی طرف دیکھتے دیکھتے مجھے ایک اور بات بھی یاد آئی کہ ان کی ایک امانت بھی تھی میرے پاس۔ میں یکدم دو قدم آگے بڑھا۔

”آپ کی ایک امانت ہے میرے پاس۔“
انہوں نے اثبات میں سر ہلادیا۔ ان کی آنکھوں کی سطح نم تھی اور پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔
”آپ کہاں ٹھہری ہوئی ہیں؟ مجھے ایڈریس دے دیجئے گا میں وہاں پہنچاؤں گا۔“
انہوں نے پھر سر ہلادیا تھا۔

”آپ ابھی یہاں ٹھہریں گی۔“
”دو تین روز اور۔۔۔“ ان کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی اور وہ پہلی بار بولی تھیں۔ ”تم۔۔۔ اسید عبدالرحمن ہو۔“

”جی۔۔۔!“ میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔ نیچے کارپبیٹ پر بیٹھی لڑکی دلچسپی سے مجھے دیکھنے لگی۔
”تو یہ فاطمہ ہیں۔“ ان کے چہرے کے جمل پر آج بھی نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی اور اگر آفتاب حسین نے اس چہرے کے بعد کسی اور چہرے کو دیکھنے کی خواہش نہیں کی تھی تو بجا تھا اور ان کی رفاقت کی خواہش کے بعد کسی اور کی رفاقت کا جنی نہ چاہا تھا تو کچھ غلط تو نہ تھا۔

”اسید! ابا نے مجھے آواز دی تو میں نے ان کی طرف دیکھا۔“
”تم جارہے ہو اسید؟“ بے اختیار انہوں نے

پوچھا۔
”میں ابھی آتا ہوں ڈرا داوی جان کو چھوڑ آؤں۔“
داوی جان فاطمہ سے ملیں لڑکی کی پیشانی چوم کر دعا دی۔
”میں جانے سے پہلے آپ سے ملنے آؤں گی؟“
لڑکی ان کا ہاتھ تھام کر کہہ رہی تھی۔ میں داوی کو پیچھے آنے کا کہہ کر مڑ گیا اور جب میں واپس آیا تو فاطمہ لاؤنج میں لگی اس پڑی سی تصویر کے پاس کھڑی تھیں جو غالباً ”نایاب کی گلی۔ میں بھی ہوئے ہوئے چلتا ہوا اس تصویر کے پاس کھڑا ہو گیا۔“
”یہ نایاب کی تصویر ہے نا!“ فاطمہ نے مڑ کر مجھے دیکھا۔

”میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن آفتاب اس کا اتنا ذکر کرتے تھے کہ مجھے اسے پہچاننے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگا اور تم۔۔۔“ انہوں نے بات ادھوری چھوڑ کر مجھے دیکھا۔
”آفتاب نے بتایا تھا جب چند ماہ پہلے وہ آغا خان میں مجھے ملے تھے کہ تم نایاب سے بہت مشابہ ہو۔“
”ہاں وہ یہی کہتے تھے۔“ میں نے افسردگی سے کہا اور نایاب کی تصویر کو غور سے دیکھنے لگا۔ واقعی کہیں کوئی مشابہت تو تھی۔
”آفتاب صحیح کہتے تھے بہت مشابہت ہے۔“ ان کے لبوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہو گئی۔
”آپ کب آئیں گی۔“ میں نے جھجکتے۔
”ہوئے پوچھا۔“
”میں جنازے سے پہلے پہنچتی تھی۔“
ان کے لبوں کے گوشے کپکپانے لگے تھے۔ تب ہی کبیر ہولے سے کھنکرتا ہوا اندر آ گیا۔ وہ مجھے اندر جانے کا کہہ کر خود پورچ میں ہی رک کر مالی یا چوکیدار سے بات کرنے لگا تھا۔
”یہ فاطمہ ہیں۔“
میں نے تعارف کر دیا تو کبیر نے اثبات میں سر ہلادیا۔ اس نے فاطمہ کے متعلق کوئی سوال نہیں کیا۔

تھا۔ شاید وہ جانتا تھا یا شاید اس نے ضروری نہیں سمجھا تھا۔ فاطمہ مڑ کر پھر تصویر کو دیکھنے لگی تھیں اور کارپٹ پر بیٹھی لڑکی بھی اٹھ کر ان کے پاس کھڑی ہو گئی تھی۔

”اسید!“ کبیر نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھے۔ ”آفتاب صاحب کی خواہش تھی کہ تم ان کی ذاتی اشیاء میں سے کچھ لینا چاہو تو لے لو۔“

”میں نے مجھے بھلا کیا لینا ہے۔“ میرے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔

”ان کی مراد اپنے کانڈزات یا کتابوں وغیرہ سے تھی۔ تم ان کا کمرہ دیکھ لو انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ ان کے بعد میں تمہیں ان کا نایاب کا اور سنی بابا کا کمرہ دکھا دوں۔“

اور مجھے یاد آیا کہ انہوں نے ایک بار خواہش کی تھی کہ میں ان کے ساتھ چلوں۔ وہ مجھے نایاب اور سنی بابا کا کمرہ دکھائیں گے۔

فاطمہ مڑ کر ہمیں دیکھنے لگی تھیں۔

”کیا میں بھی اسید کے ساتھ چل سکتی ہوں۔“

”Sure“ (یقیناً)۔

”یہ نایاب کا کمرہ ہے۔“ کبیر نے کمرہ کھولا۔ مجھے لگا جیسے میں بہت بار اس کمرے میں آیا ہوں۔ کتنی جزئیات کے ساتھ انہوں نے سب کچھ بتایا تھا۔

تیکے کے پاس اونڈھی بڑی کتاب۔

”میں نے یہ کتاب بھی اسید ہی نہیں کی اتنے سالوں میں پتا ہے کیوں اس لیے کہ میں جب کمرے میں آوں تو مجھے لگے جیسے ابھی ابھی وہ اس کمرے سے گیا ہے اور بس ابھی آجائے گا۔“

ایک بار انہوں نے بتایا تھا۔

”آوی بھی خود کو کیسے کیسے دھوکے رتا ہے۔ جھوٹے بہلاؤں سے خود کو سنبھالے رکھتا ہے۔“

حالانکہ آخری سفر پر جانے والے بھلا کب لوٹ کر آتے ہیں۔ ”کمپیوٹر سٹیل شیفٹ میں لگی میڈیکل کی کتابیں دیوار پر نایاب حسین احمد اور آفتاب حسین کی تصاویر۔ یہ گروپ فوٹو تھا۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ یہ حسین احمد ہی ہوں گے باوقار سے لیوں پر شفیق سی

مسکراہٹ لیے وہ کچھ کچھ آفتاب حسین سے مشابہ تھے۔ شاید اتنی عمر میں وہ بھی ایسے ہی لگتے اور اب نہیں ان کی کیا عمر ہوگی؟ میں نے سوچا۔ دیکھنے میں چالیس پینتالیس سے زیادہ کے نہیں لگتے تھے۔ پچاس سال سے زیادہ کے نہیں ہوں گے وہ۔

میں کبیر کے ساتھ ان کے کمرے میں آیا۔ یہ ساوا سا بیڈ روم جیسا نایاب کا تھا۔ دیوار کے ساتھ کی شیفٹ میں کتابیں، دائیں طرف دیوار پر وہی گروپ تصویر اور اس کے آس پاس نایاب اور حسین احمد کی ایک قلم سائز تصویر۔ ٹیبل پر کچھ فالٹس جن میں غالباً ان کی تحریریں تھیں۔

ان کے تیکے پر گڑھا سا پڑا تھا جیسے ابھی ابھی کوئی سوکرا تھا ہو۔ بیڈ سائڈ ٹیبل پر ایک دو ڈائریاں، ہالکس غیر ارادی طور پر میں نے ایک ڈائری اٹھا کر اسے کھولا۔ اس میں سے کارڈ سائز کچھ تصاویر نیچے گر گئیں۔ یہ یونیورسٹی کے کسی فنکشن کے گروپ فوٹو تھے۔ میں نے تصاویر فاطمہ کی طرف بڑھائیں۔ جو بھری بھری آنکھوں کے ساتھ ساکت کھڑی تھیں۔

”یہ یونیورسٹی کی تصاویر ہیں۔ یہ آفتاب ہیں یہ میں نے صدف سے۔“

وہ بتا رہی تھیں کہ کبیر کے فون کی تیل ہوئی۔ وہ معذرت کرتا ہوا باہر چلا گیا۔ فاطمہ تصاویر دیکھ رہی تھیں جب میں نے ڈائری کھولی۔ جو صفحہ میرے سامنے تھا اس کا پہلا جملہ تھا۔

”اور پتا نہیں میں فاطمہ کے بغیر زندگی کیسے گزاروں گا۔“

میں نے ایک دم ڈائری فاطمہ کی طرف بڑھادی۔

”سوری۔ میں چند لفظ پڑھنے کا مجرم ٹھہرا۔ یہ آپ کی امانت ہے۔ چاہیں تو ضائع کرویں۔ چاہیں تو رکھ لیں۔“

فاطمہ نے بنا کچھ کہے ڈائری لے لی اور پرس میں رکھ لی اور تصویریں میری طرف بڑھادیں۔

”آپ رکھنا چاہیں تو رکھ لیں۔“

”نہیں۔ میرے پاس ہیں۔“ وہ جیسے تھک کر بیٹھ

کے کنارے پر بیٹھ گئیں۔

”آفتاب کی بڑی خواہش تھی کہ کبھی میں اس کے ساتھ اس کے گھر چلوں لیکن میں سوچتی تھی کہ مجھے نہیں جانا چاہیے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ اس گھر کا خواب میری آنکھوں میں اتر جائے جہاں میں نے نہیں آتا۔“

وہ ہولے ہولے بول رہی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ کتنا برا المیہ ہے کہ کبھی کبھی جسے جہاں ہونا ہوتا ہے وہ وہاں نہیں ہوتا اور شاید قدرت اسی طرح اپنے بندوں کو آزماتی ہے۔

تب ہی کبیر اندر آ گیا۔ ”آپ کیا لینا چاہیں گے اسید؟“

”یہ تصاویر آفتاب صاحب اور ان کے بھائی اور بابا کی اور ان کا یہ تحریری موادیں کوشش کروں گا کہ کبھی ان کی کہانیوں کا مجموعہ چھپوا دوں۔“

کبیر کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”یہ کتنی عجیب بات ہے اسید عبدالرحمن! کہ آفتاب صاحب تمہیں تم سے زیادہ جانتے تھے انہوں نے کہا تھا کہ اسید تصویریں لے گا۔ اور میرا تو کوئی وارث نہیں ہے جس کے لیے یہ تصاویر ایسے ہی قیمتی ہوں جیسی میرے لیے ہیں۔ اگر اس نے تصاویر نہ لیں تو پھر انہیں جلا دیتا۔“

میں عجیب سی کیفیت میں گھرا کبیر کی بات سن رہا تھا جب ذرا سے توقف کے بعد اس نے کہا۔ ”اور آفتاب صاحب نے کہا تھا کہ ان کی کتابیں آپ کے دادا جان کو گفٹ کر دی جائیں۔ وہ بہت باذوق اور قدردان شخص ہیں اور اگر وہ لینے سے انکار کریں تو کسی لائبریری کو ڈونٹ کر دیتا۔“

میں نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ فاطمہ نے پتلی نظروں سے مجھے دیکھا۔

”پلیز مرے ہوئے شخص کی خواہش کو ٹھکراتے نہیں۔“

اور میں بنا کچھ کہے کمرے سے باہر نکل آیا۔ فاطمہ کچھ دیر وہاں ہی کھڑی رہیں میں لاؤنچ میں آکر کچھ دیر

ٹھہر گیا۔ وہ لڑکی جو ایک پینٹنگ کے پاس کھڑی اسے بہت دیکھی سے دیکھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر میرے قریب آئی۔

”آپ وہی اسید عبدالرحمن ہیں نا! جن کے آرٹیکل ”مطلوع“ میں چھپتے ہیں۔“

میں نے اثبات میں سر ہلادیا میں اب جلد از جلد یہاں سے جانا چاہتا تھا۔ مجھ پر ایک دم گھبراہٹ طاری ہو گئی تھی۔ کل تک یہ گھر آباد تھا۔ یہاں لوگ چلتے پھرتے تھے اور اب سسہ یہاں اس ٹیبل پر بیٹھ کر کبھی

نایاب آفتاب حسین اور سنی بابا نے کھانا کھایا ہوگا پھر ہلکے نایاب پھر پھانا اور پھر سنی بابا ایک ایک کر کے چلے گئے آفتاب حسین اکیلے رہ گئے اس گھر میں یہاں

اس صوفے پر کبھی وہ بیٹھ کر لی وی دیکھتے ہوں گے۔ کبھی یہاں کھڑے ہو کر انہوں نے نایاب کی تصویر کو گھنٹوں دیکھا ہوگا اور اکیلے میں اس سے چسکے چسکے باتیں کی ہوں گی اور اب کل یہاں کوئی اور چلنا پھرنا ہوگا۔ کسی اور کی نہیں یہاں گونجے گی اور بس یہ ہی ہے زندگی کا مال۔ میں نے دل گرفتگی سے قیمتی فریج پر نل

سائز لی وی اور دوسری اشیاء پر نظر ڈالی۔

اس سب کے لیے جو یہاں ہی رہ جاتا ہے انسان کتنی بددیانتی کرتا ہے اپنے ساتھ دوسروں کے ساتھ۔

ایک ایک مجھے لگا لڑکی کی نظریں مسلسل مجھ پر ہیں۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا دی۔

”آپ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ بہت بے پاکی سے حالات کا تجزیہ کرتے ہیں۔ مانا کو بھی آپ کی تحریر پسند ہے۔ مجھے بہت شوق تھا جرنلسٹ بننے کا لیکن مانا نہیں چاہتی تھیں کہ میں جرنلسٹ بنوں۔ حالانکہ وہ خود آپ کو تو پتا ہو گا نا۔ انہوں نے جرنلزم میں ماسٹرز کیا تھا لیکن بابا نے نہ تو کبھی انہیں لکھنے کی اجازت دی اور نہ کبھی کسی اخبار کو جو ان کے کرنے کی جالانکہ مانا میں لکھنے کی بہت صلاحیت تھی بلکہ کالج یونیورسٹی میں وہ شاعری بھی کرتی تھیں۔“

وہ بہت باتوں ہی تھی۔ گندی رنگ بڑی بڑی خوب صورت بے تحاشا چمکتی آنکھیں تھما سب قدر میری

97

ماہنامہ شعاع

جون 2009

نظر غیر ارادی طور پر پھر اس کی طرف اٹھی۔ بلاکی معصومیت اور کشش بھی اس میں۔
 ”میں آمنہ ہوں۔ ممانے بتایا ہے آپ کو؟ ان کی بیٹی۔“

مجھے اپنی طرف دیکھتا پھر اس نے بات ادھوری چھوڑ کر تعارف کروایا۔ میں نے فوراً نظریں جھکا لیں۔

”اور بتا ہے مجھے بھی بہت شوق ہے لکھنے کا۔ اور بتا ہے میری کہانیاں خواتین کے ایک ڈائجسٹ میں چھپتی ہیں۔ آمنہ شاہ کے نام سے آپ نے کبھی پڑھیں۔“
 ”نہیں میں خواتین کے ڈائجسٹ نہیں پڑھتا۔“

”پڑھنے چاہیں۔“ اس نے دانش مندی سے سر ہلایا۔ ”جو پڑھتے ہیں وہ فائدے میں رہتے ہیں۔ خواتین کے ڈائجسٹوں میں جو کہانیاں چھپتی ہیں وہاں سے آئیڈیے لے کر بلکہ چرا کرئی وی کے لیے لکھنے میں سہولت ہو جاتی ہے، ہے نا؟“

”بد قسمتی سے میں ٹی وی نہیں دیکھتا۔“ میں نے اپنی بے ساختہ مسکراہٹ کو چھپایا۔

”دیری سیڈ (Very sad)۔“
 ”خیر۔ کبھی آپ کراچی آئے نا تو میں آپ کو اپنی کہانیاں پڑھاؤں گی۔“

”آپ کے پاپانے آپ کو منع نہیں کیا لکھنے سے؟“
 میں نے یونہی پوچھ لیا۔

فاطمہ ابھی تک آفتاب حسین کے بیڈ روم میں تھیں جبکہ کبیر لاؤنج سے باہر چلا گیا تھا شاید اس کا ڈرائیور بااوردادی کو چھوڑ کر واپس آ گیا تھا۔

”نہیں بلکہ بہا تو بہت خوش ہوتے ہیں میرا افسانہ اور پھر اس کی تعریفیں پڑھ کر۔“

”اور آپ نے پوچھا نہیں کہ یہ کیا تضاد ہے ممانا کو اجازت نہیں۔ بیٹی کو ہے۔“

”نہیں۔ لیکن وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ وقت کے ساتھ آدمی کی سوچ بدل جاتی ہے اب جیسا کہ میں بالکل بھی انکس لٹریچر میں ماسٹرز نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن یہ ممانا اور بہا کی خواہش تھی اور جب

میں پڑھنے لگی تو مجھے لگا کہ مجھے اسی میں ماسٹرز چاہیے تھا۔“

”آپ ماسٹرز کر رہی ہیں؟“
 میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ فرسٹ ایریا سیکنڈ ایریا کی طالبہ ہوگی۔

”ہاں، میرا فائنل ایر ہے۔“
 تب ہی فاطمہ آگئیں۔ میں نے دیکھا ان کی چلیں پھر بھگی بھگی سی تھیں۔ شاید وہاں اکیلے کمرے میں پھر روئی تھیں۔ میں نے ان کے احساسات کو سمجھنے کی کوشش کی اور دھیمے لہجے میں پوچھا۔

”آپ یہاں کچھ دیر اور ٹھہرنا چاہیں گی یا چلیں گی؟“
 ”نہیں چلتی ہوں، اب ٹھہر کر کیا کرنا یہ گھر کون خرید رہا ہے؟“

”معلوم نہیں لیکن میرا خیال ہے انہوں نے یہ کسی ادارے کو ڈونٹ کر دیا تھا۔ کبیر صاحب کو سب تفصیل معلوم ہوگی۔ آپ بتا کرنا چاہیں تو۔۔۔“

”نہیں۔ میں نے تو یونہی پوچھا تھا۔“
 ”لوکے شاید ایک دو ملاقاتیں اور ہوں آپ سے۔“

کبیر نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور میں خدا حافظ کہتے ہوئے باہر نکل آیا۔ فاطمہ گیٹ کے ساتھ کھڑی سفید کرولا کی طرف بڑھیں پھر گاڑی کے دروازے پر ہاتھ رکھتے ہوئے انہوں نے میری طرف دیکھا۔

”آئیے اسید! ہم آپ کو ڈراپ کر دیتے ہیں۔“
 ”تھینک یو میم! میں چلا جاؤں گا۔“

”تکلف مت کریں آئیے۔ پھر مجھے آپ سے ملانت بھی تو لیتا ہے۔ آپ کہاں تکلیف کرتے پھریں گے۔“

”وہ کیا ہے؟ آفتاب انکل نے کیا دیا ہے ممان کو؟“ آمنہ نے پوچھا۔

میں ڈرائیور کے ساتھ پنجر سیٹ پر بیٹھ گیا تھا اور اسے پتا سمجھا رہا تھا۔

میں نے مزہ کرنا ہیچھے دیکھا۔

”کوئی کہانی ہے شاید انہوں نے کسی کی فرمائش پر بھی۔۔۔ ان کی آخری کہانی۔ ایک طویل گیپ کے بعد انہوں نے لکھی ہے۔“

”اجہ لانا! کیا میں وہ کہانی پڑھ سکتی ہوں؟“
 ”جی نہیں، ناظر نے کیا جواب دیا تھا۔ میں نے سنا نہیں تھا۔ میں ایک بار پھر آفتاب حسین کے متعلق

سینے لگا تھا۔ میں نے ان سے نفرت کرنے کی ان سے دور رہنے کی کتنی کوشش کی تھی لیکن نہ تو میں ان سے نفرت کر سکا اور نہ ہی ان سے دور رہ سکا۔ آج اور کل کے ہر اخبار میں ان کی موت کے متعلق خبر چھپی تھی۔ اکثر کالم نگاروں نے اپنے اپنے کالموں میں ان کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھا تھا۔“

ہر ایک کی اپنی رائے اپنا خیال تھا اور اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ میں ان کے متعلق کیا رائے رکھتا ہوں تو شاید میں کچھ بھی نہ کہہ سکوں۔

”یہاں سے کدھر جانا ہے؟“
 ڈرائیور نے پوچھا تو میں چونکا۔

”بس یہاں ہی ایک سائیڈ پر کر کے پارک کر لیں۔ اندر گلی میں گھر ہے اور وہاں گاڑی کا جانا ذرا مشکل ہے۔“

ڈرائیور نے روڈ سے ہٹ کر ایک سائیڈ پر گاڑی کھڑی کی۔

”تھینک یو میڈم!“ میں نے فاطمہ کا شکریہ ادا کیا۔
 ”آپ پکیز باج منٹ ویٹ کریں۔ میں آپ کی امانت لاتا ہوں۔“

”کیوں کیا آپ ہمیں اپنے گھر تک نہیں لے جانا چاہتے۔“

آمنہ شوخ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں یکدم شرمندہ ہو گیا۔

”نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ شاید آپ غریب خانے پر آنا پسند نہ کریں۔“

”یہ آپ کی سوچ ہے ویسے آپ کو مان لینا چاہیے کہ آپ کو ہمیں گھر چلنے کو کہنا چاہیے تھا۔“

”مسوری مس! اب چلیں آپ تو غریب خانہ اس

قابل نہیں کہ۔“
 ”ہم بھی کوئی جدی پشتی دولت مند لوگ نہیں ہیں۔ ہمارا تعلق بھی متوسط گھرانے سے ہے اور اب جی ہم کوئی رئیس نہیں ہیں۔ یہ گاڑی میرے بھائی کی ہے جو دیار غیر میں نہ جانے کتنی محنت کر کے اپنی فیملی کو سولتیں فراہم کر رہا ہے۔“

فاطمہ گاڑی سے باہر آگئی تھیں۔ میں مزید شرمندہ ہوا اور ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

داوی انہیں دیکھ کر خوش ہو گئیں۔

”ارے یہ اچھا کیا بیٹا! کہ تم اسید کے ساتھ آگئیں۔ وہاں تو تم سے ڈھنگ سے بات بھی نہ ہو پائی تھی۔ اللہ آفتاب بیٹے کو جنت میں جگہ عطا فرمائے۔“

اور یہ بزرگ بھی خوب ہوتے ہیں لحوں میں اجنبیوں سے بے تکلف ہو کر رشتے جوڑ لیتے ہیں۔

داوی بھی ایسی ہی تھیں اور ایک میں تھا۔ مجھے تو کسی سے بے تکلف ہونے میں بہت وقت لگتا تھا۔ انہیں

داوی کے پاس چھوڑ کر میں بیٹھک میں آیا اور اپنی الماری سے وہ پیکٹ نکالا جو آفتاب حسین نے مجھے دیا تھا۔

وحید فوراً ہی پیپسی گلاسوں میں ڈال کر لے گیا۔

وحید اور سعید تینوں ہی بچن اور گھر کے کاموں میں داوی کا ہاتھ بٹاتے تھے جب کہ مجھے ذرا بھی ان کاموں سے دلچسپی نہ تھی بلکہ دادا بھی اکثر بچن میں داوی کے پاس بیٹھے کبھی انہیں پیاز کٹ کر دے رہے ہوتے۔ کبھی آلو اور سبزی کالی جا رہی ہوتی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ

داوی پر اس عمر میں بہت ذمہ داریاں پڑ گئی تھیں۔

پھوپھی کا گھر نزدیک تھا۔ وہ بھی کبھی آکر ہاتھ بنا جاتیں۔ خاص طور پر جب داوی بیمار ہو میں ان کے

تین بچے تھے دو بیٹیاں ایک بیٹا۔ بڑی بیٹی تو آمنہ کی ہی ہم عمر ہوگی۔ یا کچھ کم ہی اسے کی طالبہ تھی۔ اس کی

وجہ سے بھی داوی کو آسانی ہو گئی تھی وہ جب بھی فارغ ہوتی داوی کے پاس آ جاتی۔

”سعید بیٹا! ذرا عاشری کو بلا لو کہنا ممان آئے ہیں۔“

میں نے صحن میں داوی کی آواز سنی اور ساتھ ہی

فاطمہ کی آواز آئی۔
 ”پلیز خالہ جان! کوئی تکلف وغیرہ مت کریں۔“ پتا نہیں دادی نے کیا کہا تھا۔ میں نے سنا نہیں اور واپس بیٹھک میں آگیا۔ سعید عاشری کو بلا لایا تھا۔
 اور جب کچھ دیر بعد فاطمہ اور آمنہ جارہی تھیں تو میں نے دیکھا عاشری اور آمنہ میں اچھی خاصی دوستی ہو چکی تھی۔ بلکہ ایک دوسرے سے ایڈریس اور فون نمبرز کا تبادلہ بھی ہو رہا تھا۔
 ”یہ لڑکیاں بھی بس۔“

اب بھلا ایک کراچی میں رہنے والی لڑکی اور ایک لاہور کی لڑکی کی ایک دوسرے سے دوستی کر کے کیا کرے گی۔
 میں انہیں گاڑی تک چھوڑنے آیا۔ عاشری بھی نئی نئی دوستی نبھانے کو ساتھ تھی۔ وہ دونوں آگے آگے جارہی تھیں جبکہ فاطمہ اور میں کچھ پیچھے تھے۔
 ”آفتاب نے آخری دنوں میں تمہیں میرے متعلق کوئی بات کی؟“

انہوں نے کسی قدر جھجکتے ہوئے پوچھا۔
 ”وہ آپ کی بہت تعریف کرتے تھے۔“ میں نے ایک نظر انہیں دیکھا۔ ”آپ کی ذہانت کی“ آپ کی سوچ کی“ آپ کے خیالات کی“ مرنے سے چند منٹ قبل انہوں نے ٹایپ اور سنی بابا کو یاد کیا تھا۔ مجھ سے کہا تھا کہ میں ان کے سنی بابا کے لیے ضرور دعا کیا کروں اور کہا تھا اگر کبھی آپ سے میری ملاقات ہو جائے تو آپ سے بھی درخواست کروں کہ ان کی اور سنی بابا کی مغفرت کی دعا کریں کہ ان کے لیے تو دعا کرنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔“

اور پھر گاڑی تک خاموشی رہی۔ واپس آتے ہوئے عاشری مسلسل بول رہی تھی۔
 ”آمنہ بہت اچھی ہے۔ آپ کو نہیں پتا اسید بھائی! کہ مجھے آمنہ سے مل کر کتنی خوشی ہوئی ہے۔ پتا ہے۔ وہ بہت اچھے افسانے لکھتی ہے۔ میں نے کئی افسانے پڑھے ہیں۔ اس کے سچی اور فاطمہ آنٹی بھی بہت اچھی ہیں انہوں نے میری بنائی ہوئی چائے کی

بہت تعریف کی لیکن وہ جل کر سعید فوراً بول دیا۔
 ”اس نے تو صرف وہ ہے۔ میری تعریف سے ہمیشہ جل جاتا ہے۔ سعید عاشری اور راحیل یوں ہی ایک دوسرے لڑتے جھگڑتے رہتے تھے اور تینوں میں دوستی تھی۔ اور۔“

پھر کئی دن گزر گئے۔ میں نے دفتر جانا شروع کیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں وہ سب کچھ کر سکوں گا جس کی خواہش آفتاب حسین نے کی تھی۔ نہیں۔ یہ میرے بس کی بات نہیں۔ اخبار نکالنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں اور جیسا بندہ جس کا کوئی مددگار نہیں وہ بھلا کیا کر سکتا ہے۔ میں کبیر سے کہوں گا کہ میں یہ ذمہ داری اٹھا سکتا۔ تم مہربانی کرو اور یہ مکان بھی کسی اور ڈونٹ کرو۔ اور مجھے معاف کرو۔ میں فیصلہ کئی دنوں کے بعد مطمئن ہوا، تو مجھے اس پر خیال آیا جسے میرے ایڈیٹر نے چھاپنے سے انکار کیا تھا۔ میرا خیال ہے مجھے دوسرے اخبارات سے رابطہ کرنا چاہیے۔

اس روز اور اس سے اگلے کئی روز تک میں اخبارات سے بات کی لیکن سب نے اسے چھاپنے سے انکار کر دیا۔
 ”آپ کیا چاہتے ہیں کہ ہمارے اخبار کے آگ لگا دی جائے اور یہاں تو پھوڑکی جائے۔“ ایک صاحب نے کہا۔
 ایک اور اخبار کے ایڈیٹر نے جواب دیا۔ ”صاحب ہمارے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ہمیں ان مستقبل عزیز ہے۔“

میں بے حد مایوس سا گھر آیا تھا اور صحن میں چارپائی پر بانو کا تکیہ بنائے لیٹ گیا۔ اور یہ کس مشکل ہے ہر آدمی کی اپنی ترجیحات ہیں اور اپنے میں نے یوں ہی خواہواہ اتنی تحقیق کی۔ ہاں اگر

اخبار ہوتا تو میں اپنی مرضی سے جو چاہے چھاپ لیتا۔ ایک لمحے کے لیے میرے دل میں خیال آیا تھا لیکن دوسرے لمحے میں نے یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا۔
 ”نہیں یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔“
 ”بہید! وا ابے حد چیکے سے آکر میرے پاس بیٹھے۔“
 ”ہاں! آپ۔۔۔؟“
 ”تم کچھ پریشان ہو بیٹا؟“
 ”ہاں۔۔۔ نہیں تو۔۔۔“
 وہ زرا سا مسکرائے۔

”مجھے بتاؤ شاید مجھ بڑھے کی عقل میں کوئی بات سما جائے۔“
 میں چند لمحے دادا کے شفیق چہرے کو دیکھتا چارپا اور پھر میں نے وہ سب جو سوچ رہا تھا دادا کو بتا دیا۔
 ”دادا جان! ہم اتنے بزدل کیوں ہیں؟ ہم حقائق سے کیوں منہ پھیر لیتے ہیں۔“
 ”مجبوریاں ہوتی ہیں بیٹا!“
 ”کیسی مجبوریاں۔“ میں نے ایک شکوہ بھری نظر ان پر ڈالی۔

”کئی قسم کی بیٹا پھر شخص اپنی مجبور یوں کے حصار میں قید ہوتا ہے، ہو سکتا ہے جن لوگوں کو تم بے نقاب کرنا چاہتے ہو وہ اتنے پاور فل ہوں کہ لوگ ان کی طاقت سے ڈرتے ہوں کہ وہ انہیں نقصان نہ پہنچائیں۔“
 ”پھر یہ مجبوری تو نہ ہوتی تا بزدلی ہوتی۔“
 ”اپنے اپنے انداز فکر کی بات ہے بیٹا! ہو سکتا ہے ان کے نزدیک یہ بزدلی نہ ہو۔ مصلحت اور عقل مندی ہو۔“

”اور پھر بابا! یہ کالی بھیڑیں کیسے ان کی شناخت ہوگی۔ کیسے ملک کو ان سے بچایا جاسکے؟“
 ”ہاں۔ یہ بات تو سونے کی ہے کہ کیسے ان بھیڑیوں کے ہاتھوں سے اس ملک کو بچایا جائے جو اسے لوج لوج کر کھا رہے ہیں۔“ انہوں نے جیسے اپنے آپ سے کہا تھا۔

”خیر!“ انہوں نے میرے بازو پر ہاتھ رکھ کر ہولے سے تھپتھپایا۔ ”تم اپنی سی کوشش کرتے رہو۔ ضروری تو نہیں تم انہیں بے نقاب کرو، کسی اور طرح ان برائیوں کے خلاف لکھ کر جو معاشرے کو دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں اپنا فرض ادا کر سکتے ہو۔“

”پتا نہیں دادا جان! مجھے کیا کرنا ہے میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا اور وہ آفتاب حسین کہتے تھے۔ قلم کی حرمت کو کبھی نہ بیچنا۔ کبھی سچ لکھتے ہوئے ڈراما مت روشنی پھیلاتے رہنا۔“
 ”اچھے آدمی تھے آفتاب حسین، بہت محبت کرنے والے۔ اللہ ان کے درجات بلند کرے۔ بہت کم ملاقاتیں ہوئیں لیکن بہت اپنے اپنے سے لگتے تھے۔ گئے تو یوں لگا جیسے اپنا بچہ رخصت ہوتا ہے تو دل درد سے بھر جاتا ہے۔“ وہ افسردہ سے ہو گئے تھے۔
 ”دادا جان! آپ کو کیا پتا۔ وہ اچھے آدمی تھے یا برے۔“

میرے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔
 ”کیوں! کیا وہ تمہیں برے لگتے تھے؟ تمہارے ساتھ کیا برائی کی تھی انہوں نے؟ پھر وہ اگر برے تھے تو تم اتنا روئے کیوں تھے۔ اتنے افسردہ کیوں ہو اب تک؟“
 ”نہیں میری ساتھ تو کوئی برائی نہیں کی انہوں نے۔“ میں سٹٹا گیا۔
 ”لیکن دادا جان! وہ وہ نہیں تھے جو نظر آتے تھے۔“
 ”اچھا پھر۔۔۔“ دادا نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”کیا تھے وہ؟“

”دادا جان!“ مجھے لگا جیسے میرے دل پر بہت بھاری بوجھ دھرا ہوا اور میں بولتا چلا گیا۔ پہلی ملاقات سے لے کر آخری لمحے تک دادا خاموشی سے بیٹھے رہے۔
 ”میں انہیں پسند نہیں کرتا تھا شاید میں ان سے نفرت کرتا تھا۔ لیکن جب وہ بیمار ہوئے اور جب میں ان کے آخری دنوں میں ان کے پاس رہا تو مجھے لگا جیسے میں ان سے نفرت نہیں کرتا۔ کبھی نہیں سکتا۔ ایسا کیوں ہے دادا جان! وہ جھوٹ سے ریا سے دھوکے سے نفرت کرتے تھے پھر بھی وہ ہی سب کچھ کرتے

رہے کیوں؟“
 کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی بنے بنائے راستے پر چلتا ہی چلا جاتا ہے وہ اپنے لیے کوئی الگ راستہ تلاش نہیں بس جو اس کے بزرگ اس کے لیے راستہ بنا دیتے ہیں وہ اسی پر چل پڑتا ہے۔“

”لیکن اس کا اپنا دماغ اپنی سوچ بھی تو ہوتی ہے دادا جان! وہ خود بھی تو فیصلہ کر سکتا ہے کہ یہ غلط ہے یہ صحیح ہے۔“

”ہاں ایسا وہ لوگ کرتے ہیں جن کے پاس کوئی نصب العین ہوتا ہے۔ زندہ رہنے کا کوئی جواز ہوتا ہے۔ آفتاب حسین کے پاس نہ زندہ رہنے کا کوئی جواز تھا نہ زندگی کا کوئی نصب العین۔ تالیاب نہیں رہا تھا۔ فاطمہ بھی نہیں تھی تو۔“

دادا جان ان کی وکالت کر رہے تھے۔ یہ آفتاب حسین بھی جاو کر تھے پورے۔ کیسے دادا جان اور سب گھر والوں کو اسیر کر گئے تھے۔ یہ محبت تھی جو دادا جان کے کبچے سے جھلک رہی تھی آفتاب حسین کی محبت لیکن غلط وہ بھی نہیں کہہ رہے تھے۔ اگر سنی بابا ان کے لیے کوئی روشن راستہ بناتے تو پھر وہ اسی ڈگر پر چل پڑتے لیکن وہ تو خود اندھیرے رستوں کے مسافر تھے پھر آفتاب حسین کے لیے کوئی روشن رستہ کیسے چھوڑتے، سو وہ بھی اندھیروں کے ہی مسافر بن گئے تھے۔ کبھی کبھی آدمی کو اپنے بڑوں کی غلطیوں کی سزا بھی بھگتنا پڑتی ہے۔ کاش سب والدین اپنے بچوں کے لیے صراطِ مستقیم کا ورثہ چھوڑیں اور اگر ایسا ہو جائے تو سب سنور جائیں پھر بھی اگر کوئی بھنگ جائے تو یہ اس کی تقدیر لیکن ہوتا یوں ہے کہ والدین نہ حرام و حلال کا فرق بتاتے ہیں۔ نہ غلط صحیح کا اور اک دیتے ہیں نہ جھوٹ سچ کی تمیز سکھاتے ہیں۔

اور۔۔۔
 ”تمہیں چاہیے اسید! کہ وہ عہد جس کا وارث تمہیں آفتاب حسین نے بنایا ہے وہ ضرور پورا کرو۔“

انہوں نے میری سوچوں کا سلسلہ توڑ دیا۔
 ”لیکن دادا جان یہ ناممکن ہے میں سمجھتا ہوں۔“

”تھیں چاہیے اسید! کہ وہ عہد جس کا وارث تمہیں آفتاب حسین نے بنایا ہے وہ ضرور پورا کرو۔“

انہوں نے میری سوچوں کا سلسلہ توڑ دیا۔
 ”لیکن دادا جان یہ ناممکن ہے میں سمجھتا ہوں۔“

”کچھ بھی ناممکن نہیں میری جان! میری بات کالی۔“ تم کو شش تو کرو۔ اگر تم ہو گئے تو کم از کم روز محشر ان کے سامنے شرمندہ ہو گے کہ تم نے عہد پورا کرنے کی کوشش کی۔“

وہ مسکرا رہے تھے۔ مجھے ان کی باتوں سے ہوا اور میں نے سوچا کہ کوشش کر لینے میں حرج ہے۔ آخر یہ میرا خواب بھی تو تھا بڑا راستہ اور پورا بنا۔ کیا پتا تقدیر نے مجھے اسی لیے آفتاب حسین ملایا ہو۔

اور پھر جدوجہد کی ایک لمبی طویل داستان ایک اخبار نکالنا۔

اور اخبارات کے ہجوم میں اس کی پہچان شناخت بنانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ کئی دفعہ میں ہوا۔ کئی بار ہمت ہار دی۔ لیکن جو صلہ بڑھانے و بہت تھے۔

دادا جان میرے سب سے بڑے سپورٹر تھے اور ہولے ہولے اس قافلے میں دوسرے بھی شامل ہوتے گئے۔
 صدق احمدی کرن اور مگیت۔

اس روز میں احمدی کے دادا اور والدہ سے ملنے گیا میری عادت تھی کہ میں مینے میں ایک دو چکر ضرور تھا۔ اس کے دادا جان اور والدہ خوش ہو جاتے۔ احمدی کا واحد اثاثہ تھا۔ اور اسے کھو کر وہ کتنے تھی وہ ہو گئے تھے۔ ان کے چھوٹے سے گھر میں بیٹھے سے باتیں کرتے ہوئے مجھے احمدی بے تحاشا یاد آتی میری آنکھیں جلنے لگتیں۔

احمدی نے۔۔۔
 اس کے خواب۔
 اس کے آدرش۔
 اس روز میں پورے دو ماہ بعد ان کی طرف گیا تھا۔

انہوں نے گلہ نہیں کیا تھا لیکن میں شرمندہ تھا کہ اپنی مسوئیت میں انہیں بھلا بیٹھا تھا۔
 ”تو مصروف تھا بابا جان! اخبار نکالنے کے لیے بھاگ بوز رہا ہوں۔“

”آپ اخبار نکال رہے ہیں؟“
 ”جی ہاں! ابھی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ احمدی وفات کے بعد تین چار بار اس کے گھر میں میری ملاقات اس سے ہو چکی تھی۔
 ”ہاں کوشش کر رہا ہوں۔“
 ”میری مدد کی ضرورت ہو تو۔۔۔“

اور مجھے یاد آیا احمدی نے کہا تھا۔ وہ بہت مخلص کارکن ثابت ہوگی۔
 ”مثلاً“ آپ کیا مدد کر سکتی ہیں؟ میں یونہی پوچھا۔

”میں لکھ سکتی ہوں۔ طنز و مزاح، سنجیدہ ہر طرح کا۔ احمدی میں اکثر خواب دیکھتے تھے کہ ہم اپنا ایک میگزین نکالیں گے اور اس میگزین میں ہم کیا کیا شامل کریں گے وہ ایک پورے تقریبی میگزین نہیں ہو گا اس میں۔۔۔“

وہ بول رہی تھی اور میں خاموشی سے سن رہا تھا۔ وہی سوچ وہی خیالات جو احمدی کے تھے۔ برائیوں کے خلاف فلم سے جہاد۔ اتحاد کی کوشش۔ محبتوں کا پرچار۔ وہ یہ سارے کام اپنے فلم سے لینا چاہتی تھی بالکل احمدی طرح۔

بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں نمی پھیل گئی۔ میں نے دیکھا۔ بابا جان اور ماں جی کی آنکھیں بھی نم ہو رہی تھیں۔ وہاں موجود ہم سب احمدی کی یادوں میں گھر گئے تھے۔

”لو کے!“ میں نے سب کو احمدی کی یادوں سے باہر لانے کی کوشش کی۔ میرے اخبار میں آپ کی نوکری پائی۔ دو چار روز تک ڈیکوریشن مل جائے گا تو میں آپ کو انعام کروں گا۔“

اس نے سر ہلادیا۔ میں نے دیکھا باوجود ضبط کے بھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلتے تھے۔
 ”کیا خیال ہے Pay وغیرہ بھی ملے کر لیں ابھی

”وہی آپ کی ڈیمانڈ کیا ہوگی؟“ میں اسے اس فیر سے نکالنا چاہتا تھا۔
 ہلکی سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا اور وہ ٹرے اٹھا کر باہر چلی گئی۔

آمنہ شاہ فاطمہ کی بیٹی، عروج اس کی دوست، آمنہ اور عاشی کی دوستی ہو چکی تھی اور عاشی اسے سب خبریں دیتی رہتی تھی۔
 ”اسید بھائی! آمنہ کہہ رہی تھی کہ آپ اپنے اخبار میں اس کی کہانیاں بھی شائع کریں۔ کرس گے نا!“
 ”یا گل! اخبار میں کہانیاں نہیں چھپتیں۔“ سعید نے اسے ٹوکا تھا۔

”سنڈے میگزین میں تو چھپتی ہیں نا تو وہ سنڈے میگزین کے لیے بھیج دیا کرے گی۔“
 لیکن وہ جو ستر ستر صفحے کی کہانیاں لکھتی ہے نا وہ سنڈے میگزین میں نہیں چھپ سکتیں۔“
 ”تو وہ مختصر لکھ لے گی۔“

دونوں بحث کرنے لگے تھے لیکن پھر یوں ہوا کہ آمنہ کے پاپا کراچی کے حالات سے گھبرا کر لاہور شفٹ ہو گئے جب میرے اخبار کی پہلی کاپی آئی تھی تو وہ لاہور آچکی تھی۔ اور جگمگاتی آنکھوں والی وہ لڑکی بہت ایکسائٹڈ تھی اور میرے اخبار کے آفس میں بیٹھ کر صدف اور عروج کے ساتھ اس نے مستقبل کے لیے نہ جانے کتنے پلان بنا ڈالے تھے۔ عروج اس کی کزن بھی تھی اور دوست بھی۔

پھر حامد تھا بے حد ذہین اور جینٹلس۔ خود بخود ہی ایک ٹیم بن گئی تھی۔ ہم سب ایک جیسی سوچ رکھنے والے تھے۔

”نوید سحر۔“ اخبار کا یہ نام آمنہ نے تجویز کیا تھا اور پتا نہیں کیا بات تھی کہ جب عاشی نے کہا کہ آمنہ کہہ رہی ہے کہ اخبار کا نام ”نوید سحر“ رکھ لیں۔ تو میں نے اسے اٹھنے اور جالا تک سعید راجیل اور صدف نے کئی اور نام بھی تجویز کیے تھے۔ جلد ہی ہمارے اخبار کا ایک نام بن گیا تھا۔ ہم سب بہت محنت کرتے تھے۔

آمنہ نے خواتین کا صفحہ سنبھال لیا تھا۔ صدف

آمنہ نے خواتین کا صفحہ سنبھال لیا تھا۔ صدف

کرنا تھی۔

شاید ہم اس نظام کو بدل نہیں سکتے تھے۔ رشتوں کو تبدیل نہیں کر سکتے تھے۔

ہم لالچ اور ہوس سے آلودہ دلوں میں قناعت پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن ہم ایک کوشش تو کر سکتے تھے اور میں نے یہ کوشش کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ داوا کہتے تھے انسان کو اپنے حصے کا کام کر لینا چاہیے یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ دوسرا نہیں کر رہا تو میں کیوں کروں۔ میرے ساتھ مختص ساتھی تھے۔

محب وطن۔

اور دلوں میں کچھ کرنے کا جذبہ رکھنے والے۔ سو میں نے اس راستے پر قدم رکھ دیا تھا۔ جہاں قدم قدم پر رکاوٹیں تھیں۔

مشکلات تھیں۔ آبلہ پائی تھی لیکن مجھے اسی راستے پر چلنا تھا۔ یہ طے ہو چکا تھا۔

اور اس کانٹوں بھرے راستے پر چلتے چلتے مجھے لگا کہ میرے اندر کہیں ایک تار اساتھمنا ہے۔

ایک روشنی سی جگمگ کرتی ہے۔

اور یہ آمنہ کی محبت کی روشنی تھی جو کسی ٹھنڈے پیٹھے احساس کی طرح تھکی ماندی زندگی کو حرارت بخشتی تھی۔

آمنہ شاہ۔

جو بہت پیاری اور کومل تھی۔ جس کے دل کا حسن اس کے حسین چہرے پر جھلکاتا تھا۔ اور خوب صورت اور پلج چہرے پر کسی جھیل کے پانیوں کا عکس سوچوں کی روشن کرنوں سے چکا چوندا کرتا۔

”تو میں آمنہ شاہ سے محبت کرنے لگا ہوں۔ اور یہ محبت ہے“

میں نے بے حد حیران ہو کر سوچا تھا اور اس انکشاف نے مجھے ششدر کر دیا۔

نہیں بھلا یہ کسے ممکن ہے؟ اور میں... میری زندگی تو ہر لمحہ داؤ پر لگی ہے۔ صبح و شام دھمکیاں مار دینے کی۔ ختم کر دینے کی اور نہیں مجھے ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ میں اپنے ساتھ اس کومل اور نازک سی

لڑکی کو بھی کانٹوں پر گھسیٹوں۔ وہ جو حکومت کر سکتے لیے پیدا ہوئی ہے۔

جو اتنی نایاب اور انمول ہے کہ کسی بھی کی Entire desire ہو سکتی ہے۔ اور مجھے بہت جنگ کرنا ہے اور اس جنگ میں کتنے زخم کھائے گئے، کتنے کانٹے چبھیں گے نہیں جانتا۔ تو شاید مقدر ٹھہری۔

مجھے لگا جیسے محبت کا پودا میرے دل میں اگایا تھا اس پر نار سائی کی پت جھڑا اتر آئی تھی۔ طمن کے پھول نہ تھے۔ کیونکہ میرا سفر طویل بھی تھا اور خاردار بھی۔

وہ نازک اور کومل تو میں اس محبت کی آگ کو پانی سے چھیننے مار مار کر بجھانے لگا جو خود بخود ہی میرے دل

بھڑک اٹھی تھی۔ اور میں نے قلم اٹھا لیا تھا۔ اور بے دھڑک لکھ رہا تھا۔ ان کے خلاف جو انسانوں کا خون

چوسنے والے اور گوشت کھانے والے وہ مہائیر تھے۔ جو چند کنٹوں کے عوض اپنے ایمان ہضمیر اور ملک

کا سودا کر رہے تھے۔ جن کے اندر دھڑکتے دلوں میں سیاہیاں پیدا ہوئی تھیں اور ان سیاہیوں نے ان کے چہرے مسخ کر دیا تھے۔ میں لکھنے میں مگن تھا اور میں نے محبت کی طرف سے پیٹھ موڑ لی تھی۔

زندگی کے عجائب خانہ میں اترنا کوئی معمولی بات نہیں۔

کسی انجمن کی ہم رکابی کوئی عام بات نہیں۔ لہذا میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور سوچا تھا، محبت میرے دل سے رخصت ہو گئی لیکن وہ تو ایسے ہی

میرے دل میں موجود تھی اور آمنہ شاہ میرے ساتھ کھڑی مسکرا رہی تھی۔

”سنو اسید عبدالرحمن! تم محبت سے کتنا بھی غم

جراؤ۔ تم اس سے بچ نہیں سکتے۔ بولو کیا مجھے بھول گئے۔ کیا میرے بغیر زندگی گزار پاؤ گے؟“

میرے پاس اس کے خاموش سوالوں کا جواب نہیں تھا۔ لیکن میں اپنے سفر پر چلتے ہوئے اس محبت کو دل سے نکالنے کی کوشش کرتا رہتا۔ یہ

میرے پاس اس کے خاموش سوالوں کا جواب نہیں تھا۔ لیکن میں اپنے سفر پر چلتے ہوئے اس محبت کو دل سے نکالنے کی کوشش کرتا رہتا۔ یہ

میرے پاس اس کے خاموش سوالوں کا جواب نہیں تھا۔ لیکن میں اپنے سفر پر چلتے ہوئے اس محبت کو دل سے نکالنے کی کوشش کرتا رہتا۔ یہ

صراط سے جس پر مجھے اکیلے چلنا تھا۔ لیکن محبت بضد تھی کہ وہ بھی میرے ہمراہ نہیں رہے گی۔

اور میں عروج مصطفیٰ ہوں آمنہ کی دوست اور ماموں زاد بہن مجھے آمنہ سے ہمیشہ ہی محبت رہی ہے اور میں نے ہمیشہ اسے آئیڈل لائز کیا۔ شاید اس کی وجہ اس کی بے پناہ ذہانت ہے۔ اس کا رائٹ ہونا ہے۔

ہمت کم عمری میں ہی اس نے خواتین کے پرجوں میں اپنا ایک مقام بنا لیا تھا۔

مجھے اس کی تحریر اس کی کہانیاں بہت پسند تھیں۔ میں سوچتی تھی کاش میں بھی اس کی طرح لکھ سکوں۔ میری کہانیاں بھی خواتین کے پرجوں میں چھپیں اور لڑکیاں ان کے لیے تعریفی خط لکھیں لیکن میں یہ بھی جانتی تھی کہ شاید میں بھی آمنہ جیسا نہ لکھ سکوں یا شاید کبھی لکھ ہی نہ سکوں جبکہ فاطمہ پھوپھو کہتی تھیں تم لکھ سکتی ہو۔ تمہارے اندر یہ صلاحیت ہے لیکن تم کوشش نہیں کرتی ہو۔

جب آمنہ لاہور آئی اور اس نے ”نویدِ سحر“ کو جو ان کیا تو میں بھی اس کے ساتھ جانے لگی۔ اسید نے میرے ذمہ خواتین کے صفحے کی ترتیب کا کام لگا دیا تھا۔ میں بس خواتین کے صفحے کے لیے آنے والے اقتباسات شعر اور اقوال زریں ترتیب دیتی تھی گو میرا اپنا تو لکھنے کا کوئی کام نہ تھا پھر بھی میں خوش تھی کہ میں ان لوگوں کے لیے کام کر رہی ہوں جو کچھ کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ یہ سب مخلص اور محبت وطن لوگ تھے۔ ان کے ہاتھ میں قلم تھا، قلم جو ہاتھ میں ہو تو بولنے لگتا ہے۔ کبھی زخموں پر مرہم رکھتا ہے۔

کبھی زخموں کو کیر دیتا ہے اور گہرا کرتا ہے۔

کبھی گیت گاتا اور لووریاں سناتا ہے۔

کبھی سوئے ہوئے کو جگاتا ہے۔

کبھی یوں گرتا ہے کہ آدمی سہم کر رہ جائے دہل جائے۔

کبھی اتنا نرم و حساس کہ کسی بچے کی آنکھ میں آنسو دیکھ کر رو پڑے۔

کبھی اتنا سخت اور بے رحم کہ لاشوں کے انبار پر بیٹھے۔

نیو کی کی طرح بانسری بجائے۔

اور اس ساری فسوں کاری کا محرک وہ ہاتھ جس میں قلم ہے۔

وہ ہاتھ اگر معتبر ہے تو وہ قلم بھی معتبر ہے۔ محترم

اصل میں قلم، قلم رکھنے والے کے ظرف کو آزما

ہے اسے پرکھتا ہے۔ چاہتا ہے پھر اس کی مرضی پر

چلنے لگتا ہے۔

گو یا وہ آئینہ ہے ایسا آئینہ جس میں ایک عکس چمکتا ہے ایک ہی شبیب اترتی ہے۔

قلم عکس ہے قلم رکھنے والے کا۔

کم طرف ہاتھ میں قلم کم طرف وہ وقعت ہو جاتا ہے اور با طرف ہاتھ میں معتبر محترم سو آدمی کو پہچاننا

ہو تو اس کے قلم کو دیکھو اس ہاتھ کو نہ دیکھو جس میں قلم ہے۔ سو قلم کی آبرو ہاتھ کی آبرو اور ہاتھ والے کا

وقار قلم کی آبرو قلم تو بہت سے رکھتے ہیں پر قلم کی آبرو کا پاس کسی کسی کو ہے۔ قلم کا حق کوئی کوئی ادا کرتا ہے۔

ان بہت سارے ہاتھوں میں میرے ان سب دوستوں کے ہاتھ بھی شامل ہیں جو قلم تھامے ہوئے ہیں۔

تھامے رکھنا چاہتے ہیں جیسے بہت سارے چراغ اندھیری رات میں روشن ہیں اور تاریکی سے نیرو آزا

ہیں۔ شاید ان میں سے کچھ چراغ بجھ جائیں اور کچھ تند ہی باد مخالف میں بھی جلتے رہیں۔

قلم میرے ہاتھ میں بھی ہے قلم آپ کے ہاتھ میں بھی ہے لیکن قلم کی آبرو کون برقرار رکھتا ہے اس کا فیصلہ آنے والا وقت کرے گا۔ فی الحال تو آپ اس

کہانی کو پڑھیے۔ یہ میری پہلی کہانی ہے۔ آمنہ شاہ کی کہانیاں پڑھ کر مجھے لکھنے کا شوق پیدا ہوا تھا اور آج آمنہ شاہ اور اسید عبدالرحمن کی کہانی لکھتے ہوئے میرا خیال ہے کہ میں بھی لکھ سکتی ہوں۔

آپ کا کیا خیال ہے کہانی پڑھ کر مجھے ضرورتاً بتائیے گا۔ میری کہانی کا نام ہے ”پل صراط۔“

میری بھینس کو ذمہ کیوں پارا؟

تیرے باپ کا وہ کیا کرتی تھی؟

وہ تو صیت میں چارہ چرتی تھی۔

ہاں ہی کھیت میں چارہ چرتی تھی

سنو کھیت میں چارہ چرتی تھی

سعید نیبل پر پاؤں لٹکائے بیٹھا لٹک لٹک کر گاربا تھا۔

”تم ڈاکٹر بننے کے بجائے سنگریوں نہیں بن جاتے خدا کی قسم بہت کامیاب رہو گے۔“

فیصل نے جو اسید کے ایک آرٹیکل کی پروف ریڈنگ چیک کر رہا تھا سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”دراصل اسے خوف ہے کہ باقی سنگراس کی سرلی آواز سن کر کہیں بھاگ ہی نہ جائیں۔“

حامد نے جو کچھ فیصلے پر کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا نہ جانے کیا تلاش کر رہا تھا مگر سعید کی طرف دیکھا۔

”ویسے اس کا ٹیسٹ بھی بہت اعلیٰ ہے۔ نا عاشی!“

آمنہ نچلے ہوئے کا دایاں کونہ دانتوں تلے دبائے عاشی کو دیکھ رہی تھی۔

”اس میں کیا شک ہے ڈیر سسٹر!“ سعید نیبل سے نیچے اتر آیا۔

”بائے دادے تمہیں کیا آج کل لگ نہیں جاتا تھا؟“

حامد نے پھر پوچھا۔

”جانا تو تھا بلکہ جا رہا ہوں اس وقت تو عاشی کو چھوڑنے آیا تھا۔“

”اچھا!“ آمنہ نے اچھا کو لبا کیا اور معنی خیز نظروں سے عاشی کو دیکھا اور عاشی اس کے اس طرح دیکھنے سے یک دم سرخ ہو گئی۔

”یہ عاشی کو ڈراپ کرنے اور پک کرنے کی ذمہ داری تم نے کیوں اٹھا رکھی ہے یہ اسید کے ساتھ بھی تو آسکتی ہے؟“

”دراصل... وہ دائیں کلن کی لو مروڑنے لگا۔“

”اسید سے سحر خیز اور یہ محترمہ اٹھتی ہیں دوپہر کو اور اسید ان کے اٹھنے کا انتظار نہیں کر سکتا۔“

”جھوٹ مت بولو میں ساڑھے آٹھ تک اٹھ جاتی ہوں۔“

”اور ناشتا کرتے تیار ہوتے نونج جاتے ہیں۔“

سعید نے اس کی بات کالی: ”جبکہ اسید ساڑھے سات گھر سے نکل پڑتا ہے تو ان محترمہ نے مجھ سے دست

بستہ عرض کی تھی۔ پلیز سعید تم تو نوبے جے جاتے ہو نا مجھے بھی ڈراپ کر جایا کرو۔“

اس نے باریک آواز میں عاشی کی نقل اتاری۔

”کوئی بھی نہیں۔“ عاشی جھینب گئی۔

”ویسے یہ سب لوگ تو کوئی کام کرنے آتے ہیں۔ تم کس لیے آئی ہو؟ کیا دل بہلانے۔“ وہ شرارت سے عاشی کو دیکھ رہا تھا۔

”تمہیں کیا؟“ عاشی چڑھی۔ ”تم بہلاؤ اپنی ”فل فلونی“ کا دل۔“

”میری فل فلونی۔“ اس نے دل پر ہاتھ رکھا۔

”ہائے سوئی فل فلونی کہاں تھی وہ۔ قریب جا کر جو دیکھا تو کھلی کھلا رہی تھی۔“

فیصل نے اکتھیا رہنا۔

”تمہیں بھینسوں سے بہت دلچسپی ہے سعید! تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ ڈاکٹری چھوڑ کر گوالے بن جاؤ۔“

ایمان سے دودھ تو خالص ملے گا۔ ورنہ دودھ کے نام پر جو مخلول آج کل مل رہا ہے نا وہ ضرور کسی موزی مرض میں مبتلا کر دے گا۔“

آمنہ نے قلم نیبل پر رکھ کر بظاہر سنجیدگی سے کہا لیکن اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

”ہائے بہنا! کیا بتاؤں کتنی حسین لگتی ہیں یہ مجھے۔ سیاہ آنسو رنگت یہ مزے ہوئے سینک ان کے حسن کا کیا کہنا اور پھر چال کا بانگہن آپ کو کیا پتا۔“

بالے گجری کتنی ہی بھینسوں میں دل انکا ہوا ہے میرا۔ دل چاہتا ہے اغوا کر لوں۔ دودھ تو خالص ملے گا۔“

آخری بات اس نے آسکتی سے کہی تھی۔

سب ہی ہنس رہے تھے اور عاشری سرخ چہرے کے ساتھ اسے گھور رہی تھی۔

”تمہیں تو ”بھینسوں“ کی سوسائٹی کی طرف سے ایوارڈ ملنا چاہیے۔“

تب ہی دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ کھلا تھا۔ پیشانی پر لکیریں ڈالے ایک شخص اندر داخل ہوا۔

سب خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

”فرمائیے!“ سب سے پہلے خالد کو ہی خیال آیا تھا۔

”کس سے ملنا ہے آپ کو“

”وہ کہاں ہے تمہارا بڑا اسید عبدالرحمن۔“

اس نے کھوجتی نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور اس ہال کمرے کے دائیں طرف والے کمرے پر چیف ایڈیٹر کی تختی دیکھ کر اس کی طرف بڑھا۔

”وہ ابھی نہیں آئے آپ کو کیا کام ہے ان سے؟“

سعید بہت غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”کام!“ وہ عجیب طرح سے ہنسا اور اپنا دایاں ہاتھ تنبیہ والے انداز میں اوپر اٹھایا دایاں ہاتھ کی تین انگلیوں میں موٹی موٹی انگوٹھیاں تھیں جن میں مختلف رنگوں کے پتھر جڑے تھے۔

”اس سے کہہ دینا کہ یہ جو بکواس وہ آج کل لکھ رہا ہے نا اپنے اخبار میں اسے بند کر دے ورنہ...“

”ورنہ کیا ہوگا؟“

اب خالد اپنی جگہ کھڑا ہو گیا تھا اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”درنہ۔“ اس نے چٹکی بجائی۔ ”یوں ہو گا۔ یوں لاش بھی نہیں ملے گی اس کی۔“

وہ پھر اسی طرح سے ہنسا تھا۔ عجیب سی سنسنی پیدا کرتی ہوئی تھی۔ عروج نے گھبرا کر آمنہ کی طرف دیکھا۔ جو ساکت بیٹھی تھی۔

”تم وہی ہونا ایک وزیر کے کارندے ایک بار اسپتال میں میری ڈیوٹی لگی ہوئی تھی اور وہ وہاں وی آئی ٹی روم میں داخل تھے اور تم ان کے پاس تھے۔“

”ڈاکٹر! تم اپنے کام سے کام رکھو، تمہیں کیا کہ میں کون ہوں اور کس کے ساتھ ہوں اور۔“

وہ حامد کی طرف مڑا۔

”کہہ دینا اس سے کہ زیادہ ہاتھ پاؤں نہ پھیلائے ورنہ ہم ہاتھ باندھنا بھی جانتے ہیں اور توڑنا بھی اور تمہارے جیسے احمقوں کا یہ ٹولہ کسی کا بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“

پھر سب کو باری باری دیکھتا ہوا وہ جس طرح آیا تھا اسی طرح باہر نکل گیا۔

”یہ یہ کیا تھا سعید؟“ عاشری اس کے جاتے ہی اٹھ کر سعید کے پاس آئی۔ ”یہ شخص اس طرح کیوں دھمکیاں دے رہا تھا؟“

”کچھ نہیں۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔“

اس نے ایک تسلی آمیز نظر عاشری پر ڈالی۔

ویسے آج کل اسید کس موضوع پر لکھ رہا تھا۔

”آج کل وہ این جی اوز پر کام کر رہا تھا۔ وہ نام نہاد این جی اوز جو عورت کو حقوق دلانے کے نام پر حکومت اور دوسرے اداروں سے لاکھوں روپے کھا رہی ہیں۔“

اور وہ این جی اوز جو دیہی علاقوں کی بھلائی کے نام پر وہاں بے ہودہ لٹریچر تقسیم کر کے گراہی کو فروغ دے رہی ہیں۔“

اور وہ این جی اوز جن کے کرتا دھرتا یہودی اور مسلمان دشمن لوگ ہیں جن کا مقصد اسلام کے متعلق غلط نظریات پھیلاتا اور لوگوں کو اسلام سے متنفر کرنا ہے۔“

صدف نے جواب تک خاموش بیٹھی تھی تفصیل سے بتایا۔

”ویسے اس وقت اسید ہے کہاں؟ وہ تو ہم سب سے پہلے یہاں موجود ہوتا تھا۔“

آمنہ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا۔ اس کے چہرے پر بکھری پریشانی کو سب نے ہی نوٹ کیا۔

”وہ کسی ڈاکٹر فہد علی سے ملنے گیا ہے نا شہتہ کرتے“

ہی نکل گیا تھا۔“

”یہ ڈاکٹر فہد کون ہے؟“

آمنہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”معلوم نہیں۔“ سعید نے کندھے اچکائے۔ ”صبح وہ دادا جان کو بتا رہا تھا کہ میں ڈاکٹر فہد کی طرف جا رہا ہوں تو سنا۔“

”ڈاکٹر فہد دراصل ایک این جی اوز میں چار سال تک جاب کرتے رہے ہیں۔ سو درون خانہ کئی رازوں سے واقف ہیں۔ انہوں نے پہلا آرٹیکل چھپنے کے بعد خود ہی فون کیا تھا اسید کو اور بتایا تھا کہ وہ بہت کچھ جانتے ہیں اور لکھنا چاہتے ہیں ان کے متعلق کہ ان این جی اوز کی حقیقت کیا ہے؟“

صدف نے پھر تفصیل بتائی تب ہی ایک کمرے سے کیمرو کندھے پر لٹکائے دلیر خان نکلا۔ دلیر خان بیس بائیس سال کا ایک بے حد جینس فوٹو گرافر تھا۔ اس کا تعلق باجوڑ ایجنسی کے ایک گاؤں ڈومہ ڈولا سے تھا۔

سب ہی اس سے پیار کرتے تھے اگرچہ اسے یہاں جوائن کیے چند ماہ ہی ہوئے تھے ابھی پچھلے دنوں ایک عمارت میں جو آگ لگی تھی تو وہ تصویریں بنانے کے چکر میں عمارت میں بہت آگے تک چلا گیا تھا۔ جس پر اسید نے اسے ڈانٹا بھی تھا کہ تصویروں سے زیادہ تمہاری زندگی ہمارے لیے اہم ہے دلیرا!

”فرض کے سامنے زندگی کوئی معنی نہیں رکھتی سب! فرض کے لیے جان بھی قربان کی جاسکتی ہے۔“

اسے باہر آتے دیکھ کر حامد بھی اپنا بیگ کندھے پر لٹکا کر کھڑا ہو گیا۔

”اوکے تو پھر ہم چلتے ہیں۔“

”تم لوگ کہاں جا رہے ہو بھئی؟“

”ایک تقریب کی کوآرڈینیشن کرنی ہے۔“

”کوئی سیاسی تقریب۔“ فیصل نے پوچھا۔

”مطلی جلی۔“

”اوکے۔ زندگی ہوئی تو پھر ملیں گے اللہ حافظ۔“

فیصل نے اپنا مخصوص جملہ دہرایا۔

اس کی عادت تھی کہ جب کوئی باہر جاتا یا خود اسے

کہیں جانا ہوتا تو یہ جملہ ضرور کہتا۔

”گھر سے باہر جانے والا شخص یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ زندہ واپس آئے گا یا کسی دھماکے کا شکار ہو جائے گا یا غائب کر دیا جائے گا۔“

”اور تمہیں کیا تمہیں کالج نہیں جانا؟“

صدف نے پوچھا تو سعید نے جو فیصل کے کہنے گئے جملے پر غور کر رہا تھا چونک کر اسے دیکھا۔

”ہاں میرا موڈ نہیں ہے۔“

”یہ تمہارا فائنل ایر ہے سعید اور تمہیں یوں لا پرواہی نہیں کرنا چاہیے۔“ صدف نے بڑی بہنوں کی طرح نصیحت کی۔

”تم لوگوں کو دیکھ دیکھ کر میرا جی چاہنے لگا ہے کہ میں بھی تمہاری فیلڈ میں آجاؤں۔“ وہ بے حد سنجیدہ لگ رہا تھا۔

”ہمیں ہمارے ملک کو اچھے صحافیوں کی ہی نہیں اچھے ڈاکٹروں کی بھی ضرورت ہے۔“

”ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ ایک وزیر کا بھلا این جی اوز سے کیا تعلق اور یہ شخص جو ابھی دھمکی دینے آیا تھا یہ۔“

عاشری نے جو ابھی تک کھڑی تھی کسی کو مخاطب کیے بغیر کہا۔

”بڑی جلدی خیال آ گیا ہے صفدر!“ سعید تھوڑا سا اس کی طرف جھکا۔ ”دراصل یہ جو وزیر صاحب ہیں نا، اپنا این جی اوز والوں نے ان کی بھیتیں چرائی تھی۔“

”مخبردار جو اب تم نے بھینس کا نام لیا۔“ عاشری نے اس کے بازو پر مکا مارا۔

”ویسے یہ ڈاکٹر فہد رہتا کہاں ہے؟“ آمنہ نے پوچھا۔

”معلوم نہیں۔“ سعید نے کندھے اچکائے۔

”تمہیں پوچھنا تو چاہیے تھا نا جبکہ اسید کو ایک بار بقول تمہارے ہی گاڑی سے کچلنے کی کوشش بھی کی گئی تھی۔“

”ریلیکس آمنہ! کچھ نہیں ہوتا، آجائے گا ابھی۔“

صدف نے آہستگی سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔
 ”چلو دیکھیں ذرا مصدق صاحب نے ”سرخیاں“
 بنالیں۔ اسید نے کہا تھا نا ایک نظر دیکھ لیتا۔“
 تب ہی سعید کے سیل کی بپ ہوئی اس نے پاکٹ
 سے فون نکال کر دیکھا اور ماتھے پر ہاتھ مارا۔
 ”اوہ۔ میں تو بھول ہی گیا تھا۔ آج تو نورین نے ہم
 سب فرینڈز کو ریٹ دینا بھی اپنی برتھ ڈے کی اسی کی
 مس کال ہے۔ اوسکے میں چلا۔“
 ”خفے میں بھینس دے دیتا۔“
 عاشی نے پیچھے سے آواز دی تو دروازہ کھولتے ہوئے
 اس نے مڑ کر اسے دیکھا۔
 ”تمہارے مشورہ اچھا ہے لیکن میرے جیسا
 غریب اسٹوڈنٹ بھینس کی تصویر دے سکتا ہے بھینس
 نہیں اور ہاں۔“ اس نے انگلی اٹھائی۔ ”اب تم نے
 بھینس کا ذکر کیا ہے میں نے نہیں۔“
 اور عاشی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی تیزی سے باہر
 نکل گیا اور اس کے جانے کے بعد سب لوگ اپنے
 اپنے کام میں مصروف ہو گئے تھے۔ اندر دوسرے ہال
 میں بھی اخبار سے متعلق لوگ اپنے اپنے کاموں میں
 مصروف تھے لیکن آمنہ قلم ہاتھ میں تھامے خالی
 الذہن سی بیٹھی تھی۔
 یہ اسید نے کس خاردار میں قدم رکھ دیا ہے۔
 گو ایک بے باک صحافی کی حیثیت سے اس نے اپنی
 پہچان کروالی تھی اور ان چند ماہ میں اخبار کی سرکولیشن
 مزید بڑھی تھی۔ کئی بڑے اخباروں میں تبصرہ کیا گیا تھا
 کہ ”صبح نو“ کے بند ہو جانے سے جو خلا ہو گیا تھا۔
 ”نوید سحر“ نے اس کی کمی بہت حد تک پوری کر دی
 ہے۔
 پھر بھی یہ ہر لمحہ خوف کی زندگی۔
 کتنی دھمکیاں دی جاتی تھیں اسید کو۔
 بھلا زندگی کو یوں واؤپر لگانا عقل مندی تو نہیں ہے
 نا! اب جو اسید نے منشیات اور بھکاریوں پر لکھا تو کیا
 یہ سب ختم ہو گیا؟ یا اب یہ اس جی اوز ختم ہو جائیں گی
 یا اس سے پہلے جو کالے جاو کرنے والوں کے خلاف

اتنے آرنیکل اتنے انٹرویو چھے۔ اتنے لوگوں نے اظہار
 خیال کیا تو یہ لوگ کام چھوڑ کر چلے گئے کہیں؟ ان کا
 کاروبار تو پہلے سے بھی زیادہ چمک رہا ہے اور ہر اخبار
 میں کیبل پر دیواروں پر ان کے اشتہارات کی بھرمار
 ہے۔ میں کہوں گی اسید سے کہ چھوڑ دے سب کیا
 ضرورت ہے خواجواہ مصیبتیں مول لینے کی۔ سب
 زندگی سیدھے سادے راستے پر چلتے ہوئے سکون سے
 گزر سکتی ہے تو پھر کیوں آدمی میڑھے راستے اٹھائے۔
 وہ تو اپنے افسانوں کے کرداروں جیسی زندگی گزارنا
 چاہتی تھی۔
 سبک رندی کی طرح۔
 دھیرے دھیرے بہتی زندگی۔
 جس میں محبت اور خوشی کے رنگوں کی پاپیل ہو اور
 بس۔۔۔
 اس نے یہ سب سوچا تو تھا لیکن جب اسید آفس
 آیا تو وہ اس سے ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی۔ وہ بہت
 پر جوش تھا۔
 ”ڈاکٹر فمد نے جو انکشافات کیے ہیں وہ بہت حیران
 کن ہیں۔ تم تصور بھی نہیں کر سکتیں صدف! کہ ان
 اس جی اوز کے پوشیدہ مقاصد کیا ہیں؟ یہ یہاں ہمارے
 ملک میں کیا انقلاب لانا چاہ رہے ہیں۔“
 اس نے مختصراً ”فمد سے معلوم ہو جانے والی باتیں
 بتائی تھیں۔ وہ سب خاموشی سے اس کی بات سنتے
 رہے تھے اور جب اس نے بات مکمل کر لی تو فیصل نے
 اسے آفس میں آنے والے شخص اور اس دھمکی کے
 متعلق بتایا جو وہ دے گیا تھا۔
 ”ہوں۔“ اسید نے سر ہلایا۔ ”ایسی دھمکیاں تو
 بہت دنوں سے مل رہی ہیں۔ میں نے جب اس خاردار
 میں قدم رکھا تھا تو میں جانتا تھا کہ یہ آسان نہیں
 ہے۔ جان بھی جاسکتی ہے۔ مگر مجھے یہ سب کرنا ہے کہ
 میں نے اس کا عہد کیا ہے۔ اظہر سے اور آفتاب حسین
 سے کہ میں اپنے آخری سانس تک برائیوں کے
 خلاف جہاد جاری رکھوں گا۔ چاہے کچھ بھی
 ہو جائے۔“

”ہم سب تمہارے ساتھ ہیں اسید!“ صدف نے
 ذرا کہا۔
 ”تم سب!“ اسید نے باری باری سب کی طرف
 دیکھا۔
 ”فیصل! آمنہ! عاشی! عروج! تم سب چاہو تو کہیں
 کسی اور اچھے اخبار میں جا سکتے ہو۔ حامد اور دلیر کو
 بھی میرا پیغام دے دینا۔ حامد کے سیاسی تبصرے اتنے
 زبردست ہوتے ہیں کہ کوئی بھی اخبار اسے بخوشی قبول
 کر لے گا۔ فیصل کے فیچر صدف اور آمنہ کے سروے
 تم سب کا اتنا نام ہو چکا ہے کہ کہیں بھی تمہیں اچھی
 جا ب مل سکتی ہے اور آمنہ کا تو خیر پہلے ہی ایک مقام
 ہے۔ ایک نام ہے ادب کی دنیا میں۔“
 ”تم کیا سمجھتے ہو اسید عبد الرحمن! کہ صرف تم ہی
 ایک تھے اور بے باک صحافی ہو اور ہم سب قلم کی
 حرمت بچنے والے۔“
 آمنہ کونہ جانے کیوں غصہ آگیا تھا۔
 ”ہم اگر بزدل ہوتے تو اسی روز تمہارا ساتھ چھوڑ
 جاتے جب تم نے یہاں اسی کمرے میں ہم سے کہا تھا
 کہ اب تم وہ لکھو گے جس کے لیے ہم نے یہ اخبار
 شروع کیا تھا، تمہیں شاید یاد نہ ہو لیکن تم نے بہت
 اچھی طرح سے ہر بات ہر خطرے اور ہر مشکل کی
 وضاحت کر دی تھی۔“
 اسید کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار
 ہوئی۔ وہ بہت دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔
 ”آئی ایم سوری آمنہ! شاید تم میری باتوں سے
 ہرٹ ہوئی ہو۔ لیکن میرا فرض بنتا ہے کہ میں تمہیں
 وہ سب بتا دوں جو تم نہیں جانتے۔ مجھے خود اندازہ نہیں
 تھا کہ یہ اتنا مشکل کام ہو گا اور اس طرح قدم قدم پر
 مجھے روکا جائے گا اور مجھے دھمکیاں دی جائیں گی۔ کبھی
 قتل کی دھمکی۔ کبھی اخبار کا ڈیٹیکلوشن ضبط کروانے
 کی دھمکی اور کبھی میرے سے خریدنے کی دھمکی۔ میں سچ سچ
 نہیں چاہتا کہ تم لوگ کسی مشکل میں پڑو۔“
 ”تو تم یہ سب چھوڑ کیوں نہیں دیتے اسید!“ عاشی
 نے احمقوں کی طرح کہا۔ ”کیا صرف ہماری زندگیاں

قیمتی ہیں تمہاری زندگی قیمتی نہیں۔“
 اوہ عاشی! کیا سعید نے تمہیں نہیں بتایا تھا کہ داوی جان
 کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور وہ تمہیں بلا رہی
 تھیں۔“
 اسید کو اب یاد آیا تھا کہ عاشی کو تو آج گھر ہونا
 چاہیے تھا۔
 ”تمہیں تو۔“ عاشی نے انکار کیا۔ ”وہ ہے ہی بھلا کڑ۔
 پتا نہیں میڈیکل کی اتنی بڑی بڑی کتابیں کیسے ریٹ لیتا
 ہے۔ خیر میں ابھی چلی جاتی ہوں۔“
 ”اب کیسے جاؤ گی اکیلی۔ میرے ساتھ ہی چلنا۔“
 ”اچھا!“ عاشی نے آہستہ میں سر ہلادیا۔ موضوع
 بدل گیا تھا۔
 ”مجھے آج جلدی جانا ہے۔“ آمنہ کھڑی ہو گئی۔
 ”میں اسے ڈراپ کر لی جاؤں گی۔“
 ”ناراض ہو کر جا رہی ہو؟“ اسید بے اختیار پوچھ
 بیٹھا۔
 ”نہیں۔ آج ماما کے ساتھ جانا تھا کہیں۔“ آمنہ کی
 آنکھوں میں بیک دم روشنی سی کوندی تھی۔ تو اسے
 اسید عبد الرحمن کو اس کا احساس ہے۔
 ”تھینکس۔“ اسید اپنے آفس کی طرف بڑھ
 گیا۔
 اور آمنہ عروج اور عاشی باہر نکل گئیں۔
 * * *
 ”کچھ محبتیں آہستہ آہستہ سرایت کر جاتی ہیں اور
 کچھ محبتیں بند دروازے کھول کر زبردستی دل میں
 گھس کر بیٹھ جاتی ہیں۔ پلک جھپکتے میں جب احساس
 ہوتا ہے کہ ایسا ہو گیا ہے تب تک دل اور روح کے
 تمام خلا پر ہو چکے ہوتے ہیں لیکن خالی خالی محبت دل
 میں اتر آنے سے بھی کہیں زندگی سل ہوئی ہے۔“
 ”یہ حقیقت ہے یا افسانہ؟“ عروج نے آمنہ کے
 کندھے پر سے جھکتے ہوئے پڑھا۔
 ”افسانے بھی تو حقیقتوں سے جنم لیتے ہیں نا
 عروج!“ آمنہ نے فائل بند کر دی تو عروج اس کی گری

اس کی آنکھیں نم تھیں اور وہ پتا نہیں اس سے کیا کر رہا تھا لیکن وہ مجھے ایسا ہی لگا تھا جیسے میرے خیالوں نے اسے تراشا تھا۔“

”تم اس سے محبت کرتی ہو آمنہ! اور یہ میں نے پہلے دن ہی جان لیا تھا جب یہاں آفس میں پہلی بار میں تمہارے ساتھ آئی تھی اور تم نے مجھے اس سے متعارف کرایا تھا۔“

عروج نے پورے یقین سے کہا تو آمنہ ایک بار پھر مسکرا دی۔

”حیرت ہے عروج! وہ بات جسے جاننے میں مجھے اتنا عرصہ لگا بلکہ اب بھی میں کبھی کبھی تذبذب میں پڑ جاتی ہوں کہ کیا یہ محبت ہے۔ یہ جذبہ جو ہولے ہولے دل میں چٹکیاں لیتا ہے اور سارے وجود میں عجیب انوکھی سی سنسنی پیدا کرتی خوشی بن کر بکھر جاتا ہے۔ کیا واقعی محبت ہے۔ تم نے اسے محوں میں جان لیا۔ کہیں تمہارا دل تو محبت آشنا نہیں۔“

”نہیں جناب! تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔“

اور دروازے کی تاب پر ہاتھ رکھے اسید عبدالرحمن نے ایک گہری سانس لے کر ہاتھ تاب سے اٹھالیا اور کلپ بورڈ اٹھانے واپس اپنے آفس کی طرف بڑھ گیا۔ وہ نہ جانے آمنہ سے کس بات پر ڈسکس کرنے آیا تھا کہ عروج کی زبان سے اپنا نام سن کر ٹھنک گیا۔

”تو...؟“ اپنے آفس میں آکر کرسی پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھتے ہوئے اس نے سوچا۔

”تو آمنہ شاہ...!“

کئی بار اسے گمان تو گزرا تھا لیکن اس نے ہمیشہ ہی اپنے گمان کو جھٹلایا تھا نہیں بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے اور اب عروج مصطفیٰ کہہ رہی تھی کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے اور خود آمنہ...!“

اس نے یونسی بے مقصد ٹیبل پر پڑے کاغذات کو ادھر ادھر کیا۔

”اور تم اسید عبدالرحمن کیا تم بھی؟“ اندر دل میں کہیں چراغوں سا ہوا۔

کی پشت سے ہٹ کر اس کے سامنے پڑی کرسی پر آکر بیٹھ گئی۔

”بہت دنوں سے تمہارا کوئی نیا افسانہ نہیں آیا۔ کیا یہ کوئی نیا افسانہ لکھ رہی ہو۔“

”نہیں۔“ آمنہ مسکرائی۔ بس یونسی قلم چلا رہی تھی۔

”تمہاری قارئین تمہیں مس کر رہی ہیں۔ کب لکھ رہی ہو نیا افسانہ؟“

”پتا نہیں۔“ آمنہ نے پیشانی پر آجانے والے بالوں کو پیچھے کرتے ہوئے کہا۔ ”آج کل تو زندگی میرا افسانہ لکھ رہی ہے پتا نہیں اس کا اینڈ ٹریجک ہو گا یا خوش گوار۔“

”آمنہ! ایک بات پوچھوں!“ عروج نے بغور اسے دیکھا۔

”پوچھو؟“ آمنہ نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”تم... تم اسید عبدالرحمن سے محبت کرتی ہو؟“

ایک لمحہ کو آمنہ چپ سی اسے دیکھتی رہی۔

”ہاں شاید۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔

”اسے شاید محبت ہی کہتے ہیں۔“

وہ ہولے سے ہنسی۔

”اپنے ڈھیروں ڈھیروں افسانوں میں محبت کا ذکر کرنے کے باوجود مجھے لگتا ہے جیسے میں محبت کو صحیح طرح سے نہیں سمجھ سکتی۔ پتا نہیں یہ محبت سے ‘انسیت ہے‘ لگاؤ ہے‘ احترام ہے یا کیا؟ لیکن عروج مصطفیٰ میں اس شخص اسید عبدالرحمن کو بہت سوچتی ہوں۔ جب میں نے اسے دیکھا نہیں تھا تب بھی کئی بار خیالوں میں اس کا پیکر تراشا تھا۔ اس کے کالم اور آرٹیکل پڑھ کر۔“

وہ سانس لینے کو ذرا سار کی۔

”ایک ناراض، خفا خفا سا شخص۔ اپنے علاوہ تمام لوگوں کے لیے مخلص۔ اپنے وطن سے جنون کی حد تک محبت کرنے والا اور پتا ہے عروج! جب پہلی بار میں نے اسے آفتاب حسین کے گھر نایاب کی تصویر کے سامنے کھڑے دیکھا تو وہ مجھے ایسا ہی لگا۔ اس وقت

وہ بھی تو اسے دیکھ کر دل کی ایک دھڑکن مس کر بیٹھا تھا۔ لیکن دل میں یک دم چراغاں نہیں ہوا تھا بلکہ آہستہ آہستہ ایک احساس دل میں سرایت کر گیا تھا جسے شاید محبت کا نام دیا جاسکتا ہو۔ یہ احساس آمنہ کی موجودگی میں اندر کہیں پھول کھلائے رکھتا تھا اور جس روز آمنہ غیر حاضر ہوتی تو جیسے۔۔۔

”اوہ نہیں!“ سر کو جھٹکا۔ ”میں جس راہ پر قدم رکھ چکا ہوں وہاں محبت کو ہم قدم لے کر نہیں چلا جاسکتا اسید عبدالرحمن!“

اس نے میز پر بڑی فائل اٹھائی اور آمنہ کے سامنے بیٹھی عروج آمنہ کی آنکھوں میں محبت کے رنگ دیکھ کر پوچھ رہی تھی۔

”کیا اسید عبدالرحمن بھی تم سے محبت کرتا ہے؟“

”ہاں نہیں۔“ آمنہ نے ایک گہری سانس لی۔ ”وہ ایسا شخص ہے کہ محبت اس کے قریب سے ہو کر چلی جائے تو اسے پتا نہ چلے۔“

وہ ہولے سے ہنسی۔

”اسے اپنے کام کے سوا کچھ نہیں سوچتا۔ لگتا ہے اللہ تعالیٰ نے اس کے سینے میں دل کی جگہ پتھر رکھ دیا ہے۔“

”خیر اتنا مبالغہ تو نہ کرو آمنہ! اگر اس کے سینے میں پتھر ہوتا تو وہ اس اجنبی لڑکی عافیہ سلیمان کے لیے یوں سرگرداں نہ ہوتا۔ یوں انصاف کا ہر دروازہ نہ کھٹکتا۔“

”پتا نہیں عافیہ سلیمان کہاں کھوئی زمین نکل گئی اسے یا آسمان۔“

”ہاں لیکن اس کی ماں کو یقین ہے کہ اسے اس ابن جی او نے غائب کیا ہے جہاں وہ جا رہی تھی۔“

منہ نے کرسی سے اٹھ کر دراز کھولی اور دراز سے کوئی فائل نکال کر واپس کرسی پر بیٹھتے ہوئے عروج کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”تمہیں پتا ہے عروج! ڈاکٹر فمد نے اسید کو بتایا تھا کہ اس نے عافیہ سلیمان کو نہ جانے کتنی ہی بار اس ابن جی او میں دیکھا تھا۔ بلکہ اس کی عافیہ سے بات

چیت بھی ہوتی رہتی تھی۔

”ڈاکٹر فمد کیا اسی ابن جی او میں جا رہا تھا۔؟“

عروج نے پوچھا۔

”ہاں۔ اور اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ جس رات اس کی ماں اس کے گھر نہ آنے پر اس کا پتا معلوم کرنے پریشان ہو کر ابن جی او کے آفس گئی تھی اس روز بھی عافیہ سلیمان آفس آئی تھی لیکن وہ لوگ سرے سے مگر ہی گئے کہ وہ آئی تھی۔“

”پھر وہ کہاں گئی؟“ عروج کو حیرت ہو رہی تھی۔

”معلوم نہیں لیکن عروج! یہ بہت بڑا المیہ ہے۔ بے چاری لڑکیاں جو اپنے گھر والوں کو بہتر مستقبل دینے اور ان کی آسائش کے لیے گھروں سے نکلتی ہیں زیادہ تنخواہوں کے لالچ میں ان ابن جی او کے چکر میں پھنس جاتی ہیں۔“

آمنہ نے تفصیل بتائی۔

”یہ عافیہ بھی اسی لالچ میں اس ابن جی او میں آئی تھی۔ اس کی ایجوکیشن صرف ایف اے تھی۔ باپ کی وفات کے بعد اس نے محلے کے کسی پرائیویٹ اسکول میں جا کر کئی کئی سالوں سے صرف پندرہ سوڑتے تھے۔ پھر وہاں ہی کسی نے اس سے ”مددگار“ نام کی اس ابن جی او کا ذکر کیا تھا اور پتا ہے اس کی ماں نے بتایا ہے کہ یہ لوگ اسے دس ہزار تنخواہ دے رہے تھے۔“

”اور انہوں نے اسے غائب کیوں کر دیا؟“ عروج نے حیرت سے پوچھا۔

”میں کیا کہہ سکتی ہوں عروج! ان کا مقصد کیا تھا۔ ڈاکٹر فمد نے بتایا تو ہے کہ وہ لوگ بہت مذموم مقاصد رکھتے تھے۔ گو اس نے ابھی تفصیل نہیں بتائی تاہم وہ سب کچھ لکھ رہا ہے جلد ہی اسید کو اپنی رپورٹ دے گا۔“

”لیکن آمنہ!“ عروج نے جرح کی۔ ”اتنے سارے لوگ مختلف ابن جی او میں کام کر رہے ہیں سنا ہے ان کی تنخواہیں بہت اچھی ہیں اور یہ ابن جی او بہت کام کر رہی ہیں تو کیا سب ابن جی او کے پس پردہ اور مقاصد ہیں؟“

”یار! میں کیا کہہ سکتی ہوں؟“ آمنہ ہنستے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ ”کیا خبر کچھ ابن جی او واقعی کوئی بہتر اور رفیعی کام کر رہی ہوں۔ یہ اسید اور حامد اس پر کام تو کر رہے ہیں۔ مضمون چھپیں گے تو پڑھ لیں گے۔“

”تو کیا اسید اب بھی مضمون لکھے گا آمنہ! جبکہ وہ شخص اس روز اتنی دھمکیاں دے کر گیا ہے۔“ عروج نے حیرت سے پوچھا۔

”وہ اسید ہے عروج!“ آمنہ کے لہجے میں خود بخود ہی ایک فخر سا شامل ہو گیا۔ ”وہ ایسی دھمکیوں سے ڈرنے والا نہیں۔“

”ماما کہتی ہیں آفتاب حسین کہتے تھے اسید عبدالرحمن روشنی کا مینار ہے۔“

اور ایک بار پھر دروازے کی تاب پر ہاتھ رکھے رکھے اسید عبدالرحمن ٹھنک کر رہ گیا۔

”اور کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی کسی کو اتنی بلندیوں پر بٹھارتا ہے کہ پھر خود کو ان بلندیوں کا اہل ثابت کرنے کی کوشش میں آوی ہانپ ہانپ جاتا ہے۔“

ابھی کچھ دیر پہلے وہ سوچ رہا تھا کہ وہ اس آرٹیکل کو نہ چھپوائے جسے کل رات اس نے لکھا تھا اور اس میں عافیہ سلیمان کی پوری اسٹوری تھی اور ارباب اقتدار سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ یہ وہ ماں کی اس بیٹی کو اس نام نہاد ابن جی او کے پنجے سے رہائی دلوائے۔ اس سے قبل اس سلسلے کے اس کے تین آرٹیکل چھپ چکے تھے اور حامد کا ایک سروے ان ابن جی او کے متعلق چھپ چکا تھا جو صرف یہاں لاہور میں کام کر رہی تھیں۔ ابھی اس سلسلے میں اس کا ارادہ مزید سروے کرنے کا بھی تھا۔ وہ ان کے اصل مقاصد کی کھوج میں بھی تھا لیکن مسلسل دھمکی آمیز فون آرے تھے کہ وہ اس سلسلے کو ختم کر دے ورنہ نقصان اٹھائے گا۔

ابھی کچھ دیر پہلے اپنے آفس میں اس نے ایک بے حد ذمہ دار حکومتی آفسر کا فون ریسور کیا تھا کہ اگر اس نے مضامین چھاپنے کا یہ سلسلہ بند نہ کیا تو اس کے اخبار کا

ڈیکلویشن ضبط کر لیا جائے گا۔ تب اس نے سوچا تھا کیا فائدہ اگر یہ مضمون چھپ بھی گئے تو کیا ہوگا۔ کون سا یہ ابن جی او ختم ہو جائے گی اور کون سا لڑکیاں ان میں جا کر چھوڑ دیں گی یہاں جا کر رہنے والی اسی فیصد لڑکیاں اخبار کہاں پڑھتی ہیں تو خواجہ ڈیکلویشن ضبط کیوں کرواؤں۔ فرائی ڈے ایڈیشن کے لیے کوئی اور ٹاپک دیکھ لیتا ہوں۔ لیکن اب ہینڈل پر ہاتھ رکھے رکھے اسے لگا تھا جیسے اس کے کندھوں پر کوئی بھاری سا بوجھ آ رہا ہو اور اسے کسی کی توقعات پر پورا اترنا ہے۔ وہ تو اینڈ ہیروں کا حصہ بننے جا رہا تھا اور آمنہ شاہ کہہ رہی تھی وہ روشنی کا مینار ہے! حرا اور آفتاب حسین یکایک ہی اس کے سامنے اکھڑے ہوئے تھے۔

”اسید! ہمت نہ ہارنا۔ جو لوگ ہمت نہیں ہارتے ایک وقت آتا ہے کہ راستے خود بخود ان کے لیے کشادہ ہو جاتے ہیں اور منزلیں بازو دیکھے انہیں اپنی منتظر ملتی ہیں۔“

”تو یہ طے ہوا کہ فرائی ڈے ایڈیشن میں یہ آرٹیکل چھپے گا اب چاہے ڈیکلویشن ضبط ہو یا۔۔۔“

اس نے دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا اور اجازت طلب کرتے ہوئے اندر گیا آمنہ فائل ہاتھ میں پکڑے کھڑی تھی اور عروج کرسی پر بیٹھی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

”کیا ہو رہا ہے گرلز؟“ وہ مسکرایا۔

”اسید! میں آپ کی طرف ہی آرہی تھی۔ یہ میں نے اسپتالوں کی حالت زار پر رپورٹ تیار کی ہے۔ میں اور صدف پچھلے دو ہفتوں سے مختلف اسپتالوں کے چکر لگا رہے تھے۔“

اسید نے فائل لے لی۔

”اوکے میں دیکھ لیتا ہوں۔“ اس نے کمرے میں نظر دوڑائی۔

”آج صدف نہیں آئی۔“

ہاں۔ پتا نہیں کیوں؟“ عروج نے جواب دیا۔

”طبیعت خراب تھی اس کی۔“ آمنہ نے جواب

دیا۔
 ”نمیر پھر ہو رہا تھا۔“ اسید نے سر ہلا دیا۔
 ”عاشی کیسی ہے؟ آنہیں رہی؟“ آمنہ نے پوچھا۔
 اسید ایک کرسی پر بیٹھ چکا تھا اور فائل کی ورق گردانی کر رہا تھا۔
 ”ٹھیک ہے، دراصل داوی جان کی طبیعت بگڑتی ہی جا رہی ہے۔ نمیر پھر کم ہی نہیں ہو رہا اس پر چیسٹ انفیکشن شدید ہے سو عاشی اوہری ہے۔“
 ”میں آج چلوں گی دادی جان کو دیکھنے عروج تم چلوگی میرے ساتھ۔“
 آمنہ عروج سے پوچھ رہی تھی جبکہ فائل میں موجود پیپر دیکھتے ہوئے اسید کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ ابھری تھی۔
 ”یہ غالباً تم نے لکھا ہے آمنہ!“
 جب بھی روانی میں وہ آمنہ کو تم کہہ کر بلا تا تھا آمنہ کو بہت اچھا لگتا تھا۔
 ”ہاں اہکچو نکی صدف کی طبیعت ٹھیک نہ تھی تو اس نے مجھے لکھنے کو کہہ دیا۔“
 ”ہاں تمہارا انسانی رنگ جھلک رہا ہے اس میں اور یہ رپورٹ کے بجائے ایک درد بھرا افسانہ لگ رہا ہے۔“
 ”سوری۔ یہ فائل مجھے دے دیں میں دوبارہ لکھتی ہوں۔“
 ”نی الجال رہنے دو۔ میں فالتو جملوں کو انڈر لائن کر دیتا ہوں۔ تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ کیسے لکھنا ہے۔“
 آمنہ نے سر ہلا دیا۔ اس کا دل کسی انوکھی لے پر دھڑک رہا تھا۔ آج سے پہلے اسید نے بھی اس طرح اتنی بے تکلفی سے بات نہیں کی تھی۔ تو کیا محبت کی آج نے اس کے دل کو بھی پھلایا ہے۔ اس نے سوچا۔ ابھی کچھ دیر پہلے عروج نے ہی تو کہا تھا۔ کہ محبت کی آج تو پتھر سے پتھر دل کو بھی پھلایا دیتی ہے اور اسید اتنا پتھر بھی نہیں کہ اسے آمنہ شاہ کی آنکھوں میں کھلتے محبت کے پھول نظر نہ آئیں نہ ہی وہ اتنا کوتاہ بین ہے

کہ تمہارے گالوں پر بکھرتے ان رنگوں کو کوئی مفہوم ہی نہ پہنچا سکے جو اسے دیکھ کر ایک دم تمہارے رخساروں پر ہولی کھینے لگتے ہیں۔ تب اسے عروج کے جملوں پر ہنسی آئی تھی۔
 ”یار! تم بھی کسی افسانہ نگار سے کم نہیں ہو افسانے لکھنا شروع کرو۔“
 اور عروج نے دل گرفتگی سے سوچا تھا۔ بھلا وہ کسے افسانے لکھ سکتی ہے۔ چند لفظ بول دینے سے بھلا کوئی افسانہ نگار بن سکتا ہے۔ افسانہ نگار تو پیدا کئی ہوتا ہے آمنہ شاہ کی طرح لیکن اس کے اندر ایک چھپی ہوئی خواہش نے چٹکی ضرور بھری تھی کاش ایسا ہو کہ کسی وہ بھی لکھ سکے آمنہ شاہ کی طرح۔
 تب ہی اسید عبدالرحمن کے موبائل کی بیل ہوئی تو عروج اور آمنہ دونوں ہی اپنے اپنے خیالوں سے چونک کر اسید کو دیکھنے لگیں۔ اسید نے ہاتھ میں پکڑی فائل میز پر رکھ کر پکارت سے فون نکالا۔
 ”ارے ڈاکٹر فمد آپ خیریت؟“
 ”کیا؟ عافیہ سلیمان کا ہسپتال گیا؟“
 ”اوہ کہاں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ اس سے بات ہو سکے؟“
 ”اوکے۔ میں آ رہا ہوں۔“
 اس نے بیل آف کر کے دونوں کی طرف دیکھا۔
 ”میں ذرا ڈاکٹر فمد کی طرف جا رہا ہوں۔ اگر حامد یا فیصل میں سے کوئی آجائے تو انہیں بتا دینا کہ فرانی ڈے اسپتال میں میرا این جی او والا آرٹیکل بھی لگے گا۔“
 اور وہ انہیں خدا حافظ کہتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔
 * * *
 ”کیا ہوا اسید؟“ حامد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”تم کچھ بتاتے کیوں نہیں ہو؟“
 ”کیا بتاؤں دوست! اسید نے سر اٹھاتے ہوئے گہری سانس لی۔
 ”تم جب سے آئے ہو یوں آپ سیٹ سے لگ

رہے ہو۔“
 ”ہاں۔ میں رات بھر سو نہیں سکا۔“ اسید نے پیشانی پر آنے والوں کو ہاتھوں سے پیچھے کیا۔
 ”عافیہ سلیمان کو کسی نے قتل کر دیا۔“
 ”کیا؟“ حامد اچھل پڑا۔ ”آمنہ نے بتایا تھا کہ تم اس سے ملنے گئے ہو۔“
 ”ہاں۔ لیکن جب ہم وہاں پہنچے تو وہاں پولیس تھی اور۔“
 حامد الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔
 ”تمہیں علم تو ہے حامد ڈاکٹر فمد اس این جی او میں ملازمت کرتا تھا جہاں عافیہ بھی جا کر رہی تھی۔ فمد نے مجھے بتایا تھا کہ عافیہ بہت پریشان تھی۔ وہ لوگ اسے کسی ایسے کام کے لیے مجبور کر رہے تھے جو وہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے ایک روز فمد سے کہا تھا کہ وہ جا چھوڑنا چاہتی ہے لیکن اسے ڈر ہے کہ یہ لوگ اسے نقصان پہنچائیں گے۔ ڈاکٹر فمد نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ اس طرح کا خوف کیوں محسوس کر رہی ہے تو اس نے کہا تھا کہ وہ فون پر ان سے بات کرے گی اور یہ کہ اسے ان کی مدد کی ضرورت ہے۔ فمد نے اسے اپنا سیل نمبر دے دیا اور اس سے اگلے روز کی بات ہے کہ وہ آفس نہیں آئی اور اس این جی او کے کرتا دھرتا نعیم ملک نے بتایا کہ وہ جا چھوڑ گئی ہے۔“
 اور اسی شام عافیہ سلیمان کی ماں اسے تلاشتی ہوئی آفس آئی تھی جبکہ آفس والوں نے اس کے آفس میں آنے سے انکار کر دیا اور اس کی ماں کو بتایا کہ وہ تو بہت دنوں سے آفس نہیں آ رہی۔ جب عافیہ کی ماں کی اپیل ایک اخبار میں چھپی تو فمد نے مجھے فون کر کے بتایا کہ شاید اس نے جا چھوڑ دی ہوگی یہ اخبار سے پتا چلا تھا کہ وہ گھر نہیں چھٹی کیم و سمبرج وہ گھر سے نکلی اور واپس نہیں پہنچی۔“
 اسید حامد کو تفصیل بتا رہا تھا اور حامد بہت توجہ سے سن رہا تھا۔ میں نے فمد سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق عافیہ کے متعلق ساری تفصیل اپنے آرٹیکل

میں لکھ دی تھیں کہ دو ماہ سے اس کی ماں بیٹی کی تلاش میں خوار ہو رہی ہے اور میں نے فمد کو اس کے متعلق بتایا تھا کہ کل صبح فمد کا فون آیا کہ عافیہ نے اسے فون کیا ہے وہ اس سے ملنا چاہتی ہے۔ وہ کسی پرائیویٹ ہوسٹل میں تھی۔“
 وہ اپنے گھر کیوں نہیں گئی؟“ حامد نے پوچھا تو اسید افسردگی سے مسکرایا۔
 ”کاش یہ بتانے کے لیے وہ زندہ رہتی۔ وہ فمد سے مل کر اسے سب کچھ بتانا چاہتی تھی۔ فمد نے مجھے فون کر دیا لیکن جب ہم وہاں پہنچے تو وہ نہیں رہی تھی۔“
 ”یہ این جی او کیا کام کرتی ہے؟“ حامد نے پوچھا۔
 اس کا کام Rural Development یعنی دیہی علاقوں میں لوگوں کی Learning (تعلیمی پروگرام) کا جائزہ لینا ان کی طبی سہولتوں کا جائزہ ان میں شعور پیدا کرنا انہیں حفظانِ صحت سے آگاہ کرنا جس میں نیکی پلاننگ بھی شامل ہے۔“
 اسید نے تفصیل بتائی۔
 ”مگر مقصد صرف یہی ہو تو بہت اچھے مقاصد ہیں۔“
 حامد نے آہستگی سے کہا۔ ”لیکن افسوس میں تم بتاؤ تم جس این جی او کے متعلق تحقیق کر رہے تھے اس کے متعلق کیا جانا ہے؟“
 ”یہ دراصل حدود آرڈیننس کے خلاف ویمن ایکشن فورم کے نام سے بنائی جانے والی تنظیم کی طرح کی ایک این جی او ہے۔ دورانِ خانہ مقاصد تو ابھی بوزی طرح واضح نہیں ہوئے مجھ پر لیکن جلد ہی پتا چل جائے گا۔ بظاہر یہ انسانی حقوق، حقوق نسواں، خواتین کے خلاف امتیازی سلوک اور balance gender کے نعرے لگا رہے ہیں۔ میں اس کی بانی بیگم نصر اللہ سے ملا ہوں ان کا انٹرویو لیا ہے۔“
 ”فائن! اسید کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔ ”کیا فرمایا محترمہ نے؟“
 ”یہی کہ انہوں نے یہ این جی او مظلوم عورتوں کے حقوق حاصل کرنے کے لیے بنائی ہے۔ عورت جس کا استحصال کیا جا رہا ہے۔“

”جتنے حقوق عورت کو اسلام نے دیے ہیں اتنے حقوق تو دنیا کے کسی مذہب نے نہیں دیے۔“ صدف نے جو کچھ دیر پہلے خاموشی سے آکر ایک طرف بیٹھ گئی تھی۔ گفتگو میں مداخلت کی۔ ”یہ جن رسوں و رواجوں کا سہارا لے کر مسلمان عورت کی مظلومیت کا رونا ساری دنیا کے میڈیا پر کرتی پھر رہی ہیں۔ وہ رسم و رواج جہالت اور لاعلمی کا نتیجہ اور اسلام سے دوری کی وجہ سے ہیں۔ اسلام تو ان کی حمایت نہیں کرتا۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو صدف! کاش کوئی ریفاہ مران کو شعور دے۔ ان میں صحیح اسلام کی تبلیغ کرے۔ یہ نام نہاد فلاحی انجمنیں اور این جی او صدف اپنا مقصد نکالنا چاہتے ہیں۔ تم ایسا کرو مسلمان عورت کے حقوق کے متعلق کچھ آرٹیکل لکھ ڈالو۔“

صدف نے آہستہ سے سر ہلایا دیا تو اسید کو یاد آیا کہ اس کی طبیعت خراب تھی۔

”تمہاری طبیعت کیسی ہے اب؟“

”ٹھیک ہوں۔“

اور دادا جان اور احمد کی والدہ کی طبیعت کیسی ہے؟ بہت دنوں سے جان نہیں پایا ہوں۔ اسید نے پوچھا۔

”ٹھیک ہیں۔ تمہیں یاد کرتے ہیں۔ لیکن تمہاری مصروفیات سے بھی باخبر ہیں۔“ صدف نے بتایا تب ہی حامد نے اس کی طرف دیکھا۔

”صدف! اگر تمہیں اپنے آرٹیکل کے لیے کچھ معلومات چاہئیں تو میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ 1995 میں بیجنگ میں عورتوں کے حقوق کے متعلق کانفرنس ہوئی تھی۔ اس کے بعد اڑتالیس ممالک کے سفارت خانوں میں ایسے دفاتر کھولے گئے جو ایسے لوگوں کو امداد دیتے تھے جو خواتین کی امداد کے نام پر ادارے یا این جی او بناتے تھے انہیں دفاتر ’کمپیوٹر کیریئر اور ملٹی میڈیا سے لے کر گاڑی تک فراہم کی جاتی تھی۔“

صدف بے حد دھیان سے سن رہی تھی۔

”دراصل این جی او کے سلسلے میں تحقیق کرتے ہوئے میرے حکم میں یہ ساری معلومات آئیں۔“

مختصراً تمہیں بتا رہا ہوں کہ شاید اس میں سے کچھ تمہارے کام آسکے۔ تو میں کیا بتا رہا تھا کہ ان افراد کو ورکشاپ کروانے کا نفرنس کرنے اور احتجاج کرنے کے لیے پیسہ دیا جاتا تھا۔ دراصل امریکہ کی نیشنل سیکورٹی ریسرچ نے جسے RAND کہا جاتا ہے پوری مسلم اُمّت کے خلاف جامع منصوبہ بنایا تھا۔ 2003 میں جس کا نام اس کی دو اہم شقوں کے متعلق میں تمہیں بتاتا ہوں ایک تو یہ کہ ماڈرن اسکالرز کو سامنے لایا جائے۔ انہیں چینلز پر موقع دیا جائے ایسے اخبارات اور چینلز کو پیسہ دیا جائے جو اسلام کے خلاف کم علم علماء کو سامنے لائیں۔ اور دوسرا یہ کہ مسلمان عورت کو ہر طرح سے تحفظ دیا جائے اسے اعلیٰ تعلیم اور جائز مواقع دیے جائیں۔ اسے احساس دلایا جائے کہ وہ بہت محنت کی اور پابند زندگی گزار رہی ہے۔ اسے آزادی کے نام پر بے راہ روی کی طرف مائل کرنا۔ اسے آزاد زندگی گزارنے کی ترغیب دینا۔ اسے اتنی سہولتیں مہیا کرنا کہ وہ شادی کرنے کے بجائے خود مختار زندگی گزارنے کی طرف مائل ہو جائے۔ ایسے ایڈیٹرز کو سامنے لانا کہ پتا چلے کہ مسلمان عورت دنیا کی مظلوم ترین عورت ہے۔“

”مختار ان مائی کا ایڈیٹور بھی مجھے ایسا ہی ایک ایڈیٹور لگتا تھا۔“ صدف نے کہا۔ ”کیا یورپی ممالک میں مختار ان مائی جیسی عورتیں نہیں ہوتیں؟“

”کیوں نہیں ہوتیں۔“ اسید عبد الرحمن نے اس کی طرف دیکھا۔ ”یورپ کی عورت تو بہت قابلِ رحم ہے وہاں تو کم عمر بچیاں اور۔“

تب ہی دروازہ کھلا اور آمنہ نے اندر جھانکا۔ ہمیشہ کی طرح بہت فریٹ اور شکستہ سی۔ لہجہ بھر کے لیے اسید کی نظر میں اس کے چہرے پر ٹھہریں اور پھر فوراً ہی اس نے نگاہیں جھکا لیں۔

”السلام علیکم۔“ وہ سب کو سلام کرتے ہوئے اندر آئی۔

”کیسی ہو صدف؟“

”شکر ہے تم آگئیں۔ سچ بہت بوری تھی۔“

ان دنوں۔ عاشی اور عروج بھی نہیں آ رہیں اور وہ سعید بھی آج کل بہت بری طرح سے اپنی اسٹڈی میں مصروف ہے۔ سیز تیز بولتی ہوئی وہ صدف کی کرسی کے ہتھے پر ہی ٹیک گئی اور پھر اسید کی طرف دیکھا۔

”اسید! تمہاری ملاقات ہوئی عافیہ سے کیا کہا اس نے؟“

”عافیہ کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔“

”وہ تو! بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔“

”اور فمد۔ ڈاکٹر فمد تو ٹھیک ہے نا۔ سوہ۔“

”ہاں فمد تو ٹھیک ہے تمہارا مطلب۔ سوہ۔“

”نہ۔“ اسید عبد الرحمن یکدم پریشان نظر آنے لگا۔

”تم صحیح سوچ رہی ہو۔ مائی گاڑا مجھے پہلے اس کا خیال ہی نہیں آیا جو لوگ عافیہ کو قتل کر سکتے ہیں وہ ڈاکٹر فمد کو بھی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔“

بات کرتے کرتے اس نے فون اپنی طرف کھینچا اور فمد کے نمبر مانے لگا۔

اسے چند ہی ملاقاتوں میں یہ نوجوان ڈاکٹر بے حد عزیز ہو گیا تھا۔ اس کی باتوں سے وطن کی محبت کی خوشبو آتی تھی۔ بہت سچا، گھرا اور بولڈ لڑکا تھا۔

”ہیلو۔ ہیلو ڈاکٹر فمد سے بات کرنا ہے۔“ شاید نمبر مل گیا تھا۔ تینوں اسید کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”میں ڈاکٹر فمد بول رہا ہوں۔ اسید خیریت ہے۔“ دوسری طرف سے ڈاکٹر فمد پوچھ رہے تھے۔

”اوہ ہاں۔! اسید نے اطمینان بھر سانس لیا۔

”میں نے پریشانی میں تمہیں پہچانا نہیں۔ میں تمہارے لیے پریشان ہو رہا ہوں۔ یار! وہ لوگ تمہارے لیے بھی خطرہ ہو سکتے ہیں۔“

”میرا خیال ہے کہ وہ میرے متعلق نہیں سوچ سکتے۔ میرا تعلق تو طبی شعبے سے تھا۔ یہ جو کچھ میرے علم میں آیا اتفاقاً تھا۔ اور عافیہ سے نہ تو وہاں بات چیت اکثر ہوتی تھی نہ ایسی کوئی خاص ملاقات تھی۔ سوہ تو صرف دو تین بار میرے کلینک میں آئی تھی اپنی آنکھیں چیک کروانے کے لیے۔ الرجی ہو گئی تھی تو اتفاق سے میں اکیلا تھا تو اس نے بات کی۔ میں چونکہ

ان دنوں ان کی سرگرمیوں سے متعلق کچھ مشکوک سوچتا تھا تو میں نے اس کی مدد کا وعدہ کیا تھا۔“

فمد نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

”بہر حال اپنا خیال رکھنا بہت۔“

”لو کے تھنک یو۔“

فون بند کر کے اس نے فمد کی گفتگو سے انہیں آگاہ کیا۔

”تو میرے لیے اب کیا حکم ہے سر؟“

حامد نے قدرے مزاحیہ انداز میں پوچھا۔

”ہاں تم اپنا آرٹیکل مکمل کر لو۔ میں چاہتا ہوں دو دنوں آرٹیکل ایک ہی ایڈیشن میں آجائیں۔ اسی فرمائی ڈے کو۔“

”اوکے۔“ حامد اٹھ کھڑا ہوا تو اسید ٹیبل پر بکھرے کاغذات کو اکٹھا کر کے فائل میں رکھنے لگا۔

”اسید! جو لوگ عافیہ کو قتل کر سکتے ہیں وہ ان آرٹیکل کے چھپنے کے بعد تمہارے بھی تو دشمن ہو سکتے ہیں۔“ آمنہ کے لہجے میں تشویش تھی۔

”پھر؟“ اسید نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھائیں

”کیا ان آرٹیکل کے چھپنے کا کوئی فائدہ ہو گا اسید؟“

آمنہ اب اسے دیکھ رہی تھی۔

”معلوم نہیں آمنہ! اگر نہ بھی ہو تو ایک کوشش تو کی ہے نا! ہم نے عوام کو حکومت کو لوگوں کو آگاہ کرنے کی کہ یہ ہے ان کا اصل چہرہ۔ ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم بہت سے مسائل میں گھبرے ہوئے ہیں۔ تین روزگاری ’لامحدود خواہشات‘ آسانسوں کی طلب ہمیں اندھا دھند بھگا رہی ہے۔ ہمیں جہاں پیسہ زیادہ ملتا ہے۔ ہم ادھر ہی لپکتے ہیں۔ ان آرٹیکل کو پڑھ کر چند افراد نے بھی ان کے جال میں آنے سے خود کو بچا لیا تو یہ میرے نزدیک کامیابی ہے۔ بڑی نہ سہی چھوٹی کامیابی۔ کہیں نہ کہیں سے تو کام کی ابتدا کرنا ہے نا آمنہ!“

اس نے بے حد ٹھہرے ٹھہرے انداز میں سمجھایا تو آمنہ کے اس کہنے کے لیے کچھ نہ رہا۔

وہ صحیح کہتا تھا کہ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے نا! تو پھر

یہاں سے ہی سہی۔ لیکن کیا اس شخص کے دل میں کبھی میرا خیال بھی آتا ہوگا۔ میں آمنہ شاہ جو اپنے دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں ہر لمحہ تمہیں سوچتی ہوں اور ہر لمحہ میرے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ کیا کبھی آمنہ شاہ کو اسید عبدالرحمن کی رفاقت مل سکتی ہے۔

”آمنہ! صدف نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونکی۔“ چلیں اپنے کمرے میں۔“

”ہاں۔“ وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”چلو مجھے ابھی فرانی ڈے ایڈیشن کے لیے اپنی رپورٹ مکمل کر کے دینا ہے حامد کو۔“ اسید بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”تم کہیں جا رہے ہو اسید؟“ صدف نے پوچھا۔

”ہاں مجھے ذرا حسن پر تنگ پر لیں تک جانا ہے اخبار کے سلسلے میں کچھ بات کرنا ہے۔“

نوید سحر حسن پر تنگ پر لیں سے ہی چھپتا تھا۔

”خیریت۔ کہیں انہوں نے تو بصیر پر تنگ والوں کی طرح ہمارا اخبار چھاپنے سے انکار تو نہیں کر دیا ہے“ صدف نے بے اختیار پوچھا۔

”نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کچھ اور مسئلے ہیں۔“

اسید اپنا موبائل اٹھا کر باہر نکل گیا تو آمنہ اور صدف بھی اس کے کمرے سے باہر نکل آئیں۔ یہاں میں فیصل اور حامد کسی مسئلے پر بحث کر رہے تھے اور سعید نیبل پر بڑی تصویروں کو چھانٹ رہا تھا جبکہ دلیر اس کے پاس خاموش کھڑا کچھ سوچ رہا تھا۔

”صدف! تمہیں۔۔۔ آرٹیکل کے سلسلے میں اگر کسی مدد کی ضرورت ہوئی تو مجھے بتانا میرے پاس ۲۰ اسلام میں عورت کے حقوق پر“ ایک کتاب بھی ہے۔ وہ میں تمہیں لادوں گا۔“

حامد نے بات کرتے کرتے مزکر صدف سے کہا اور صدف سر ہلاتی ہوئی آمنہ کے ساتھ اس کمرے کی طرف برہ گئی جہاں وہ تینوں بیٹھتی تھیں۔



”سیونی اسی فیصل دے آکھے لگے۔“

کتاب گود میں دھرے آنکھیں بند کیے آگے پیچھے جھولتے ہوئے سعید گنگنا رہا تھا جب عاشری نے آواز صدف اور عروج آگے پیچھے کمرے میں داخل ہوئیں۔

”یہ بڑھائی ہو رہی ہے یا ریاض؟“ عاشری نے آگے بڑھ کر کتاب اس کی گود سے اٹھائی۔

”ہائے سیونی فیصل دے آکھے لگے۔“

”نیم وا آنکھوں سے عاشری کو دیکھتے ہوئے وہ پھر گنگناتا۔“

”آنکھیں کھولو دیکھو کون آیا ہے؟“

”ارے ہاں ہاں! اس نے آنکھیں کھولیں اور یکدم اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ بڑی بڑی ہستیاں تشریف لائی ہیں آج غریب خانے پر آئے آئے حضور! وہ تھوڑا سا جھکا۔“

”زبے نصیب اتنی بڑی افسانہ نگار اور کالسٹ نے ہمارے غریب خانے پر قدم رنجہ فرمایا ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں پھول بچھاؤں۔“

”بکو مت۔“ عاشری نے بیٹھتے ہوئے تینوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ”نانو کہاں ہیں یہ سب نانو کی مزاج پر سی کے لیے آئی ہیں۔“

”تمہاری نانو اور ہماری دادو اس وقت دادا جان کے ساتھ گھومنے کے بعد آرام کر رہی ہیں۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا۔ نانو ڈاکٹر کے پاس گئی ہیں نانا جان کے ساتھ۔ تم نہیں جاسکتے تھے ساتھ۔“

”ہاں جاسکتا تھا۔ سعید نے سر کھمایا اور کمرے میں بڑی اکلوتی میز پر اچھل کر بیٹھ گیا۔ ”لیکن افسوس وہ میرے کالج سے واپس آنے سے پہلے ہی اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ ڈاکٹر کے کلینک تک چل قدمی کر کے واپس آگئے تھے۔“

”تو یہ ہے سعید! تم کس قدر فضول بولتے ہو۔“ عاشری نے عاجز آ کر کہا۔ ”نانو کہاں ہیں؟“

”ٹھک ہے ہم نانو کے کمرے میں جا رہے ہیں۔“

عاشری نے اٹھنے کی کوشش کی تو وہ فوراً بھول اٹھا۔

”ارے نہیں اب اگر اس کمرے کی قسمت جاگ ہی اٹھی ہے کہ اتنی اہم ہستیاں یہاں تشریف لائی ہیں تب یہاں سے جا کر اس کی قسمت کو سلانے کی کوشش پر گز کریں۔ یوں بھی دادی جان محترمہ اس وقت خواب استراحت کے مزے لے رہی ہیں اور دادا جان کرسی پر نیم دراز ”عمرو عیار“ کے کارٹھے بڑھ رہے ہیں اور گاہے گاہے دادی جان پر بھی نظر ڈال لیتے ہیں۔“

عاشری نے اس کی اس اتنی لمبی چوڑی گفتگو پر براسا منہ بنایا۔

”اسید بھائی اور ماموں بھی نظر نہیں آ رہے۔“

”اسید بھائی اور تمہارے ماموں کچھ دیر پہلے ہی گھر سے باہر نکلے ہیں لیکن چونکہ اس وقت میں یہ غور کر رہا تھا کہ ہم آخر تینوں کے ”آکھے“ ہی کیوں لگتے ہیں اور یہ دونوں کب ہمیں مشورے دینے لگتے ہیں اور مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر ان بے چاری گوئی آنکھوں پر الزام کیوں لگایا جاتا ہے۔ خواجواہ میں اور میرا دل ان کی مظلومیت پر اتنا رقیق ہو رہا تھا کہ میں پوچھ ہی نہ سکا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔“ تب ہی راحیل ٹرے میں پیپسی کے گلاس رکھے اندر داخل ہوا۔

”میں نے ایک نظر عاشری پر ڈالی۔“

”تو تمہیں تو اسید کے ساتھ عاشری۔ یہ تو بالکل سامنے کی بات ہے۔ میرا وہ بیان اس طرف گیا ہی نہیں اور اسے لگا جیسے اس کا دل کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔ کیا یوں بھی ہوتا ہے۔ ابھی تو دل نے اسید کے نام پر دھڑکننا شروع کیا تھا۔ ابھی تو آنکھوں میں خواب اترے تھے اور۔“

”بڑی گھٹی ہو تم! عروج نے عاشری کی پیٹھ پر مکہ مارا۔ تو وہ چونک کر عاشری کو دیکھنے لگی۔“

”میں نے کیا کیا ہے؟“ عاشری منمنارہی تھی۔ ”اس سے پوچھو۔“

”اچھا! سعید نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا صدف نے پوچھا۔“

”سعید دادی جان کی طبیعت اب کیسی ہے؟ اسید

”بہت پریشان تھا کل۔“ میری پچھریوں نہیں اتر رہا۔“

”لہجہ جو نکلی طیرا بگڑ گیا تھا۔ اب کافی بہتر ہیں۔“

پہلے ڈاکٹروں ہی دوا دیتا رہا۔ دو دن پہلے ہی تو بلڈ ٹیسٹ کروایا تو پتا چلا کہ لیبریا ہے۔“

”یہ ڈاکٹر بس ایویں ہی ہوتے ہیں صدف! یوں ہی بس تگے سے دوائیاں دے دے کر مریض کو مار ڈالتے ہیں۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آخر ڈاکٹر بننے کی ضرورت ہی کیا ہے جب مریض کو مارنا ہی ہے تو اس بے چارے کو بغیر علاج کے ہی مرنے دیں! اچھا خاصا دوائیوں کا خرچ بچ جائے گا۔“

عاشری کو اب موقع ملا تھا سعید کو تنگ کرنے کا۔

”ہاں واقعی میں بھی اکثر سوچتا ہوں بالکل ایسا ہی۔ یہ ہم دونوں کی سوچ کتنی ملتی ہے نا! تب صدف اور آمنہ کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ تب ہی ایک طرف کھڑکی سے ٹیک لگائے کھڑے راحیل نے کہا۔“

”بھائی! میں تو جا رہا ہوں ٹیوشن پر۔ چائے آپ خود بنا لیجئے گا۔“

”ہاں ہاں۔ تم جاؤ۔“ اس نے اپنا گلاس خالی کر کے میز پر رکھا۔ ”یہ ہے نا عاشری! اپنا ہی گھر ہے اس کا۔ کل کو بچی تو اس نے ہی میزبانی کرنا ہے۔ تو آج۔“

”جی نہیں۔“ عاشری نے اس کی بات کالی۔ ”آج تو میں مسمان ہوں۔ چائے تم پلاؤ گے۔“

آمنہ نے ایک نظر عاشری پر ڈالی۔

”تو تمہیں تو اسید کے ساتھ عاشری۔ یہ تو بالکل سامنے کی بات ہے۔ میرا وہ بیان اس طرف گیا ہی نہیں اور اسے لگا جیسے اس کا دل کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔ کیا یوں بھی ہوتا ہے۔ ابھی تو دل نے اسید کے نام پر دھڑکننا شروع کیا تھا۔ ابھی تو آنکھوں میں خواب اترے تھے اور۔“

”بڑی گھٹی ہو تم! عروج نے عاشری کی پیٹھ پر مکہ مارا۔ تو وہ چونک کر عاشری کو دیکھنے لگی۔“

”میں کیا بتاؤں؟“ سعید دانتوں تلے انگلی دبائے شرمیلے کی ایکٹنگ کر رہا تھا۔ ”جوں ہی میں نے دنیا میں آنکھ کھولی تو بس ہماری پھوپھو صاحبہ نے جھٹ پٹ اپنی بیٹی کا نام ہمارے ساتھ لگا دیا کہ اتنا سونا منڈا ہے۔ نہیں کوئی اغوا ہی نہ کر لے برا ہونے پر۔“

”پڑوس میں بالا سبج بھی تو رہتا ہے نا!“ عاشی شرارت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”تو تو تمہیں اور سعید۔“ آمنہ نے رک رک کر اپنا جملہ مکمل کیا۔ ”یعنی تم دونوں کی انگیج منٹ ہو چکی ہے۔“

اندر جیسے ایک بار پھر سے چراغاں ہو گیا تھا۔

”ہاں نہیں یہ انگیج منٹ ہے یا کیا ہے۔ بس داوی نے اسی وقت ایک لٹو پھوپھو کے منہ میں ڈالا اور کہا۔ لو منہ میٹھا کرو“ آج سے منڈا تمہارا ہے۔“

”کجو مت۔ اماں کی تب شادی بھی نہیں ہوئی تھی“ جب تم پیدا ہوئے تھے۔“

عاشی جھینپ رہی تھی۔

”یہ تو بعد میں جب ماما بیمار تھیں تو انہوں نے اماں سے مجھے مانگ لیا تھا۔“

”چلو بعد میں ہی سہی لیکن تمہاری اماں تو مجھ پر فدا تھیں نا! نہیں تو اسید بھی تھا اور فیصل بھی۔“

”تم خود ہی ہر وقت اماں کی گود میں گھسے رہتے تھے تو قدرتی بات ہے اماں کو تم سے محبت تھی اور جب ماما نے کہا تو انہوں نے تمہارا نام دے دیا۔“

”ویسے۔۔۔ وہ تو ہوا سا اس کی طرف جھکا۔“ یہ اماں نے اپنی محبت کچھ تمہاری طرف بھی منتقل کی ہے یا۔۔۔“

عاشی کے رخساروں پر سرخی دوڑ گئی۔ وہ تینوں ان کی باتوں کو انجوائے کر رہی تھیں جب سعید نے ٹرے اٹھا کر راجیل کو پکڑائی۔

”یہ تم کھڑے کھڑے کیا وائٹ نکال رہے ہو“ ٹیوشن پر نہیں جانا۔“

”تم برہایا کرو نا اسے۔“ عروج نے مشورہ دیا۔ ”ہاں نہیں ٹیوشن سینٹر میں کیسا پڑھاتے ہیں۔ پیسہ کمانے کا

ذریعہ ہیں سب۔“

”مشورہ اچھا ہے عروج جی بی!“ سعید اچھل کر ٹیبل پر بیٹھ گیا۔ لیکن یہ ٹیوشن لینے نہیں دینے اور یہ حضرت خود اس قدر تیز ہیں کہ میرے جیسے بندوں کو پڑھا دیں۔ مجھ سے کیا پڑھنا ہے اسے۔“

”یعنی اس ہمد خانہ آفتاب است۔“ ماشی نے فارسی کی لیاقت جھاڑی۔

”تمہیں فارسی پڑھنے کا مشورہ کس نے دیا تھا؟“ سعید نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”فارسی میں نمبر زیادہ آتے ہیں۔ ہماری کتاب سب لڑکیوں نے آپشنل فارسی ہی رکھا تھا۔“

”ہائے کاش مجھے بھی کوئی مشورہ دے دیتا تب فارسی رکھنے کا۔ خیر مستقبل میں تم سے پڑھ لوں گا۔ بہت آتی ہے فارسی۔ ویسے اب تم کیوں نہیں فارسی میں ماسٹرز کر لیتیں۔ خواجہ وقت ضائع کر رہی ہو۔“

”جی نہیں میں نے وقت ضائع نہیں کیا۔ ہانوں منع کیا تھا مجھے ایڈمیشن لینے سے۔“

”اوہ ہاں۔ ہاں لیکن میں نے تو ابھی ہاؤس جا ب بھی کرنا ہے۔“

اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ عاشی نے اس کی طرف سے منہ پھیر کر آمنہ کی طرف دیکھا۔

”آمنہ! کیا انگلش میں ماسٹرز کرنا بہت مشکل ہے۔“

”نہیں خیر ایسا مشکل بھی نہیں شوق ہو تو سب کچھ ممکن ہے۔ اب کے ایڈمیشن کھلیں تو تم لے لو ایڈمیشن۔“

”ہی۔ اے میں میرے پاس اسلامیات ہسٹری اور ریاضی کیا پھر بھی میں۔۔۔“

”چھوڑو مارا! انگلش میں کیا رکھا ہے مجھے بالکل نہیں ہے انگلش۔ اب دیکھو نا انگریزی ابوب کا ہمارے احساسات سے کیا تعلق ہمارے ہاں آہ ہوتا ہے کے ہاں آویج ہے اور پھر انگریزی میں عشق نہیں محبت ہوتی ہے۔ یعنی Love لیکن محبت بھی محبت ضرورت ہوتی ہے۔ ویسے آمنہ جی! عشق کو انگریزی

میں کیا کہتے ہیں؟“

”آمنہ کے لبوں پر مدہم سی مسکراہٹ ابھری۔ ”دیکھا۔“ اس نے چنگلی بجا دی۔ ”انگریزی میں عشق نہیں ہوتا وہ والا عشق جس میں کہتے ہیں۔“

عشق ہو یا گھر و سریا دور و سریا عشق ہوتا کہوں بولتے ہو سعید؟“ عاشی زنج ہو کر کھڑی ہوئی تھی۔

”میں اس لیے بولتا ہوں کہ تم مجھے یاد رکھو ایسے ہی جیسے کوئی بادشاہ۔ یہ غالباً خلیل جبران نے کہا تھا اور مجھے اس وقت بالکل بھول گیا ہے کہ خلیل جبران نے کیا کہا تھا۔“

آمنہ کو پتا نہیں کیوں لگا جیسے اس کی آواز کی شوخی اپنا تک ختم ہو گئی ہو لیکن جب اس نے سراٹھا کر اسے دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر ویسی ہی مسکراہٹ تھی اور آنکھیں یوں ہی چمک رہی تھیں۔

”ویسے آمنہ جی!“ اس نے آمنہ کو اپنی طرف دیکھتے باکر پھر سے بولنا شروع کر دیا تھا۔ ”آپ لوگوں نے اب کو شیک پیپر کے عامیانہ ڈراموں تک ہی کیوں محدود کر دیا ہے محبت ہے کسی نے خلیل جبران حافظ اور شیرازی کی گہرائی کو محسوس نہیں کیا۔ آمنہ جی کبھی جبران اور حافظ کو پڑھ کر دیکھیں۔“

”میں چائے بنا کر لاتی ہوں آمنہ! صرف آپ ادھر ہی داوی جان کے کمرے میں آجائیے گا۔ میں دیکھتی ہوں اگر وہ جاگ رہی ہیں تو۔“

”لو جی۔ اسید بھائی بھی آگئے۔“

وہ جہاں ٹیبل پر بیٹھا تھا وہاں قریب ہی کھڑکی سے باہر گئی کا منظر نظر آ رہا تھا۔ آمنہ کی آنکھیں یکدم جگمگا اٹھیں۔ وہ دن میں نہ جانے کتنی بار اسید کو دیکھتی تھی اور ہر بار اسے لگتا تھا جیسے نہ جانے کب سے وہ اسید سے نہیں ملی اور ہر بار جی اس کی پر شوق نظروں میں آتی ہے جگمگا نہیں اتر آتی تھیں۔ عیبرادادی طور پر وہ کھلے دروازے سے باہر دیکھ رہی تھی۔ سعید ہولے سے کھنکارا۔ اس کے لبوں پر بڑی شریری مسکراہٹ تھی۔ آمنہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

”کچھ نہیں۔ کچھ نہیں“ آمنہ جی! آپ بڑے شوق سے باہر کا نظارہ کریں۔ میں تو یوں ہی کھانا تھا۔ گلے میں خراش بڑھ گئی تھی۔“ آمنہ اس کی بات سمجھ نہیں سکی تھی۔ جبکہ صدف کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آگئی تھی۔ تب ہی اسید صحن میں نظر آیا اور پھر وہ دادا جان کے کمرے کی طرف جاتے جاتے سعید کے کمرے کی طرف مڑ گیا۔ شاید عاشی نے بچن سے آواز دے کر اسے بتایا تھا۔

”السلام و علیکم!“ کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر اس نے سب پر ایک اچھتی سی نظر ڈالی اور لہجہ بھر کے لیے اس کی نظریں آمنہ کے چہرے پر ٹھہری تھیں پھر اس نے سعید کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ سعید کچھ بتا سکے عاشی نے دروازے کے باہر سے آواز لگائی۔

”داوی جان جاگ چکی ہیں۔“

”اوہ اچھا!“ آمنہ سب سے پہلے کھڑی ہوئی تھی۔

”ہم سب داوی جان کی مزاج پر سی کے لیے آئے ہیں۔“ آمنہ نے اس کے اچھے اچھے سے انداز کو دیکھتے ہوئے بتایا۔

”اوہ۔ تھنکس۔“ وہ چونک کر ایک طرف ہٹا۔

”داوی جان اب تو کافی بہتر ہیں لیکن پچھلے دنوں بہت طبیعت خراب ہو گئی تھی ان کی۔“

وہ ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے تفصیل بتانے لگا۔ داوی جان انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھیں۔ خوش رہو۔ سکھی رہو۔“ انہوں نے سب کو دعا دی۔

آمنہ جگہ نہ ہونے پر ان کے پاس ہی ان کی چارپائی پر بیٹھ گئی تھی۔ عاشی نے میزور میاں میں رکھ کر چائے کی ٹرے رکھی تھی ساتھ میں نمکو بسکٹ اور سمو سے بھی تھے۔

”ارے اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔“ صدف نے عاشی کی طرف دیکھا لیکن جواب اسید نے دیا۔

”تکلف کہاں کہاں یہاں یہی کچھ میسر ہوتا ہے۔ گھر میں

کوئی خاتون تو ہے نہیں کہ کچھ بنا کر محفوظ کر دے۔“
 ”یعنی کچھ کیا؟“ عروج کے لہجے میں شرارت تھی۔
 ”یہی کباب ٹنگٹس وغیرہ۔“ سعید نے سموسہ اپنی پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔

”تو کب سے کہہ رہا ہوں تمہاری دادی جان سے کہ اب اسید کی شادی ہو جانی چاہیے۔ لیکن ہماری بات تو ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دی جاتی ہے۔“

”ارے مانے بھی تو تبت نا!“

”میں۔۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ اسید سٹپٹایا۔
 ”تو مطلب نہیں تھا تب بھی اب سیشن ہو گئے ہو۔ اخبار بھی چل نکلا ہے تو۔“

”نہیں دادا جان! اسید نے ان کی بات کاٹی۔“

”ابھی نہیں۔ آپ پہلے سعید کی کر دیں۔“

”اور وہ کہے گا تجھے ابھی امتحان دینا ہے۔ ہاؤس جا ب کرنا ہے پھر پارٹن کرنا ہے پارٹن۔“

”ارے نہیں دادا جان! آپ اپنی خوشی پوری کریں۔ باقی سب تو چلتا رہے گا۔“

حاضر ہوں جان دول سے

کیڑا ہوں گرچہ میں ذرا سا اس نے دایاں ہاتھ سینے پر رکھ کر سر خم کیا۔

”میں تو چاہتی ہوں دونوں کی اکٹھی ہی کر دوں۔“

دادی جان نے محبت بھری نظر دونوں پر ڈالی۔

”رہے راجیل اور وحید تو دونوں ابھی چھوٹے ہیں۔ جب سے بیمار ہوئی ہوں دونوں بچن کی ذمہ داریاں بھی نبھارے ہیں اور پڑھائی بھی۔“

”ہاں یاد آیا یہ وحید کدھر ہے۔ صبح سے نظر نہیں آیا مجھے۔“ اسید نے پوچھا۔

”ہاں میں نے بھی نہیں دیکھا۔“

”راجیل بتا رہا تھا کہ وہ صبح کہہ رہا تھا کہ دیر سے آئے گا۔ اسکول میں فٹ بال کا میچ ہے۔“

دادا جان نے بتایا تو اسید نے گھڑی پر نظر ڈالی۔

”لیکن اب تو چھ بجنے والے ہیں۔“

آمنہ نے یک دم نظر اٹھا کر اسید کی طرف دیکھا۔ وہ

بے حد پریشان اور مضطرب سا لگ رہا تھا۔

”اسید! خیریت ہے نا آپ یکا یک پریشان ہوئے ہیں۔“ آمنہ کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

”ہاں بس یونہی۔“ وہ مضطرب سا ہو کر کھڑا ہو گیا۔
 ”میں پتا کرتا ہوں اس کے اسکول سے۔“

”بیٹھے جاؤ اسید بیٹا! وہ اب اتنا پھوٹا بچہ بھی نہیں ہے میٹرک کا طالب علم ہے۔ ماشاء اللہ تو راتیر سے بھی بڑا ہو گیا ہے اس کا۔“

دادا جان نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ لیکن یونہی مضطرب اور بے چین سا بار بار گھڑی کی طرف نگاہ ڈالتا رہا۔ آمنہ نے دو تین بار اس کی طرف دیکھا۔

پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ہم اب چلتے ہیں دادی جان! پھر کسی روز آئیں گے۔“

صدف اور عروج بھی کھڑی ہو گئیں۔

”خوش رہو بیٹا! جیتی رہو کیسی رونق سی ہو گئی تھی تمہارے آنے سے کبھی کبھی آتی رہا کرو۔“

”جی ضرور۔“

آمنہ اور صدف نے ایک ساتھ کہا اور سب کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکلیں۔

”اسید! آمنہ نے مڑ کر اسے دیکھا۔
 ”وحید کا اسکول کہاں ہے؟ ہمارے ساتھ آجاؤ۔ اسکول سے پتا کر لینا تمہاری تسلی ہو جائے گی۔“

”ہاں۔“ اسید نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”سناڑھے چھ ہونے والے ہیں اور وہ کبھی آج دیر تک گھر سے باہر نہیں رہا۔ آج کل حالات بھی ایسے ہی ہیں۔“

وہ دادا جان کو بتا کر ان کے ساتھ ہی باہر نکل آیا تھا۔
 ”کدھر جانا ہے اسید؟“

آمنہ نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھے اسید کی طرف دیکھا۔
 ”یہ ادھر سامنے ہی سیدھی روڈ ہے پھر چوک سے رائیٹ سائیڈ پر ہو جانا۔“

آمنہ نے سر ہلا دیا۔

”پریشان نہ ہو اسید! ان شاء اللہ وحید اسکول میں آئے گا۔“

ہی ہوگا۔

وہ سامنے روڑ پر دیکھ رہی تھی۔

اسید کی نظریں اسٹیرنگ پر دھرے اس کے ہاتھوں پر ٹک سی گئیں۔ بہت خوب صورت ہاتھ تھے آمنہ کے یا اسے ہی لگتے تھے۔

اس نے نظریں ہٹائیں۔ وہ اب سامنے دیکھ رہا تھا۔ اس کی پریشانی پر گہری لکیریں تھیں۔

”کیا یہ ممکن ہے کہ وہ لوگ وحید کو اغوا کر لیں؟“

اس کے ذہن میں بس ذرا سی دیر کو خیال آیا تھا۔ پچھلے تین چار دنوں میں کتنے ہی دھمکی بھرے فون آچکے تھے لیکن وہ ان کی پروا کیے بغیر لکھ رہا تھا، وہ سب جو اس کے علم میں آ رہا تھا۔ بیگم زبیدہ حسن کی این جی اوز اور ان کے بچے چھٹے۔

ایک سابق فنی اداکارہ عذرا سبحان کا پار لرا اور وہاں ہونے والی سرگرمیاں، نوجوان اور خوبصورت لڑکیوں کا اغوا اور ان میں ملوث یہ پار لرا اور این جی اوز۔

”تو کیا...“ اس نے سر جھٹک کر دائیں طرف دیکھا۔ گاڑی وحید کے اسکول کے گیٹ کے پاس کھڑی تھی۔

”اسید! مجھے تو اسکول ویران ہی نظر آ رہا ہے“ بہر حال تم اتر کر جو کیدار سے پتا کرو۔ وہ یہاں کہیں ہی ہوگا۔“

”ہاں تھینک یو آمنہ! تم لوگ جاؤ اب میں پتا کر کے پھر گھر چلا جاؤں گا۔“

اس نے گاڑی کے دروازے پر ہاتھ رکھتے ہوئے آمنہ کی طرف دیکھا۔

”نہیں اسید! تم پتا کر کے آؤ۔ میں انتظار کر رہی ہوں۔ اسکول کے اندر اتنی خاموشی ہے کہ مجھے پریشانی ہو گئی ہے اور پھر گیٹ بھی بند ہے اگر میچ کھیلنے والے بچے ابھی تک یہاں ہوتے تو اتنی دیر اپنی نہ ہوتی۔“

اسید کچھ جواب دیے بغیر گاڑی سے اتر کر گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ لیکن کچھ دیر بعد ہی پلٹ آیا۔

”چو کیدار کہہ رہا ہے کہ میچ تو چار بجے ختم ہو گیا تھا اور سب لڑکے ساڑھے چار تک چلے گئے تھے۔“

”تو پھر؟“ آمنہ نے پریشانی سے اس کی دیکھا۔

”میرا خیال ہے میں گھر جا کر راجیل سے اس دوستوں کے متعلق پتا کرتا ہوں۔“

اس نے قریب سے گزرتے ہوئے رکشہ کی دے کر روکا۔

”میں تمہیں گھر ڈراپ کر دیتی ہوں اسید! نہیں۔ مغرب کی اذان ہونے والی ہے تم گھر جاؤ۔ میں چلا جاؤں گا۔“

”اسید! کیا کوئی پریشانی کی بات ہو سکتی ہے۔ سوچ رہے ہو؟“

صدق نے کھڑکی کا شیشہ سرکا کر پوچھا۔

”میں سمجھتا نہیں۔ خدا کرے ایسا کچھ نہ ہو۔ لیکن کچھ لوگ دھمکیاں دے رہے تھے کئی دنوں سے۔ گو کچھ واضح نہیں تھا کہ وہ کیا کریں گے لیکن“

”وہ ضرور کسی دوست کی طرف ہی چلا گیا ہوگا۔“

صدق نے گویا تسلی دی لیکن اسید کا دل پتا نہیں کیوں مطمئن نہیں تھا۔

ابھی کل شام ہی کو تو وہ فون آیا تھا۔

”صبح اخبار میں کل والے ادارے کے سلسلے میں معذرت اور تردید چھپنی چاہیے ورنہ انجام کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔“

ادارے میں اس نے ان نام نماد این جی اوز اور ان پار لرا کے متعلق لکھا تھا جو بے حیائی پھیلا رہے تھے اور جن کے رابطے خلیج کی ریاستوں تک تھے۔

اس نے کسی بھی طرح کی کوئی تردید نہیں کی اور۔

وحید کہیں بھی کسی دوست کے گھر نہیں تھا۔

”پولیس میں رپورٹ کروا لیتے ہیں۔“

اب جان نے مشورہ دیا۔

لیکن اسید جانتا تھا کہ پولیس میں رپورٹ لکھوانے کا مطلب ہے ذلیل و خوار ہونا۔ وحید خود سے نہیں جاسکتا تھا یہ اسے یقین تھا۔ سڑک تک وہ دوست کے ساتھ ہی آیا تھا۔ اس کے دوست نے

قند پھرہ اپنی گلی کی طرف مڑ گیا تھا تو کیا۔ گلی سے گھر کے فاصلے میں اس کے ساتھ کچھ ہو گیا تھا۔

”تو کہاں چلا گیا وہ؟“ داوی نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اسید کی طرف دیکھا۔

”میں نے مختلف اسپتالوں سے پتا کر دیا ہے۔ آج ہی اتنی عرصہ پہلے ہو کر میر جنسی میں نہیں آیا۔“

سعید داوی کو بتا رہا تھا جب اسید کا سیل بج اٹھا۔ اسید نے نمبر دیکھا۔ آمنہ کا فون تھا۔

”کچھ پتا چلا وحید کا؟“

”نہیں آمنہ؟“

”تمہیں جس نمبر سے دھمکیاں ملتی رہی ہیں اس نمبر پر چیک کرو فون کر کے۔“

”وہ نمبر کسی پی سی او کا تھا۔ میں نے اسی وقت چیک کر لیا تھا۔“

اسید نے مختصر بات کر کے فون آف کر دیا تب ہی پھر فون ہونے لگی تو اسید نے اسکرین پر نظر ڈالی کوئی اجنبی نمبر تھا۔

وہ آف کرتے کرتے ٹھنکا اور پھر کمرے سے باہر آیا۔

”ہیلو مسٹر اسید! آواز اجنبی تھی۔“

”آپ کون؟“

”اس سوال کو رہنے دو۔ یہ بتاؤ ہمارا سربراہ کون سا رہا؟“

”کیا مطلب صاف بات کرو۔“

”ارے۔۔۔“ لہجے میں حیرانی تھی۔ ”کیا تمہیں ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا کہ تمہارا بھائی آج گھر نہیں آئے گا۔“

”تمہیں؟“ اسید کے ماتھے کی رگیں ابھر آئیں۔

”ہاں میری جان! ہم نے پتا کیا تھا تم سے کہ بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ مت ڈالو لیکن۔“

”شٹ اپ! اسید کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔“ ”مگر وحید کو کوئی نقصان پہنچا تو میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا تم ہیک میٹر ڈاکو برہ فروش۔“

”ہا آ۔۔۔“ دوسری طرف وہ شخص عجیب طرح سے ہنسا تھا۔ ”کیا کر لو گے تم۔ کیا حقیقت ہے تمہاری ہمارے سامنے۔ تم محض ایک معمولی قلم کار چند لفظوں پر اتر رہے ہو۔“

”دیکھو۔“ اس نے لہجے کو حتی الامکان نرم رکھنے کی کوشش کی۔ ”تمہیں جو بھی کچھ شکایت ہے یا جھگڑا ہے وہ تمہارے ساتھ ہے۔ میری فیملی کے افراد کو اس میں ملوث نہ کرو۔ جو کچھ کرنا ہے کہنا ہے میرے ساتھ کرو۔“

”تمہارے ساتھ ہی تو کر رہے ہیں بچو! وہ پھر ہنسا تھا۔“ ”بھی تو تمہارا بھائی سے پھر پاپ پھر دادا پھر۔“

”یکو مت۔۔۔“ اس نے کہتے کہتے خود کو روکا۔

”ہاں کہو کیا کہہ رہے ہو۔ دیکھو تم وحید کو چھوڑ دو۔“

”چھوڑ دیں گے لیکن آئندہ تمہارے اخبار میں میڈم عذرا کے بار لڑکے متعلق کچھ غلط چھپا تو یاد رکھنا پھر زندہ بھائی کے بجائے بھائیوں کی لائیں وصول کرنا۔“

اسید ہونٹ بیچنے کھڑا تھا۔ دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا تھا۔

”اسید! اس کا فون تھا؟“

سعید نے چونہ جانے کب باہر آ گیا تھا اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

اسید نے ایک گہری سانس لی اور سعید کو برآمدے میں بڑی چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا اور ہولے ہولے اس نے تفصیل بتادی۔

”تو اب۔۔۔؟ سعید اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔“

”میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا سعید! کہیں وہ وحید کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔ اگر کبھی ایسا ہوا تو میں کبھی خود کو معاف نہ کر سکوں گا کہ محض میری وجہ سے۔“

اس کی آواز میں نمی تھی۔ سعید ہولے سے اس

فمد کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھک کی طرف بڑھ گیا۔
 ”تم کچھ دیر سو جاؤ۔ یہاں میرے بیڈ پر۔ رات سے جاگ رہے ہو۔“
 ”ڈونٹ وری یار ناٹس بھگتا بھگتا کر عادی ہو گئے ہیں راتوں کو جاگنے کے۔ تم کچھ دیر آرام کر لیتے۔“
 ”ہاں کر لوں گا آرام لیکن تم بھی کچھ دیر لیٹ جاؤ۔ اسپتال بھی جانا ہو گا تمہیں تو۔ اوکے ایز یونیورسٹی۔“
 فمد مسکراتا ہوا بیڈ پر لیٹ گیا۔ جبکہ اسید جلد آنے کا کہہ کر باہر نکل آیا۔ باہر ابھی تک سب وحید کو گھیرے بیٹھے تھے۔ وہ بتا رہا تھا کہ ”جون ہی اس نے گلی میں قدم رکھا۔ ایک شخص نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ دوسرے نے ماؤزر کمر سے لگا دیا اور وہ چیخ بھی نہ سکا۔ اتفاق سے گلی بھی سنسان تھی۔ وہ اسے گلی کے ساتھ ہی باہر روڈ پر کھڑی گاڑی تک لے آئے۔“
 ”لیکن تم مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو۔ ہم کوئی امیر آدمی نہیں ہیں۔ مجھے اغوا کر کے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“
 اس نے احتجاج کیا لیکن وہ اسے زبردستی گاڑی میں بٹھا کر لے گئے۔
 ”توبہ!“ وادی نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ”کیسا زمانہ آگیا ہے کہ دن دھاڑے اتنے بڑے لڑکے کو اغوا کر لیا۔“
 ”انہوں نے تمہیں مارا تو نہیں۔“ راجیل نے جو اس کے ساتھ لگا بیٹھا تھا پوچھا تھا۔
 ”نہیں۔ انہوں نے مجھے کچھ نہیں کہا۔ بس لے جا کر ایک کمرے میں بند کر دیا۔ رات کو کھانے کے لیے بھی دیا اور پھر صبح یہاں گلی کے ٹکڑ پر اتار کر چلے گئے۔ شاید انہیں پتا چل گیا تھا کہ میں کوئی دولت مند لڑکا نہیں ہوں۔“
 ”ضرور یہی بات ہوگی۔“ وادی نے بھی سر ہلایا۔ ”بے چاروں کی محنت اکارت گئی۔“
 وحید ہنسا تو اسید نے دل میں ایک اطمینان سا پھیلتے محسوس کیا۔
 ”سعید! کسی نے ابا کو بھی بتایا؟“ اس نے پوچھا۔

”لوہ ہاں۔ میں جاتا ہوں مسجد میں۔“ سعید تیزی سے صحن کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔
 وحید! کیا دوبارہ وہ لوگ تمہیں نظر آئیں تو پہچان لو گے؟“ سعید نے پوچھا۔
 ”میرا خیال ہے کہ پہچان لوں گا۔“
 ”اے چھوڑو، ہمیں کیا پہچان کر کرنا۔ ہمارا پیر واپس آگیا۔ بس اللہ کا شکر ہے کسی سے دشمنی مول لینے کی ضرورت نہیں۔ چلو سب کمرے میں کچھ دیر سیدھی کر لو۔“
 وادی اٹھ کھڑی ہوئیں۔
 ”اور عاشی! تم نماز پڑھ چکی ہو تو چائے کا پانی رکھو۔“
 ”سید! دادا جان نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے لیکن پھر خاموش ہو گئے۔“
 ”جی دادا جان!“
 ”کچھ نہیں تم جاؤ اور ہاں کہیں ڈاکٹر فمد یوں ہی بغیر ناشتے کے نہ چل دے۔ دھیان رکھنا۔ ساری رات ہمارے ساتھ پریشان رہا۔ اللہ اسے زندگی دے۔ بہت اچھا بچہ ہے۔“
 اسید سر ہلا کر بیٹھک کی طرف بڑھ گیا۔ فمد جو جاگ رہا تھا اسے دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔
 ”میں اب چلتا ہوں۔“
 ”کہاں؟“ اسید نے اس کے کندھوں پر دباؤ ڈالنے ہوئے اسے پھر بٹھا دیا۔
 ”گھر۔“ اس کے لبوں پر ایک افسردہ سا مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”گھر ہی سمجھ لو۔“
 ”کیا مطلب؟“ اسید اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔
 ”گھر تو گھر میں رہنے والے افراد سے بنتا ہے وہ تو ایک ایئر ٹمنٹ ہے بس۔ جہاں میں ٹھہرا ہوں۔“
 ”تم نے کبھی اپنے متعلق بتایا نہیں فمد! تمہاری فیملی۔“
 ”پھر کبھی سہی۔“ فمد نے اس کی بات بکٹ دی۔ ”میں تو میں چلتا ہوں۔ نوبے اسپتال بھی جاتا ہے۔“

”کمال کرتے ہو یا ر! عاشی ناشتہ بنانے لگی ہے۔“
 ”جانتا۔ ابھی تو بہت ناٹم ہے۔“
 تب ہی سعید اندر داخل ہوا۔
 ”ابا آگے!“ اسید نے پوچھا۔
 ”ہاں۔“ سعید سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔
 ”اب تم نے کیا سوچا ہے؟ کیا تردید چھاپو گے؟“
 ”کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ مجھے تو سب نہیں سمجھا۔ شاید میرا سفر یہاں تک ہی تھا۔ شاید میں کسی ایسے امتحان کے قابل نہیں ہوں۔“
 ”تم اپنے راستے پر چلتے رہو اسید! پروا مت کرو کسی کو۔“
 ”کیسے پروا نہ کروں؟“ اسید کی آواز قدرے بلند ہو گئی۔ ”کنسے سعید! جانتے ہو گزری رات کا ایک ایک لمبے لمبے کتنی اذیت میں کاٹا ہے۔ کتنا کرب سہا ہے میں نے۔ اگر خدا نخواستہ وحید کو کوئی نقصان پہنچتا تو میں ابا کو دادا کو وادی کو کسی کو عمر بھر منہ دکھا سکتا تھا۔“
 ”ریلیکس اسید!“ فمد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”سب ٹھیک ہو جائے گا۔ گھبراؤ مت۔ آئندہ چند دنوں تک تم ان کے متعلق کچھ بھی مت چھاپو۔ کیا صبح کے اخبار میں پارلر کے متعلق بھی کوئی آرٹیکل ہے۔“
 ”نہیں۔“ اسید نے نفی میں سر ہلادیا۔ ”یہ لوگ کچھ ایسے اونچے لوگ نہیں ہیں۔ جانتا ہوں میں ماضی کی ایک ایک شرا کے طور پر کام کرنے والی یہ اداکارہ کوئی اتنی پاور فل بھی نہیں ہے۔ چند ایک کرائے کے فنڈے یہاں رکھے ہیں اس نے اور۔“
 ”نہیں فمد! بھلے وہ ایک شرا ہی سہی لیکن اس وقت ساری رسائی عرب ریاستوں تک ہے۔“
 ”تو کے۔ دیکھ لیں گے اسے بھی۔“
 اس نے اندر آئی عاشی کی طرف دیکھا جو ٹرے لٹائے آ رہی تھی اور اس کے ساتھ راجیل تھا۔ راجیل کے ہاتھ میں بھی ٹرے تھی۔ سعید نے ٹیبل

بیڈ کے قریب کی۔ عاشی نے ٹیبل پر ناشتہ لگا دیا۔
 ”پراٹھے“ آلیٹ ”اچار۔“
 فمد مسکرایا۔
 ”آج تو مزا آگیا۔ بدشیں ہو گئیں پراٹھے اور آلیٹ کا ناشتہ کیسے۔“
 ”تھینکس سسٹر!“ راجیل نے بھی ٹرے ٹیبل پر رکھ دیا تھا جس میں پیالا اور ٹی پارٹ وغیرہ رکھے تھے۔
 آجاؤ سعید!“ اسید نے پلیٹ فمد کو پکڑائی۔
 ”چائے آپ خود بنا لو گے یا میں آگریتاؤں۔“ عاشی نے سعید کی طرف دیکھا۔
 ”بنا لیں گے تم جاؤ۔ ویسے یہ پراٹھے تمہارے ہاتھ کے کتے تو نہیں لگتے۔ تم تو ساری دنیا کے نقشے بنا دیتی ہو۔“
 ”امی بنا رہی ہیں۔“ عاشی نے برا نہیں مانا تھا۔
 اسید نے اچار کی پلیٹ اپنی طرف کھسکائی۔
 سعید مسکراتے ہوئے پلیٹ میں آلیٹ ڈالنے لگا اور فمد تھو سا گیا۔
 کہیں کسی منظر نے یادداشت کے کینوس پر ابھر کر جیسے اسے اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا اور وہ ارد گرد سے بے خبر سا ہو گیا تھا۔
 ”فمد! یہ لوٹا آلیٹ سب ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ تم کیا سوچنے لگے؟“
 ”ہاں؟“ وہ چونکا۔
 ”کچھ نہیں۔ یوں ہی میڈم عذرا اور ان کے حواریوں کے متعلق سوچ رہا تھا۔“
 وہ خاموشی سے ناشتہ کرنے لگا تھا لیکن اندر کہیں نمی پھیلتی جا رہی تھی۔
 (دوسری اور آخری قسط آئندہ ماہ)

شعرہ بخاری

ماہنامہ شہزادہ

سویرے سے ہی گھر میں چل پل کا عالم تھا، نیلما نے سب کے کپڑے پر لیس کرنے کے بعد بڑی احتیاط سے کرسیوں کی بیک پر ڈالے تھے اور اب کرسیوں پر بیٹھنے پر مکمل پابندی تھی، داوی نے اپنی چادر و حلوائی تھی۔

”یہ مٹی کی تیز دھوپ ہے، کپڑا زیادہ دیر دھوپ میں ڈالو تو رنگ خراب ہو جاتا ہے۔“

سر مٹی کھر کی چادر میں ابھی بکلی ہی باقی تھی کہ لاکر لاؤنج میں صوفے پر پھیلا دی گئی تھی تو اب صوفے پر بھی کوئی نہیں بیٹھ سکتا تھا، تمام اہل خانہ جس میں شبلی کی امی، نانا، ماموں اور خود شبلی بھی شامل تھا، نیچے

تاؤ لپٹ

ہو جائے گی، لیکن صبح ہی فون کرنے پر پتا چلا ہے، زہرا کو کلج اور اپنی اسٹوڈنٹس کا مستقبل زیادہ عزیز ہے، یہ نسبت نذر انکل کے ہاں سکنے والے قورے اور پلاؤنگے، اس لیے وہ تشریف نہیں لے جا رہیں، سنتے ہی شبلی کے ارمانوں پر بھی اوس پر گئی، جو اووی تو پہلے ہی تھیکے دار کی شو باز طبیعت اور ان کی بیگم کی پھرتی مرحیلی طبیعت سے عاجز تھا۔ صرف شبلی کی وجہ سے شرکت مجبوری تھی، اب جو شبلی نہیں جا رہا اس نے بھی گھر پر رہنے کا فیصلہ کیا۔

”میں تو کہتی ہوں، اب بھی اٹھ کر کپڑے بدل دو، چلو ہمارے ساتھ، اے شبلی! تو ابراہیم کا سفید کرنا پانچامہ پن لے، ذرا معتبر لگے گا اور جو او تو بھی ڈھنگ



Saba n

کے کپڑے پہن لے، میں بتا تو سکوں، اب میرے پوتے بھی ذمہ دار انسان بن گئے ہیں۔“
 دادی کی بات پر نیم سویر از شبلی اٹھ بیٹھا اور بولا۔
 ”یعنی آپ کا مطلب ہے سفید کرتا یا سچا پھانڈ پھانڈ لینے سے انسان ذمہ دار ہو جاتا ہے۔“

”تو اور کیا سفید کپڑوں کو داغ دھبوں سے بچانا ہر کسی کے بس کی بات تھوڑی ہے۔“ جوادی نے سر ہلا کر بات کو آگے بڑھایا۔

”وے تنیں وے، میرا مطلب تھا سب کو بتاؤں گی، اپنا اسکول چلا رہے ہیں، اب تمہارے جو چلے ہوتے ہیں، لوگ تو محفل ہی سمجھیں گے، تا میری بات کو اسی لیے کہا ہے ڈھنگ کے کپڑے پہن لو۔“

”ہاں شبلی! پہن لے، نانا، ماموں کا پانسجامہ ویسے بھی آج کل نیکر نما پانسجامے لڑکیوں میں تو این ہیں ہی تو پہنے گا تو لڑکوں میں بھی ہو جائیں گے اور ساتھ میں سفید کرتا پانسجامہ میں ملتا ہی کہتے، واہ واہ۔“

جوادی نے تصور کی آنکھ سے شبلی کو نٹنوں سے اونچے پانسجامے اور کرتے کھسے میں ملبوس دیکھ لیا تھا اور مسلسل داد دے رہا تھا۔

”ہاں! ابراہیم کا قد تو تیرے سے چھوٹا ہے۔“
 اب جا کے دادی کو بھی خیال آیا، پروگرام بدلا، بولیں۔
 ”چل رہیں دے، تو اپنا ہی کوئی ڈھنگ کا کپڑا پہن لے۔“

”ہمارے لیے تو کسی نے محلے کے پچھواڑے والے بازار سے بھی شاپنگ کرنا گوارا نہیں کیا، ڈھنگ کے کپڑے آخر کہاں سے آئیں گے؟“

”جتنے بھی کپڑے بنوادو، تم لوگ دہفتے میں تاس مار لیتے ہو۔“ تانی امی کی نظروں میں پرانے منظر فلم کی مانند چلنے لگے۔

دونوں نے جواب نہیں دیا، آدھے گھنٹے کے بعد سب لوگ، ابا جی کی پرانی گاڑی میں پیک ہو کر روانہ ہو گئے۔ اب گھر پر یہی دونوں تھے، دن کے بارہ بجنے کو تھے، گرمی کی شدت پچھلے دنوں کے مقابلے میں آج زیادہ تھی، لاسٹ چلی گئی تو دونوں اٹھ کر صحن میں لگے

جامن کے درخت کے نیچے آ بیٹھے، بمشکل اس منظر ہی بیٹھے ہوں گے، جوادی نے آہ بھر کے بھرے جامن کی جانب دیکھا، پھر شبلی کی طرف دیکھا، جو بار بار ہیمنہ پوچھ رہا تھا۔

”دادی اپنا نیا لائیک سوٹ چھت پر پھیلا کر رکھیں، کہہ رہی تھیں بس پانچ منٹ ہی اوپر ڈالنا، نیچے لا کر چھائوں میں رکھ دینا، میرے تو پیر میں سخت ہے۔ تم ذرا چھت پر جا کر لے آؤ۔“

”کیا کرتا ہے یار! اتنی گرمی میں، میں تو پچھل جا رہی گا۔“ جوادی نے انکار کے ساتھ نہ جانے کی وجہ بتادی۔

”تم آئس کریم نہیں ہو، جاؤ جلدی لے آؤ، سوٹ ہے، ان کا بڑے شوق سے بنوایا ہے، میرے پیسے میں اس قدر درود نہ ہوتا تو میں خود جا کر لے آتا، امر کی شدت سے گھبرا کر جوادی کو اٹھنا پڑا، چھت پر گیا وہاں سے جھانک کر اطلاع دی۔

”سوٹ غائب ہے، وہی وجوہات قابل غور ہیں، کسی پڑوسن کا دل آگیا ہے اور وہ لے اڑی ہے یا پھر گستاخی ہو اکی ہے۔“

”پہلی وجہ قابل غور ہے، آس پاس کی چھتوں پر تلاش کرو اگر کسی عورت کا سایہ بھی کسی چھت پر دکھائی دے رہا ہے تو لپک کر بوج لو۔“

”پیارے! اس وقت مارے گرمی کے میری آنکھوں کے آگے ویسے ہی کئی کئی شکلیں بن اور رہی ہیں۔“

”اچھا پھر آ جاؤ۔“ جھٹ اجازت دی گئی، جوادی جیسے تیسے نیچے اتر اور آکر جامن تلے پچھی چار پالے گر کر ہاتھ پینے ساگا۔

شبلی نے غور سے صورت حال کو دیکھا، پھر مطمئن انداز میں سر اثبات میں ہلایا اور بولا۔

”چل کچن میں چلتے ہیں، فریج میں جو بھی پڑا گرم کر کے کھاتے ہیں اور اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔“

”تمہیں میری امی کا تو پتا ہے فریج کے تو ویسے ہی بڑی خلاف ہیں اور باسی سالن جمع کرنا ان کے نزدیک

کی علامت ہے۔“
 ”یعنی کہ کچھ نہیں پڑا۔“
 ”جوادی نے مشورہ دیا۔

”ہمارے ہاں تو صبح ہی امی نے فریج کی صفائی کی ہے، صافائی کی ہے اور اب وہ خالص بالکل نواں نکور ہے۔“

”جواب نہیں ہمارے گھر والوں کا۔“ جوادی نے شبلی نے فضا میں کچھ سو گھنٹے کی کوشش کی۔

”یار جوادی! یہ جو خوشبو آ رہی ہے، قیاس ہے کہ اس کا سر در در نہیں۔“

”تو یار! بلکہ لگتا ہے بانو کچھ پکا رہی ہے۔“
 ”بس پھر تو مزے ہو گئے، دیکھنا۔ ابھی دروازے پر دستک ہو گی۔“ جوادی پر جوش ہوا۔

”لگتا ہے تو رومہ بن رہا ہے اور کبھی کبھی ساتھ میں برائی کی خوشبو بھی شامل ہو جاتی ہے۔“ شبلی تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ماہرانہ تبصرہ نشر کر رہا تھا، لیکن جوادی اب بالکل خاموش اور کسی گرمی سوچ میں گم تھا۔

”کیا ہوا، کیا آج آلو ٹنڈے کھانے کا موڈ ہو رہا تھا،“ شبلی نے اس کی بے توجہی کو نوٹ کر کے قیاس لیا۔

”ہاں، کاش آج ادھر آلو ٹنڈے ہی پک رہے ہوتے۔“
 ”بہت برا تو رومہ بتاتی ہے کیا؟“

”کو نہیں یار! تو رومے برائیاں کتنے بڑے خطرے کی علامت ہیں، تم نہیں سمجھ سکتے، یہ تو غریب لوگ، سب دال سبزی سے آگے کچھ سوچتا ہے تو بانو کا چھوٹا ہاتھ ہمارے ہاں پوچھنے آ جاتا ہے کہ تھوڑا سا لٹن ہو گا تو

”ابھی آج آج یہ منحوس خوشبو میں بتا رہی ہے،“
 ”ابھی کی آمد آمد ہے۔“

”کچن میں کچھ نہ سمجھ کر آنکھیں منکامیں، لیکن پھر اس کی ٹھٹک گیا۔“
 ”تمہیں کسی کی چلچلاتی دھوپ تمہارے دماغ کو

”کچن میں کچھ نہ سمجھ کر آنکھیں منکامیں، لیکن پھر اس کی ٹھٹک گیا۔“

”اوہ نہیں اوسے میرے تو دل کو لگ گئی ہے دھوپ۔“ شبلی حیران ہوا۔ ”تم مسلسل میرا سر کھا رہے ہو، اندر جاؤ اور ایک گلاس پانی لے کر آؤ میرے لیے۔“

اس وقت گلی میں جن جی رکنے کی آواز آئی، جوادی چونکا ہوا، اٹھا اور ذرا سا گیٹ کھول کر جھانکا، شبلی کو بھی تجسس ہوا اور پیچھے جا کھڑا ہوا۔

”جس کا ڈر تھا آخر ہو گیا نا وہی کام۔“ اب کے جوادی صرف سنجیدہ تھا۔

”اگر اب بھی تم نے مجھے کچھ نہ بتایا تو میں دھوپ میں جا کر کھڑا ہو جاؤں گا۔“ شبلی نے دھمکی دی۔

”اوہ یار! بتایا تو تھا، بانو کی خالہ اپنے لفٹنے بیٹوں کے ساتھ آ رہی ہے۔“

”خالہ، لفٹنے بیٹے، یار رات ہی سلطان راہی مرحوم کی ایک پنجالی قلم دیکھنے کا حسن اتفاق ہوا ہے، بالکل ایسے ہی چوتھن بار بار دکھائی جا رہی تھی، دشمنوں کی طرف سے خزانہ خواتین اور لفٹنے نوجوان تانگے بھر بھر کر آتے ہیں۔ ادھر ہیرو صاحب اکیلے ڈانگ لے کر استقبال کو کھڑے ہیں اور استقبال بھی ایسا کہ میں تو دیکھ کر در پر تلک سر دھنسا اور عیش عیش کرتا رہا، غریب چیختے چلاتے معافی پر معافی مانگتے، واپس بھاگتے ہیں۔“

سن کر جوادی کی نگاہوں کی چمک واپس آئی، بولا۔

”ہاں! آج سے مجھے بھی سلطان راہی مرحوم کا دو سرا روپ سمجھ لو اور ان آنے والوں کو تانگے میں بیٹھے دشمن۔“

”کمال ہے، بیٹھے بٹھائے اچھی بھلی صورت سے کیوں خار کھانے لگے ہو، جو سلطان راہی کا روپ اپنانے کا تہہ کر لیا ہے۔“

”تمہیں کیا پتا، تم کیسے سمجھ سکتے ہو، تمہارے پیار کی راہ میں کوئی ظالم سلج ہے ہی نہیں۔“

”تو اس میں طنز والی کون سی بات ہے، میں نے نہیں کہا تھا، ادھر دل لگاؤ۔“
 ”خیر! میں بھی ان دیواروں کو گرا کر دم لوں گا۔“

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیرائل

SOHNI HAIR OIL



- ☆ گرت ہوئے بالوں کو روکتا ہے۔
- ☆ نئے بال آگاتا ہے۔
- ☆ بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- ☆ مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے یکساں مفید۔
- ☆ ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

سوہنی ہیرائل قیمت = 70 روپے

12 جزی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ عمومی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خرید جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف 70 روپے ہے، دوسرے شہروں کے لئے ڈسٹری بیوٹرز کے ذریعے سے منگوائیں، رجسٹری سے منگوانے والے کسی ڈسٹری بیوٹر سے منگوائیں۔

- 1 بوتل کے لئے = 90 روپے
- 2 بوتلوں کے لئے = 160 روپے
- 3 بوتلوں کے لئے = 240 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیننگ چارج شامل ہیں۔

منی آرڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس 53 اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیرائل ان بوتل سے حاصل کریں

بیوٹی بکس 53 اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37 اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 2735021

تھی۔

”آئے ہائے ہم کیوں نکالے جاتے بھلا ہم تو چند دن کے لیے ادھر آئے ہیں۔“ پھر واپس اپنے شہر چلے ہی جائیں گے۔“

”یہ پڑوسی ہیں بڑا پیار ہے ہمارے گھروں میں۔ بانو کی والدہ یعنی خالہ محترمہ نے کچھ زیادہ ہی چمک کر تعارف کروایا۔“

”مہمانوں نے بھی بڑی محبت اور اپنائیت کے ساتھ ادھر دیکھا جہاں مکمل بے گانگی ہی بے گانگی تھی۔“

”یہ جو ادھے بیڈ ماسٹر صاحب کا بیٹا اور یہ تو پورا گھر ہی پڑھا لکھا ہے، دونوں لڑکے بھی اسکول چلا رہے ہیں۔“

”اتنی تعریفیں تو لڑکی دیتے ہوئے ادھر نظر کیوں نہیں پڑی، جو ادھی نے جل کر سوچا اور چہرے پر بے زاری کا تاثر مزید گہرا ہو گیا۔“

”آہو! یہ تو میں دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی پڑھے لکھے لوگ ہیں، جب ہی تو اوپر (بیگانے) سے ہیں ہمارے جیسے ہوتے تو کھلی بانہوں سے نہ ملے بھلا۔“

خاتون خیالات کا اظہار کرنے میں کھلی ڈلی تھیں ویسے بھی ان لڑکوں کی طرف سے یوں نظر انداز کیا گیا معزز مہمانوں کو یقیناً تو نہیں ہی محسوس ہوئی تھی۔

”ہمارے شہر میں تو ایک گھر کا مہمان پورے محلے کا مہمان ہوتا ہے۔“ ایک جگر گوشے نے بھی انہیں نظروں میں رکھ کر طنز کیا اور آئندہ کے لیے ان کی لسٹ میں اپنا نام لکھوا لیا۔

”ہمارے شہر کی تو کیا ہی بات ہے، ہم تو بڑا ہی پیار کرنے والے لوگ ہیں بڑے شہروں کے محبت کے سوا کو کیا سمجھیں۔“

جو ادھی کو لگا یہ خاتون صرف اتنا سنانے کے لیے ہی پیار محبت جیسے الفاظ استعمال کر رہی ہیں، تاؤ دلداری ہیں گرتا ہے جو کر لو ہم تو لڑکی لے کر ہی جائیں گے۔“ تو آپ لوگ اپنے شہر سے اسی وجہ سے نکلتے تھے ہوں گے کہ وہاں سارے پیار محبت کرنے والے بستے تھے۔“ شبلی کی معصومیت سوال کرتے وقت ذہنی

”دیکھ کے خالہ جی، ایک تو بیٹے آپ کے سارے کے سارے ایشوریا بچن کی طرح اسمارٹ ہیں۔“ شبلی نے لپک کر بڑے زور سے لڑکے کو تھام لیا۔

میں چلے آئے۔

”بیٹھک آج واقعی بیٹھک تھی کہ یہاں وہاں بیٹھے تھے انہوں نے سلام کیا تو انہیں بھی بیٹھے گیا۔“

”یہ پڑوسی ہیں بڑا پیار ہے ہمارے گھروں میں۔ بانو کی والدہ یعنی خالہ محترمہ نے کچھ زیادہ ہی چمک کر تعارف کروایا۔“

”مہمانوں نے بھی بڑی محبت اور اپنائیت کے ساتھ ادھر دیکھا جہاں مکمل بے گانگی ہی بے گانگی تھی۔“

”یہ جو ادھے بیڈ ماسٹر صاحب کا بیٹا اور یہ تو پورا گھر ہی پڑھا لکھا ہے، دونوں لڑکے بھی اسکول چلا رہے ہیں۔“

”اتنی تعریفیں تو لڑکی دیتے ہوئے ادھر نظر کیوں نہیں پڑی، جو ادھی نے جل کر سوچا اور چہرے پر بے زاری کا تاثر مزید گہرا ہو گیا۔“

”آہو! یہ تو میں دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی پڑھے لکھے لوگ ہیں، جب ہی تو اوپر (بیگانے) سے ہیں ہمارے جیسے ہوتے تو کھلی بانہوں سے نہ ملے بھلا۔“

خاتون خیالات کا اظہار کرنے میں کھلی ڈلی تھیں ویسے بھی ان لڑکوں کی طرف سے یوں نظر انداز کیا گیا معزز مہمانوں کو یقیناً تو نہیں ہی محسوس ہوئی تھی۔

”ہمارے شہر میں تو ایک گھر کا مہمان پورے محلے کا مہمان ہوتا ہے۔“ ایک جگر گوشے نے بھی انہیں نظروں میں رکھ کر طنز کیا اور آئندہ کے لیے ان کی لسٹ میں اپنا نام لکھوا لیا۔

”ہمارے شہر کی تو کیا ہی بات ہے، ہم تو بڑا ہی پیار کرنے والے لوگ ہیں بڑے شہروں کے محبت کے سوا کو کیا سمجھیں۔“

جو ادھی کو لگا یہ خاتون صرف اتنا سنانے کے لیے ہی پیار محبت جیسے الفاظ استعمال کر رہی ہیں، تاؤ دلداری ہیں گرتا ہے جو کر لو ہم تو لڑکی لے کر ہی جائیں گے۔“ تو آپ لوگ اپنے شہر سے اسی وجہ سے نکلتے تھے ہوں گے کہ وہاں سارے پیار محبت کرنے والے بستے تھے۔“ شبلی کی معصومیت سوال کرتے وقت ذہنی

”دیکھ کے خالہ جی، ایک تو بیٹے آپ کے سارے کے سارے ایشوریا بچن کی طرح اسمارٹ ہیں۔“ شبلی نے لپک کر بڑے زور سے لڑکے کو تھام لیا۔

”کیوں مسلسل خطرناک باتیں کر رہے ہو جو ادھی! دیواروں تلے کیا سونا دفن ہے جو گرانے پر تل گئے ہو جاؤ۔ اندر سے کوئی اخبار ہی لے لے او اس کو ہاتھ کا پکھا بنا کر ہوا لوں تو شاید کچھ چین پڑے۔“

”اخبار میں گرما گرم خبریں ہوتی ہیں، ہوا بھی گرم ہی آئے گی جو ادھی یار! اٹھو اور ہمت سے کام لے چل پڑوس میں چلتے ہیں، وہی بمانہ بہت ہے کہ والدہ صاحبہ ہمارے لیے کھانے کا انتظام کیے بغیر ہی تشریف لے گئی ہیں۔ ہم پڑوس پر حق جتانے اور یاد دلانے آئے ہیں۔“

”آں ہاں ہاں کتنا تو ٹھیک ہے۔“ جو ادھی بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

پڑوسی کے دروازے کے ساتھ ہی ان کی بیٹھک بھی تھی، جس کی کھلی کھڑکی پر پردہ لہرا ہوا تھا، یوں نگاہ اندر جانے سے قاصر تھی، البتہ کٹن قمقموں اور باتوں کی آوازیں مسلسل سن رہے تھے۔

”دیکھ لو خالہ جی کو کیسے پچھرا رہی ہیں۔“ جو ادھی کو پھر غصہ آیا۔

”ظاہر ہے ان کی بیٹی کا ڈولا اٹھنے کی امید بندھی ہے، پچھرائیں گی نہیں۔“ شبلی نے لا پرواہی دکھائی۔

”میں اس ڈولے کو آگ لگا دوں گا۔“

”فی الحال منہ بند رکھو، ان کے دروازے پر کھڑے ہو کر سنہرے خیالات کا اظہار فرماؤ گے تو کھانا نہیں ملے گا۔“

دوبار دستک دینے کے بعد دروازہ بانو کے دس سالہ بھائی صاحب نے کھولا، دروازہ کھلنے سے پہلے ہی وہ بیٹی نکالے ہوئے تھے، سو جو دروازہ کھلا تو وہی تصویر ان کے سامنے آئی۔

”تمہیں پتا تھا، ہم آئے ہیں جو اتنے خوش ہو رہے ہو۔“

”نہیں جی۔ آپ کو نہیں پتا ہمارے گھر مہمان آئے ہیں، بڑی دور سے اور بڑی سوغاتیں لائے ہیں، آئیں آئیے نا! اندر آجائیے۔“ وہ کمرے جیسے بانو کے ہاں بیٹھک کہا جاتا تھا، اسی

ہوئی تھی۔
 ”ہاں ہاں پکاؤ پکاؤ کھلاؤ انہیں راستہ بناؤ ان کے دلوں تک میں تو سمجھ رہا تھا تم آٹھ آٹھ آنسو بہانے کھیر میں مرچیں اور کوفتوں میں چینی ڈال رہی ہوگی یہاں تو۔۔۔“
 ”میں نے کسٹرو بنایا ہے اور قورمہ کھیر اور کوفتے تو بنائے ہی نہیں۔“ (واہ رے اے معصومیت۔)
 ”تو اب بناؤ۔ کس نے روکا ہے۔“ انداز کٹ کھانے والا تھا۔
 بانو سمجھی نہیں کچھ دیر اس کا بگڑا موڈ دیکھتی رہی پھر دھیرے سے بولی۔
 ”مجھے کیا پتا تھا آپ کا دل کھیر اور کوفتوں کے لیے چاہ رہا ہے کل بنا دوں گی۔“
 ”ہاں ہاں جیسے تم یہ سب میرے لیے ہی تو اہتمام کر رہی ہونا!“ انداز مزید طنزیہ ہوا۔
 ”وہ مہمان آئے ہیں کچھ نہ کچھ تو بنانا ہی تھا۔“
 ”جوادی!“ آہستگی سے شبلی نے پکارا اسے پلٹنا پڑا۔
 ”یار! باہل تو نہیں ہو گیا کچن میں پہنچ گیا لڑکی کے پاس۔“ وہ بیرونی دروازے کے قریب کھڑا تھا جوں ہی جوادی قریب پہنچا وہی آواز سے ڈانٹنے لگا۔ جوادی کچھ سوچ کر چونکا۔
 ”یار! خواجواہ تم نے بلا لیا۔ اچھا ہے نا سب دیکھیں سب کو پتا چلے لڑکی کا تو پڑوسیوں کے لڑکے کے ساتھ ایئر چل رہا ہے۔“
 ”کیوں بانو کے ابا کو ہارٹ اٹیک کروانے کا ارادہ ہے تمہیں پتا تو ہے وہ بڑا غیرت مند ہے مجھے یقین ہے ہارٹ اٹیک سے پہلے وہ بانو پر اٹیک کرے گا اسے بار کر ہی وفات پائے گا۔“
 ”ہاں! چچا ہے تو کچھ ایسے ہی مزاج کا اور یہ بانو کی والدہ یعنی خالہ جی یہ کون سا کم ہے میرا خیال ہے یہ خود ہی لڑکی کا گلا گھونٹ دیں گی۔“ جوادی نے بھی اتفاق کرنے کے ساتھ مزید خدشے کا بھی اظہار کیا۔
 ”تو کیا پھر تم بانو کی زندگی نہیں چاہتے؟“

”آہ چلو گھر چلتے ہیں۔“ جوادی بے حد ادا اس تھا۔
 ”وے پتر جوادی! شبلی! بیٹھو نا اب روٹی ہمارے ساتھ کھا کر ہی گھر جانا۔“ خالہ کی محبتیں بے مثل تھیں ہاتھ تنگ، ٹیکن دل کھلا تھا۔
 جوادی تو شاید انکار کر دیتا لیکن شبلی جھٹ راضی ہو گیا دونوں پھر ہنسی میں آ بیٹھے۔
 ”خیر سے کتنا کما لیتے ہو دونوں؟“ خاتون نے اب کے انداز بدلا۔
 ”چالیس پچاس تو کہیں نہیں گئے۔“
 ”ہاں میں اچھا!“ آنکھیں پھیلیں پھر پانچویں۔ (خود سے ہزار کا اضافہ جو کیا تھا۔)
 ”کتنے ساہ مزاج اور نیک شریف ہو آج کل کے لڑکے تو بڑے ہی اوجھے ہوتے ہیں میں بندے کی بڑی پہچان رکھتی ہوں۔ دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی ہو خاندانی نا، ویسے ان کے گھر کیا کرنے آتے ہو ادھر تو تمہارے جوڑا ایک بھی نہیں۔“
 محترمہ کس طرح ہیر پھر کر اپنے مطلب پر لا رہی ہیں دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔
 ”ہاں جی! مطلب کا تو ایک بھی نہیں بلکہ سچ کہوں تو اب کے مطلب کا بھی کوئی نہیں ہے۔ آپ تو مجھے اپنی سلی پھوپھی کی طرح لگ رہی ہیں۔“
 جوادی جگہ سے اٹھا اور ان کے پہلو میں جا بیٹھا کہ موقع غنیمت تھا خالہ جی اس وقت بانو کو کچھ بدلتی دینے کچن کی طرف گئی تھیں۔
 ”نہیں۔ میں تو اس طرح کہہ رہی تھی کہ ادھر کوئی نہ کوئی اتنا پیسے والا ہے نہ بڑھا لکھا باقی یہ تو میں جانتی ہوں یہ گھر محبتوں میں سمجوس نہیں ہے۔“ (چلو جی بات ہی ختم خاتون کے خیالات تو بہترین تھے۔)
 ”ہاں دور کے ڈھول سہانے۔“ شبلی خانے کے انداز میں ہنسا۔
 ”ہاں جی! یہ تو ٹھیک کہا ہے بھائی جان آپ نے قسمیں! ادھر ہمارے پڑوس میں شادی بھی گڑیاں رات کے بارہ ایک بجے تک ڈھولک بجا کر پتا نہیں کس کس سے انتقام لیتی تھیں نیندیں حرام ہو گئی

نہیں ہماری تو برابر میں جو گھر تھا اور میں یہی سوچتا تھا کہش ہمارا گھر یہاں سے دور ہو تا یا یہ پڑوس دوسرے محلے میں ہوتے۔“
 بڑے صاحبزادے نے شبلی سے پورا اتفاق کیا مگر خاتون ہوا کہ شبلی کو اس اتفاق سے ذرا خوشی نہیں ہوئی۔
 ”جو جی سب نیچے درری پر آ جاؤ۔ میں دسترخوان بچھا رہی ہوں۔“ خالہ جی نے اگر اعلان کیا اور مسرت کی لہر دوڑادی ذرا سی در میں سب درری پر تھے۔
 ”اے میں نے کہا نسرین! لڑکیوں سے کونا تم کیوں لگی ہوئی ہو۔“
 ”وہ کھانا لا رہی ہیں آیا!“
 ”ویسے بڑے ہی اچھی لڑکیاں ہیں تمہاری میری بانو کی طرح ہی کام میں پھرتی۔“
 ”ہاں بانو کی تعریف تو ضرور کریں گی ان کے سامنے۔“ جوادی نے گلس کر پہلو بدلا۔
 ”اے پھڑو جی پھڑو گرم ہے ذرا احتیاط کے ساتھ۔“ آواز اور لہجہ بانو کا نہیں تھا۔ نگاہ اٹھائی سامنے دو اجنبی لڑکیاں کھڑی تھیں خوب کڑھائی پالنے کپڑے پہنیں تھیں یقیناً یہیں ہیں وہ جن کی تعریف ابھی خالہ کر رہی تھیں۔
 ”آ جاؤنی اب تمہی ساریاں بھی بانو کو بھی بلا لو۔“
 ”اچھا امی جی! پہلے کھانا رکھ تو لیں پھر بار بار اٹھنا پڑے گا۔“ لڑکیاں واپس ہو لیں۔
 ”میرا خیال ہے میں لڑکیوں کے لیے دوسرے کمرے میں دسترخوان بچھا دیتی ہوں۔“
 نسرین کو بانو کے یہاں آکر کھانے پر اعتراض تھا کہ یہ ان کے گھر کی روایت نہیں تھی۔ ساتھ میں مہمان نہیں آکھنا بھی اندر والے کمرے میں ہی لگا دیا گیا۔
 ”پکایا تو بڑا کچھ ہے پڑو ذرا بھی سواد کا نہیں ہے۔“ جو نبی خالہ پانی لینے باہر نکلیں کھانے سے انصاف لیتی خاتون میزبان بچوں سے ذرا برے ہو کہ دھیرے سے شبلی کے کان میں بولیں اور شبلی کے ساتھ ساتھ بانو نے بھی پڑو انداز میں اثبات میں گردن ہلائی۔

”آپ نے تو میرے دل کی بات کہہ دی پھوپھی جی! اصل میں ان کے ہاں کہاں ایسے کھانے بنتے ہیں بے چاری نے ادھر ادھر سے ترکیبیں پڑھ کر کھانا بنایا ہوگا۔“
 ”ہائے ہائے!“ افسوس کا اظہار کیا پھر بولیں۔ ”کسی دن کبوں گی جیلہ سے کہیں قورمہ بنا کر کھلائے میری جیلہ، اینلا بڑا ہی اچھا کھانا بناتی ہیں ہم بھی تمہاری طرح کھاتے بیٹے لوگ ہیں یہ قورمہ بریائیاں ہمارے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہیں روز ہی کھاتے رہتے ہیں۔“
 ”پھر میں خالہ سے کہے دیتا ہوں ڈالیں پکائیں، آپ کے لیے وہ تو نئی ہوں گی تا سواد آجائے گا۔“ شبلی نے جھٹ سے کہا تو گھبرا گئیں۔
 ”نا، وال، ہم کہاں کھا سکتے ہیں بس تو اس بات کو ہمیں چھوڑ دے کچھ نہ کہنا و چاری سے دل ٹوٹ جائے گا اس کا۔“
 ”کیسی مکار عورت ہے خالہ اس کی بانو کی ساس بنانا چاہتی ہیں۔ پتا نہیں کس پات کا بدلہ لے رہی ہیں۔“ معصوم سے جوادی نے جذباتی ہو کر ہاتھ میں تھما گلاس زور سے پٹخا۔
 ”کیا ہوا؟“ سب ہی نے ان کی جانب دیکھا ”زیادہ مرچیں کھالے تو جذباتی ہو جاتا ہے چل شامشے یہ وہی کھالے اس میں مرچیں نہیں ہیں۔“ شبلی نے سب کی تشفی کرا کے اسے مشورہ دیا۔
 ”میں گھر جا رہا ہوں۔“ جوادی نے اٹھنا چاہا۔
 ”بیٹھو نا اینلا سے کہتی ہوں چائے بنا لے لی کر جانا بڑی سواد چائے بناتی ہے۔“
 ”اس گرمی میں چائے پی لے گا تو اور بھی جذباتی ہو جائے گا جانے دیں اسے۔“ شبلی نے سلاو کی پلیٹ سامنے رکھتے ہوئے بتایا۔
 ”اچھا گرمی زیادہ لگتی ہے۔“ اتنا کہہ کر ہلکا سا تقبہ لگایا پھر فرمایا۔
 ”بالکل میری اینلا کی طرح۔“
 ”اماں!“ جوان بیٹا بسن کی عادت پر اے لڑکے سے

جوڑنے پر جذباتی ہو کر چلایا۔

”کیا ہے وئے نہ ہر ویلے کا کاہن کے مجھے بلاتا رہا کر۔ یہ دونوں تیرے بھائی آئے بیٹھے ہیں، مل کر پروگرام بنا لو۔ کل ہی شہر کی سیر کو چلیں گے۔ ویسے مجھ ہم یہاں اس چھوٹے سے گھر میں سڑنے کے لیے تھوڑی آئے ہیں، ابھی راستے میں رکشہ جس سڑک سے گزرا تھا۔ ساتھ ساتھ نہر بہتی تھی، کنارے کنارے گھنے درخت، ہری ہری گھاس ہائے ربا جی تو کرتا تھا بس یہی اتر جاؤں نہر میں پاؤں ڈال کر بیٹھوں اور تریوڑ کھاؤں۔“

”تو پھوپھی جی! یہ کون سا مشکل ہے، آپ تریوڑ خرید لیجئے گا، ہم کل ہی آپ کو نہر ریلے جائیں گے۔“ شبلی نے خوش خبری سنا کر سب کو خوش کر دیا۔

”یہ بچہ بڑا کم صم ہو رہا ہے۔“ پھوپھی جی کو جوادی کی چپ سے تشویش ہوئی۔

”کھانا کھا کر یہ ایسے ہی ست ہو جایا کرتا ہے، فکر نہ کریں، تھوڑی دیر بعد پھر بولنے لگے گا۔“

”تم لوگ تو تھکے دار ہو، جانتے ہو گے ان کے گھر کے حالات کیسے جارہے ہیں، بھائی جی کتنا کما لیتے ہیں، ان کے منڈے تو ابھی پھولے ہیں اور پھر بڑھنے پر بھی لگایے ہیں، پتا نہیں یہ مشورہ کس عقل کے اندھے نے دیا ہے انہیں، بھئی جب گھر میں دانے نہیں تو ایسے بکھیڑوں کی کیا ضرورت ہے۔“

اور چونکہ یہ مشورہ جوادی کے ابا کا تھا تو یقیناً ”پہلو بدلنا تو حق بنتا تھا۔“

”بھئی۔ ہم تو اپنے بڑوں سے یہی سنتے آئے ہیں یہ پڑھائیاں، لکھائیاں، داغ میں خشکی پیدا کر دیتی ہیں، پھر بندہ کسی جوگا نہیں رہتا۔ اسی لیے بھئی کسی بچے پر بڑھنے کے لیے دباؤ نہیں ڈالا، ہاں پر میری کڑیوں کو شوق (شوق) تھا۔ دونوں پوری آٹھ، آٹھ جماعتیں بڑھ گئی ہیں، ان کا ابا تو جب لاڈ کے موڈ میں ہوتا ہے، انہیں پروفیسر پتہ ہی کہہ کر بلاتا ہے۔“

”سبحان اللہ۔ ابا اور ابا کا لاڈ زندہ باد، بس کوئی پروفیسر، یہ لاڈیہ فقرہ نہ سن لے۔“ جوادی بڑبڑایا۔

”یہاں اس شہر میں سیر کرنے والی کون کون سی جگہیں ہیں؟“

بڑے صاحبزادے نے سوال کیا اور چونکہ بڑا صاحبزادہ ہی جوادی کو سب سے زیادہ کھٹک رہا تھا اس لیے جواب دینے کے بجائے تھلی پر بڑی کتاب اٹھالے۔ عنوان تھا ”نارزن اور چھن چھنگو“ یقیناً ”یہ باؤ کے کسی برادر عزیز کی ہوگی، اس وقت تو جوادی کی ساری دلچسپیاں اسی کتاب میں سمٹ آئی تھیں۔“

”بتایا نہیں جی، آپ نے؟“ اب وہ شبلی سے پوچھ رہا تھا۔

”مقامات تو بہت سے ہیں، اب یہ تو اپنے اپنے مزان چر رہے نا!“

”میں نے سنا ہے، ادھر مزار بھی بہت ہیں، میلے لگتے رہتے ہیں، وہاں پر اور جلیبیاں، قنطاریاں، بڑی سوادی بنتی ہیں، ان مزاروں پر۔“ پھوپھی جی کی معلومات پر شبلی جھوم اٹھا اور بولا۔

”کوئی ایسے ویسے میلے سمجھیں، یہ تو شہر ہی میلوں ٹھیلوں کا ہے۔“

”ہمیں بھی دکھائیں نا، میلہ۔ وہاں پر موت کا کنواں بھی ضرور ہوگا۔“ لڑکے بڑے خوش اور پر جوش تھے۔

”موت کے لیے کنویں پر جانے کی کیا ضرورت ہے، گلے میں رسی کا پھندا اڈال کر تنکھے سے لٹکا جاسکتا ہے۔“ جوادی نے کتاب بند کر کے سمجھایا تھا۔

”اور نہیں جی نہیں۔ آپ سمجھے نہیں ہو۔“

”ہاں۔ تم پڑھو اپنی کتاب، جو مزہ کنویں میں ڈوب کے مرنے میں ہے، وہ بھلا تنکھے کے ساتھ لٹکنے میں کہاں۔“ شبلی نے کتاب کھول کر دوبارہ جوادی کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

”جی کڑیو! جیلہ! اینٹلا کدھر جا کر بیٹھ گئی ہو۔ ادھر آؤ، سیروں کے پروگرام بن رہے ہیں۔“ پھوپھی نے صحن کی کھڑکی کھول کر آواز لگائی۔

جیلہ، اینٹلا کے ساتھ ساتھ خالہ نسرین بھی یقیناً اعلان سن کر ہی چلی آئی تھیں، لڑکیاں جتنی خوش

رکھائی ویسے رہی تھیں، خالہ کے چہرے پر اتنی ہی بریشالی تھی، آتے ہی بولیں۔

”اے ہے، اس گرم موسم میں سیر، سر کو لو لنگ چلے گی، گردن توڑ بخار ہو جائے گا۔“

”جی چپ دی کرو۔ کیوں منحوس الفاظ زبان سے نکالتی ہو۔“ کچھ خیال کرو۔ مہمان ہیں تمہارے گھر میں۔“ پھوپھی خالہ نسرین سے خفا ہو گئیں۔

”ہم اس فیشننی شہر کے رہنے والے نہیں ہیں کہ جتنی ہوا بھی برداشت نہ ہو۔ ہمارے گھر میں آٹھ، آٹھ گھنٹے لوڈ شیڈنگ ہوتی ہے بغیر پکھنے (پکھنے) کے بھی ہم ہنستے مسکراتے رہتے ہیں۔“

خالہ نسرین تھک ہار کر خاموش ہو گئیں، لیکن بریشالی چہرے سے ہویا تھی، جس کی وجہ اس وقت لڑکوں کی سمجھ میں نہیں آئی۔

”کہاں جائیں گے اماں! اور کس وقت جانا ہے، سڑک سے ٹائم بتاؤ، پھر جو تیار ہونے لگتے ہیں تو تم بولنے لگتی ہو۔“

”نہیں۔ میں کچھ نہیں کہوں گی، یہ بڑا شہر ہے، ہم آج شام کو نہر پر جائیں گے، رات کا کھانا نہر کے کنارے ہی کھائیں گے۔“ پروگرام کا اعلان ہوتے ہی دونوں لڑکوں نے نفی میں سر ہلایا اور چلائے۔

”یہ غضب نہ کرنا پھوپھی! رات کو وہاں سانپ، کچھ حکومت کرتے ہیں۔ ایویں ایک آدھ بھی آپ لوگوں میں سے قس ہو گیا تو نام ہمارے بے چارے شہر کا بدنام ہو جائے گا۔“

”چلو، پھر جلدی آجائیں گے اور کل کا پروگرام پکا رکھو۔ ہم کسی عرس میں ضرور شرکت کریں گے۔“

”ٹھیک ہے، جی پتا کرتے ہیں، کون کون عرس ہائے گا، وہ میں ہے، پھر لے چلیں گے اسی مزار پر۔“

”نور جی، ہم نے سنا ہے، لاہور میں کھانے، پینے کا بازار ہے، ہر طرف طرح طرح کے کھانے ملتے ہیں۔ ادھر تو ضرور جانا ہے۔“ کچھ گیسو گیسو سی اینٹلا سے کھٹک کر براہ راست جوادی سے فرمائش کی تھی۔

”اے چھوٹو، بھی، بڑا رش ہوتا ہے وہاں، آوارہ لڑکے ساری شام ادھر ہی گزارتے ہیں اور لڑکیوں کو چھیڑتے ہیں، ادھر کا تو نام نہ لو۔“ خالہ نسرین نے نجانے کیوں ایسا بیان دیا، حالانکہ وہ تو آج تک ادھر گئی ہی نہیں تھیں۔

”تو ہم کس لیے ہیں، چھیڑنے والے کا منہ تو ذکر ہاتھ میں پکڑا دیں گے۔“ بھائی غیرت میں آگئے۔

خالہ نسرین آہ بھر کر باہر نکلیں، تو دونوں اس فیملی کو پروگرام بنانے میں مصروف چھوڑ کر باہر آگئے۔

”کیا ہے خالہ! اب پھارے اتنی دور سے آئے ہیں، تھوڑی بہت تفریح تو حق بنتا ہے، واپس گھر ہی آئیں گے۔“

”تمہیں کیا پتا، کیسے بتاؤں، اصل میں اتنا پیسہ کہاں ہے ہمارے پاس، یہ سیر میں ہمیں بھی ساتھ ٹھیسٹیں گے، پھر میزبان ہونے کی وجہ سے خرچہ بھی ہم سے ہی چاہیں گے، ہائے ربا! میں کہاں سے یہ سب پورا کروں گی۔“

”آپ مت جانا، بس کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دینا۔“

”وہی تو مصیبت ہے بہانے بنانے کہاں آتے ہیں مجھے، یہ تو بانو کو بھی ساتھ لے جانے کی بات کریں گے اور بانو کے ابا کو تو یہ بات بالکل پسند نہیں آئے گی، رشتہ داری اپنی۔“

”خالہ! بانو کو کاموں میں مصروف کر دیا کرتا۔ ادھر یہ لوگ نکلنے کے لیے تیار ہوں، ادھر اسے کپڑے دھونے پر لگا دیں یا پھر مرغیوں کے دڑبے کی صفائی بھی مفید اور طویل کام ہے۔“

”ہاں۔ کچھ تو کرنا پڑے گا، جی تم تو سب جانتے ہو، کیا حال ہے ہمارے گھر کا، مہمان داری تو چلو ٹھیک ہے، یہ سیر سیٹلے۔“

”فکر نہ کریں۔ اپنے شہر کی لاج رکھیں گے اور آپ پر حرف نہیں آنے دیں گے۔“

”اے خالہ جی! ہاتھ روم کدھر ہے؟“ بڑے والا صاحبزادہ چلا آیا تھا۔

”ہاتھ روم کا تو ناکا خراب ہے، پانی نہیں آ رہا۔“

ہمارے گھر چل کر نہالو۔
”چھا! کچھ سوچا پھر اثبات میں سر ہلادیا۔
دونوں اپنے ہاں لے آئے۔
”باتھ روم کدھر ہے بھی؟ کیا سوچنے لگے تم دونوں؟“

”اں کچھ نہیں، ادھر گیٹ روم ہے ساتھ میں اٹیچ باٹھ، ادھر ہی گھس جاؤ۔“ جوادی نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور محترم غراب سے گھس گئے۔ پانچ منٹ جوادی نے انتظار کیا اس کے بعد پانی کے پائپ پر لگا ہینڈل بند کر دیا۔
”اوتے بھائی پانی بند ہو گیا ہے، میں صابن لگا کر بیٹھا ہوں۔“ میں نے کہا، اوتے پانی کا کچھ بندوبست کرو، وہ دروازہ پیٹ رہا تھا۔

دس منٹ بعد جب جسم پر لگا صابن کا جھاگ تولیے میں منتقل کرنے کے بعد نہانے کی خواہش دل میں دبا کر بادل نخواستہ باتھ روم کو خیر آباد کہہ کر لاؤنج میں قدم رکھا تو ان دونوں کو سلطان راہی مرحوم کی فلم نقد و شوق سے دیکھتے پایا۔
”برہاسیا ہے، بھی اس شرمیں۔“
”کیوں تجھی اب کیا ہو گیا؟“ نیم دراز شبلی توجہ دینی کی جانب رکھتے ہوئے پوچھا، جوادی نے تو کچھ پوچھنے کی زحمت بھی نہیں فرمائی۔
”پانی نہیں آ رہا۔ تولیے سے صابن صاف کر کے کپڑے بنے ہیں، سر میں سیمپو اسی طرح لگا ہوا ہے، یار! کچھ انتظام کرو۔“ حضرت تو رو دینے کو تھے۔

”خالہ نسرين نے اطلاع دی ہے ان کے ہاں ٹھیک ٹھاک پانی آ رہا ہے جائے جا کر ڈوب جائے۔“
آخری جملے پر غور کیے بغیر وہ تو لپک کر خالہ نسرين کے گھر کو چل دیے۔ شبلی نے جذبات میں آکر جوادی کا ماتھا چوما، پھر گلو کیر آواز میں فرمایا۔
”سو عاشق مرے ہوں گے تو آپ کی پیدائش کا منحوس واقعہ پیش آیا ہوگا، مان گئے آپ کو۔ سچ سچ مان گئے، نسرين گریٹ او۔“

شام کو بانو کا بھائی بلانے آگیا اس اطلاع کے ساتھ کہ مہمان تو بالکل تیار ہے۔
ادھر جو آئے تو واقعی مہمان تیار اور پرجوش تھے۔
”تروز تو مل جائیں گے نا؟“ پھوپھی نے کچھ فکر مندی کے عالم میں دریافت کر لیا۔

”فکر نہ کریں تروز نہ ملے تو فالسے لے لیں گے۔“ جوادی نے اپنے انداز میں تسلی دی۔
”مخول نہ کرو۔ میرا مطلب تھا کہ سر کے کنارے تروز نہ کھائے جائیں تو کی فائدہ نہر تک جانے کا۔“
”بس رہن دو اماں! تروز تو ہم اپنے شہر میں بھی کھاتے رہتے ہیں۔ آج تو برگر کھا میں گے۔“ جیلہ چکی تھی۔
”دفع دور، انگریزی کی بجی مجھے نہیں اچھے لگتے یہ برگر شرکر، میرے سامنے نام بھی نہ لیا کر۔“

”اماں ہماری پرانے خیالات کی ہیں، آپ ماٹرنڈ نہ کرنا۔“ شرکرا ایلایا بیگم نے جوادی کو اطلاع دی اور پھر درخواست کی۔
”نہیں۔ میرے پرکھوں میں تو کوئی برگر کی صنعت سے وابستہ نہیں تھا میں نے کیوں برامانا ہے۔“
”اے نسرين! اب آہی چکو اور یہ تمہاری بانو کدھر رہ گئی ہے؟“

”آبا! بانو کو تو میں نے چھت کی صفائی پر لگایا ہے، گرمی کا موسم ہے اور صحن چھوٹا ہے، کچھ بستریات میں چھت پر بھی لگیں گے نا، آپ لوگ جاؤ۔ ہم تو اسی شہر کے رہنے والے ہیں، یہ سب کئی بار کا دیکھ رکھا ہے۔“
نسرين اتنا کہنے کے بعد پھر چولہے کے پاس جا بیٹھیں اور یہ سب سر کی جانب روانہ ہوئے۔
”دیکھ لو جی ذرا بھی لحاظ ہو، گھر آئے مہمانوں کے ساتھ چلنا بھی گورا نہیں ہے انہیں اور ایک تم لوگ، کوئی رشتہ داری بھی نہیں، لیکن بات ہے ساری خلوص اور مروت کی۔“

”ہاں! پھوپھی جی ٹھیک کہتی ہیں آپ ان کے گھر میں خلوص اور مروت کی بڑی کمی ہے۔ ان کی لڑکی کی

محلے کی کسی لڑکی سے دوستی نہیں ہے۔ کسی کو کچھ سمجھتی جو نہیں۔“ لگے ہاتھوں جوادی نے بانو کی برائی بھی کر دی۔

”چھا۔ ہمارے خاندان میں بڑی تعریفیں ہوتی ہیں اس لڑکی کی۔ جو بھی ادھر سے ہو کر جاتا ہے بانو کی بڑی ہی حریف کرتا ہے۔“
”تم بڑی بھولی ہو پھوپھی! ان کی سیاست نہیں سمجھیں، وہ تو چاہتے ہی یہی ہوں گے، لڑکی کہیں ٹھکانے لگے، تاکہ ان کے گھر اور سپوت تو محفوظ ہو جائیں۔“

”ہاں کہتے تو تم ٹھیک ہو، یہ برادری والے ہیں، بڑے بیسنے ہیں۔ خیر میں نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔ نبت لوں گی ایک ایک سے ویسے سرین کے گھر سے تو مجھے خود بڑی ہمدردی ہے۔ پیسے کے لحاظ سے بڑے کمزور ہیں بے چارے اور پھر بانو نے دوپہر کو بری عنیت سے کھانا بنایا تھا۔“
”تو جی پھر وہی مرغ کی ایک ٹانگ۔“ جوادی سخت بد مزہ ہوا۔



سر کے کنارے خوب رونق تھی۔ لڑکے اور بچے چھپا چھپ نہر میں چھلانگیں لگا رہے تھے۔
”اماں! میں بھی نہاؤں گا۔“ چھوٹا مچلا تھا۔
”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ سب ہی نہائیں گے۔ بڑے کی آواز مارے جذبات کے پھٹ سی گئی تھی۔
”سب یعنی کہ سب۔ کیوں مرنے کا ارادہ ہے؟“ جوادی نے گھبرا کر لڑکیوں اور اماں حضور کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”میرا مطلب سب لڑکوں سے ہے۔“ سٹیٹا کر جواب دیا۔
”ہائے! میں بھی کہوں کہ اپنے پانی جان شر اگر کتنے لذت ہو گئے ہیں۔“ ایلانے تہقہ لگایا، پھر اس کے بعد بھی تسلی نہیں ہوئی، دیر تک ہنسی اور مزہ لیتی رہی۔

”نی بس کر۔ اندر کر لے یہ دنیاں، وہ دیکھ دو، خبیث کے بچے تھے ہی گھور رہے ہیں۔“ پھوپھی نے چیخ لگانے کے بعد خبردار کیا۔

”ہم سے زیادہ سوہنی یہاں کوئی لگ بھی تو نہیں رہی، ہم نے تو سنا تھا بڑے شہر کی لڑکیاں بڑی فیشننی اور سوہنی ہیں، پرکھے تے سوا باند ریاں سی لگتی ہیں ساری کی ساری۔“
”ویسے منڈے سوہنے ہیں۔“ جیلہ نے جوادی اور شبلی کی جانب اشارہ کر کے ایلانے کان میں کہا۔ ایلانے نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا، پھر دونوں شرما گئیں۔
”اسی یہ جوادی کو کیا ہو گیا ہے، جا کر پلیٹیں تیار کروا رہا ہے۔“ شبلی ایلانے کو چھوڑ چھاڑا دھر کو لپکا۔
”ہاں ہاں پانی ہلٹنوں میں مرچیں نارمل رکھو۔ یہ ایک پلیٹ بس، جھوٹا یہ گول کے مرچوں سے ہی تیار کرنے ہیں۔“ آگے اب شبلی کو کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

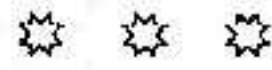
واقعی وہی ہوا جیسا سوچا تھا، مرچوں بھرے مگر لنڈیز گول کے اور پھوپھی کے لالچی بڑے صاحبزادے تاک بھی پونچھ رہے ہیں۔ آنسو بھی صاف کر رہے ہیں، مگر پلیٹ نہیں چھوڑ رہے تھے۔
”مرچیں اتنی تو نہیں ہیں۔“ سب ان کی حالت پر حیران ہونے لگے۔
”لگتا ہے کچھ زیادہ نازک مزاج ہو۔“ جوادی کے طنز نے مزید غیرت بھڑکانی۔ پلیٹ خالی کر کے ہی چھوڑی اور اس کے بعد جیسے چراغوں میں روشنی ہی نہ رہی، پانی بھی پیا، پاپڑ بھی چبائے، مگر مرض بڑھتا گیا، جوں جوں دوا کی۔

”چلو گھر چلو۔ جا کر چینی کھلاتی ہوں اسے۔“ ساری تفریح غارت ہو چکی تھی۔ پھوپھی کے واپسی کے اعلان نے ان کے ہائی بچوں کو بد مزہ کر دیا۔
”ویسے یار جوادی! اس حسن مذاق کا مطلب میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا۔“
”یہ ایک ہیرو کا دلن سے انتقام ہے۔ دل والوں کی

باتیں ہیں، بس اور کچھ نہیں۔ میرا بس چلے تو اس
مرچوں کی بوری میں بند کر کے کسی کریانے والے کے
ہاتھ فروخت کروں۔“

”چلو دے تم دونوں ادھر کیوں رک گئے؟“ پھوپھی
حضور نے پکارا، دونوں باتوں کا سلسلہ موقوف کر کے
چل پڑے۔

گھر قریب آنے پر ان دونوں نے خدا حافظ کہا اور
اپنے گھر کی راہ لی۔



”وے کدھر تھے تم دونوں ذرا گھر میں نہیں بیٹھا
جاتا، ہمارے ساتھ نہیں گئے اور گرمی میں پتا نہیں
کدھر کدھر مارے پھرتے رہے ہو۔“

جوادی کی اماں دیکھتے ہی شروع ہو گئیں، دادی بڑے
کمرے میں تشریف فرما تھیں، آواز سن کر وہ بھی باہر
آگئیں۔

”آپ گرمی میں کیوں نکل آئیں، اے سی کی
ٹھنڈک میں بیٹھیے، ہم ڈانٹ کھانے ادھر ہی آجاتے
ہیں۔“ شبلی نے ادب سے کہا۔

”وے بے بدایتو، فون بھی بند کر رکھے تھے ادھر
گاڑی خراب ہو گئی، تم لوگوں کو کتنے فون کیے، آکر لے
جاؤ، باپ تمہارا گڈی ٹھیک کرانے گیا ہے، ابراہیم کو تو
دوپہر میں ہی کسی دوست کا فون آگیا تھا، وہ ادھر نکل گیا،
ہم عورتیں بڑی مشکل سے نیکیسی کر کے آئی ہیں۔“

”کیوں، کیا نیکیسی بھی خراب تھی، وہ کالگنا پڑ گیا تھا
یا بغیر ڈرائیور کے بھی اور یہ سیٹ آپ کو سنبھالنا پڑ گئی
تھی۔“

”دیکو اس نیہ کر جوادی! اندر آکر میرے پیریا بڑا درو
ہو رہا ہے اور تو شبلی ذرا چائے تو بنا ہمارے لیے بڑا ہی
تھک گئے ہیں۔“

”چائے پی لیں گی تو پھر ساری رات چھت کو سکتے
گزرے گی نیند نہیں آئے گی۔“

”میں تو کہتا ہوں دادی! تھوڑی بھنگ منوا کر
رکھیں۔ سچی کل ہی میں نے اس کی افادیت پر ایک

کتاب بڑھی ہے، واہ واہ سبحان اللہ۔“
”ہا، کیسی باتیں کر رہا ہے، کچھ پتا بھی ہے کس کی
نسل سے ہے تو۔ خبردار! جواب یہ نام بھی لیا تو، دادی کو
جوادی کی بات پر صدمہ بھی ہوا، غصہ بھی آیا۔“

”وہ نیلما کی بچی کہاں رہ گئی ہے؟“
”نیلما، زیبا کے گھر گئی ہے، زیبا کی امی اور چھوٹی
بہن آئی ہوئی تھیں، ادھر بڑا اصرار کر رہی تھیں، اس
لیے نیلما کو بھیج دیا میں نے ان کے ساتھ۔“

”واپسی کا کیا پروگرام ہے۔ مجھے بتا دیجیے گا، میں لیتا
اؤں گا۔“ بات زیبا کے گھر تک پہنچنے کی ہو اور شبلی یہ
موقع گنوا دے۔

”آجائے گی کل شام تک، وہ غریب بھی کہاں کہیں
آتی جاتی ہے۔ بڑی خوش تھی زیبا کے ہاں جانے سے
وہاں پر بھی ساری لڑکیاں ہی ہیں، نا، دل لگ جاتا ہے
اس لیے نیلو کا۔“

”جی ہاں، کافی شریف گھرانہ ہے۔“ شبلی نے
تعریف کی۔

رات کے کھانے سے فارغ ہو کر شبلی کی امی نے گھر
جانے کا ارادہ ظاہر کیا، لیکن جوادی کی امی نے آج رات
کے لیے انہیں اور دادی کو ادھر ہی روک لیا۔ خواتین
دیر تک محفل جمائے آج ملنے والے رشتہ داروں پر ہر
طرح کا تبصرہ فرماتی اور انہیں بور کرتی رہیں، جب بھی
اٹھنے کا ارادہ کیا ڈپٹ کر سی کہا گیا، وے بے بدایتو! کبھی
گھر والوں کے ساتھ بھی بیٹھ جایا کرو اور انہیں بٹھانے
کے بعد پھر بھول ہی جاتیں، مجال ہے جو ان پورے
تین گھنٹوں میں ان سے کچھ پوچھا ہو یا انہیں کچھ بتایا
ہو، آخر دونوں ہمیں کارپٹ پر گئے اور سو گئے۔

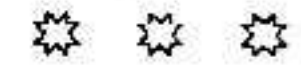
آنکھ صبح دادی کے جگانے پر کھلی۔ وہ نماز کے لیے
جگا رہی تھیں۔

”اٹھ جاتے ہیں دادی! آپ بھی نا پہلی اذان کے
ساتھ ہی جگانا شروع کر دیتی ہیں۔“

”ہاں! وہ اس لیے کہ اٹھتے تم تب ہو، جب آخری
چند منٹ باقی رہ جاتے ہیں۔“

بات سچ تھی سو خاموش ہونا پڑا۔

"اٹھ جا شہلی! یہ تیرا نہیں تیرے تایا کا گھر ہے" یہاں میری آواز پر نہ جاگا تو صبح صبح جوتے پڑنے شروع ہو جائیں گے۔
"شکر یہ دادی! آپ کی اطلاع نے مجھے بروقت خواب غفلت سے جگا دیا۔" شہلی ایک دم سے اٹھ بیٹھا تھا۔



دروازے پر دستک دیتے ہی پوچھا کھنٹا مسکراتا چہرہ برآمد ہوا تھا۔
"تمہیں پتا تھا ہم آئے ہیں۔" جوادی نے جوابی مسکراہٹ اچھال کر پوچھا۔
"نہیں۔" مختصر جواب آیا۔
"چھا پھر ہونٹوں پر مسکراہٹ کیوں؟"
"تو آپ کا خیال ہے میں صرف آپ کو دیکھ کر مسکراتا ہوں۔"

"واقعی یہی خیال تھا۔ اچھا ہوا جو یہ خوش فہمی بھی دور ہو گئی۔" جوادی اداس ہو گیا۔
"یہ اس گھر کی دلیریز قدم رکھتے ہی تمہیں اداسی کے دورے کیوں پڑنے لگتے ہیں؟ میری مانو تو چھوڑو اس گھر کا خیال۔ یہ تمہارے لیے بہتر نہیں ہے۔"

"بکو مت۔"
"آتی مرچیں کھلا کر بھی تسلی نہیں ہوئی؟"
"مرچیں کھا کر وہ کون سا واپس بھاگ گئے ہیں؟ نہیں جتے ہوئے ہیں۔"

"خیر تو ہے" آج اتنی سویرے سویرے۔" خالہ نسرین کسی کام سے صحن میں نکلیں، انہیں دیکھا تو ناصر فٹھکیں، بلکہ تیور بتاتے تھے آج اتنے برسوں میں پہلی بار انہیں ان کا آنا کچھ اچھا بھی نہیں لگا۔
"وہ خالہ ادھر سے گزر رہے تھے سوچا آپ کے مہمانوں کی خیریت ہی معلوم کرتے چلیں۔"

"نا میرے مہمانوں کو کیا ہوا ہے؟ جو خیریت معلوم کرنے چلے آئے ہو، میں تو کل سے تم لوگوں کو چیک ہی کر رہی ہوں اور پریشان ہو رہی ہوں۔"

"اوسے ادھر تو دھیان ہی نہیں گیا" آخر یہ خالہ کے خاص مہمان ہیں، ان کی راہوں میں تو ہر دم آنکھیں بچھائیں گی اور ہم کون سا کرائے کے قابل ہیں جو مہمانوں پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔"

"جاؤ شہلا شے گھر جاؤ اپنے گھر۔"
اس سے پہلے کہ وہ پلٹ جائے پھوپھی بھی کمرے سے برآمد ہو گئیں، انہیں دیکھا تو باغچیں کھل گئیں۔
"تم دونوں آئے ہو، سچی ساری رات تمہیں ہی یاد کرتی رہی ہوں۔ آؤ آؤ کھڑے کیوں ہو۔"

"وہ جی، ہم ادھر بیٹھک تک ہی آیا کرتے ہیں۔" وہ کمرے میں کھینچ رہی تھیں، بتانا پڑا۔
"چلو پھر ادھر ہی بیٹھو، اینٹلا بڑے مزے دار پرائے بنا رہی ہے کھا کر جانا۔"

"ہم تو ناشتہ کر کے آئے ہیں۔"
"کوئی بات نہیں، دو چار ٹوالے ہمارے ساتھ بھی لے لیتا، ویسے کل نہر بڑا مزہ آیا لڑکیاں آج چڑیا گھر جانے کی ضد کر رہی ہیں، ورنہ میرا پروگرام تو آج پھر نہر پر جانے کا تھا۔"

اب خالہ نسرین کی موجودگی میں وہ کیا جواب دیتے کہ وہ تو نظر ان ہی پر جمائے جیسے ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہی تھیں۔
مٹی کا مہینہ دن کے ساڑھے بارہ یہ جذبہ شوق ہی تھا جو گھر سے نکال لایا تھا، ورنہ اور تو کوئی بات ہو نہیں سکتی تھی۔ بندروں کے پنجروں سے ذرا آگے ہی بڑھے تھے کہ آنکھوں کے آگے نیلے پیلے ترمرے لہرانے لگے تب یہ دونوں تو چھاؤں میں آئی تھیں، پوپے چارے کو بھی دیوچ کر اپنے پاس بٹھالیا۔ باقی سب آگے بڑھ گئے۔

"میں بھی ان کے ساتھ جاؤں گا۔" پوپے بولا۔
"بے وقوف، بیمار بڑا جاؤ گے، نیا خرچہ نئی مصیبت کیا کبھی کتے، بلیاں، گوے، چڑیاں نہیں دیکھے جو اس گرمی میں ان کے دیدار کو مرے جارہے ہو، خبردار ہونے کی کوشش نہ کرنا، ورنہ بندر کے پنجرے میں نہیں بھی بند کروادوں گا۔" دھمکی کار آمد رہی، پوپے کی ضد

جالی رہی۔ وہ ان سب کے پیچھے جانے کے بجائے ادھر ہی گئے جھولے جھولے لگا۔

کھانے کا آغاز ہوا، جوادی نے جمیلہ کے بنائے پلاؤ کی خوب تعریفیں کیں، شہلی اس دوران اللہ تعالیٰ سے اس کو فرمائے دار جھوٹ بولنے پر معاف کر دینے کی درخواست کرتا رہا۔

"ایسا کھانا اور ادھر کبھی نہیں بنا۔"
"ادھر چڑیا گھر میں بنے گا بھی کیوں، شیر گینڈے پلاؤ تھوڑا ہی کھاتے ہیں۔" پوپے نے بول کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا تو شہلی اسے سارس دکھانے لے گیا، سارا لگا بچہ جتا رہا تھا اسے سارس دیکھنے سے زیادہ کھانا کھانے میں دلچسپی ہے۔

اس کے جاتے ہی جوادی نے بانو کی سستیوں، تلابیقوں کے کئی قصے گھر گھر کر سنا ڈالے۔
"اچھا۔ خالہ تو کہتی ہیں میری بیٹی بڑی سکھ رہی ہے۔" اینٹلا نے منہ بنا کر نقل اتاری۔

"کون سی ماں ہے جو بیٹی کی تعریف نہیں کرے گی، وہ بھی کرتی ہیں تو برائی کیا ہے، لیکن ہم تو پردوس میں رہتے ہیں۔ پگوان کالین دین عام بات ہے، لیکن ان کے بل سے آج تک کوئی سوادی کی چیز نہیں آئی۔"

"اور صبح کہہ رہی تھی پلاؤ میں بنا دیتی ہوں، شکر ہے میں نے ہوا نہیں لیا۔"

"اے بس چپ کر خواجخواہ میں کیوں برائیاں کر رہی ہے، اچھی بچی ہے، بڑا احترام کرتی ہے میرا تو۔"

پھوپھی کا دل نامراد تو لگتا تھا، بانو رات تک کہہ رہی رہ گیا، قدم قدم پر کوئی نہ کوئی خوبی یاد آجاتی تھی جب کہ پوپے سارس دیکھ کر واپس آیا، جوادی بانو کو پھوپھیں پر اتنا بول رہا تھا کہ لکھا جاتا تو ایک چار سو پینس صفحات کی کتاب وہ میں آسکتی تھی۔

پھوپھی کافی بالاطلاق تو تھیں، دونوں لڑکوں کو کھانا بھی خود نکال کر دیا اور بار بار دیا، آکس کریم، بوتلس، پیمیں، جوس، بار بار صرف ان ہی دونوں کو پیش کیے گئے، پنے پیٹنے، گراتے رہے پردا نہیں کی۔

کھانے کے بعد بقیہ جانوروں سے ملاقات کی گئی، اب سورج ڈھل رہا تھا۔ سو یہ دونوں بھی ساتھ ساتھ تھے اور لڑکیوں کو تیار ہے تھے۔

"بڑے شہری لڑکیاں ہاتھی کے دانت کی طرح ہوتی ہیں، آپ کی امی تو بڑی بھولی ہی، آپ انہیں یہ بات اچھی طرح سمجھا دیجیے گا۔"

"ہائے اللہ! ہم آپ کی یہ رائے اپنی امی تک پہنچائیں، توبہ توبہ، آپ بھی نا بڑے شریر ہیں۔" پتا نہیں کیوں وہ خواجخواہ شرمائی تھیں۔

جب واپسی ہوئی مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں اور خالہ نسرین انہیں گھور رہی تھیں۔

گلی میں آتے ہی جوادی شہلی سے بولا۔ "دیکھا تم نے کتنا بدل گئی ہیں خالہ۔ اب انہیں ہمارا آنا جانا بھی اچھا نہیں لگتا۔ میرا جی چاہتا ہے۔ اس امجد کے بچے کو کبھی بنا کر دیوار سے چکا دوں۔"

"جی ہاں، اُوہ بھی عین نکاح کے ٹائم۔ سب کچھ تیار ہے تقریب اپنے جوبن پر سے اور روح رواں غائب ڈھنڈاپا بڑ چکی ہے۔ آئے ہائے کوئی لڑکے کو تولو اور مگر یہ کوئی نہیں دیکھ رہا کہ ایک مکھی بلکہ کھشا شیروانی پنے دیوار سے چکا آٹھ آٹھ آنسو بہا رہا ہے۔ اپنے نصیبوں کو کوس کوس کے اس کا گلا بیٹھ چکا ہے، بس ادھر تو فیصلہ ہی ہوا ہے عزت بچانے کے لیے جگ ہنسائی سے بچنے کے لیے کوئی دوسرا لڑکا ڈھونڈو اور یہ دوسرا لڑکا جناب جوادی سے بہتر اور کون ہو سکتا ہے۔ سو جھٹ سے جوادی صاحب کو پکڑ کر منہ ہاتھ دھلا کر نئے کپڑے پہنا کر مولوی صاحب کے رو برو بٹھا دیا ہے اور یوں ڈر لہالی طور پر مس شہرمانو مسز شہرمانو جو ادب ن گئی ہیں۔"

"بکو اس بند کرو، میں بڑا پریشان ہوں۔ کوئی حل سوچو۔ بھلا یہ امجد بانو کے قابل ہے۔"
"امجد ہی کیا جواد کے علاوہ دنیا کا کوئی بھی لڑکا بانو کے قابل نہیں ہے۔"

"میں خالہ نسرین کو اتنی ظالم ہاں نہیں سمجھتا تھا۔"
"اچھا گھر کا گیٹ آلیا ہے تم والدین کی عدالت میں

پیش ہونے کی تیاری کرو۔ میں گھر چلتا ہوں۔
 "نہیں نہیں شبلی تم بھی ادھر ہی رک جاؤ۔ پتا ہے راتوں کو نیند ہی نہیں آتی۔ اگر نیند آجائے تو پھر خواب ایسے خوف ناک آتے ہیں کہ نیند آنے پر ہی بچھتاوا ہونے لگتا ہے۔"
 "ٹھیک ہے میں رُک جاتا ہوں اور یہ بھی بتا دیتا ہوں امجد کے خوابوں کو نہ کبھی پورا ہوتا ہے نہ ہوں گے۔"
 "ارے! میں تو عین نکاح کے وقت اس کی ایک عدد بیوی اور ساتھ ساتھ دو بچے بھی پیش کر دوں گا۔"
 "ارے ہاں اس بات کا تو مجھے خیال ہی نہیں آیا۔" مارے جوش کے جوادی اس کے گلے لگ گیا۔
 "مگر مجھے تو کب سے یہ خیال آیا ہوا ہے اسی لیے تو مطمئن ہوں۔ مجھے کہہ لینے دو۔"
 "تسبی گریٹ ہو۔"
 "وہ فقیرنی جو اکثر ہمارے اسکول کے گیٹ کے قریب مانتے بیٹھی ہوتی ہے ارے وہی جس سے ایک بار ہم نے سو روپیہ ادھار بھی لیا تھا۔"
 "سیدھی طرح بول نہ تو چھینو کی بات کر رہا ہے۔"
 "اس کے سامنے اب چھینو نہ کہنا یاد نہیں بتایا تو تھا اس نے نام بدل لیا ہے اب وہ قطرینہ کیف کہلاتی ہے تو میں سوچ رہا ہوں امجد کی فرضی بیوی بنانے کے لیے وہ بہتر نہ ہے۔"
 "ارے ہاں یار! وہ ہمیں انکار نہیں کرے گی۔" جوادی کا دکھ اب کافی حد تک دور ہو چکا تھا۔
 "گھر آئے تو نیلما بچن میں کھڑی کچھ بنا رہی تھی واوی اور شبلی کی امی کے بارے میں پتا چلا اپنے گھر جا چکی ہیں ویسے واوی شاید صبح کو دوبارہ چکر لگائیں۔"
 "امی کدھر ہیں! جوادی نے دھیرے سے پوچھا۔
 "ان کی دوست سلمیٰ آئی ہوئی ہیں۔ رات کا کھانا کھا کر جائیں گی۔ کچھ سووا منگوانا تھا کدھر تھے آپ۔"
 "یا اللہ شکر۔ سلمیٰ آئی اچھے وقت پہ آئی ہیں۔ لاڈ لسٹ بنا کرو۔ کیا کیا منگوانا ہے؟"

"نیلو! میں نے سنا تھا۔ تم زیبا کے ہاں گئی تھیں۔" شبلی جوادی کے ساتھ قدم نہیں برہاسکا تو جوادی کو بھی رکنہ پڑا۔
 "جی بالکل گئی تھی برا مزہ آیا۔ برا اچھا نا تم گزر آ۔"
 "اوس بھلا وہ کس طرح؟" دلچسپی عروج پر تھی۔
 "بھئی تین تین لڑکیاں ہیں ان گھر میں۔ ہم نے مزے مزے کی ڈشز ترائی کیں۔ ہسی مذاق بھی خوب رہا۔ جی پتا بھی نہیں چلا نا تم گزر گیا۔ وہ تو نا ناموں مجھے لینے آگئے تھے ورنہ میں تو مزید ایک دو روز بعد آتی۔"
 "کچھ کہتی تھی زسا؟"
 "ہاں کیوں نہیں۔ کہہ رہی تھیں پھر دوبارہ بھی آکر ٹھہرنا۔" نیلما نے اپنی سادگی میں جو بتایا جوادی شبلی کو دیکھ کر ہنس پڑا۔
 "اور ہاں شبلی بھائی ایک کام آپ کے لیے بھی بتایا ہے۔"
 "وہ کیا؟" شبلی پورے کا پورا کان بن گیا۔
 "کہہ رہی تھیں واوی کے انگوری دوپٹے پر جو کوشیے کی تیل ہے۔ وہ انہیں بے حد پسند ہے۔ وہ لا کر نیلما کو دے دیں جب دوبارہ نیلما ہماری طرف آئے گی تو میں اس سے لے لوں گی۔"
 "یہ نہیں کہا کہ دوپٹہ میرے گھر آکر مجھے دے جائیں؟"
 "نہیں۔ یہ تو نہیں کہا۔" نیلما نے سوچ کر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بتایا۔
 "اس کا فون آئے تو کہہ دینا دوپٹہ پرانا اور بد رنگ ہو چکا تھا۔ واوی نے قطرینہ کیف کو دے دیا ہے۔"
 "یہ کہہ کر جوادی کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل گیا۔
 "کیا کہا بھائی! قطرینہ کیف کو بتائیں کیا واقعی؟"
 نیلما کی حیرت میں ڈوبی آواز آرہی تھی لیکن وہ رکنے نہیں۔

ابھی سویر کے صرف دس ہی بجے تھے دونوں خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے کہ ایتلا اور

جلد کا ان کے ہاں نزول ہوا۔ نیلما اور امی سے بڑے ہی تپاک سے ملیں اور وہ جلوہ پیش کیا جو بقول ان کے لہنے ہاتھوں سے بنا کر لائی تھیں۔
 "اچھا۔ پیٹھے کا جلوہ ہے۔" امی جی نے خوشی کا اظہار کیا۔ پھر خود فوراً ہی فرمایا۔ "اگر اس میں سوچی سمجھی کر شامل کر دی جائے تو اور بھی اچھا بنتا ہے مجھے لگتا ہے تم نے سوچی نہیں ڈالی۔"
 دونوں ہاں یا نا میں جواب نہیں دے سکیں کہ انہیں واوی علم نہیں تھا۔ خالہ نسرین نے سوچی ڈالی ہے یا نہیں۔
 "وہ جی آپ کے گھر میں شاید دو لڑکے رہتے ہیں نام تو ہمیں معلوم نہیں۔ وہ خالہ بلا رہی تھیں انہیں۔"
 "اچھا۔ نسرین نے بلایا ہے نیلما! جا کر دیکھو سو رہے ہیں یا دنیا پر احسان کرنے اٹھ گئے ہیں۔"
 "پھر لڑکیوں سے بولیں۔ نسرین نے ہمیں کیوں بھیج دیا اپنی چھوٹی کو بھیج دیتی یا دیوار سے ہی کہہ دیتی۔"
 "وہ اصل میں پوپو بڑی تعریف کر رہا تھا آپ لوگوں کی۔ اسی لیے بھی ہم چلے آئے۔"
 "چلو اچھا کیا۔ امی محترمہ کو لڑکیاں کچھ بھائی نہیں تھیں۔"
 "وہ دونوں تو ابھی سو رہے ہیں جب انھیں گے میں انہیں خالہ کی طرف بھیج دوں گی اور یہ بانو کہاں ہے آج کل لگتا ہے زیادہ مصروف ہو گئی ہے۔"
 "نہیں، نہیں مصروفیت کیسی؟ سارا گھر تو آتے ہی ہم بہنوں نے سنبھال لیا تھا بس وہ ویسے کمرے سے کم تن اٹکتی ہے۔ ہمیں تو حیرت ہوئی کہ آپ سے دوستی ہے۔ آپ اسے یاد کر رہی ہیں ہم تو سمجھے تھے بڑی غمور ہے کسی سے بھی بات نہیں کرتی شاید۔"
 "ہائے بانو اور مغرور، وہ تو بڑی ہی سوٹ لڑکی ہے۔ نیلما اس کی برائی برداشت نہیں کر سکتی۔"
 "آہو! جہاں مطلب دکھائی دیتا ہو وہاں تو شہد نکانا ہی ہوتا ہے۔" بڑے معنی خیز انداز میں کہا گیا تھا۔
 نیلما تو نوٹ نہیں کر سکی، لیکن جوادی کی والدہ محترمہ کو کوہید ماشنی صاحبہ تھیں۔ دال میں کالا ہے کیسے

نہ پہچانتیں، لیکن بولیں کچھ نہیں بظاہر اخبار کی جانب متوجہ ہو گئیں۔
 "وہ میری امی بھی آنا چاہتی تھیں آپ کے گھر۔" ایتلا نے متوجہ کیا۔
 "جم جم آؤ۔ ہمارے گھر کے دروازے سب کے لیے کھلے ہیں۔"
 "اچھا پھر ہم چلتے ہیں، آپ کے بیٹے جب ناشتا وغیرہ کر لیں تو میری امی کا پیغام دے دیجئے گا۔"
 "نیلما! کان کھول کے سن لے، کوئی پیغام دینے کی ضرورت نہیں۔ میں لکھ کر دیتے کو تیار ہوں یہ اپنا ہی پیغام لے کر آئی تھیں، آئے ہائے یہ بے غیرت نام ڈبو میں گے باپ، دادا کا۔ پتا نہیں کیا کیا بکواس ماری سے لڑکیوں کے سامنے۔ دیوانی سی ہوئی جا رہی ہیں۔"
 گیارہ بجے جب دونوں ناشتا کر رہے تھے واوی اور نا ناموں چلے آئے۔
 "دے شبلی! تیری ماں گھر میں اکیلی ہے۔ ناشتا ختم ہو جائے تو گھر چلے جانا۔"
 "سوال یہ پیدا ہوتا ہے واوی! اگر انہیں آخر بھری پری دنیا میں اکیلا چھوڑا کیوں گیا ہے۔ اچھے بھلے آپ دونوں گھر میں موجود تھے ادھر کیوں چلے آئے۔"
 "آج میرا مسالے والے ٹینڈے کھانے کو جی چاہ رہا ہے اور اٹھ کیاری میں ٹینڈوں کی تیل کیسی ہری بھری سے ہنس وہی لینے آئی ہوں۔"
 "تو بہ کیا شوق ہے اب اس آگ برسائی گرمی میں بیٹھ کر ٹینڈے توڑیں گی۔"
 "نا میں کیوں توڑوں گی۔ تم دونوں کو شرم نہ آئے گی، جوان جہان ہو کر خود تو ادھر بیٹھے ہو اور بوڑھی واوی دھوپ میں جل رہی ہے۔"
 "چلو جی بات ہی ختم۔ آج ہمیں یہ کہنے دیں واوی! تسبی گریٹ ہو۔"
 دونوں نے مل کر کہا تھا نیلما نے بھی اثبات میں سر ہلایا اور ہنسنے لگی۔
 "اسلام علیکم۔" کھلے گیٹ سے بارہ تیرہ سال کا ایک اجنبی لڑکا داخل ہوا۔ وہ اجنبی گھر والوں کے لیے تھا۔ یہ دونوں تو ایتلا، جمیلہ کے بھائی کو اچھی طرح

پچانتے تھے۔
 ”وہ میری امی کو کچھ کام تھا جی آپ دونوں سے یاد کر رہی ہیں آپ کو۔“
 ”اوہر آؤ۔ پہلے یہ بتا، کس کا پتہ ہے تو؟“ داوی نے کڑک کر لایا تھا۔
 ”انسان کا ہی پتہ ہے، داوی!“ جوادی نے اطلاع دی جو سنی نہیں گئی۔
 ”میں اپنے باب کا بیٹا ہوں جی! بچہ بھی گھبرا یا۔“
 ”چھا، واقعی؟“ شبلی کی پر مسرت آواز گونجی جیسے بتانا ماموں نے مزید گل افشانی سے روک دیا۔
 ”تیری ماں انہیں کیوں یاد کر رہی ہے۔ یہ کیا گلے میں دوپٹے رنگتے ہیں یا تالے پر اندے بیچتے ہیں۔“
 ”داوی!“ دونوں نے اعتراض کیا۔
 ”چپ وے یہ ساری زبائیاں تمہیں ہی کیوں یاد کرتی رہتی ہیں؟“
 ”ہمیں کیا پتا؟ یہ تو آپ یاد کرنے والیوں سے پوچھیں۔“
 شبلی نے شانے اچکائے، جبکہ جوادی نے مزید اضافہ کیا۔
 ”قسم کھا کرتا میں، کبھی ہم نے بھی کسی زبانی کو یاد کیا ہے۔“
 ”یہ ہے کون محلے میں نیا آیا ہے کیا؟“ داوی کی نظریں نیچے کا جائزہ لے رہی تھیں۔
 ”اماں کہتی ہیں۔ اب شادی کروا کر ہی اس شہر سے واپسی ہوگی۔“
 ”ہائیں۔ آئے ہائے درلفٹے منہ!“ داوی تو اچھل پڑیں، جبکہ یہ سمجھ رہے تھے کس کی شادی کا ارادہ ہے اسی لیے جوادی کا چہرہ ایک دم سے سرخ ہو گیا تھا۔
 شبلی نیچے کو واپس دوڑا نہ دیتا تو عین ممکن تھا جوادی ایک ہاتھ ہی جڑوتا۔
 ”دیکھو بھئی۔ دنیا کے تماشے بچہ بتا رہا ہے ماں اس شہر میں شادی کرنے آئی ہے اور شادی کروا کر ہی واپس جائے گی۔ بلایا جا رہا ہے ہمارے ہونہار پوتوں کو، یعنی نظر ان پر ہے اور یہ عقل کے اندھے جس پر وہ انگلی رکھے گی وہی نکل کر پڑھوانے پر تیار ہو جائے گا۔ میں

کے دیتی ہوں۔ لحاظ نہیں کروں گی، سو جوتے لگاؤں گی، تم میں سے جو اس سے شادی کرے گا اسے بھی اور ساتھ اس بیسنی کو بھی۔“
 ”ظاہر ہے جی، جب پوتے کی بیوی بن جائے گی پھر تو آپ کی جوتیوں کی مار اس کے لیے عین سعادت بلکہ باعث افتخار ہی ہوگی۔“ شبلی نے بیچیدگی سے کہا تھا۔
 ”مجھے تو تیری ہی نیت خراب لگ رہی ہے۔“
 ماموں کی گہری جاچتی نگاہ اس پر تھی۔
 ”اللہ کو مانے! ماموں کیوں بہتان نگار ہے ہیں؟“
 ”پھر کیا جوادی۔“ انہوں نے انگلی اٹھائی۔
 ”جوادی نے تو نن بننے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ وہ اب ساری عمر شادی نہیں کرے گا۔“
 ”اس نتن؟“
 ”بات تو سنو۔ اب کہاں چل پڑے ہو، نڈے تو اتار دو مجھے۔“
 جمانگیر کا مقبرہ تھا اور پھوپھی جی کی پوری فیملی کے ساتھ یہ دونوں تھے۔ چٹ کھانے کے بعد سب بہت خوش تھے، اسی لیے فیصلہ ہوا تھا کہ ایک ایک پلیٹ مزید خریدی جائے۔
 ”میں تو آؤں کریم بھی لوں گا، میرے لیے نان کباب پکڑو۔ میں تو تھک گئی ہوں۔“
 مجال ہے جو کسی نے اس عمارت میں کوئی دلچسپی لی ہو۔ وہ متوجہ تھے تو صرف کھانے پینے کی دکانوں کی طرف، ہاں کچھ دیر بعد کچھ گوریاں بھی انہیں متاثر کرنے لگی تھیں، جو بے چاری عمارت کی ایک ایک اینٹ سے تارن کھٹکاتے نہیں تھک رہی تھیں۔
 ”میں کیا جی، سنا ہے ان گوریوں کو پاکستانی لڑکے بڑے اچھے لگتے ہیں۔“ امجد قریب آکر سنی سنائی کی تصدیق کروانا چاہ رہا تھا۔
 ”پاکستانی لڑکے، ارے ہاں ہاں بالکل، بس ایک بات انہیں ناپسند ہے پاکستانیوں کی، کہتی ہیں بڑوں ہوتے ہیں، دور دور سے ہی دیکھتے ہیں، چھوٹے کی کوشش نہیں کرتے۔“

”چھا جی، او یہ تو بڑی بے عزتی کروادی پاکستانی لڑکیوں نے۔“ امجد صاحب جوش کے عالم میں آگے بڑھے، آگے اور آگے۔ اور جب یہ وہاں پہنچے فرائض ادا کرنے کی آرزو میں چور ایک پولیس والا جناب امجد صاحب کی ٹھکانی میں مصروف تھا۔ گوریاں شاید کچھ دیر پہلے خفا ہوئی ہوں گی، اب تو پھر ایک بار ان کی دلچسپی ایک ایک اینٹ میں تھی۔ مار کھانے کے بعد امجد صاحب نے اس مار کا معاوضہ پولیس والے صاحب کو پیش کیا اور بظاہر بے نیاز بنے دوسرے رخ پر چل گئے۔
 ”چل دیکھیں تو کتنے ڈینٹ پڑے ہیں۔“ شبلی نے کہا اور دونوں اس کے پیچھے لپکے۔
 * * *
 واپسی شام کو ہوئی، سارا دن خوب کھایا پیایا گیا۔ انہوں نے دھیان نہیں دیا، آج پھوپھی بار بار ہم تو کھاتے بیٹے گھرانے کے لوگ ہیں کی تکرار کرتی رہی تھیں، انہیں بانو کے گھر کے دروازے پر چھوڑ کر دونوں اپنے گھر کی جانب بڑھے تھے۔ ویسے آج امجد کی خاطر اچھی ہوئی ہے۔ جوادی کے دل کو ٹھنڈ پڑی تھی۔
 ”ہاں، پولیس والے کے ہاتھ کا پورا نشان پڑ گیا ہے چہرے پر۔“
 ”گھر میں داخل ہوئے تھے برآمدے میں داوی، امی اور نانا ماموں کے ساتھ ساتھ خالہ نسیرن کو بھی کھڑا پایا اور سب سے پہلے انہیں مخاطب بھی خالہ نسیرن نے ہی کیا، الفاظ کچھ یوں تھے، ”ہاں جی گھما پھر لائے ہو اپنے سر ایوں کو۔“
 ”ہمارے کہاں سے سر لیے ہو گئے، کیوں مذاق کرتی ہیں خالہ!“ دونوں کھسیانے ہو گئے۔
 ”تیسری پریشان کیوں ہوتے ہو، اوہر تو تیاریاں تیار ہیں۔“
 ”کیسی تیاریاں؟“
 ”کیسی ہوئی ہیں تیاریاں۔ ہائے تپا کتنا سمجھایا میں نے ان دونوں کو، نہ اتنی محبتیں بڑھاؤ کہ میری تو شادی کے لوگ ہیں۔ خوب جانتی ہوں انہیں، کہاں

وہ کہاں آپ کا گھرانہ، مگر ان لڑکیوں کی مت ماری گئی ہے۔ ایک نہیں سنی میری۔“ خالہ کی شکایتیں جاری تھیں۔
 ”ہم تو آپ کے مہمان سمجھ کر عزت کر رہے ہیں۔“
 ”میں نے کہا تو تھا اپنے مہمانوں کی عین خود ہی عزت کر لوں گی، پر ناجی! یہ آج کل کے بڑے پتا نہیں کھیلوں والی خاصیت کیوں رکھتے ہیں، تاہ لڑکیاں بھلا کسی طرح بھی تمہارے قاتل ہیں۔“
 دونوں نے پر زور انداز میں ٹی میں سر ملایا۔
 ”نیکھا، اب کیسے مکر رہے ہیں اور اوہر وہ آیا صبح مجھے کہہ کر گئی تھیں، جس مقصد کے لیے لاہور آئی تھی، پورا ہو گیا ہے، میری لڑکیوں کو بڑے شہر میں شادی کرنے کا شوق تھا۔ دیکھ لو آتے ہی دو کیسے عمدہ لڑکے ملے ہیں، بس بات پتی ہی سمجھو اور تم ہو کہ چھپا رہے ہو ہم سے۔“
 ”لڑکے، کیا وہ لڑکیوں کی شادی کے لیے آئی تھیں، لڑکے امجد کے لیے نہیں؟“
 جوادی نے مری مری آواز میں پوچھا تھا کہ امجد پر ڈھائے ظلم یاد آکر قیامت ڈھا گئے تھے۔
 ”نا، امجد بھلا اس جو گا ہے وچارا۔ آپا کہتی ہے۔ پہلے لڑکیاں بیاہوں گی اور مل گئے تم جیسے کاٹھ کے الو۔“
 ”ٹھیک کہتی ہیں آپ بالکل ٹھیک فرماتی ہیں۔ آپ ہمیں ایک ایک لفظ سے انفاق ہے۔“
 جوادی نے کرسی پر بیٹھے پیچھو تپا کھاتے نانا ماموں کے پیر سے جوتی اتاری اور داوی کے حضور پیش کرنے کے بعد فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا، کچھ ایسا ہی شبلی نے بھی کیا کہ خوان کے خیال میں آج وہ جوتیاں کھانا ان کا حق بننا تھا، خالہ نے جو کچھ بیان کیا تھا اس کے بعد دنیا میں بھلا ان سے بڑا چند کون ہو سکتا تھا۔
 جیلہ، انیلا کی والدہ جب کسی ضروری بات کے بہانے اوہر چلی آئیں تو وہ داوی سے تاز تاز جوتیاں کھانے میں مصروف تھے۔ بس وہ وہیں سے واپس پلٹ گئیں، صبح اپنے شہر گئیں اور مڑ کر نہیں آئیں۔

نعیمہ نگار



میڈیا میں ایک طوفان برپا تھا۔ ہر چینل پر وہی ایک تصویر، وہی ایک خبر حقوق انسانی کے چیپٹن سیاست و صحافت اور مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستہ افراد تو اپنی اپنی آراء کا اظہار کر رہے تھے مگر کچھ چینلز کے کچھ نیوز کاسٹرز بھی اپنے فرائض منصبی ایک طرف رکھ کر ایسے ایسے بھرے کر رہے تھے کہ ایک انتہائی مشہور و معروف چینل پر ان ہی کے ایک صحافی کو آن لائن کہنا ہوا کہ۔

”مجھے یہ سب سن کر بہت افسوس ہو رہا ہے کہ ہم غیر جانبدار ہو کر خبر سنانے کے بجائے بالکل اسی انداز میں اور انہی الفاظ میں ری ایکٹ کر رہے ہیں جو مغرب ہم سے چاہتا ہے اور ہمارے دشمن سننا چاہتے ہیں۔ بے شک جو کچھ ہم اسکرین پر دیکھ رہے ہیں۔ وہ قابل مذمت ہے مگر اس کی آڑ لے کر اسلام اور شریعت میں نافذ سزاؤں کے لیے خوف ناک اور بارباریک جیسے الفاظ استعمال کرتے ہوئے خدا سے ڈریں سزاؤں کا یہ قانون اللہ نے دیا ہے۔ انہیں طنز، ملامت اور تضحیک کا نشانہ بنانا خدا کے غضب کو آواز دینا ہے۔ ہاں اگر اسلامی قانون اور سزاؤں کا سہارا لے کر کوئی فریاد گروہ ان کا غلط اور ناجائز استعمال کرتا ہے تو وہ خود قابل مذمت ہے۔ قابل ملامت بلکہ قابل گردن زنی ہے۔ مگر خدا کے واسطے اس بات کا فیصلہ ابھی فوراً آپ کیسے کر سکتے ہیں؟ کہ جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں اس کے پیچھے کیا کہانی ہے؟“

”بند کرونی دی۔ مجھے تو وحشت ہونے لگی ہے۔“

فاضلہ نے اٹھ کر نئی وی بند کر دیا۔

سوات میں سترہ سالہ لڑکی کو کوڑوں کی سزا کی خبر پوری ملک پر کوڑا بن کر برس رہی تھی۔ تینوں کی تینوں گنگ بیٹھی تھیں۔ ملک کی حالت اور غیر ملکی مداخلت پہلے ہی ہر پاکستانی کو تشویش اور بے چینی میں مبتلا کر رہے تھے اور پھر اس طرح کی خبریں باور پھر انہیں پھیلائے اور بتانے کا انداز؟ پھر بھرے تجزیے، مباحثے اس وقت کچھ پاکستانی چینلز کے نیوز کاسٹرز بی سی یا سی این این کے نیوز کاسٹرز کی طرح غیض و غضب اور غصے کا شکار نظر آ رہے تھے اسلام، اسلامی قوانین اور شرعی سزائیں سب ہی ہدف ملامت تھے۔

”کیا یہ ریشل ویڈیو ہو سکتی ہے یا پھر Fake (جعلی)؟“ عاقلہ نے سوال اٹھایا۔ کسی پولیس مین کی طرح وہ ہر معاملے کو انتہائی شک و شبہ کی نظر سے دیکھتی تھی۔ اور کبھی اس کے شکوک و شبہات درست بھی نکل آتے تھے۔

”کچھ بھی ہو سکتا ہے“ عالمہ نے کندھے اچکائے۔

”یاد ہے۔ افغانستان پر حملے سے کچھ عرصہ پہلے مغربی چینلز پر ایک ویڈیو بار بار دکھائی جا رہی تھی جس میں افغانستان کی سرزمین پر دو افراد (جنہیں طالبان کہا گیا) ایک عورت کو لاناٹیوں سے پیٹ رہے تھے۔ اس ویڈیو کو لے کر اسلام اور مسلمانوں کو غیر منذب اجڈ گنوار کیا گیا۔ القاب دے گئے اور بعد میں ایک مغربی صحافی نے ہی پول کھولی کہ یہ ویڈیو جعلی تھی۔ اس میں نظر آنے والے مردوں اور خاتون کو رٹم دے

زراں کام پر آنا دیکھا تھا۔“ عالمہ ایک لمحے کو رکی پھر

عالمہ کچھ بعید نہیں۔ اسلام کی تصویر مسخ کرنے کے لیے ایک چال بھی ہو سکتی ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس طرح کا واقعہ پیش آیا ہو مگر کب؟ کہاں؟ کیا سوات کا ہی واقعہ ہے؟ اور حال ہی کا ہے؟ اس پر صحافی حضرات ہی لگا سکتے ہیں۔“

مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ 34 کوڑے کھانے کے بعد وہ لڑکی کتنے آرام سے اٹھ کر چلی۔ فاضلہ بھی مشکوک ہو رہی تھی۔

”ہمیں کیا حقیقت نکلے گی اس کے پروے میں ہے۔“ عالمہ نے ایک گہری سانس لی، مگر یہ تو طے ہے کہ اب اس کی آڑ میں پھر اسلام اور پاکستان کو ہدف ملامت بنایا جائے گا اور ہماری بہت سی آوازیں ان کی ہم آواز ہوں گی۔ پرانی کہاوٹ ہے، جس کا کھائے اسی کا گائے۔“ وہ دھیرے سے مسکرائی۔

انگلے مفتے عالمہ ایک پروگرام دیکھ رہی تھی جو ڈاکٹر ہانیہ صدیقی کے حوالے سے تھا۔

”آئیے ناظرین اب ہم آپ کو ایک ویڈیو دکھاتے ہیں جو شاید نہیں یقیناً دنیا کی سب سے منذب قوم اور منذب یافتہ (بہ زعم خود) سوسائٹی کے منہ پر ایک

طمانچہ ہیں اور ساتھ ہی ہمیں اس بات کا بھی احساس دلاتے ہیں جو لوگ اپنی ہم منذب اور ہم وطن شہری کے ساتھ یہ سلوک کر سکتے ہیں انہوں نے ڈاکٹر عافیہ کے ساتھ کیا کیا نہ کیا ہو گا؟ اور ہم تو چلیے جاہل ہیں مگر منذب ہیں، حقوق انسانی کی پامالی میں آگے ہیں مگر جناب یہ آپ کو کیا ہوا؟ آپ جو دنیا بھر میں حقوق انسانی اور خاص طور پر خواتین کے حقوق کے سب سے بڑے چیپٹن ہیں، آپ کے اپنے ملک اور اپنی ریاستوں میں یہ کیا ہوا ہے؟ کمپیئر کا لہجہ آخر میں طنزیہ ہو گیا۔

اسکرین پر ویڈیو چل رہی تھی اور عالمہ اسے دیکھ کر دنگ تھی۔ آخر یہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟

ریاست اوہائیو کی کبھی کا جرم اتنا تھا کہ وہ اپنی مرحومہ بہن کا ڈرائیونگ لائسنس استعمال کر رہی تھی۔ اسے گرفتار کر کے پولیس سیل میں لے جایا گیا جہاں اس شبہ میں کہ اس کے پاس کوئی معمولی یا غیر معمولی ہتھیار تو نہیں، اسے مکمل طور پر بے لباس کر کے تلاشی لی گئی۔ جو چار پولیس اہلکار اس واقعے میں ملوث تھے ان میں دو مرد اہلکار تھے اور دو خواتین اہلکار، اوہائیو کے ایک مقامی چینل سے ایک ویڈیو نشر ہوئی اور ان ہی کا صحافی اب تفصیلات بتا رہا تھا، کبھی



ایک شیر خوار بھی ہو، اس ماں کا دل کیسے نہ تڑپتا ہوگی۔
تم تصور کر سکتی ہو ہماری قوم کی بیٹی پر ظلم کے کیا
حربے آزمائے گئے ہوں گے جو اپنے نام کی طرف سے
عزت مآب تھی، جو بے گناہ تھی اور بے گناہ ہے۔
وہ تمہارے ملک میں ہی قیدی بنی ہوئی ہے۔ تو پھر کیا تم
اس کے لیے کوئی آواز اٹھاؤ گی؟

مجھے یہ امید اس لیے ہے کہ اس مظلوم قیدی
عورت کے بارے میں بھی ہمیں تمہاری ہی ایک
صحافی نے بتایا تھا۔ اسی نے آواز بلند کی تھی۔ مگر خیر یہ
ہمارے زخم ہیں ان کا کیا ذکر میں تم سے اپیل کرتی
ہوں کہ یہاں سے جو چند آوازیں ایک مظلوم کی رہائی
کے لیے اٹھ رہی ہیں تم اپنی آواز بھی اس میں شامل
کر لو، میں جانتی ہوں تمہاری قوم کی اکثریت منڈب
انسانی رویوں اور اقدار پر یقین رکھتی ہے اور ظلم کے
خلاف اور مظلوم کے لیے آواز اٹھانا جانتی ہے۔ تب
ہی تو عراق، افغان جنگ کے خلاف سب سے زیادہ
مظاہرے مغرب میں ہوئے۔ یہ تو بس کتنی کے چند
افراد کی پالیسیاں ہیں، جنہوں نے پوری دنیا کو پریشان کر
رکھا ہے۔

تو میں امید رکھوں؟ کہ یو ایس کی ایک شہری خاتون
اس پاکستانی خاتون کی زندہ اور بحفاظت وطن واپسی کے
لیے آواز بلند کرے گی جو اس کے اپنے وطن میں قید
ہے۔ جس کے دو بچے ابھی تک اس سے جدا اور لاپتہ
ہیں۔

ڈیئر کیشی! ہمارے ساتھ ساتھ تم بھی اس کی آواز
بن جاؤ۔

تم دونوں کے ساتھ ہونے والے ظلم کے خلاف
انصاف کی منتظر۔
ایک پاکستانی۔



کے شوہر کے تاثرات بھی دکھائے گئے جو بتا رہا تھا کہ
اس کی بیوی کو کئی گھنٹے اسی حال میں سیل میں محبوس
رکھا گیا اور اس نے اپنی برہنگی چھپانے کے لیے
ٹائلٹ پیپر کا استعمال کیا اور جب وہ گھر آئی تو اس کے
جسم پر فقط ایک گیلی چادر تھی جس سے اس نے خود کو
ڈھانپا تھا۔ کیشی کے شوہر نے یہ بھی کہا کہ اس کی
بیوی کے ساتھ اس طرح کا سلوک ایسا ہی ہے جیسے
اس کا رپ کیا گیا ہو۔

مقامی چینل کا صحافی مزید تفصیلات بتا رہا تھا کہ
مقدمہ اب عدالت میں زیر سماعت ہے۔ کیشی اور
اس کا شوہر انصاف چاہتے ہیں۔

عالمہ انتظار کرتی رہی کہ شاید کیسی چینل پر یہ خبر نشر
ہو، جس کی ویڈیو مشتبہ نہیں بلکہ مستند تھی، مگر شاید
کسی نے بھی اسے درخور اعتنا نہیں سمجھا، ہمیں اپنے
دامن کے ہلکے گہرے داغ بہت نظر آتے ہیں مگر
دوسروں کے تار تار وجود ہماری نگاہوں سے او بھل
رہتے ہیں۔ عالمہ نے دل گرفتگی سے سوچا۔ اور کاغذ قلم
لے کر بیٹھ گئی۔
ڈیئر کیشی!

تمہارے ساتھ جو ہوا بہت افسوس ہے۔ بحیثیت
ایک مسلمان، بحیثیت ایک پاکستانی، بحیثیت ایک
عورت میں اس کی شدید مذمت کرتی ہوں۔ اور امید
کرتی ہوں کہ تمہارے مجرموں کو سزا ملے اور تمہیں
انصاف، یہ تو طے ہے کہ انتہائی اور شدید رویے دنیا
میں ہر جگہ ہیں اس کے لیے کسی کا مخصوص جگے یا
مخصوص مذہب کا پیروکار ہونا شرط نہیں، اور یہ بھی
ایک حقیقت ہے کہ ایک مظلوم ہی دوسرے مظلوم کا
درد سمجھ سکتا ہے۔ تم سمجھ سکتی ہو کہ بگرام کی سابقہ
قیدی نمبر 650 پر کیا گزری ہوگی جب اسے بد
ترین تشدد اور غیر انسانی سلوک کا نشانہ بنایا گیا ہو گا، وہ
بھی محض شک و شبہ کی بنیاد پر جس طرح تمہارے
ساتھ ہوا۔

تم سمجھ سکتی ہو کہ ایک ماں سے اس کے چھوٹے
چھوٹے تین بچے جدا کر دیے جائیں جس میں سے

پیم مریم

پیم مریم

دلی و ہایوسی سے دروازہ بند کر کے چٹختی چڑھا دی۔ پٹنیں تو ضویا کو اپنے پیچھے کھڑے دیکھ کر ایک بل کو ڈر سی گئیں۔
 ”ارے تم اس وقت؟“ مسکراہٹ لیوں پر تو آنکھوں سے محبت و شفقت چھلکی تھی۔
 ”جی میں... وہ ذرا مسکرائی۔
 ”آج بھی لیٹ ہیں ہارون؟“
 ”ہوں، پتہ نہیں کیوں یہ لڑکاتی دیر کرنے لگا ہے۔“
 ”آجائیں گے، دنیا کے مصروف ترین انسان ہیں پورا ملک ان ہی کے کندھوں یہ تو سوار ہو کر چل رہا

دیوار گیر گھڑی نے با آواز بلند رات کے گیارہ بجنے کا اعلان کیا تو خدیجہ بیگم بے قرار سی ہو کر نماز کے تخت سے نیچے اتر آئیں۔ جائے نماز کا کونہ موڑا اور تسبیح اٹھائے پاؤں میں چہل پہن کر کمرے سے نکل آئیں۔ پورے گھر پر خاموشی اور تاریکی کا راج تھا۔ آنکھن پار کر کے انہوں نے پگن میں قدم رکھا اور آہستگی سے بیرونی دروازے کی چٹختی گرا کے پٹ واکیا۔ گلی میں تاحد نگاہ تاریکی تھی۔ دور کہیں سے پالتو کتے کی آواز فضا میں موجود خاموشی اور سناٹے کو چیر کر ان تک آئی تو ان کا خدشات کی یلغار سے سماں کچھ اور بے کل ہونے لگا۔

مسکراہٹ نازک



”انداز میں طنز کی آمیزش بھی تھی جسے خدیجہ بیگم نے اپنی ساواگی میں محسوس ہی نہیں کیا اور ایک بار پھر کلاک سے نظر ڈالتے ہوئے قدرے چونکیں۔“

”تم بیٹا! اس وقت بہت رات ہو چکی ہے جاؤ آرام کرو جاگے۔“ ان کے دبے ہوئے انداز میں جو گریزاور احتیاط چھپی تھی اس سے ضویا اچھی طرح سے آگاہ تھی جب ہی بے نیازی سے کانڈھے اچکا کر بولی۔

”مما سو گئی ہیں۔“ خدیجہ بیگم نے اب کے ذرا غور سے اس کی شکل دیکھی۔ صبح چہرے کی جاڑویت نکھار اور دلکشی اس کی کم عمری کی ہی عطا نہیں تھی۔ بلاشبہ قدرت نے اسے بہت فیاضی سے حسن کی دولت عطا کی تھی مگر کچھ دنوں سے وہ اس کے بدلے ہوئے

دھنک محسوس کر کے عجیب سی بے چینی اور اضطراب میں مبتلا ہو چکی تھیں۔ گوکہ ہارون کی طرف سے انہیں بھرپور قسم کی تسلی و اطمینان تھا۔ اپنی تربیت پہ بھروسہ بھی نکم۔

”آپ سو جائیں پھینچو! ہارون کے آنے تک میں نہیں ہوں۔ ایک چوٹی مجھے ان سے کچھ سوالات حل کرانے ہیں۔“ انہیں بغور اپنی جانب تکتے یا کر وہ نظریں چرا کر مگر بہت اعتماد سے جھوٹ بول رہی تھی وہ چپ سی رہ گئیں۔

”کیا سوچنے لگیں پھینچو؟“ ضویا کچھ جزبزی ہوئی تھی۔

”بیٹا! میں ہارون کے انتظار میں بھوکی بیٹھی ہوں۔ وہ آئے تو اکٹھے کھانا کھائیں گے۔ تم ایسا کرو جو بھی سوال سمجھنے ہیں کل دن میں سمجھ لینا اتنی رات کو ایک تو وہ تھکا ہوا ہوگا دوسرے اگر بھائی صاحب یا بھابھی کو پتہ چلا تو بالکل مناسب بات نہیں۔“

ضویا نے الجھ کر انہیں دیکھا۔

”دن میں وہ دستیاب کہاں ہوتے ہیں۔ چلیں میں آپ کی موجودگی میں بڑھ لوں گی۔ اب بتائیں چائے بنا لاؤں۔ ایسے تو انتظار نہیں ہو سکتا ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے۔“

ضویا چائے بنانے کی غرض سے کچن میں جا چکی تھی وہ بہت تھکے ہوئے سے انداز میں صوفے پر واپس آکر ابھی بیٹھی ہی تھیں کہ بیرونی دروازے سے باہر پہلے بائیک اور پھر کال بتل کی آواز سننے ہی سے مطمئن ہو گئیں۔ گھنٹوں پہ ہاتھ رکھ کر اٹھتے اٹھتے ہی ان کے منہ سے کراہیں نکل گئی تھیں۔ یہ جوڑوں کا درد سردیوں کے آغاز سے بھی پہلے ان کی جان کو آن چڑھا تھا۔

عجلت بھرے انداز میں کمرے سے نکل کر باہر آئیں تو ضویا کو دروازہ کھولتے پا کر وہ وہیں کھڑی رہ گئیں۔ ہارون اسرار بائیک گھسینتا ہوا اندر لا رہا تھا۔ دیوار کے ساتھ بائیک کھڑی کر کے وہ ان کے پاس چلا آیا۔

”السلام علیکم ماں! آئی ایم ساری۔ آج پھر میں لیٹ ہو گیا۔“ سر سے کیپ اتار کر ہاتھ کی مدد سے بل سنوارتا وہ خفیف سا ہو کر بولا۔ کچھ فاصلے پر موجود ضویا کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔

”کوئی بات نہیں بیٹا! اب تم منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لو۔ میں کھانا گرم کر دیتی ہوں۔“ انہوں نے پیار لٹانی نظروں سے اس کے اونچے پورے وردی میں بچے شاندار سراپے کو ستائشی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ تو ہارون سر ہلانا پلٹ کر اپنے کمرے کی جانب چلا گیا۔ ضویا وہیں سکھ چین کے پیڑ سے پشت ٹکائے دونوں ہاتھ سینے پہ باندھے بالکل خاموش کھڑی تھی۔

”چائے بن گئی بیٹا؟“ انہوں نے اس سے پوچھا۔

”جی۔“ وہ خفیف سی ہو کر نظریں جھکا گئی پھر جانے کیا دل میں سمائی کہ سوچے سمجھے بنا اس کے پیچھے چلتی کمرے کے دروازے پہ آن ٹھہری۔ نہایت محتاط سی انگوٹھی کی مدد سے دی گئی دستک کے بعد دروازہ کھولا اور اندر قدم رکھ دیا۔

ہارون اپنے دھیان میں تھا، شرٹ کے بٹن کھولتے ہوئے پلٹا اور اسے رو روایا کے ٹھنکا۔

”تم۔“ اس کی آنکھوں میں حیرت جھلکی تھی۔

دونوں بٹن جو کھل چکے تھے بند کرتے ہوئے وہ تنہا یہ انداز میں اسے تک رہا تھا اور ضویا جو دل کے یہاں تک آؤ گئی تھی اب جھجک کر پھینک گئی تھی۔

”پھینچو کھانے کا پوچھ رہی تھیں۔“

”کچھ اور نہ سوچتا تو اس نے احقانہ سی بات کہہ کر ہاتھ درتے اسے دیکھا۔ سیلیوں کے پڑھائے صل و عاشقی کے تمام اسباق ذہن سے اڑ چھو ہو چکے تھے۔“

”مگر میں انہیں گرم کرنے کا کہہ تو آیا ہوں۔“ اس کی حیرت و چند ہولی تھی تو ضویا کی خفت و خجالت۔

”جی۔ ممہ۔ میں چلتی ہوں۔“ اس نے گڑبڑا کر کہا اور اگلے ہی لمحے چھپاک سے باہر۔ ”اوہ ماں! گاڈ!“

دھک دھک کرتے دل پہ ہاتھ رکھ کر اس نے جانے کس کا سینے میں پھانس کی طرح انکا سانس خارج کیا اور کچن میں پھینچو کے پاس جانے کی بجائے دو گھروں کو ہم ملا دروازہ کھولتی سرعت سے بھاگ گئی۔



کہنے کو رہتے ہو دل میں پھر بھی کتنی دور کھڑے ہو کون سی بات ہے تم میں ایسی اتنے اچھے کیوں لگتے ہو

حوریہ اپنی فرینڈز کے ساتھ سراج احمد جہاں زیب کو اسائنمنٹ جمع کروانے کے بعد پیٹ پوجا کے خیال سے کینٹین کی طرف جا رہی تھی۔ جب اس نے اپنے آوارہ دوستوں کے جھرمٹ میں راجہ اندر بنے ایزی کو اسے دیکھ کر سبھی بجاتے اور پھر لوفرانہ انداز میں آواز بلند اشعار پڑھتے دیکھا اس کے قدموں کی رفتار تیز ہوئی تھی۔

ہم چھین لیں گے تم سے یہ شان بے نیازی لمحہ بھر کی نگاہ چار ہونے پہ ہی ایزی نے موقع غنیمت جانتے ہوئے اسے آنکھ مار دی تھی اور اس کا دل چاہا بڑھ کر اس آوارہ بد کردار لڑکے کا چہرہ پھینچوں

لال کر دے مگر اندر اندر تا اشتعال رہائے وہ تیز تیز چلتی کینٹین میں آئی اور گرنے کے سے انداز میں ایک کرسی تھپیٹ کر بیٹھ گئی۔

اس نے بی اے بہت اچھے گریڈ سے پاس کیا تھا۔ انگلش میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد بہت اچھی جا ب اس کا پرسوں پرانا خواب تھا، جسے وہ ہر صورت پورا کرنا چاہتی تھی۔ ماں کی ناراضی کے باوجود اس نے اپنے بابا سے بات کی تھی جو گورنمنٹ ہائی اسکول کے ریٹائرڈ ماسٹر تھے اور تعلیم کے حامی بھی مگر جانے کیوں اسے کو ایجوکیشن میں تعلیم دلوانے کے خیال سے متذبذب تھے اور یہ جھجک حوریہ نے ہی دور کی تھی۔

”بچہ پتا ہے بابا! مجھے اپنی اور آپ کی عزت کا پاس کیسے رکھنا ہے مجھ پہ اعتماد کریں بابا! پلیز!“ وہ اتنی لجاجت سے کہہ رہی تھی کہ حنیف محمد سے انکار نہیں ہو سکا اور حوریہ یہ عہد بھی کر چکی تھی کہ اسے ہرگز ہرگز بھی کسی لڑکے سے دوستی کرنی ہے نہ ہی ان کی غلط امیدوں پہ پورا اترا ہے۔ گوکہ اپنے غیر معمولی دلکش اور سا حزانہ نقوش کی بدولت کئی لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی تھی مگر اس کا لیا ویا انداز اور صنف مخالف کے لیے نولفٹ کا تاثر دیکھ کر پیچھے ہٹ گئے تھے۔ مگر کچھ دنوں سے یہ ایزی جانے کیوں اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا تھا۔



فلاورز شاپ پر اس نے گاڑی روکی تھی اور اتر کر رنگ برنگ اور خوشنما پھول دیکھنے لگی۔ ہر سو تیزی سے پھیلتی شام کی سیاہی اور تیز چلتی ہوا میں بارش کی پیشگی آمد کا پتہ دے رہی تھیں جس وقت اس نے ریڈو پینک روز کی کلیوں سے سجاو کے سنبھال کر بے منت کی تب بو بھل گھٹاؤں سے پہلی بوند نے ٹپک کر اسے چونکا دیا۔ بوندیں ایک تو اتر سے گرنے لگی تھیں۔ اس کے لبوں پہ بہت دلفریب سی مسکراہٹ بھرتی جا رہی تھی۔ کل سے آج تک کتنا کچھ بدل گیا تھا۔ وہ جو اجنبی

تھا، کل تک جو اس کی فاسٹ ڈرائیو کی اندھی خواہش کی بھیٹ چڑھتے گویا موت کے منہ میں جاتے بچا تھا، وہ اتنی رحم دل بھی کبھی نہیں رہی تھی نہ ہی اس قدر احمق کہ کسی کو گلہ مار کر زخمی کرے اور پھر اسے اٹھا کر ہسپتال بھی لے کر جائے مگر وہ بری چھنی تھی۔ ٹریفک کا اڑدھام تھا تو آگے وہ دررو کی شدتوں سے کراہتا انسانی وجود۔ آن واحد میں لوگ اکٹھے ہوئے تھے اور اسے لعنت ملامت کرنے لگے، اب اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ اسے لے کر ہسپتال جاتی مگر راستے میں ہی اس کا دل اسے بری طرح دغا دے گیا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، لحوں میں سحر طاری کر دینے والی پر سنائی رکھتا تھا، کیسے لحوں میں اس کی بیگانگی اور بے نیازی اس کی ذات کو چھوڑے کیسے فضا میں تحلیل ہو گئی تھی اور وہ خودیر بیت جانے والی اس انہونی پر ششدر ایک مرتبہ پھر ایک سیڈنٹ کرتے کرتے رہ گئی تھی۔

ڈاکٹر مسور کے کلینک پر اسے ایڈمٹ کیا گیا تھا، چوبیس معمولی تھیں مگر سر پر لگنے والی چوٹ خطرناک تھی، جب ہی ڈاکٹر نے اسے ایڈمٹ کر لیا تھا وہ نہ چاہتے ہوئے بھی گھر واپس ہوئی تھی کہ اس عرصے میں مام کی لگانا کئی مس کالز اس کے میل پہ آچکی تھیں مگر آنے سے قبل وہ اس مغرور نقوش والے شخص سے اپنا تعارف ضرور کروا چکی تھی۔

”میں کل پھر آؤں گی۔ ڈاکٹر کی فیس اور ہسپتال کے چارجز کی آپ فکر نہ کریں، وہ میں بھروں گی۔ ڈونشوری۔“

اس کا سلی رہنے کا بھی اپنا ہی انداز تھا مگر مقابل کے چہرے پر حد درجہ درشتی دیکھ کر اپنی بات کے غلط ہونے کا احساس خفت کا شکار کر گیا۔

”اوہ۔ آئی ایم ساری۔ شاید آپ نے مانڈ کیا، ایک جو کئی۔“ وہ خفیف ہوئی تھی۔

”وہ۔ آپ کا کوئی کانٹیکٹ نمبر تو ہو گا؟“ وہ جانے کیوں اس سے بات کرنے کا بہانہ تلاش رہی تھی۔ مگر

چند لمحوں بعد جب اس نے اپنا سوال دہرایا، اس کی وضاحت کے ساتھ کہ اس کے گھر والے پریشان ہوں گے، وہ انہیں اطلاع کرنا چاہتی ہے، اس نے آنکھیں کھولی تھیں۔

”آپ کا کام ختم ہو چکا، بہت مرہانی کہ مجھے یہ مل پھنچا دیا، ورنہ سڑک پر تو مجھے تماشا بنا کر مرنے کو چھوڑنے کی کوئی کسر آپ نے رکھی نہیں تھی۔“

اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ کوئی اسے کچھ کہہ دے اور وہ اسے بخش دے، ناممکن۔ ابھی بھی وہ اس پر نفرین بھیج کر اپنی راہ ہوتی۔

”پلیز جا میں آپ یہاں سے۔ لیوی الون پلیز۔“ وہ از حد سختی سے کہہ رہا تھا۔ اسوہ بکھرتی تھی اور باہر نکل گئی تھی۔



کلینک کے باہر گاڑی روک کر وہ بارش کی بوچھاڑ کی پروا کے بغیر نکلی تھی اور بو کے اٹھائے تیز قدموں سے چلتی کلینک کے داخلی گلاس ڈور کو دھکیلتی اندر داخل ہو گئی۔ پہلا دھچکا اسے خالی بیڈ کو دیکھ کر لگا تھا۔ کل وہ یہیں اسے چھوڑ گئی تھی اور اس کی حالت ایسی ہرگز نہیں تھی کہ وہ خود سے کہیں جا سکتا۔ وہ جیسے کانٹوں پر چلتی ریپسز پر آئی اور دو سرا دھچکا اسے اس وقت لگا، جب ریپسڈ نے پیشہ وارانہ مسکراہٹ سمیت یہ کہتے ہوئے اس کی معلومات میں اضافہ کیا کہ وہ مریض آج صبح نوبے ڈسچارج ہو کر چلا گیا ہے۔



ضویا کی نگاہیں بظاہر کتاب پر تھیں مگر ذہن ہارون اسرار کو سوچ رہا تھا، وہی ہارون اسرار جو بچپن سے لے کر اب تک اس کے سامنے رہا تھا اور اس نے اپنی ماں کی طرح کبھی اسے عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے نزدیک ہارون اسرار کی حیثیت نچلے درجے کے انسان اور ایک معمولی ملازم سے زیادہ نہیں تھی۔ ہارون اسرار اس کا پچھلی زاد تھا جو بچپن میں باپ کے

بعد ان کے درپہ آکر بیٹھ گیا تھا اور ایسا جم کر تھا کہ پھر ملنے کا نام نہیں لیا وہ اور اس کی ماں کو کہ جس سے بھی بوجھ نہیں بنے تھے کہ پچھو اپنی ساوگی کی کساری کی بدولت شاید ہی کسی کے لیے باعث بنی ہوں۔ جوانی میں پیوگی کی چادر سے جب وہ خود سے چند سال چھوٹے بھائی کی بدلیز میں والدینہ صدمہ سبب نہیں سکے۔ دل کا جان لیوا شہ کے غم میں مزید اضافہ کر گیا۔ باپ کی وفات کے بعد مراد حسن (ضویا کے والد) اور اماں کو بیٹی کے لیے کچھ اور بھی حساس کر دیا۔ کچھ کھانے کی بات ہوتی تھی اس کی اولیت انہیں دی جانے لگی۔ یہ بھی ایک بڑا زخم تھا، بٹانے کا اپنائیت و محبت کا تاکہ انہیں شوہر کی کمی کا احساس نہ ہو۔ یہی بات ثانیہ (ضویا کی والدہ) کے دل میں مند اور اس کے معصوم بچے کی نفرت کے بیج کو تازہ و درخت بنا گئی۔ اماں تو ایک دو سال کے عرصے میں راضی عدم سدھار گئیں۔ اب ثانیہ بیگم کو کھلنے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ شوہر سارا دن کاروبار کے لیے بیٹھ گھر سے باہر ہوتے۔ خدیجہ کو انہوں نے بہت سہولت اور سہولت سے ایک ملازمہ کا درجہ دے دیا۔ کچھ کم آہیز اور انتہائی ذہین بچہ تھا۔ گھر کا سوا سلف سے لے کر ہر چھوٹے بڑے کام کے لیے اس کی سہانی کا خیال کیے بغیر دوڑا دیا جاتا۔ خواہشات کو مارنا اور سنگ سنگ کر جینا وہ بہت کم عمری میں سیکھ گیا تھا۔ یہ تو باسوں کا دم غنیمت تھا کہ وہ بڑھائی چھوڑ کر نہیں بیٹھا تھا۔ ضویا میٹرک کے بعد کالج میں گئی تھی۔ نئی نئی دوستیاں ہوئی تھیں جو بڑھائی سے زیادہ دو سری باتوں کی آہلی رکتی تھیں۔ اینڈین موویز انڈین ڈرامے اور اینڈین ساکنز ہالی ووڈ اینڈ ہالی ووڈ کے ہیروز ان کی زندگی کے گراف پر بہت اور تک پہنچے ہوتے تھے۔ اس فلمی دنیا کی تمام باتوں کی آگاہی یہاں کرتی تھی۔ یہی وہ آپس میں ڈسکس کیا کرتی تھیں۔ ضویا کے لیے سب کچھ نیا اور بہت دلچسپ تھا۔

اس کی برتھ ڈے سیلبریت کرنے کے لیے اس

کی یہی فرینڈز اس کے گھر آئی تھیں اور انہوں نے اس کے گھر میں ہارون اسرار کو دیکھا تھا، وہ ان دونوں سی ایس ایس کر رہا تھا۔ اس کی شدید خواہش تھی وہ پولیس میں بھرتی ہو کر اپنے ملک کے لیے کچھ کر سکے۔ وہ معمول کے مطابق صبح کے ناشتے کے لیے فریش ہو کر پیکٹ بریڈ اور جیم وغیرہ لایا تھا اور کچن میں رکھ کر پلٹ رہا تھا، جب لائینے نے اسے بالکل اچانک دیکھ لیا۔ وہ تو دل تھام کر رہ گئی تھی۔

”یہ۔ یہ پر نس کون تھا؟ اتنا گڈ لکننگ اور ڈیشننگ ہے تمہارا کزن اور تم نے آج تک ہوا نہیں لگائی؟“ وہ سب اس کے سر ہوئی تھیں اور ضویا حق دق سی آنکھیں پھاڑے انہیں جانے کون سے القاب سے نوازتے اور اس کے لیے آہیں بھرتے اور خود کو صرف اس وجہ سے لگی ہونے کی نوید سنتی رہی تھی۔

”سنو، کیا تمہارا اس کے ساتھ کچھ چل رہا ہے۔“

زہرا نے اس کا بازو ہلایا تھا اور وہ اپنی حیرانی پر قابو پانے کی کوشش میں کچھ اور ہونق ہو گئی۔

”کیا مطلب، کیا چل رہا ہے؟“ اسے یہ انداز ناگوار محسوس ہوا تھا۔

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے
بہنوں کیلئے خوبصورت ناول

دل اک شہر جنوں

آسیہ مرزا

قیمت --- = 400 روپے

منگوانے کا پتہ
ملکتی عمران ڈائجسٹ
37- اردو بازار، کراچی۔

”مطلب، عشق و شوق“ انیسویں ”زہرا نے ایک بار پھر آہ بھری اور یکایک ہی ضویا کو جانے کیوں ایک بار پھر شرمندگی نے آن لیا، ویسی ہی شرمندگی جو اس نے اس وقت محسوس کی تھی کہ جب اس نے کہا تھا اس کا کوئی بوائے فرینڈ نہیں ہے۔“

”نہیں۔“ وہ چیختی تھی۔ یعنی وہ اتنا ڈیشننگ اس قدر شان دار شخص تمہارے سامنے ہے اور تمہیں نظر نہیں آتا۔“

”کیا تمہاری آئی سائیڈ ویک ہے؟“ نائلہ کے سنجیدگی سے سوال کرنے پر وہ گڑبڑا گئی تھی۔

”یہ اپلو تمہیں کیوں نظر نہیں آیا ایسا کرو اگر تم نہیں تو میری بات، ہواؤ۔“ نائلہ نے آنکھ میچ کر جذب سے کہا اور ضویا گھبرا کر وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

اسی رات وہ جب ان باتوں کو لے کر اچھی خاصی ڈسٹرب ہو گئی تھی اور بے چینی سے باہر نکل رہی تھی وہ اچانک ہی سامنے آ گیا تھا۔ وہ یقیناً پاپا کے کمرے سے باہر آیا تھا۔

”سنو۔“ وہ اپنے دھیان میں دروازہ بند کر کے آگے بڑھ جانا چاہتا تھا۔ اس پکار پر چونکا۔ سرخ اور نیلے خوبصورت پرنٹ کے شلوار سوٹ میں دوپٹہ شانوں پہ پھیلائے وہ اسے بہت توجہ بہت دھیان سے دیکھ رہی تھی۔ دیکھ کہاں رہی تھی، جا بچ رہی تھی اور وہ تو ان تعریفوں سے بھی کہیں بڑھ کر اثر پکٹو اور دلربا شخصیت کا مالک تھا، وہ حیران حیران سی دیکھ کر سوچتی رہی۔

بارون کو اس کی دماغی حالت پہ شبہ سا ہوا۔

”کچھ کام ہے؟“ جربز ہونے سے پہلے کی کیفیت حیرانی کی تھی۔

”ہاں کام تو ہے لیکن کل بتاؤں گی۔“ وہ جانے کیوں مسکرائی اور ایک بار پھر اس کا سر تپا جائزہ لیا۔ بارون کو عجیب سا احساس ہوا، وہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔

پھر مزید تین سال گزر گئے، وہ اپنی فرینڈز کی تمام عادات اپنالینے کے باوجود بھی کبھی کھل کر بارون سے اظہار نہ کر سکی۔ البتہ دل میں جھنجھلاتی ضرور رہتی۔

جانے کیسا دبدبہ اور رعب تھا اس کی شخصیت میں کہ اس کے سامنے جاتے ہی سب کچھ بھولنے لگتی۔ کیا وہ کچھ بھی محسوس نہیں کرتا، کتاب بدل گئی ہوں میں اس کی وجہ سے۔ اس کے آس پاس منڈلاتی ہوں، اس کے کتنے ہی کام کرتی ہوں، وہ کیوں خود سے نہیں بچو جاتا۔ کتاب پختے ہوئے وہ جڑی سی گئی۔

باہر بارش کا شور تھا، وہ اٹھی اور چلتی ہوئی کھڑکی میں تان رکھی۔ گلاس ونڈو کے پار قدرت کے خوبصورت رنگ بکھرے تھے، وسیع و عریض لان میں ہمار دکھاتے گل بوٹے پارش میں دھل کر نکھرے گئے تھے۔ یہ ہی وہ چونکی تھی۔ نگاہ اٹھی اور ساکن رہ گئی۔ ثانیہ بیگم کسی پہ برہم ہو رہی تھیں۔ وہ بارون اسرار تھا جو ہمیشہ کی طرح ان کی لعنت ملامت کو بغیر کسی تاثر کے سن رہا تھا۔ ضویا کے اندر ناگواری بکھری تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے مڑی اور تیز تیز چلتی باہر آ گئی۔

”کیا ہوا ہے؟ کیوں چلا رہی ہیں ماما؟“ بد لحاظ اور گستاخ لہجہ۔ ثانیہ بیگم کے ساتھ بارون اسرار نے بھی چونک کر اسے دیکھا۔ بارون اسرار نے ایک کے بعد دوسری نظر بھی اس پر نہیں ڈالی تھی اور پلٹ کر لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا تھا۔

”تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟“

ثانیہ بیگم، بارون اسرار کی چوڑی پشت کو گھورتے ہوئے اس پر غرائیں۔

”آپ کیا قصور کیا تھا اس نے کہ آپ اس پر اس طرح برس رہی تھیں۔ ماما! کتنی باریہ بات بتاؤں کہ وہ آپ کا ملازم نہیں ہے۔ پولیس میں اعلا گریڈ کا آفیسر ہے۔“

”او سنو۔ ہوا کرے ہمارے نکڑوں پر ہی تو۔“

”ماما۔“ ضویا کے لہجے میں بادلوں کی آگ گھن گھن تھی۔ ”وہ اس گھر کا ہونے والا دلداد بھی ہے، یہ بات آپ کو پتا ہے پھر بھی آپ اسے۔“

”شٹ آپ۔“ اس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی اس سے پہلے ہی وہ حلق کے بل دھاڑی تھیں اور ایک

جانے دار تھیں اسے رسید کر دیا تھا۔ ضویا گل پر ہاتھ رکھے جھلکتی آنکھوں میں تیر سموئے انہیں دیکھتی رہ گئی۔

”کس نے کی یہ فضول بکواس تم سے، اس کی ماں کی آنکھیں لہورنگ ہو چکی تھیں۔“

”نہیں پاپا نے اور پاپا نے ابا ماں کی خواہش کو ہرگز سہلا میں گئے۔ ماما! چاہے آپ کچھ بھی کر لیں، لے بھی کہ میں ایسا چاہتی ہوں۔“

جو اس بحال ہوئے تو ضویا ان کے وجود پر جلیلیں آنی ایک جھٹکے سے پلٹ کر اندر بھاگ گئی۔ وہ شدید کھڑی رہ گئیں۔



”پھر تم نے کیا سوچا؟“ خدیجہ بیگم نے اپنے سامنے بیٹھے تھکے تھکے سے بارون اسرار کے چہرے پر گہری دیکھ کر کہا۔

”کس بارے میں؟“ وہ چونکا تھا اور حیرت سے لہجہ لگایا۔ ان کا انداز خاص تھا یا اسے محسوس ہوا۔

”ضویا کے متعلق؟“ انہوں نے مسکرا کر دلچسپی سے اسے دیکھا تو بارون کو جھٹکا لگا تھا۔

”کیا مطلب ضویا کے متعلق میں کیوں سوچنے لگا۔“ یہ نام سن کر اس کا لہجہ سخت ہوا تھا۔

”بھول گئے بیٹا! حالانکہ یہ بھولنے والی بات تو نہیں تھی۔ لہاں ابا کی شدید خواہش تھی یہ اور بھائی جان، ابا۔“ وہ عاجز سا ہوتا انہیں ٹوک گیا۔ ”وہ سب پرانی باتیں تھیں۔ نانا جان اور نانا اب اس دنیا میں نہیں ہے، ان کے ساتھ ہی ان کی خواہش بھی منوں مٹی سے جا چھپی۔ آپ پلیز اس تذکرے کو رہنے دیں ہم سب کو، بائیں بائیں کے زیر احسان ہیں۔ کیا آپ اپنے بچے کو بائیں عمران کا زیر بار رکھنا چاہتی ہیں، اس کا خدشہ اور کرواہٹ لیے تھا۔ انہوں نے اس کی کھلی کو محسوس کیا اور گہرا سانس کھینچا۔

”یا تم ضویا کو پسند نہیں کرتے؟“ ان کے لہجے میں اظہار نہ کر سکی۔ البتہ دل میں جھنجھلاتی ضرور رہتی۔

بے بسی کا اظہار چھلکا۔

”وہ ابا۔! میں۔۔۔ آئی ایم سوری۔ میں نے کبھی اسے اس نظر سے نہیں دیکھا۔ لائف پارنٹر کے لیے میرے ذہن میں جو ایچ ہے، وہ کم از کم ضویا جیسی لڑکی کا نہیں ہے۔“ وہ جھنجھلاتے ہوئے کہتا بیٹھ گیا۔

”تو پھر کیسی لڑکی کا ہے؟“ خدیجہ بیگم کا لہجہ کانپا اور چہرہ متغیر ہونے لگا۔

”سائہ خان، ابا! وہ بہت اچھی ہے، میرے دوست کی بہن ہے، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سلجھی ہوئی۔“ اس کے لہجے میں ہی نہیں، آنکھوں میں بھی نرمی اتر آئی۔ خدیجہ بیگم یک ٹک اسے دیکھ رہی تھیں۔

”یعنی تم۔۔۔ تمہ۔۔۔ ضویا سے شادی نہیں کرو گے؟“ ان کے حلق سے سرسرائی آواز برآمد ہوئی۔ بارون چونکا اور بہت تھکے ہوئے انداز میں ماں کو دیکھ کر سر جھکالیا۔

”کیا ممانی جان ضویا کی شادی مجھ سے کر دیں گی؟“ اس کی آواز سپاٹ تھی۔

”پتا نہیں لیکن بھائی جان ضرور ایسا چاہتے ہیں۔ ابھی برسوں ہی انہوں نے مجھ سے بات کی ہے۔“

”اور کل شام ضویا کو دیکھنے ایک بہت ایڈوانس قسم کی فیملی آئی ہوئی تھی جو آپر کلاس کے لگتے تھے۔“

بارون نے بھرپور مسکراہٹ سے کہتے ہوئے خدیجہ بیگم کو حیران کر ڈالا۔

”آپ ابھی خاموش رہیں اور دیکھیں کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ مجھے جلدی نہیں ہے۔ اباں بہتر ہو گا کہ ضویا اس گھر میں آنے کے بجائے کہیں اور کھب جائے۔“

”ہاں! تاکہ تم اپنی پسند کی لڑکی لاسکو۔“ انہیں اس کی بے نیازی کھلی تھی۔ بارون نے مسکراہٹ ضبط کر لی اور وہاں سے اٹھ گیا۔

اسے چند روز قبل کی وہ برستی شام بہت اچھی طرح سے یاد تھی۔ جب کمرے میں دانش روم سے نکلتے ہوئے اس نے ضویا کو اپنی اسٹڈی ٹیبل پر جھکے دیکھا تھا۔ آہٹ پر وہ پلٹ تھی اور اسے رو روپا کر گھبرانے یا

بوکھلانے کے بجائے وہ بہت اعتماد سے مسکرائی تھی۔ اتنے اعتماد سے کہ وہ جو اپنے کمرے میں بے تکلفانہ انداز میں جینز پر بنیان ہی پہن کر باہر آ گیا تھا۔ خود کو اس کے سامنے اس حیلے میں پا کر شرمندہ سا ہو گیا تھا۔ ”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ شرٹ پہننے کے چکر میں وہ اس کی کارگزاری پر دھیان نہیں دے سکا تھا۔ ”خود دیکھ لو نا؟“ وہ ہنسی اور سراہتی ہوئی نظروں سے اسے نکتے لگی۔ ہارون اس کی نظروں کے ارتکاز کو محسوس کرتا جڑبڑ ہوا تھا اور تیزی سے شرٹ کے ٹین بند کرنے لگا۔

”اوکے اس وقت تو تم جاؤ۔ یقیناً تمہیں کوئی سہری یاد کرنا ہوگی۔ ٹرانسلیشن کروانا ہوگی یا پھر۔“ ”یا پھر کچھ نہیں۔ ہارون اسرار! ان سب فضولیات کے علاوہ بھی تو دنیا میں بہت کچھ ہے۔ مثلاً یہ کہ تمہارا نام بہت یونیک ہے مگر تم سے زیادہ نہیں۔ سچ بتاؤ۔ ہر روز کتنی لڑکیاں مرتی ہیں تم پر۔“ اس کے نزدیک آکر آخری ٹین جو رہ گیا تھا اس کے ہاتھ ہٹا کر خود بند کرتے ہوئے وہ اس درجہ اعتماد سے بولی تھی کہ ہارون اسرار اس کی اس جرات کے مظاہرے یا دوسرے لفظوں میں بے شرمی پر درنگ رہ گیا۔



طوفانی ہواؤں کے جھکڑو دروازوں اور کھڑکیوں سے سرخ رہے تھے۔ بادلوں کی گڑگڑاہٹ اور بجلی کی خوفناک چمک ماحول میں پراسراریت پیدا کر رہی تھی۔ جب بجلی چمکتی تو گلاس ونڈو کا شیشہ جیسے تڑختا ہوا سا محسوس ہوتا اور یہ نیم تاریک سا کمرہ چکاچوند روشنی سے بھر جاتا۔ آف وائٹ پردے پھت سے لٹکتا قیمتی فانوس، بلبو تھمیلیں صوفے ہر شے پر ایک وحشت بھری خاموشی تھی۔ اسی خاموشی کا حصہ اس کا وجود بھی تھا جو کسی پتھر کی مانند ہی ساکت تھا۔ ایزی جیسر پر نیم دراز سینے پہ ادھ کھلے فیشن میگزین کو اوندھائے وہ جانے کیا سوچ رہی تھی تب ہی وہ دروازہ کھلنے کی آواز پر چونکی جو کہ پاؤں کی ٹھوک سے کھولا گیا تھا۔ کیچڑ سے بھرے

جو گرز نے قیمتی کارپٹ پر نقش و نگار بنائے تھے۔ جیسے تڑپ کر سیدھی ہوئی۔ ”اسٹاپ! ایزی نیم آن یو۔“ اس نے انگریزی شہادت کی مدد سے کارپٹ پر کیچڑ سے بن جانے والے جوتوں کے نشانوں کی سمت اشارہ کرتے ہوئے ملاستی نظروں سے اسے گھورا۔

”یہ کارپٹ تمہارے باپ نے تو نہیں بچھوایا یہاں پر۔“ اس کا لہجہ اس کے چہرے کے نقوش کی طرح ہی تھا۔

”اوہ یس! میرے باپ نے نہیں بچھوایا تو تمہارے باپ نے بھی نہیں بچھوایا۔ یہ تو ہماری مشترکہ محی نے بچھوایا ہے۔ جو اتنی امیر کبیر ہے کہ اتنے ہی دس کارپٹ بھی تمہیں لا کر دے سکتی ہے۔ لو میرے لال اور انہیں بے دریغ گندا کر دو۔“ اس نے چڑ کر کہا۔ ایزی نے جیسے اس کی کسی بات پر بھی توجہ نہیں دی۔ بڑا سا مٹھلیں فلور کشن کھینٹا اور اسے سر کے نیچے رکھ کر لمبا لبا لیٹ گیا۔

”خیریت! تم اتنی رات تک جاگ رہی ہو؟“ جینز کی جیبیں ٹٹول کر گولڈ لائف کا سگریٹ کیس اور لائٹر نکالنے کے بعد وہ سگریٹ نکال کر لبوں میں دباتا اب شعلہ دکھا رہا تھا۔ اسوہ نے مسکرا کر اسے دیکھا اور کھلکھلا کر ہنس دی۔

”ہاں۔“ ایزی جو نیا سگریٹ سلگانے کو ڈبیا اٹھا رہا تھا سرعت سے ہاتھ پشت کے پیچھے لے گیا۔ سامنے موجود عورت ہائٹ گاؤن میں ملبوس تھی۔ ان کے ریشمی لائسنے گھنیرے بال ان کی پوری پشت کو چھائے ہوئے تھے۔ وہ اس عمر میں بھی اتنی جاذب نظر اتنی رکشش شخصیت کی مالک تھی کہ ایک کے بعد دوسری نگاہ اس پر خود بخود اٹھتی تھی۔

”نہیں! بس یونہی بس جا ہی رہے تھے سونے۔“ جواب اسوہ نے دیا تھا جبکہ ایزی میکا کی انداز میں اٹھ کر اپنے بیڈروم کی سمت بڑھ چکا تھا۔ جب ان کی ٹھہری ہوئی آواز پر ٹھٹکا۔

”وہ اچانک مڑا۔“ ”یہ اگر جوتے خراب ہوں تو انہیں باہر اتار دیا جائے۔“ ایزی نے تنک کر اسوہ کو دیکھا، جو کھٹ کھٹ کرنے کی کوشش میں سرخ ہو رہی تھی۔ ”خٹنا ہوا اپنے بیڈروم میں چلا گیا جبکہ اسوہ لٹ کر آنکھیں موند کر سوچنے لگی۔“

”خوش ہو بھی نہیں کر سکتی تھی کہ جس کی تلاش میں اس کی خاک چھانٹی پھری ہے وہ اسے مایوسی کے تھکن کی انتہاؤں پر یوں اچانک مل جائے۔“ ”اسان کارنگ سیاہی مائل سرخ رنگ کے آثار تھے، جب وہ گھر سے نکلی اور سٹیڈیم روڈ سے ٹرن لے کر چرچ روڈ کی سمت آئی تھی اور تب ہی اسے لگا تھا جیسے برستی بوندوں نے سڑک پر اور فضا میں مہک اٹھی ہیں۔“

”سڑک پارک میں بھینٹا وہ ایک شخص جسے اس کی نگاہ کی خواہش نے کہاں کہاں اور کس کس جتن سے کھنکھناتا تھا۔ سڑک کنارے چلتا ہوا کتنا بے نیاز دکھاتا تھا۔ اس نے تو جیسے خوشی سے قابو ہوتے ہوئے گاڑی پارک پر روکی۔ ایک افراتفری کے سے عالم میں اس کے پیچھے بھاگی تھی۔ یوں اس طرح کہ اسے پھر سے گھوڑنے کا خوف اسے ہراساں کر رہا تھا۔“

”سنس۔ سنس۔ پلیز۔“ وہ بارش کیچڑ اور گاڑیوں کی رو کیے بغیر لپکتی ہوئی اس تک آئی تھی۔ وہ اچانک رکا تھا اور حیران سا ہو کر پلٹا۔ اس کی بڑی بڑی بارش آنکھوں میں نہ کوئی شناسائی کی رمت تھی نہ ہی کوئی پہچان بلکہ وہ کیسی حیرانی اور بیگانگی سمیت اسے گرا رہا تھا۔

”اگر اب بھی تم نہ ملتے نہ تو مجھے لگنے لگا۔“ ”نہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے مرجاؤں گی۔“ اس نے خوشی کے احساس سمیت بے ربط ہو چلا تھا۔ اس نے اب کے ذرا دھیان سے مگر کڑی نگاہ سے دیکھا مگر ان آنکھوں میں پہچان کا رنگ پھر بھی سرا تھا۔ ”واٹ نان سنس۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں آپ

ہیں کون اور یہ جذباتی تقریر کس سلسلے میں فرما رہی ہیں؟ اس کا لہجہ بہت سخت اور سخت تھا۔ اسوہ کے اندر دیکھت چھٹا کا ہوا وہ ایک دم چپ سی ہوئی تھی۔ اس نے بہت ٹوٹی ہوئی آس سمیت اسے دیکھا۔ یوں جیسے وہ یقین نہ کر پائی ہو کہ وہ واقعی اسے فراموش کر چکا ہے۔

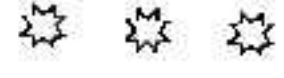
”آ۔۔۔ آپ کو واقعی یاد نہیں کچھ بھی۔“ اس کے مدھم لہجے پر آنسوؤں کی کمی غلب پانے لگی۔ ”مگر کیا؟“ وہ جھنجھلا کر لگا۔ ”بچہ راہ یوں راستہ روک کر کھڑا کرنے والی یہ لڑکی اسے کھسکی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔“

”وہی۔ وہی حادثہ۔ جب آپ میری گاڑی سے ٹکرائے تھے اور میں۔“ ”اوہ۔“ اسے جھٹکا لگا۔

”تو وہ تم تھیں۔“ وہ آنکھیں نکال کر پھنکارا کچھ اس طرح کہ اسوہ ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ بارش اسی تواتر سے دونوں کو بھگو رہی تھی۔ اس نے مجرمانہ سے انداز میں سر جھکا لیا۔ ”میں آئی تھی اگلے روز ادائیگی کرنے اور آپ کی عیادت۔“

”آپ کو یہی مجھے بتانا تھا۔“ اس نے طنزیہ سوال کیا۔ اسوہ لاجواب سی ہو گئی اور بے بس سی ہو کر ٹکڑ ٹکڑ سے دیکھنے لگی۔ وہ اسے وہیں چھوڑ کر لمبے ڈگ بھرتا آگے بڑھ گیا۔ وہ کبھی بھی اسے ایک بار پھر نہ کھوتی، اگر وہ ایک رکشہ روک کر اس میں بیٹھ کر نگاہوں سے او جھل نہ ہو جاتا۔ ”اگر یہ محبت ہے تو کاش مجھے یہ محبت نہ ہوتی۔“

ایک تارہ اس کی آنکھ سے ٹوٹ کر چپکے سے تکیے میں جذب ہو گیا۔



ہارون نے جھنجھلا کر فائل بند کر دی، اس کا ذہن منتشر تھا، وہ یکسوئی سے کوئی کام بھی پٹنا نہیں پار رہا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اپنے دو سالہ کیریئر میں اس نے بہت سے مشکل کیس خوش اسلوبی سے ہینڈل کیے تھے اور کامیاب بھی رہا تھا۔ سینئرز آفسر اس کی ذہانت کے قائل اور ان تھک محنت کو پسند کرتے تھے مگر زندگی میں اس مقام پر وہ جیسے اندر سے کمزور پڑنے لگا تھا۔ اماں کی ناراضی اس کے اعصاب کے تناؤ میں اضافہ کر رہی تھی۔ ایک ہی ضد اور وہ بھی بے جا۔ کیا وہ ضویا سے شادی کرنے کے بعد اسے وہ مقام دے پائے گا جو سائرہ کو اس کا دل کب کا دے بھی چکا ہے۔ کیا وہ اسے محض اس لیے اپنی زندگی کا حصہ بنا لے گا کہ اس کی ماں اپنے بھائی کے احسانوں کا بار اتارنا چاہتی ہے۔ احسان فراموش تو وہ بھی نہیں تھا مگر احسان کا بدلہ اس طرح چکانے پر بھی ہرگز آمادہ نہیں تھا کہ ساری عمر کا روگ پال لے۔ اس نے سر کرسی کی پشت سے نکال دیا۔ تخیل کے پردے پر سائرہ کا ولنشیں سر پالانے لگا تو ایک آسودہ مسکراہٹ آپسی آپ اس کے لبوں پر آن ٹھہری۔

ضویا کی عادات و اطوار کیا تھیں اس نے کبھی ان پر غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ پہلی مرتبہ وہ تب چونکا تھا جب ضویا اپنی فرینڈز کے ساتھ اس کے سامنے آئی تھی۔ وہ سب کی سب جن نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں وہ ان سراہتی اور ستائشی نگاہوں کا اب عادی ہو چکا تھا۔ صنف نازک کا اپنی طرف جھکاؤ اب اسے حیران نہیں کرتا تھا مگر ضویا کی فرینڈز کی حرکات اور اشارے بازیوں پر وہ تشویش کا شکار ہوا تھا۔ ضویا کا میل جول اتنی غلط لڑکیوں سے ہو گا اس نے کبھی سوچا نہیں تھا۔

”کیا سوچا جا رہا ہے یوں مسکرا مسکرا کے؟“ مگر چونکا اسے اس وقت لگا تھا جب اس نے ضویا کا جھکاؤ اپنی طرف محسوس کیا۔ ہارون نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”کم از کم تمہیں نہیں۔ پانی واوے، تمہیں کسی نے اتنا بھی نہیں بتایا کہ رات کو اس پر کسی غیر محرم مرد کے کمرے میں آنا کتنی آگورڈ حرکت ہے۔“ اس کا لہجہ بلا کا سرد اور تلخ تھا اور یہی تلخی بے گانگی ضویا کو آگ لگاتی تھی۔ وہ ہارون کو اب بھی خود سے کتر

سمجھتی تھی۔ ”اپنے گھر کے کسی حصہ میں بھی آتے جاتے تھے قطعی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہیں یہ بات بھولنا نہیں چاہیے کہ تم ہمارے گھر کے ہی ایک کمرے میں موجود ہو۔“ وہ بات کرتے ہوئے اس کی کرسی جس پر وہ بیٹھا تھا بالکل ہتھے پر آکر ٹیک گئی۔ فل فلنگ کی جڑ تراش خراش کی شرٹ کا گلا انتہائی گہرا تھا وہ برکارت کی حد تک حسین تھی۔ وہ بہت مضبوط اعصاب رکھتا تھا مگر اس طرح سے آزمائش میں پڑنا وہ جھلا اٹھا۔ ناگواری اور برہمی کے ساتھ اسے دھکا دے کر دروازہ ہٹایا۔

”کیا کون تم کو مجھے اس بات پر افسوس ہے کہ تمہاری جیسی سطحی سوچ کی معمولی لڑکی میرے ماموں کی اولاد ہے جسے نہ ان کی عزت کی پروا ہے نہ۔“ ”شٹ اپ۔ جسٹ شٹ اپ۔“ اس کی غضب سے بھری دھاڑ ہارون کی سرد و سفاک آواز پر غالب آگئی۔

”میں یہاں تمہارا درس سننے نہیں آئی۔ تم یہ بتاؤ انکار کیوں کر رہے ہو؟“ وہ بھری ہوئی شیرنی کی طرح کڑے تیور لیے سوال کر رہی تھی۔

”خود سے پوچھو، کیا کمی ہے تم میں جو میرے انکار کی وجہ بنتی۔“ وہ جواباً لحاظ کیے بنا تندر لہجے میں بولا۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی تھی پھر ایک وحشت کے سے عالم میں اسے پیچھے کی جانب دھکا دیتے ہوئے غرائی۔

”ایک بات یاد رکھنا ہارون! مجھے ہر قیمت پر تمہیں حاصل کرنا ہے۔“ وہ گویا اسے دھکا کر رہا ہے۔ گئی۔ ہارون لب بٹھپے کھڑا تھا۔



نیاز فجر کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر سے ستر میں بیٹھی گئی تھی۔ سردیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ ان کے گھر میں یوں بھی موسم اپنی پوری شدت کا احساس بخشتے تھے۔

تو دھوپ کی پہلی کرن جیسے ان ہی کے آئی اور آخری شعاع تک رہتی رہتی تھی۔ دھوپ اسی قدر بے اعتنائی برتا کرتی۔ چھوٹا اور برآمدہ کمرے، کچن، باتھ روم۔ یہ تھی جس میں وہ بہت مطمئن اور خوش باش خرابی تو اس ایزی کے بچے نے پیدا کر کے جب سے یونیورسٹی میں اینڈیشن ہوا تھا اور تفکرات نے جیسے اس کے دل و ذہن کو تھکا۔ اتنی ناز با حرکت کی تھی کہ وہ غصے میں تازہ بھی تھی۔ وہ ڈر کر گھر بیٹھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ یہ راجیہ کے منع کرنے کے باوجود بھی وہ یہی چلی آتی تھی۔

”میں نے کہا بھی تھا چند دن مت آنا، معاملے کو دیکھنے دیتیں۔“ اس نے ٹوک دیا۔ ”میں نہ بزدل ہوں اور نہ پلیر ایسا سبق مت پڑھاؤ مجھے۔“

ت جانے کیوں رابعہ پر بھی غصہ آگیا تھا اور رابعہ کے ہنسنے پر جھک گئی تھی۔ سارا دن راجیہ گزرتا تھا وہ کہیں نظر نہیں آیا اور جب وہ لہجہ کیٹ سے نکل کر اپنے پوائنٹ کے انتظار میں بیٹھی تھی تو وہ اچانک جانے کہاں سے آن دھمکا

ہائے مجھ سے دوستی کر لو۔ فائدے میں رہو گی اور نہ نقصان کی ذمہ دار تم خود ہو گی۔“ اس نے بہت عجیب سی نظروں سے اسے دیکھ کر کہا۔ حوری چھوڑ دی تھی۔ حوری نے کہا جانے والی ہے اسے دیکھا اور نفرت سے منہ پھیر لیا۔

”کب ہے تمہیں آسان زبان سمجھ میں نہیں آتی؟“ وہ جب دھب کرتا گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔ ”یاب تھکنے سے آگے بڑھی تھی۔“

”میں نے کہا تھا نا کہ۔“ اسے گایہ؟“ وہ رابعہ کی بات کاٹ کر چیخی۔ راجیہ نے جواباً ”سنجیدہ نگاہ اس کے سرخ ہونے والی اور دو سری تماشا دیکھنے والوں پر۔“

”عورت کے پاس اس کی سب سے قیمتی چیز اس کی عزت ہوا کرتی ہے، وہ جس حد تک گھٹیا ہے اس سے کچھ بعید نہیں کہ وہ۔“ اور حوریہ پوری جان سے کانپ گئی تھی۔ غم و غصے کی زیادتی نے اسے یہ کیوں بھلا دیا تھا کہ وہ ایک لڑکی ہے۔ کمزور، بے بس اور۔



”پلیز بائیبل کاپیئر کر لیں۔“ اس نے اپنے دھیان میں مطلوبہ اشیاء جو اس نے یہاں سے خریدی تھیں، کاؤنٹر پر ڈھیر کر کے جیسے ہی سروا نچا کیا اس کا دل جیسے پوری قوت سے سکڑ کر پھیلا اور بے تحاشا دھڑکتا چلا گیا۔ وہی تھا جو پہلی ملاقات میں ہی اس کا چین سکون چھین کر لے گیا تھا۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ وہ اسے یہاں ایک سیلزمن کی حیثیت سے مل جائے گا۔

”آپ یہاں ہوتے ہیں بہت اچھا لگا آپ کو یہاں دیکھ کر۔“ اس نے خوشی سے چھلکتی آواز میں بہت جذب سے کہا تھا۔ اس نے کچھ چونک کر جذبات کی شدتوں سے گلزار ہوتا چہرے لے کھڑی اسوہ کو کچھ خیر سے دیکھا۔ اس نگاہ کی اجنبیت اور تحیر اسوہ کے جوش و خروش اور خوشی پہ اوس ڈال گئی۔ وہ ایک پل کو بالکل چپ سی ہوئی تھی۔

”یہ آپ کا بل ہے۔ بے منٹ وہاں کریں۔“ اس نے داہنی جانب کاؤنٹر پر اشارہ کر کے گویا رہنمائی کی۔ اسوہ سلگ کر رہ گئی۔ ”او نہ! ایک معمولی سیلزمن ہو کر یہ نخرہ۔“ اس نے ناک چڑھائی اور اشیاء کا شمار اور بل اٹھا کر پلٹی۔

”معا“ کچھ خیال آنے پر گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ ”سنو، صرف اچھی صورت براتی بے نیازی کچھ چھٹی نہیں اور کچھ نہیں تو کم از کم کوئی عزت والا کام تو کرتے۔ یہاں تو ذرا سی لغزش پر اوٹر تمہیں دو منٹ میں بے عزت کر کے رکھ دیتا ہو گا۔“ وہ اپنی انا کو طنز کے پردے میں لپیٹ کر نظر انداز ہونے کا بدلہ چکا رہی تھی مگر اس نے دیکھا۔ اس کی اتنی سخت بات کے باوجود بھی

اس کے وجہ مردانہ چہرے پر نہ تو کوئی خجالت بھری ہے نہ ہی کسی قسم کی کوئی بسکی بلکہ وہ بہت مطمئن انداز میں اگلے کسٹمر کی سمت متوجہ ہو گیا تھا۔ اسوہ پیر چنتی ہوئی وہاں سے نکلے۔



ہارون کی اضطرابی کیفیت میں بجائے کسی آنے کے اضافہ ہی ہوا تھا۔ اماں سے کل اس کی حتمی بات ہوئی تھی کیونکہ کل ہی ماموں نے ان سے ضویا کی شادی کی تاریخ پکی کرنے کی بات کی تھی۔ وہ جانے کیوں شادی کی اتنی جلدی مچا رہے تھے۔ ہارون کو تو ایسا ہی لگنے لگا تھا جیسے انہیں ضویا کی غلط کپنی کا علم ہو گیا ہے۔ ساتھ ساتھ اس کی بے باکی کا بھی جب ہی تو وہ اپنی ذمہ داری اس کے سر ڈال کر خود بری الذمہ ہونا چاہتے تھے اور یہی بات ہارون کو ناؤ دلاری تھی اور اسی ناؤ میں جب اس نے اماں سے حتمی انکار کیا تو اماں ایک حد تک اسے سمجھانے کے بعد اب روٹھ کر اپنی سہیلی کے ہاں چلی گئی تھیں۔ دو دن ہو گئے تھے انہیں گئے اور اس ذہنی الجھن نے اسے بخار میں مبتلا کر دیا تھا۔ بھوک کی وجہ سے چڑچڑاہٹ میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ نقاہت سی طاری ہو چکی تھی جب ہی وہ بستر لیٹتے ہی غافل سا ہو گیا۔

اسے یونہی بے سدھ پڑے جانے کتنی دیر گزر چکی تھی جب ہلکی سی آہٹ کے ساتھ ضویا بہت محتاط سے انداز میں اندر داخل ہوئی۔ ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں چائے کے ساتھ کچھ اسٹیکس بھی تھے اس نے ٹرے ٹیبل پر رکھتے ہوئے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

وہ ذرا سا آگے بڑھی اور اس پر جھک کر کاندھے کو پکڑ کر ہلکا سا جھنجھوڑا۔

”ہارون! وہ خاموش رہی۔“ ہارون! اس نے اب کی مرتبہ اس کی صبح کشادہ پیشانی پر بکھرے بالوں کو سمیٹا۔ ہارون نے نقاہت زدہ سے انداز میں بو جھل پلکیں اٹھائی تھیں۔ جلتی ہوئی سرخ انگارہ آنکھوں

میں اس وقت کیا تھا ضویا قطعاً نہ سمجھی۔
”کچھ کھا لو ہارون! مجھے پتہ ہے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔“ اس کے لہجے میں ملائمت، نرمی اور محبت سب کچھ تھا۔ ہارون نے جواب نہیں دیا۔ اس کا سلگتا ہوا ذہن دھوپوں سے بھرنے لگا۔ یہ وہی وہ خود تو جس سے اسے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ یہ وہ خود تو جس نے بہت سے مقامات پر اس کی توہین کے لیے خوشی محسوس کی تھی اور اب اس کی سب سے قیمتی متاع اس کی ماں تک چھین لی تھی۔ وہ اپنے بیٹے پر اسے ترجیح دے کر چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

”ہارون! اٹھو نا۔“ وہ ایک بار پھر پکار رہی تھی۔ ہارون کی پیشانی پر دیکھتے ہی سلو میں نمایاں ہوئی تھیں۔ آنکھوں سے بھی بلا کی وحشت جھلکنے لگی۔ ضویا نے اس کی نگاہوں کی وحشت سے خوف زدہ ہوا کر پیچھے ہٹ جانا چاہا تھا کہ عین اسی بل ہارون نے بجلی کی سی تیزی سے بازو دوپچتے ہی ایک جھٹکے سمیت اپنی جانب کھینچ لیا تھا۔ ضویا اس اچانک حملے کے لیے قطعاً تیار نہیں تھی۔ اس قدر بدحواس ہوئی کہ حلق سے آواز نہ نکل سکی۔

”بہت پسند ہوں میں تمہیں؟“ اس کے حلق سے غراہٹ نما آواز نکلی تھی۔ ضویا کا دل دھڑکنے لگا۔ ہارون کے چہرے اور آنکھوں میں ایسی وحشت لڈائی تھی جو کسی بھی انسان کو حیوان بنانے میں ایک پل نہیں لگاتی۔ ضویا بھی اس پل اس کی حیوانیت کی ہی بھیشت چڑھ گئی تھی۔



کالج میں الوداعی پارٹی تھی۔ وہ سب جوش و خروش سے پروگرام بنا رہی تھیں۔ حور یہ بھی رابعہ کے ساتھ اس دن اپنے جانے والے لباس کو ڈمکیس کرتی ان وقت بہت خوشگوار موڈ میں نظر آرہی تھی جب اس بھاری بھر کم گونج دار آواز پر اپنی جگہ سے اچھل گئی۔ پلٹ کر دیکھنے کی نوبت نہیں آئی وہ خود سانسے آیا تھا۔ لبوں پر محفوظ ہوتی اور مخالف کو زچ کرتی ہوئی

علاہت تو آنکھوں سے ٹپک رہی جنوں خیزی جو کو خوفزدہ کر دیا کرتی تھی۔ حور یہ کے چہرے پر ہنس اڑنے لگیں۔ اچھے کے لیے رابعہ کو اشارہ کیا۔ جیسے ہی آگے بڑھی، ایزی نے لپک کر اس کا ہاتھ روک لیا۔

”تمہاری عزت کی پروا ہے جان من! جب ہی تمہیں دوستوں کے بغیر آیا ہوں۔ بتاؤ کیا فیصلہ کیا؟“ وہ رابعہ سے انداز میں بالوں میں ہاتھ پھیرتا اپنی آنکھوں سے گویا اس کے وجود کا پوسٹ مارٹم کر رہا تھا۔

”جسم میں لڑکوں سے دوستی کی قائل نہیں ہوں، میں آخر میں ہی کیوں نظر آتی ہوں۔“ اس کے خوف پر غصہ اور جھنجھلاہٹ غلبہ پانے لگی۔

”اوہ آئی سی۔“ ایزی نے ہونٹ سکوز کر تمسخرانہ نظر اس پر ڈالی پھر بڑی آواز سے اس کی جانب جھک کر بولا۔

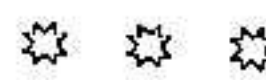
”صحیح کہتی ہو۔ حسین لڑکیوں کی تو مجھے واقعی کمی ہے۔ البتہ یہ تمہارے مجھ سے پزنگ لینے کی سزا ہے۔“

سگریٹ نکال کر سلگانے کے بعد اس نے گمراہش باہتھا۔ حور یہ کتر کر نکلنے لگی تھی کہ ایزی نے اب کی مرتبہ اس کی کلائی اپنے فولادی ہاتھ میں جکڑ لی تھی اور ٹیپ سا جھٹکا دے کر اسے اپنے مقابل کھینچ لیا۔

حور یہ کی کلائی پر جیسے الاؤ دیک اٹھے۔ خفت بے بسی اور شدید اشتعال نے اس کی آنکھوں میں دھند سی بھر دی۔

”تمہ میں تھوکتی ہوں تم پر“ سمجھے۔“ بھرپور مزاحمت کرتے ہوئے وہ غرائی۔
”سنو احمق لڑکی! تم مجھ سے کبھی بھی اپنا آپ نہیں چھڑا سکتیں۔ یاد رکھنا اس بات کو۔“ اس کا ہاتھ تھوڑتے ہوئے وہ عادت کے مطابق دھمکی دے کر پلٹ گیا۔ حور یہ لی آنکھوں میں ٹھہری دھند نے پانی کی شکل اختیار کر لی اور ٹپ ٹپ بے بسی کے آنسو بننے لگے۔ رابعہ نے ٹھنڈی سانس بھری پھر سر جھٹک کر کمرے سے اے نکلنے لگی۔
”سنو! کب تک اسے یہ تماشا کرنے دوگی۔ کسی

سے تو اس کی شکایت کرو۔“
”وہ بہت غلط آدمی ہے رابی! میں کچھ بھی نہیں کر سکتی۔“ اسے اپنی کمزوری کا احساس دلا رہا تھا۔ رابعہ بس اسے خاموشی سے دیکھتی رہی تھی۔



روشن دامن سے چھن چھن کر آتی سورج کی تیز شعاعیں براہ راست اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں وہ آنکھیں کھولے چھت کو گھور رہا تھا۔ ایسا کیا تھا ان لمحوں میں کہ وہ اس حد تک گر گیا۔ احساس گناہ اسے رات سے اب تک جانے کتنی بار ازیت انگیز موت مار چکا تھا۔ انتقام تھا نفرت یا پھر وحشت کی انتہا کہ وہ جو اس گنوا گیا تھا اور اب ایسی ندامت تھی ایسی پشیمانی تھی کہ وہ اندر ہی اندر کٹ رہا تھا تب ہی کمرے کے باہر خدیجہ بیگم کے قدموں کی مخصوص آہٹ ابھری اور اگلے ہی لمحے وہ اندر چلی آئیں۔

”ہارون! انہوں نے اسے ساکت اور گم صمپا کر بے اختیار پکارا۔“

”ہارون! کیا ہو گیا ہے؟“ خدیجہ بیگم اس کی اداسی کو پاکے تڑپ سی گئیں۔

”ہارون! انہوں نے بڑھ کر اس کا سر سہلایا۔ خطرناک حد تک زرد پڑتی رنگت اور آنکھوں کے نیچے موجود حلقے۔ وہ تو اس کی حالت دیکھ کر بے قرار سی ہو گئیں۔“

”خفا ہواں سے۔“ وہ ذرا سا مسکرائیں۔ ہارون نے اسی پل انہیں دیکھا تھا۔

”اف۔“ ان کا دل کانپ سا گیا۔
”ہارون! میرے نیچے! کیوں رریا تو۔ ہاں ماں صدقے۔ کوئی خفا ہوتا ہے تو ہوتا ہے مجھے نہیں پروا۔ میں تو تیری پسند کی ہی لڑکی کو اپنی بہو بناؤں گی۔“ وہ اس کا ہاتھ چومتے ہوئے بے اختیار ہوئیں تو ہارون نے بے اختیار سختی سے لب جھینچے تھے اتنی سختی سے کہ لبو کا زائقہ اس کے منہ میں گھلنے لگا۔ وہ بے اختیار چیخا۔

”مت کچھ کہیں اماں! چپ ہو جائیں۔ مجھے کچھ نہیں سنتا۔“

”کیوں۔۔۔ کیوں نہیں سنتا تو نے۔ ارے میں کہہ دوں گی بھائی سے مجھے اپنے بیٹے سے بڑھ کر کچھ نہیں کچھ نہیں۔“

”جب مجھ سے بڑھ کر کچھ نہیں تھا اماں! تو پھر مجھے چھوڑ کر کیوں چلی گئی تھیں۔ کیوں مجھے اکیلا کر دیا تھا!“

وہ کسی ننھے بچے کی طرح ہی ان کی آغوش میں منہ چھپا کر رویا تھا۔ اس وحشت سے کہ اماں کے ہاتھ پیر پھول گئے تھے۔

”ک۔۔۔ کیا۔۔۔ ہوا۔۔۔؟“ کسی انہونی کا احساس انہیں سہانے لگا۔

”نسب کچھ ہی تو غلط ہو گیا اماں! کچھ بھی صحیح نہیں رہا۔“ وہ یونہی گھٹ گھٹ کر بے ربط دہرایا۔ خاصی دیر بعد وہ خود ہی سنبھلا تھا اور تکیے میں منہ چھپا کر ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں۔

”دکتنی خوبصورت ہیں یہ۔۔۔ ہے نا؟“ حوریہ نے بے انتہا دلچسپی اور شوق کے عالم میں سامنے موجود وی آئی پی مہمان کی حیثیت سے براجمان ملک کی مشہور و معروف ناول نگار مسز ایف ایم چوہدری کو دیکھتے ہوئے رابعہ کی رائے لینا چاہی۔

”ہاں بلاشبہ۔“ رابعہ نے پوری شدود سے سر ہلا کر تائید کی۔ وہ خود بھی لکھتی تھی اور ایک ماہنامہ میں اس کی تحریریں شائع بھی ہوتی تھیں۔

سالانہ تقریبات میں جہاں اور بہت سے اہتمام ہوتے تھے وہاں شعری مقابلے کا بھی انعقاد ہوا تھا سچ کی حیثیت سے شاعرہ اور انسانہ نگار مسز ایف ایم چوہدری کو بلوایا گیا تھا، چونہ صرف نوجوان نسل کی بلکہ ہر عمر کے لوگوں کی پسندیدہ ترین ادیبہ تھیں۔ یونیورسٹی کے طالبات کا جوش و خروش دیکھنے کے لائق تھا۔ رابعہ اور حوریہ بھی بے حد مشتاق تھیں اور اب انہیں روبرو پا کے تو گویا وہ مبسوت رہ گئی تھیں۔ فیوزی ساڑھی

جس کے بارڈر پر میٹل کا انتہائی دیدہ زیب کام جھلملا رہا تھا۔ بالوں کا سادہ جوڑا اور فریش خوب صورت چہرہ۔ انہیں اس عمر میں باوقار جاذب نظر اور بے انتہا دلکش دکھلا رہا تھا۔

تقریب کے اختتام پر رابعہ اسے زبردستی کھینچ کر ساتھ لے گئی تھی۔

”ہائے میم۔ ہاؤ آریو۔“ رابعہ کا اعتماد قابل دید تھا۔ مسز چوہدری جو لڑکیوں کو آؤگراف دے رہی تھیں ڈرا کی ذرا متوجہ ہوئیں اور ایک حوصلہ افزا مسکراہٹ سے نوازا۔

”آپ کو آؤگراف لینا ہے؟“ لڑکیوں سے پینٹ کر وہ ان کی سمت متوجہ ہوئی تھیں۔

”تو میم۔۔۔ مجھے تو آپ سے اصلاح لینا ہے۔ اچھوٹکی میں رائٹر ہوں، نو آموز رائٹر۔ کیا آپ میری۔۔۔“

”وائے ناٹ، آپ آئیں۔ مجھے خوشی ہوگی۔“ انہوں نے اس کی بات کاٹ کر اپنا وزینگ کارڈ بیگ سے نکال کر رابعہ کی سمت بڑھایا اور چیئر مین کی طرف بڑھ گئیں۔

”ہائے کتنا یونیک سا ہے؟“ حوریہ نے اشتیاق سے کہا۔

”ہوں مگر ان کا بیٹا تو بالکل یونیک نہیں ہے، ہر لحاظ سے الٹ۔ جانے کس پر پڑا ہے۔“ رابعہ نے منہ بتایا۔

”تم ان کے بیٹے کو کیسے جانتی ہو؟“ حوریہ ابھی تک کارڈ کو دیکھ رہی تھی۔

”پہلے نہیں جانتی تھی، آج پتا چلا ہے۔ ایزی ان کا بیٹا ہے۔“

”وائے۔“ حوریہ کو گویا کرنٹ لگا تھا۔ کارڈ کی انگلیوں کی گرفت سے پھسل کر زمین پر جا گرا۔

بہت دنوں کے بعد دھوپ نکلی تھی اور بہت دنوں کے بعد ہی وہ اپنے کمرے سے باہر آیا تھا۔ خدیجہ بیگم

جن میں پچھی چار پائی پر بیٹھی عینک لگائے سبزی بنانے میں مشغول تھیں۔ اسے دکھا تو مسکرائیں۔

”میں آجاؤ دھوپ میں۔“ خدیجہ بیگم نے اس کے لیے اپنے برابر جگہ بنائی۔ ہارون کے چہرے پر کھڑکی زردی اور اضمحلال کچھ اور گہرا ہو گیا۔ یہ ان کی زندگی کی محبت اور شفقت سب اس کے لیے ہے۔ انہیں پتہ چل جائے میں کیا کر چکا ہوں، تب بھی یہ

اس نے بے ساختہ جھرجھری لی اور آنکھیں سختی سے میچ لیں۔ انہیں نہ بھی پتہ چلے، تب بھی خدا تو جانتا ہے کہ میں کتنا تھوڑا چکا ہوں گندی میں۔

”ہائی گڈ نیس، یہ کیا کر دیا میں نے۔“

اس نے مٹھی میں پیشانی کے بال جکڑ کر جھٹکا دیا۔

”ہارون! کیا ہوا بیٹے، کیا سر میں بہت زردی ہے؟“ خدیجہ بیگم سے اس کی یہ حرکت چھپی نہ رہی تھی۔ سو خوش فطری تھی۔ ہارون کے جڑے کھینچ گئے۔

”اماں! وہ کراہا تھا۔“

”ہاں! اماں کے چاند! مجھے بتاؤ ایسا کیا ہوا میرے بچے کہ تجھے تو چپ ہی لگ گئی۔ نہ ڈیوٹی نہ جاتے ہوئے، وہ تو خیر ٹھیک ہو کر چلے جاؤ گا مگر یوں کم قسم کیوں ہو گئے ہو؟“ انہوں نے دہائی دینے کے انداز میں کہنا شروع کیا جبکہ ہارون ایک بار پھر مل صراط پر آ گیا تھا۔

”مجھے اس لڑکی کا پتہ دو، میں رشتہ ڈال آتی ہوں۔“

وہ انہوں نے پیار سے کہتے ہوئے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

ہارون کا دل اداسی میں ڈوب گیا۔ ”اماں! اس لڑکی کی شادی ہو گئی ہے، اب وہ مجھے نہیں مل سکتی۔“

”انس۔ ایک جھوٹ کو چھپانے کو کتنے جھوٹ ہوں گے۔“ اس کے ضمیر نے ملامت کی تھی۔ اماں

داس سی ہو کر اسے دیکھنے لگیں، پھر گہرا سانس کھینچا۔

وہ تو اس لیے تو اداس ہو رہا ہے۔ وہ معصوم ساہ عورت اس نتیجے پر پہنچیں۔ ہارون نے جھکا سر نہیں اٹھایا۔

”اماں!“ وہ خاصی دیر بعد بولا۔ ”آپ ضویا کے

لیے ماموں کو ہاں کہہ دیں اور تاریخ کوئی نزدیک کی رکھیے گا۔“ وہ اٹھا اور قدم گھسیٹتا ہوا باہر نکل گیا۔ خدیجہ بیگم حیران سی اس کے اچھے رویے کو سوچنے لگیں۔

وڈا اسکرین پر شفاف بوندوں کا رقص جاری تھا۔ وہ بہت لمبن انداز میں گاڑی ڈرائیو کرتے زیر لب گنگنا رہی تھی، جب کوئی شخص اس کی گاڑی کے نیچے آتے آتے پچھا۔ اگر وہ بروقت بریک نہ لگا دیتی تو جانے کیا ہو جاتا۔ دروازہ کھول کر وہ تیزی سے باہر نکلی اور لپک کر اس شخص کے پاس آئی جو خود بھی اسی کی طرح اس دھچکے سے بمشکل سنبھلا۔ ابھی اسی تشکر و ممنونیت کی کیفیت سے باہر نہیں نکلا تھا۔

”آہم۔۔۔ آئی ہیٹلپ یو؟“ تیزی سے برستی بارش کی بو چھاڑ میں بھیلتا وہ پچاس سے پچپن سالہ انتہائی گریس فل اور شاندار قسم کی شخصیت کا مالک ایسا شخص تھا، جسے دیکھ کر بندہ خواجواہ مرعوب ہو جائے۔ اس آواز پر وہ چونکا تھا اور کچھ تھیر آمیز حیرانی سے اسے دیکھا۔

”تو تھینکس۔“ اور قدم بڑھا دیے۔

اسوہ کچھ خفیف سی ہو گئی۔

”آئی ایم سوری سر! غلطی میری ہی تھی، لیکن میں۔۔۔“

وہ بھاگ کر اس کے مقابل آئی تھی اور ساتھ چلتے ہوئے وضاحتی انداز میں بولی۔

”اس آل رائٹ۔ ڈونٹ مائنڈ۔۔۔“ وہ ذرا سا مسکرایا۔

نہ جانے کیوں اسوہ کو اس سے کچھ عجیب سی اپنائیت کا احساس ہو رہا تھا۔

”سر! اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔ آئی مین، بارش ہو رہی ہے اور آپ پیدل۔ پتہ نہیں کتنی دور گھر ہے آپ کا۔“

اسوہ نے کھسیا کر کہا۔

ممائی جان نے دلن بنی سپاٹ چہرے لیے بیٹھی ضویا کو دیکھ کر اپنی بھڑاس نکالنا چاہی تھی۔ ضویا نے ایک خاموش نظران پر ڈالی تھی اور سر جھکا لیا تھا۔ اس طرح گم صم ویران اور بھی ہوئی تو وہ پچھلے ڈیزھ مینے سے تھی۔ وہ ماں ہو کر بھی اس تبدیلی کو محسوس نہ کر سکی تھیں تو پھر اس نے لب بھینچ کر آنکھوں کی نمی کو باہر آنے سے روکا۔ نکاح ہوا، ایجاب و قبول کے مراحل طے ہوئے۔ وہ اپنے وجود کو کسی گلیشیر میں ڈھلتے محسوس کر رہی تھی۔ وہ محبت وہ چاہت وہ خوشی جانے کہاں کھو گئی تھی وہ نہیں جانتی تھی۔ رخصتی ہوئی اور وہ اس گھر کے ان مکینوں میں آگئی جن سے کبھی وہ بالکل لاتعلق رہی تھی اور نفرت رکھتی تھی ان سے اور پھر دل کے موسموں میں تغیر آیا اور یہی مکین اسے خود سے بھی عزیز ہو گئے اور اب اسے لگ رہا تھا جیسے وہ ایک بار پھر واپس عمر کے اسی حصے میں آگئی ہے جب اسے ان مکینوں سے نفرت، بغض اور کینہ محسوس ہوا کرتا تھا۔ ہارون کا اضطراب بھی بڑھ گیا۔

رات نصف سے زیادہ بیت چلی تھی اور آخر نومبر کی یہ قدرے خنک رات تھی۔ چاند کا سفر کب سے جاری تھا۔ جاڑے کا چاند کمر میں لینا کسی قدر تھکا ماندہ اور ملول نظر آ رہا تھا مگر ہارون اسرار کے اضمحلال اور تھکان سے زیادہ ہرگز نہیں، خود سے بھی غافل کھڑا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ اس کی سحر طراز بولتی آنکھیں کسی قبرستان کی مانند ویران خاموش اور سرستہ راز کی طرح تھیں۔ خود سے لاتعلقی کا یہ عالم تھا کہ ہونٹوں کے درمیان دبا سگریٹ سلگ سلگ کر لبوں کے کنارے کو جھلسانے لگا۔ تپش کا احساس پا کر ہی وہ قدرے چونکا اور سگریٹ لبوں سے نکال کر پھینکتے ہوئے جوتے سے مسل دیا اور ہاتھ میں پکڑے، اس مٹھلیس کیس کو دیکھا جو کچھ دیر قبل ہی ماں اسے دے گئی تھیں۔

اب جاؤ اپنے کمرے میں، بیٹی کو کیوں انتظار میں

بٹھایا ہوا ہے۔

انہوں نے جاتے جاتے تاکیدی تھی اور وہ ہر سانس کھینچ کر سوچنے لگا تھا۔ کیا واقعی وہ اب بھی اس کی منتظر ہوگی اور دل تسمخرانہ ہنسی ہنسنے لگا تھا۔ اپنے کمرے کی جانب جاتے اس کے قدم من من بھرتے ہوئے لگے۔ جی چاہا، یہیں سے پلٹ کر ایسی جگہ بھاگ جائے جہاں ضویا ہو نہ اس سے وابستہ احساس گناہ مگر ابدل کی ہانے کا وقت گزر چکا تھا۔

دروازہ کھول کر وہ جس بل اندر داخل ہوا اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ نہ انداز میں کوئی سرمستی نہ نگاہ میں بے قراری۔ اس کا ہر انداز بہت بجا ہوا تھا، وہ یونہی چلتا ہوا آکر صوفے پر بیٹھ گیا۔

ضویا دلہنپے کے تمام لوازمات سے عاری بالکل ساہ لباس میں دھلے دھلائے چہرے سمیت بیڈ پر بیٹھی تھی۔ کھلے ہوئے بالوں نے پوری پشت کو ڈھانپ رکھا تھا۔ صبح کی یاسیت اور بے گلی کا اب نام و نشان بھی نہیں تھا۔

”یہ ماں نے دیا تھا۔“ ہارون نے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالے بغیر کیس اس کے پہلو میں رکھنا چاہا، جب وہ رکھائی سے کہتی اسے ٹوک گئی تھی۔

”مجھے اس کی ضرورت نہیں بلکہ مجھے کسی بھی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔“

ہارون نے ٹھنڈا سانس بھرا اور ایک خجالت سے بھرپور نگاہ اس کے تنے ہوئے نقوش پر ڈالتے ہوئے کیس اس کی گود میں رکھنا چاہا تھا، جب وہ بدک کر اچھل کر دور ہوئی تھی۔

”ڈونٹ ٹیچ می“ انڈر اسٹینڈ۔ ”ابانت آمیز لہجہ حقارت لیے ہوئے تھا۔ ہارون کا سرخ و سفید چہرہ آن کی آن میں متغیر ہوا تھا۔ بے بسی کا اظہار اس کے ہر نقش سے چھلکا تھا۔ کچھ دیر وہ لب بھینچنے خود پر ضبط کرنا رہا، اس کے باوجود جب کچھ دیر بعد بولا تو آواز میں لرزش کے ساتھ نمی بھی واضح محسوس ہوئی تھی۔

”مجرم ہوں تمہارا، جو غلطی ہوئی ہے اس کی تلافی کو ممکن نہیں مگر ضویا! میں تمہیں خوش رکھوں گا۔ بس

دل جاؤ اس بات کو اور مجھے معاف۔۔۔۔۔“

معاف کروں تمہیں اور بھول جاؤں، یہ اتنا نہیں ہے مسٹر! وہ چھپتی ہوئی نظروں سے گھورتی حلق کے بل غرائی تو ہارون اس کی آواز بندالیوم سے گھبرا کر اسے دیکھنے لگا۔

ہستہ، پلیر ماں نے سن لیا تو۔۔۔؟“

”ضویا! پلیز۔۔۔ دیکھو، میں شرمندہ ہوں۔ اس شب کے بعد سے آئینے میں نگاہ ملا کر خود کو نہیں دیکھ سکا۔

”آئی ہیٹ یو۔ تم سسک سسک کر بھی مر جاؤ، میرے سامنے تو میں تمہیں معاف نہیں کروں گی سنا تم

وہ ہسٹریک ہو کر چلائی۔ ہارون اس کا یہ تحقیر آمیز انداز دیکھتا رہا، جبکہ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ گئی تھی۔

حوریہ نے لب بھینچ کر خود پر ضبط کے کڑے پہرے بٹھائے تھے اور جھکا سر کچھ مزید جھکا کے آگے برہنا چاہا تو ایزی جو سیرٹھیوں پر ٹانگیں پھارے بہت ریلیکس انداز میں بیٹھا نظروں کو اس پر فوکس کیے ہوئے تھا۔ ایک جھٹکے سے اٹھ کر اس کے مقابل آتے ہوئے راستہ روک لیا۔

”سنو! تم اس قدر مغرور اور بد تمیز خود سر کیوں ہو؟“ اس کی پیشانی پر موجود سلوٹوں کو محفوظ رکھنا بہت سے تلتے ہوئے وہ بہت دوستانہ سے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

”خود سری بد تمیزی اور نخوت تم جیسے ایڈیٹ اور ارباش لڑکوں کو ان کے مقام پر رکھنے کے لیے ہے۔“

اس کا ضبط چھلکا اور وہ پھٹ پڑی تھی۔ ”یہ رکھ لو، نیا ماڈل ہے۔ رات کو بات کیا کروں گا تم سے۔“ اس نے سنی آن سنی کرتے ہوئے سلور گرے چھماتا ہوا موبائل فون اس کی سمت بڑھایا۔ حوریہ اس درجہ ڈھٹائی پر آگ بگولا ہو گئی۔ اس نے وہ سیل فون اس سے تقریباً ”جھپٹا اور طیش کے عالم میں اس کے منہ پر دے مارا تھا۔ ”میں لعنت بھیجتی ہوں تم پر اور اس موبائل فون پر بھی۔ چھوڑ دو میری جان اور نہ میں اب تمہاری ماں سے تمہیں سیدھا کرواؤں گی۔“

ماں کا نام سن کر ایزی آتش فشاں بن گیا۔ ”سنو، یہ خیر سگالی کی آخری کوشش تھی جو تم نے ٹھکرائی ہے۔ اب ذرا سنبھل کر رہنا، اس لیے کہ ایزی معاف کرنے والوں میں سے ہرگز نہیں ہے۔“

بھاگنے کے انداز میں وہاں سے آگے بڑھی تھی، جب ایزی نے لٹکار کر بہت سرو لہجے میں وارننگ دی تھی۔

فل یونیفارم میں وہ پولیس اسٹیشن جانے کو بالکل تیار تھا۔ بانیگ کی چابی اٹھا کر جیب میں رکھتے ہوئے اس کے انداز سے ٹھٹھکن اور چہرے سے اضطراب چھٹک رہا تھا۔ ضویا نے ایک نظر اسے دیکھا اور منہ پھیر لیا، وہ آج بھی اتنا ہی امپریسو اور گریس فل تھا جس اس کے دل نے دھڑکتوں کے انداز بدل لیے تھے۔ نگاہوں میں وہ رنگ نہیں رہے تھے۔

”ضویا! آج شام میں تیار رہنا۔ ماں کہہ رہی تھی تمہیں کہیں گھمانے کو لے جاؤں۔“

بہت محتاط سے لہجے میں کسی قدر جھجک تھی، انجانا سا خوف۔ ضویا نے تلخی سے اسے دیکھا اور ترخ کر بولی۔

”مجھے کہیں نہیں جانا۔“

”مگر ماں۔۔۔“

”تم ان سے بھی یہی کہہ دینا۔“ وہ گستاخانہ انداز میں چیخی تو ہارون خاموش سا ہو گیا۔

”میں ان سے یہ نہیں کہہ سکتا۔ وہ پریشان ہوں گی“ وجہ پوچھیں گی۔ ”وہ جیسے لاجپاسا ہورہا تھا۔“
 ”تو وجہ بتا دینا۔“ اس نے ہٹ دھرمی سے کہا اور سر تک کبل تک لیا۔ ہارون لب بھیجے کھڑا پھر تھکے ہوئے انداز میں باہر نکل گیا۔ اسے ضویا کی کسی بات پر غصہ نہیں آتا تھا۔ اسے غصہ آج بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ اسے اس رویہ میں حق بجانب سمجھ رہا تھا۔ وہ بے خوف ہو گئی تھی اس لیے کہ سارا خوف اس نے اپنے اندر بھر لیا تھا۔ وہ اسے طعنہ دیتی تھی۔ بلند آواز سے چیخ کر وہی بات کرتی تھی جسے وہ سرگوشی میں بھی سنتا نہیں چاہتا تھا اور پھر اس کے چہرے پہ بھری اذیت کو دیکھ کر طنزیہ ہنسی ہنستی تھی۔
 ”ڈرتے ہو اپنی ماں سے اپنا گناہ چھپانا چاہتے ہو“ حالانکہ ڈرتا تو تمہیں رب سے چاہیے تھا۔“
 اور تب اس نے بے تحاشا سرخ رت جگموں کی منظر آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔
 ”اللہ سے ہی تو ڈرتا ہوں“ تب ہی احساس ندامت اور گناہ کا احساس مجھے پل پل کچوکے لگا رہا ہے۔
 ضویا!
 اس کے لہجے سے اتنی یاسیت اتنی بے چارگی اور تھکن چھلکی تھی کہ ایک پل کو ضویا کا پتھر دل بھی موم ہونے لگا تھا۔
 ”میں تمہارے سامنے صفائی دینا نہیں چاہتا کہ میں ایسا نہیں ہوں۔ یہ ایک لمحے کی لغزش تھی۔ ایک ایسی بھول جو عمر بھر کے روگ کی صورت میرے گلے کا طوق بن چکی ہے۔ میری سانس میرے سینے میں اسی روز سے اٹکی ہے۔ میری روح میں اضمحلال ور آیا ہے، ضویا! یہ گناہ کا احساس ہے جو مجھے راتوں کو سونے نہیں دیتا۔ مجھے لگتا ہے ضویا! اگر تم مجھے معاف نہیں کرو گی تو میں یونہی گھٹ گھٹ کے مرجاؤں گا۔“
 وہ دھیمے لہجے میں کہتا مضطربانہ انداز میں دونوں ہاتھوں کو مسل رہا تھا۔ ضویا نے ایک نظر اس کی شکستگی اور در ماندگی کو دیکھا اور عجیب سے انداز میں ہنس پڑی۔
 ”تم اسی طرح جلتے رہو۔ میں تمہیں معاف نہیں

کروں گی۔“ وہ ہونٹ سکوڑ کر بولی تھی۔
 ہارون نے بری طرح سے چونک کر اسے دیکھا۔
 ”تم محبت کرتی تھیں مجھ سے ایسی بھیاں کسرا مت دو مجھے۔“
 ”میں تمہیں معاف کرنا تو دور کی بات ہارون! میں تمہیں یہ بھولنے بھی نہیں دوں گی۔“
 ہارون نے اس کی سفاکی کو محسوس کیا تھا اور یہ ایک اس کی مضطرب بے چین بھیگی آنکھوں میں وحشت سی در آئی تھی۔ اس نے جانی ہوئی ضویا کا بازو دلوچا تھا اور ایک جھٹکے سے اس کا رخ اپنی جانب پھیر کر منہ پہ ایک زنائے کا تھپڑ رسید کر دیا تھا۔
 ”کیوں نہیں بھولنے دو گی تم مجھے، کیوں معاف نہیں کرو گی، جبکہ تم اس گناہ میں میرے ساتھ شریک تھیں اس کا انداز وحشت بھرا تھا۔ ضویا کے حلق سے کھنسی کھنسی سی چیخ نکل گئی۔ اس نے اپنا آپ چھڑانا چاہا، مگر وہ تو جیسے اس پل حواسوں میں نہیں رہا تھا۔ اس کا چہرہ اپنے نولواوی ہاتھ میں جکڑ کر بھیجتا ہوا سرد غراہٹ زدہ لہجے میں چیخنے لگا تھا۔
 ”کیا اس رات تم جان بوجھ کر میرے کمرے میں نہیں آئی تھیں اور اس سے پہلے متعدد بار رات کی تنہائی میں ایک اکیلے جوان مرد کے پاس رشتے میں تمہارا محرم تھا کیا مرد اور عورت کی تنہائی میں شیطان ان کے درمیان آجاتا ہے پھر وہی ہوتا ہے جو اس رات ہوا“ پھر پھر یہ دلوچا کیوں؟ بولو میں اگر احساس جرم میں مبتلا ہو کر تم سے معافی مانگتا ہوں تو تم کس بنا پہ اکرلی ہو؟“
 وہ دلیانی انداز میں چلاتا، اس کے منہ پہ تپشوں کی برسات کر رہا تھا۔
 ”میں تو اس رات حواسوں میں نہیں تھا۔ تم تو نارمل تھیں، روک سکتی تھیں مجھے۔ کیوں نہیں روکتے بولو بولو، جواب دو۔“ اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ نور ضویا اٹھل پھٹل ہوتی سانسوں کو ہنپانے لگی، مگر تب اس کی بے ترتیب سانسیں جیسے ٹھننے لگی تھیں، جب اس نے دلیزیہ پھراتی ہوئی آنکھیں لیے کھڑی خدیجہ

کو تورا کر گرتے دیکھا۔ بے اختیار ہی اس کے من سے چیخ نکل گئی تھی۔
 * * *
 اس نے جھٹکے ہوئے روازے پر دستک دی۔ پھر اجازت ملنے پر اندر داخل ہو گئی۔
 ”السلام علیکم ہام!“ اس نے اسٹڈی ٹیبل پہ جھکی ہام سلام کیا۔
 ”ہوں و سلام کیسے آتا ہوا؟“ اس نے سر اٹھائے پھر اسی محویت کے عالم میں پوچھا۔
 ”وہ ہام! مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے“ ہاتھ ملتے ہوئے وہ خود میں ان کی متوقع ناراضی کو سننے کا حوصلہ پیدا کرنے لگی۔
 ”ہوں بولو۔“ وہ اب قلم رکھ کر اس کی سمت متوجہ ہو گئی۔
 ”ہام چتر کار والے ڈانس کلاسز کا آغاز کر رہے ہیں۔ مجھے ڈانس سیکھنے کا بہت شوق ہے۔ ہام پلیز۔“
 ”کانج میں تمہاری پوزیشن مزید ڈی گریڈ ہوئی ہے اور تمہیں ڈانس سیکھنے کی سوجھ رہی ہے، شیم فار یو۔“
 ”صرف پچاس ہزار روپے کی تو بات ہے ہام!“ اس نے ضد کی۔
 ”اوکے فائن سیکھ لو یہ ڈانس بھی، مگر اسٹڈی کا حرج نہیں ہو۔ یہ فور تھ ایر ہے۔ اس کے بعد میں تمہاری شادی کروں گی۔“
 ہام نے چیک کاٹ کر اسے تھماتے ہوئے اپنے ٹیبل سے بھی آگاہ کیا۔
 یہ اس سے اگلی شام کی بات تھی، جب وہ چتر کار ٹیبل میں اسی سلسلے میں آئی تھی، تب پارکنگ لاٹ میں گاڑی پارک کر کے مین گیٹ کی جانب بڑھتے ہوئے وہ اسے اچانک ہی راستے میں مل گیا تھا۔ اسے نہ کہہ کر چونکا، پھر ایک نظر چتر کار کے بورڈ پہ ڈال کر کچھ عجب سی نظروں سے اسے دیکھنے لگا تھا۔ اسوہ جو اسے مل گیا، اسے متوقع طور پہ سامنے باکر خوشگوار سی حیرت میں تھا اس کا یہ انداز نوٹ نہ کر سکی۔

”میں یہاں ڈانس کلاسز لینے آئی ہوں۔“ اس نے بتایا۔
 ”اوہ آئی سی۔“ معاذ نے لب بھیج کر سرد نظروں سے اسے دیکھا، پھر چند ثانیوں کے توقف کے بعد شہرے ہوئے لہجے میں بولا۔
 ”آپ چند لمحوں کے لیے وہاں بیٹھ کے میری بات سن سکتی ہیں۔“
 اس نے انگشت شہادت سے سامنے ریسٹورنٹ کی جانب اشارہ کیا تو اسوہ حیرت کی زیادتی سے مرنے والی ہو گئی۔
 ”سر کے بل جناب، مگر سوچ لیں اسکنڈل نہ بن جائے آپ کا۔“ پھر حیرت پہ قابو پا کر وہ شہر سے انداز میں بولی تو معاذ نے بہت سرد نظروں سے اسے دیکھا اور کچھ کے بغیر قدم بڑھا دیے۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے وہاں تک آئی تھی۔
 ”چائے نہیں پلو امیں گے؟“ بالوں میں جکڑا کپچر نکال کر پھر سے لگاتے ہوئے اس نے بڑی سرشاری سے کہا۔
 ”مگر میں کہوں، آپ یہ ڈانس کلاسز نہیں لیں گی تو؟“
 ”تو نہیں لوں گی۔“ اس کی ادھوری بات کو اس نے بہت سرعت سے مکمل کر دیا۔ اسے یہ سوچ ہی آسمان کی بلندیوں پہ اڑا رہی تھی کہ وہ ماؤنٹ ایورسٹ جیسا شخص اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔
 ”تو ٹھیک ہے مت لو، اوکے میں چلتا ہوں۔“ اس کا چہرہ بے تاثر اور سنجیدہ تھا۔
 اسوہ کا دل بچھ کر رہ گیا۔ ”ارے رے ایہ کیا بات ہوئی۔ آپ کو مجھے کم از کم یہ تو بتانا چاہیے کہ آپ نے مجھے یہ حکم کیوں دیا ہے؟“ وہ ذرا سا جھجھکیا۔ وہ اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گیا۔
 ”آپ کے اطمینان کے لیے کافی ہونا چاہیے کہ یہ ایک اچھی نصیحت تھی، جو میں نے آپ کو کی۔ یہ میرے بابا نے مجھے کی تھی۔“
 ”آپ بھی ڈانس کلاسز لے رہے تھے اس نے

معصومیت کا تاثر دیتے چوٹ کی۔ معاذ نے اس کی آنکھوں میں مچلتی شرارت کو سنجیدگی سے دیکھا اور جواب دیے بغیر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
”سینس معاذ!“ وہ بھاگ کر اس کے پیچھے آئی اور راستہ روک لیا۔

”آپ ہر بات مانتے ہیں اپنے بابا کی؟“ عجیب سا سوال تھا۔ معاذ نے سمجھے بغیر اثبات میں گردن ہلا دی۔
”اگر آپ کے بابا کہیں اس لڑکی یعنی مجھ سے شادی کر لو تو کر لو گے؟“ اس نے نچلے لب کا کونہ دانتوں تلے دبایا، معاذ نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

”میرے بابا میرے مزاج سے آگاہ ہیں۔ وہ ایک ایسی لڑکی سے مجھے ہرگز شادی کرنے کا نہیں کہیں گے جو مجھے پسند نہ ہو۔“
وہ اپنی بات کہہ کے رک نہیں تھا، جبکہ اسوہ کو لگا تھا۔ ریسٹورنٹ کی عمارت اس کے وجود کو اپنے طبع تلے دبا چکی ہے۔



خدیجہ بیگم اس حقیقت کی سفاکی کو سبہ نہیں پاتی تھیں۔ انہیں دل کا اتنا شدید دورہ پڑا تھا کہ وہ اسپتال جاتے راستے میں ہی دم توڑ گئی تھیں۔ ایک کے بعد دوسری قیامت ہارون اسرار کے سر پہ ٹوٹی تھی۔ ایک کے بعد وہ دوسرے گناہ کا مرتکب ہوا تھا۔ ایک مرتبہ پہلے اس نے ضبط اور حواس کھوئے تھے، تب بھی ناقابل تلافی نقصان حصے میں آیا تھا اور دوسری مرتبہ بھی وہ آپے سے باہر ہوا تھا تو جیسے طوفان سب کچھ ساتھ بہا کے لے گیا تھا۔ اضطراب اور وحشت کی کوئی حد نہیں تھی۔

سگریٹ پھونک کر، آنسو بہا کر اور مسلسل ٹہل کر وہ تھک گیا تو وضو کر کے کلاہ پاک پڑھنے لگا۔ تہجد پڑھی اور سجدے میں گر کر ضبط کو پار پارہ ہوتے دیکھنے لگا۔
”یا رب العالمین رحم فرما! مجھے معاف فرما دے۔ میرے مالک! مجھے معاف فرما دے میرے رب تو گواہ ہے تو بابتا ہے میں نے ایسا نہیں چاہا تھا۔ اس گناہ کا تو

تصور بھی میرے آس پاس نہیں تھا۔“

آہیں، سسکیاں اور گریہ و زاری ضویا کی آنکھ کھلی تھی۔ اسی نے ذرا سا اونچا ہو کر جائے نماز پہ سجدہ ریزہ وجود کو دیکھا اور کبل ہٹا کر بیڈ سے اتر آئی۔ اس ایک واقعے کے ایسے گہرے اثرات اور یہ پشیمانی ضمیر کے زندہ ہونے کی علامت تھی۔

وہ بھی تو شریکِ گناہ تھی۔ پھر ایسی ندامت ایسی بے قراری اسے کیوں نہیں تھی۔ اس نے اس پہ غور ہی نہیں کیا۔ یہ سچ ہے کہ جب تک خوفِ خدا دل میں نہ جائے، تب تک کوئی احساس پیدا نہیں ہو سکتا۔ وہ ابھی بے احساس تھی۔

وہ بے حد آواز قدموں سے چلتی اس کے نزدیک آئی اور اس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھ دیا۔ ہارون کا سسکیوں سے لرزنا وجود لکھت ساکن ہوا تھا، اگلے ہی لمحے اس نے سر اٹھایا تھا۔ ان کشادہ حسین آنکھوں میں پھیلا ہر اس ان کی خوبصورتی کو برہا کر گیا تھا۔

”کیوں رو رہے ہو؟“ کچھ دیر اس کی سرخ بیچھی آنکھوں اور آنسوؤں سے تر متورم چہرے کو یوں ہی تکتے رہنے کے بعد اس نے نخوت زدہ انداز میں استفسار کیا تھا۔

”تم جانتی ہو۔“

ہارون کا گلارہ زندہ گیا اور اسے جانے کیا ہوا، منہ پہ ہاتھ رکھے وہ قل قل کر کے ہنستی چلی گئی۔ ہارون کی نگاہ سے پہلے استعجاب چھلکا، پھر تدریج شرمندگی اور دکھ۔ وہ سر جھکا کر دھندلائی ہوئی نظروں سے اپنے ہاتھوں کو تنکٹے لگا جو دھیرے دھیرے کانپ رہے تھے۔

”کیا سمجھتے ہو تم اس طرح رونے، گڑ گڑانے سے رتب تمہیں معاف کر دے گا؟“ نہیں۔ قابو یا کروہ طنز سے بھرپور کاٹ دار لہجے میں بولی۔ تب ہارون نے غم ناک نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”نہیں ہارون اسرار! رب بھی اس وقت تک گناہ معاف نہیں کرتا جب تک وہ بندہ نہ کر دے، جس کے ساتھ زیادتی ہوئی۔ تمہیں تو اسلام اور مذہب کی بہت معلومات ہیں، کیا تم یہ بات بھول گئے؟“

ہارون کے چہرے پہ زلزلے کے آثار نمودار ہوئے تھے اور تاریک سائے چہرے پہ لرزنے لگے۔



سخت متوحش سی گریز تانوں لیے اسے لمحہ بہ لمحہ جانب پر دھتے دیکھ رہی تھی۔ اس نے اپنی دھمکی پہ من کر ڈالا تھا۔ اس کے لیے حوریہ کو اغوا کرنا کسی چیز یا ناکارے سے بھی زیادہ سہل ثابت ہوا تھا۔

یونیورسٹی سے واپسی پہ اس نے رابعہ کی موجودگی میں بہت دھڑلے سے قدرے سنسان روڈ پہ اسے کسی کی طرح اٹھا کر گاڑی میں ڈالا تھا اور اب وہ یہاں تھا اپنی من مانی کو تیار۔

بیر کاشن کھول کر دو تین بڑے گھونٹ لینے کے بعد وہ کچھ مزید اس کے نزدیک آیا تھا اور ایک ہاتھ برہا کر اس کے گرد لپٹا چادر نما دپٹہ ایک ہی جھٹکے میں اتار کر کمرے کے دوسرے کونے میں پھینک دیا تھا اور وہ بغیر اپنے کے اس کے سامنے کھڑی تھر تھر کانپتی بے اختیار زور زور سے رونے لگی۔

”کیوں روتی ہو جان من! تمہیں ہماری قدر و قیمت اندازہ ہی نہیں ہے۔“ وہ اس کے نزدیک آ کر اس کے بالوں کی چوٹی کے ٹل کھولنے لگا۔

اس نے عم و غصے کی انتہاؤں کو چھوتے ہوئے اسے پیچھے کی جانب دھکا دیا تھا اور یہیں گویا ایزی کے غضب کو آواز دی تھی۔ اس نے نون دور اچھالا اور اگلے ہی لمحے تڑپتی چمکتی حوریہ کو بازوؤں کے گھٹنے میں کس لیا۔ معاذ وہ بھرپور مزاحمت کرتی اس کی گستاخانہ جساتوں پہ تپ کر چمکتی ہوئی جھکی اور اس کے بازو میں دانت ڈال دیا۔ ایزی کی گرفت ایک بل کے لیے ڈھیلی حوریہ اس بل سے فائدہ اٹھا کر اس کا حلقہ توڑنے میں کامیاب ہوئی تھی اور بھاگ کر اس سے کئی فٹ دور چلی گئی۔ ”یا اللہ میری مدد فرما!“ تیزی سے ڈرتے سمیت اس نے زور زور سے روتے ہوئے دعا مانگی۔ اور اس کی دعا قبول ہو گئی تھی۔

دروازہ اچانک بہت زور سے بچا تھا۔ بہت جارحانہ

انداز میں۔ حوریہ کے تن مرہ میں جیسے جان سی پڑی تو ایزی کا موڈ بگڑ گیا تھا۔
”کون ہے؟“ وہ چیخا تھا۔

”میں ہوں تمہاری مام، دروازہ کھولو۔“ باہر سے چیخ کر کہا گیا تھا۔ اسے جیسے ہزار روٹ کا کرنٹ لگا تھا۔
”ایزی! میں کہتی ہوں دروازہ کھولو۔“ اب کے آواز میں سرد غراہٹ دور آئی تھی۔

حوریہ نے آنسو بھری نظروں سے ایزی کے پتھر بنے وجود کو دیکھا اور دوڑ کر دروازہ کھول دیا۔ باہر مسز ایف ایم چوہدری ہی تھیں، وہ یقیناً ”بہت عجلت میں آئی تھیں۔ جب ہی ان کا لباس شگن آلود اور بال کھلے ہوئے تھے، وہ ان سے لپٹ کر دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ مسز چوہدری نے بہت خاموش اور سرد نظروں سے اسے دیکھا اور پھر آہستگی سے اسے خود سے الگ کرتیں آگے بڑھ کر ایزی کے سامنے آن رکی تھیں۔
”واٹ از دس؟“ انہوں نے اس کے قدموں میں بڑے خالی ٹن کو ٹھوکر ماری اور چیخ کر ایزی کو مخاطب کیا، جس کا سر جھک کر کاندھوں پہ گر گیا۔

”اور یہ کیا ہے؟“ انہوں نے لپٹ کر تھر تھر کانپتی آنسو بہاتی حوریہ کی سمت اشارہ کیا۔ ”تم تو کہتے تھے لوگ تمہارے بارے میں بکواس کرتے ہیں۔ الزام تراشی کرتے ہیں۔ اب بتاؤ اب بھی مکر جاؤ۔“

انہوں نے ایک زنانے کا طمانچہ ایزی کے چہرے پہ دے مارا تھا، پھر دوسرا، پھر تیسرا اور پھر تو جیسے وہ پاگل سی ہونے لگی تھیں۔ انہوں نے منٹوں میں اس کا جلیہ بگاڑ کے رکھ دیا تھا اور وہ چپ چاپ پٹ بھی رہا تھا، حوریہ آنکھیں پھاڑے یہ ناقابل یقین منظر دیکھ رہی تھی۔



یہ کیسا احساسِ رگ جلی میں اترتا تھا، آگاہی کا وہ سوچتے سوچتے حواس کھونے لگتا، جہاں اور زیاں ہوا تھا وہاں یہ بھی کہ اسے اس عمدے کے لیے نااہل قرار دے کر طرف کر دیا تھا۔

ضویا کی ڈیلوری نزدیک تھی، ممانی اسے لینے آئی تھیں، وہ کیا کہہ سکتا تھا۔ ان ہی دنوں سوہا کے رشتے کی بات بھی چل رہی تھی اور عثمان کے سعودیہ جا کر کام کرنے کی بھی، مگر وہ ہر معاملے سے لاتعلقی تھا۔ ماموں اس سے خفا تھے تو ممانی نفرت میں کچھ اور بڑھ چکی تھی۔ انہیں اپنی بات ثابت کرنے کا موقع ہاتھ آیا تھا اور وہ خوب کھل کر کہہ رہی تھیں۔

ضویا کی ڈیلوری کے بعد سوہا کی شادی طے پائی، عثمان نے البتہ انتظار فضول جانا تھا، سوہا سعودیہ فلانی کر گیا۔ دو ماہ بعد ضویا نے ایک صحت مند اور خوبصورت بچے کو جنم دیا تھا۔ ماموں نے ہی ملاستی انداز میں اسے اطلاع پہنچائی تھی۔

”اب کچھ کام بھی ڈھونڈ ہی لو۔ بیوی بچے کو بھیک مانگ کر کھلاؤ گے؟“ انہوں نے طنزاً کہا تھا۔

تب وہ اپنا ہر احساس جھٹک کر بہت شوق سے بچے کو دیکھنے گیا تھا، جو کٹ میں لینا چلا چلا کر رو رہا تھا، جبکہ ضویا بے نیازی سے گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے سب کی فاشیں مزے لے لے کر کھا رہی تھی۔

بارون نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا تھا اور خود بڑھ کر ہاتھ پیر مار کر روتے ہوئے اس ننھے فرشتے کو اپنی بانہوں میں بھر لیا تھا، مگر وہ معصوم جان تو ماں کی نرم آغوش کی متلاشی تھی، اس کا لمس پا کر کچھ اور بھی شدتوں سے رونے لگا۔

”ضویا! اسے بھوک لگی ہے۔ پلیز اسے فیڈ کرواؤ۔“ اس کی بے نیازی اور لاتعلقی کے باوجود وہ بچے کو اس کی سمت بڑھاتے ہوئے وہ بہت لجاجت سے بولا تھا۔

”اسے اپنے ہی پاس رکھو۔ تمہیں نظر نہیں آ رہا۔ میری طبیعت تھیک نہیں ہے۔“ وہ پھنکار کر بولی۔

بارون کس قدر جھنجھایا مگر یہ۔

”لینے گئی تو ہیں مانا! اس کا فیڈر آجائیں گی، کیوں اتاؤ لے ہو جاتے ہو ہر کام میں۔“ ماتھے پہ تیوریاں لیے وہ رکھائی سے بولی۔

”کیا مطلب، اب ممانی جان فیڈر سے اسے دودھ

پلائیں گی؟“ اس کے پیلے انداز بارون کو تاؤ دلانے لگے۔

”تو اور کیا میں کرواؤں گی۔ سنو مسٹر بارون! اگر کسی خوش فہمی میں مبتلا ہو تو اس کو دل سے ابھی نکال دو۔ مجھ سے اس کے لیے کسی قسم کی نرمی کی توقع مت رکھنا، اس لیے کہ یہ تمہاری اولاد ہے اور مجھے تم سے گھن آتی ہے۔“

بچے کی سمت اشارہ کرتی وہ اس قدر بے چنگ لہجے میں غرا کر بولی تھی کہ اس کا یہ بیگانہ انداز بارون کو انگشت بدنداں کر گیا۔

”یعنی تم؟“ صدے کی زیادتی سے وہ بات بھی پوری نہیں کر سکا۔

”بالکل صحیح سمجھے ہو۔“ وہ آنکھیں نکال کر بولی اور اس کے غصے کی زیادتی سے بے انتہا سرخ آنکھوں میں اپنی آنکھیں گاڑھ کر مزید گویا ہوئی۔

”سو بہتر یہی ہے کہ تم اس کے لیے گورنس کا انتظام کر لو، میری ماں خواجواہ کی ملازمہ نہیں ہے کہ تمہارے ہوتے سوتے کی آیا گیری کرتی پھرے۔“

بارون نے جواب نہیں دیا، وہ جواب دینے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔



”تم مجھے بتاؤ میری تربیت یا محبت میں کہاں کمی رہی تھی، جو تم اس حد تک پستیوں میں جا کرے اور مجھے بتا تک نہیں چل سکا۔“ وہ ان کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا، کپڑے تبدیل ہو چکے تھے، چلیہ سنورا ہوا تھا، مگر وہ اسی لباس میں تھیں، چہرے پہ تاریک سائے لرزاں تھے۔

”تمہیں وہ لڑکی پسند تھی۔ تم مجھ سے کہتے میں کسی چیز کو ترجیح نہ دیتی، ماموں تمہاری پسند کے ایزی نام نے بہت ہرٹ کیا۔ مجھے وہ آگے بڑھی تھیں اور بھرائے ہوئے گلے سے بولیں۔ وہ ہنوز خاموش تھا، البتہ چہرے پہ کسی پشیمانی یا تاسف و گھبراہٹ کا شائبہ تک نہیں تھا اور کسی چیز انہیں ہولارہی تھی۔“

”کیا یہ پہلی لڑکی تھی، جس میں تم اسی گھٹیا انداز میں انراؤ ہوئے، یا اس سے پہلے بھی کسی کی عزت کا تحفظ نکال چکے ہو؟“

اجانک خیال آنے پہ انہوں نے کچھ سم کر ہنسا کر کیا تھا، ایزی نے ایک نظر ان کے ہراساں کرنے کو دیکھا اور پھر سے سر نیپوڑا کر کھڑا ہو گیا۔

”بتاؤ ایزی ابو لو، پلیز ٹیل می اور وائز آئی ول کل اب کی مرتبہ انہوں نے اس کا گریبان پکڑ کر بچان زندہ انداز میں جھنجھوڑا تھا۔ ایزی ان کی کیفیت کو دیکھتا تو خائف ہوا تھا۔“

”یہ پہلی لڑکی ہی تھی۔ اس سے پہلے کسی لڑکی نے مجھے چٹنی کا بناج نہیں نچایا تھا۔ میں اسے سبق سکھانا چاہتا تھا۔“ وہ نروٹھے پن سے بول پڑا اور ان کے جیسے سر پہ لگی تلواروں میں بھیجی تھی۔

”تم یہ کیوں بھول گئے کہ تمہارے گھر میں ماں اور باپ بھی ہے۔ کل انہیں ان کی عزت کی حفاظت کی کوشش میں کوئی ایسا ہی سبق سکھانے لگے تو؟“

انہوں نے، مسٹر ٹیک ہوتے ہوئے اسے کہتے ہی گھونٹے سر پر کر دیے تھے، ایزی نے ناگواری سے انہیں دیکھا اور جھٹک کر ہٹکارا بھرا۔

”کم آن مام کام ڈاؤن یہ سب اس لڑکی کی بد تمیزی کی وجہ سے ہوا۔“

اس درجہ ڈھٹائی اور بد لفظی نے انہیں شدید مشتعل کر دیا۔

”میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہاری شادی بہت جلد اسی لڑکی سے ہوگی۔ انہوں نے بہت قطعی اور فیصلہ کن انداز میں کہا تھا۔“

”اٹ!؟“ ایزی کو تو جیسے بچھو نے ڈنگ مارا تھا۔ سب ہرگز بھی اس لڑکی کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ اس کی شادی ہی رچانے بیٹھ جاؤں۔“ اس کا بد لحاظ لہجہ سنائی دے رہا تھا۔

”اسی سکون سے گویا ہوئی تھیں۔“ حالانکہ تم جیسا اور عیاش بندہ ہرگز ہرگز اس کے قابل نہیں ہے،

مگر کیا کیا جائے کہ اتنے گھٹے تمہاری حراست میں رہ کر وہ اپنے پیرتس کی نگاہوں میں بھی مشکوک ہو گئی ہے، اس کے سوا اب کوئی چارہ نہیں کہ تمہارے ہی نام کی چادر اوڑھا کر معاشرے میں ایک مقام دیا جائے۔

”ہام! اس نے پیر پٹختے تھے۔“ میں گھر سے بھاگ جاؤں گا، اگر آپ نے زبردستی کی۔“ اس نے اپنا آزمودہ حربہ اپنایا۔

”بھاگ جاؤ، مگر یاد رکھنا میں تمہیں اپنی جائیداد سے علق کر دوں گی۔ ایک دھیلا نہیں ملے گا تمہیں، اور تم کیا کر سکتے ہو، یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔“

انہوں نے گہرے طنز سے کہا اور باہر نکل گئیں، ایزی کی جھنجھلاہٹ پہ غصہ غالب آ گیا، اس نے میز کو لات رسید کی تھی اور تشناتا ہوا باہر نکل گیا۔



وہ ایک جس زہ شام تھی، آسمان پہ کہیں کہیں بادل کا کوئی آوارہ نکلر ہوا کے دوش پہ اڑا پھر رہا تھا اور نہیں سے مینا کی آواز اداس فضا میں مزید اداسی گھول رہی تھی، اس کی گود میں سویا بچہ کسمسا کر رویا، تب وہ چونکا تھا اور دوران آنکھن سے ساکت نگاہ ہٹا کر بلکتے ہوئے بچے کو دیکھا۔ معاں اسے اس کی بھوک کا خیال آیا تھا، بچے کو کاندھے سے لگا کر وہ چن کی سمت بھاگا، جہاں وہ دودھ چولے پہ ایلنے کے لیے چھوڑ کر بھول گیا تھا۔ دودھ کیتلی کے کناروں سے نکل کر برز پہ گرنے کے بعد اب سوکھ کر جل چکا تھا۔ بالائی کی پھولی ہوئی تہہ کیتلی کے کناروں پہ اب بھی جھی اور ماحول میں جلنے کی بو پھیل چکی تھی، وہ کچھ لمحوں کو شدید قسم کے رنج میں مبتلا اپنی جگہ سے حرکت کرنے کے قابل نہیں رہا۔

بچے کے ایک بار پھر رونے سے وہ اسی کیفیت سے نکلا تھا اور آگے بڑھ کر پہلے چولہا بند کیا، پھر صافی سے کیتلی پکڑ کر اتاری، کچھ سرخ گاڑھا دودھ سرخ پہ موجود تھا، اس نے سنک کی ٹونٹی کھول کر کچھ پانی اس میں ٹپکایا

اور فیڈر میں ڈال کر اچھی طرح ہلانے کے بعد فیڈر بچے کے منہ سے لگا دیا۔ بچہ رو رو کر نڈھال تھا یا پھر بھوک سے کہ بے صبری سے دودھ پیتے ہی سو گیا۔

ہارون نے جھک کر اس کے معصوم چہرے پہ بکھرے آنسوؤں کو اپنے ہونٹوں سے چنا تھا اور یا سیت آمیز گہری سانس کھینچ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ سات سے آٹھ ماہ کا بچہ نیند میں ہچکیاں بھرتا اس کا کلیجہ شق کرنے لگا۔

عثمان نے سعودیہ جانے کے بعد وافر روپیہ بھجوانا شروع کر دیا تھا۔ سوہا کی شادی ہو گئی وہ بیاہ کر یونڈ اچلی گئی۔ چھ ماہ بعد ماموں، ممانی بھی عمرے کے لیے فلانی کر گئے۔ پیچھے وہ رہ گئی تھی اپنی من مانی کے لیے اور اس کا فیصلہ اتنا سفاکانہ اور سنگدلانہ تھا کہ ہارون کا ضبط پارہ پارہ ہو گیا تھا۔ ”کچھ تو گنجائش رکھو ضویا! میرے لیے نہیں تو اس معصوم بچے کے لیے یہ اولاد ہے تمہاری۔ غور تو کرو اس کا کیا تصور۔“

”مجھے سبق مٹ بڑھاؤ، جب کہہ دیا کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ تم دونوں کے لیے تو بار بار دست سوال دراز کر کے خود کو ذلیل نہ کرو۔“

وہ اتنی نفرت سے بولی تھی کہ اس روز ہی شام کو وہ اپنا مختصر سامان سمیٹ کر بچے کے ہمراہ وہ گھر چھوڑ آیا تھا جسے ضویا نے یہ کہہ کر اسے جانے کو کہا تھا کہ اس گھر پہ اس کا کوئی حق نہیں ہے اور چونکہ وہ اس کی شکل دیکھنے کی بھی روادار نہیں سو وہ وہاں سے کہیں اور ٹھکانہ کر لے۔

وہ اتنا ہرٹ تھا اس قدر ڈسٹرب اور مایوس تھا کہ ممکن تھا خود کشی کر لیتا مگر اللہ کو اسے ابھی زندہ رکھنا تھا جب ہی اسے زندہ رہنے کے لیے سہارا فراہم کر دیا تھا ایسے مشکل وقت میں سارے اس کے کام آئی تھی۔ اس کی داستانِ عم نے اسے اتنا ملول کیا تھا کہ آنکھوں میں نمی آسری تھی۔

اور ہارون جس نے کبھی اس سے اپنی محبت کا اظہار بھی نہیں کیا تھا۔ اس کی اس درجہ ہمدردی و توجہ پہ بکھرتے بکھرتے بھی سنبھل گیا۔ اب یہاں اس گھر

میں تمنائی اور آناش میں گہرا وہ جینے کے نئے ڈھنگ سیکھ رہا تھا۔ اس لیے بھی کہ اسے اس ننھی جان کی خاطر اپنا خیال رکھنا تھا جسے ماں کی بے اعتنائی سہا پڑی تھی۔



پاہر ہواؤں کی سرسراہٹ کے ساتھ بارش کا شور تھا۔ کتنی مدھر آواز تھی بارش کی وہ اٹھی اور اپنے پنڈ بیگ سے خاک کی لفافہ نکال کر باہر آ گئی۔

”مام میں آ جاؤں۔“ اس نے دروازے پر دستک دے کر اجازت چاہی۔

”بس اندر سے تھکی ہوئی آواز ابھری تھی، اسوہ نے دروازہ ہنسن کیا اور اندر قدم رکھ دیا انہیں اسٹڈی ٹیبل کے سامنے نہ پا کر نظر گھمائی۔ وہ بیڈ پہ دراز تھیں، کمرے میں ملگجاسا اندھیرا تھا وہ اندازہ نہیں کر پائی کہ یوں بے وقت کیوں لیٹی ہیں۔

”آر یو آل رائٹ مام؟“ اس نے لائٹ آن کرتے ہوئے تشویش سے کہا۔

”آپ ایزی اسٹوڈی کی وجہ سے ڈس ہارٹ کیوں ہوتی ہیں۔ مام! اس کی تو عادت ہے۔“ معا ان کے چہرے پہ بکھرتی زردی کو دیکھتے ہوئے وہ لب بھینچ گئی۔

”یہ لے لیں مام!“

”واٹ از دس۔“ ان کی نگاہوں سے استعجاب چھلکا۔

”وہ پیسے جو میں نے آپ سے لیے تھے۔“ اس نے لفافہ ان کی سمت بڑھا دیا۔

”کیوں ڈانس نہیں سیکھنا؟“

اسوہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”کوئی خاص وجہ؟“ ان کی نگاہیں اس کے چہرے پہ کھیاتی شرمیلی مسکان میں اٹکیں۔

”وہ نہیں چاہتا ہے۔“ وہ سر جھکا کہ اب کھل کر مسکرائی۔

”وہ کون؟“ ان کی حیرانی دیدنی تھی۔

”مگر کیوں چاہتی تھی۔“ وہ ہاتھ کی انگلی کا ناخن چبا کر اسے ہنسی۔

”وہ پسند نہیں کرتا اور تم نے اپنی خواہش چھوڑ لی۔“ انہوں نے بغور اس کا چہرہ جانچا۔

”جی مام! اس کے لیے تو میں سب کچھ...“ معا وہ لب کر چپ ہوئی۔

”کیا بہت اچھا ہے؟“ وہ سوال پہ سوال کرنے لگی۔ اسوہ بوکھلا سی گئی۔

”جی مام! بہت بے حد خود سے ہر کسی سے بڑھ کر اس لیے مام کہ وہ ہے ہی چاہے جانے کے قابل۔“

اس نے آنکھیں میچ کر بہت جذب سے کہا پھر اختیار سی ہو کر اپنی جگہ سے اٹھی اور ان کے گھٹنوں پہ دو ٹول ہاتھ رکھ کے لجاجت سے بولی۔

”نام پلیز! آپ اس سے ملیں تو سہی۔ وہ آپ کو پسند آئے گا۔ میں ایزی کی طرح غلط راستہ نہیں اپناتا چاہتی۔“

”ہوں۔“ وہ جیسے کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

اس سے کہو نا۔ وہ آکر مجھ سے ملے۔ بیٹی کی ماں گھر میں پہل کرتی اچھی نہیں لگوں گی۔“ انہوں نے کھمبے سوچتے ہوئے کہا۔

اسوہ کے چہرے پہ سایہ سالہا گیا۔

”مام! وہ نہیں آئے گا اس لیے کہ جو کچھ آپ کی بیٹی اس کے لیے محسوس کرتی ہے۔ وہ ایسا کچھ محسوس نہیں کرتا۔ مجھے ہی ایسا لگتا ہے کہ اگر وہ مجھے نہ ملا تو اس کا حیاؤں گی۔“

اس کا گلہ رندہ سا گیا۔ ان کا دل تو جیسے مٹھی میں اڑا تھا۔



دوسم اپنے اندر بے حد خوبصورتی سموئے ہوئے بلکے بلکے چلتی ہو اور گہرے سیاہ بالوں نے پورے گل کو شام سے پہلے ہی شام کا رنگ دے دیا تھا۔ ہلکی سی پڑتی پھوار اور قریبی مسجد سے آتی نعت کی آواز سب کچھ ہی بہت اچھا تھا، مگر وہ کمرے کی کھڑکی میں

کھڑی اپنے ہی خیالوں میں دور پہنچی ہوئی تھی۔ ایک ماہ ہو گیا اس پہ یہ سانحہ بیتے اور ایک ماہ سے ہی زندگی کا انداز بدل گیا تھا۔ وہ عزت بجا کر بھی گویا ہر نگاہ میں معتبوب ہو گئی تھی۔ کتنا بے مایا کر دیا تھا۔ ایزی کی اس انتقامی کارروائی نے اسے اپنوں کی نظر میں وہ تو بس ششدر سی بدلتے ہوئے روٹیوں کو دیکھ رہی تھی۔ کتنا برسے تھے بابا اس پہ اور ان کی بدگمانی آف وہ یاد کر کے ہی لرز جاتی۔

”صحیح کہتے ہیں لوگ، اولاد پہ اندھا اعتماد نہیں کرنا چاہیے اور بیٹیوں کے معاملے میں تو یہ اعتماد ہمیشہ ڈبو تا ہی ہے۔ برا کیا تھا میں نے کہ برادری کی مخالفت مول لے کر اس کو بڑھنے بھیج دیا، ارے رانی ہو تو پہاڑ بننا ہے نا، کچھ نہ کچھ تو اس نے بھی حوصلہ افزائی کی ہوگی، تب ہی معاملہ اتنا خراب ہوا۔“

حوریہ کا تودم نکل گیا تھا۔ وہ تو پہلے ہی خود پر اعتماد کھو چکی تھی اس درجہ الزام تراشی اور غلط بیانی پہ اسے لگا تھا جیسے وہ تورا کر ایسا کرے گی کہ پھر اٹھ نہ سکے گی، مگر ایسا ہی تو نہیں ہوا تھا، کتنی سخت جان تھی وہ۔

”پوچھو اس سے کہ کون تھا وہ؟ اس کے اگلے پچھلوں کو بلائے اور اپنی صورت لے کر دفعان ہو۔“

وہ چنگھاڑے تھے اور نیم جان ہوتی حوریہ کے قریب ہی جیسے بم پھٹا تھا۔ چہرے پہ ہوا بیاں اڑنے لگیں۔

”بتایا تو ہے اس نے وہ ایک بد قماش لڑکا تھا۔“

”چپ زبان کھینچ لوں گا تمہاری، اگر تم نے بے جا حمایت کی تو۔“ قہر بھرے انداز میں وہ امی کو جان سے مار دینے کے ارادے سے آگے بڑھے۔

”یہ اس حد تک گر جائے گی، باپ کی عزت کا جنازہ نکال کر اس لونڈے کے ساتھ کھینچے اڑائے گی، ارے مجھے ذرا سا بھی گلن ہوتا تو اپنے ہاتھ سے اس کا گلا گھونٹتا۔“

تب ڈری سہمی لرزتی کانپتی حوریہ میں جانے کہاں سے اتنی ہمت آگئی کہ وہ کمرے سے نکل کر ان کے سامنے آگئی۔

”فزع دور۔ اس سے کہو یہاں سے چلی جائے۔ میں اس کی صورت۔“

”یہی پوچھنے آئی ہوں بابا! کیوں صورت نہیں دیکھنا چاہتے، جبکہ میں بالکل بے قصور ہوں۔“

ایک طمانچہ پڑا اس کی زبان گنگ ہو گئی، اس کے ہونٹوں سے سرخ سرخ خون نکل کر پھیل رہا تھا۔

”اسے لے جاؤ یہاں سے اور جنم میں جھونک دو جتنی جلدی ہو سکے۔ اس کا رشتہ تلاش کرو، چاہے اپناج ہی ہو یا پھر سڑکوں پہ بھیک مانگتا فقیر، مگر اسے یہاں سے دفنان کر دو، ورنہ یہ میرے ہاتھ سے ضائع ہو جائے گی۔“

وہ کف اڑاتے پھنکارتے گھر سے نکل گئے تھے۔



”السلام علیکم؟ میم! میں رابعہ ہوں، وہی جس نے آپ کو حوریہ کے کڈھپ ہونے کی اطلاع دی تھی۔“

”ہاں بیٹا بولو۔“ وہ جو بہت گمن انداز میں اپنے ناول کی آخری قسط کا کلائمیکس لکھ رہی تھیں۔

”میم آئی ایم سوری! کہ آپ نے اپنا کردار اس انداز میں نہیں نبھایا، جیسے کہ نبھانا چاہیے تھا۔“ لہجہ ترش اور تلخ تھا۔

”بیٹا! وہ حوریہ نے تو اس روز بھی مجھے گھر کے اندر آنے ہی نہیں دیا تھا، وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی، حالانکہ میں چاہتی تھی کہ اس کی پوزیشن کلیئر کروں، مگر۔۔۔“

وضاحت دیتے بھی وہ جمل سی رہیں۔

”خیر جو ہوا اسے جانے دیں، ایک ریکوسٹ کروں آپ سے۔“ دو سیری جانب رابعہ نے بھی فوراً

مفاہمت اختیار کی تھی۔

”ہاں بیٹا! کوئٹہ میم! آپ اپنے بیٹے کی غلطی کا ازالہ کریں۔ حوریہ سے اس کی شادی کروادیں، میم پلیز۔ وہ اس وقت سخت آزمائش میں ہے، چونکہ وہ اس آزمائش میں اس کی وجہ سے دوچار ہوئی ہے۔“

”آں ہاں بالکل کیوں نہیں۔“ وہ چونک کر اور گڑبڑائیں۔

”تھینکس میم! میں منتظر رہوں گی۔ اللہ حافظ۔“ انہوں نے بے دلی سے فون رکھ دیا، تبھی دروازہ تھپتھپا کر ایزی اندر آیا۔

”مجھے دس ہزار کی ارجنٹ ضرورت ہے، ہم پلیز دے دیں۔“ بلیک چست، جینز پہ بلیک شرٹ پہنے وہ رف سے جلیے میں تھا۔

”کیوں اب کون سا گل کھلانا ہے؟“ ان کی تیوری چڑھی۔

”میری یہی غلطی تھی، جو تم اس حد تک بے لانا ہو گئے ہو۔“ انہوں نے پیپر ز سمیٹ کر رکھتے ہوئے تلخی سے کہا۔

”اسوہ کو تو آپ نے پچاس ہزار بھی ایک منٹ میں نکال کر دے دیے تھے، بغیر کسی حیل و حجت کے ڈانس سیکھنا کب سے اچھا کام ہو گیا۔“

وہ ناگواری سے جتا کر بولا۔ انہوں نے دروازہ لاکڈ کرتے ہوئے پلٹ کر اسے دیکھا۔

”ایزی! میں اس لڑکی کے ساتھ تمہارا رشتہ طے کر رہی ہوں۔ شادی بھی جلدی ہوگی۔ اب تم یہ فضولیات چھوڑ دو۔ اب بھی اگر تم میری بات سے انکار کرو گے تو یاد رکھنا میں اس مرتبہ خود نہیں گھر سے نکالوں گی۔“

ان کی آنکھوں سے برہمی چھٹک رہی تھی۔ ایزی نے سختی سے لب بھیج کر انہیں دیکھا۔

”آپ میری کمزوری سے آگاہ ہیں، اماں! اور اس سے فائدہ بھی اٹھا رہی ہیں۔ اوکے فائن۔ کر لیں اپنی مرضی ابھی تو مجھے رقم دے دیں، شادی کے وقت نہیں بھاگوں گا، ماں! میری دکھتی رگ آپ کے ہاتھ میں ہے۔“

باٹ کاٹ کر تلخی سے کہتا وہ ان کے بڑسائے اس ہزار کے چیک کو اچک کر چلتا بنا۔ وہ کچھ پریشان تھا کھڑی رہ گئی تھیں۔



خوش ہونے کے بجائے عجیب سی یاسیت اور رنج

تھا۔ حوریہ کے باپ کے جاہلانہ رویے پہ تاسف ہوا تھا، نہ کوئی رسم ادا کرنے دی، نہ شکر، بس شادی کی تاریخ طے کر دی، انہیں فیسی پہ بہت دونا آ رہا تھا۔ ایزی سے ان کے نزدیک تو بد فیسی ہی تھی، مگر وہ اس کی کیا سکتی تھیں۔

معاذ کے گھر چلیں۔ ”اسوہ جو ان کے ساتھ ہی راستے میں ہی گاڑی روک کر اچانک بولی۔

”ہاں چلو دیکھتے ہیں وہاں سے کیا ملتا ہے۔“ وہ مسکرائیں۔

اسے جاہل اور دقیانوسی سوچ کے مالک نہیں سمجھتی، معاذ کے بابا اتنی ڈشنگ اور امپرہسو کرتے ہیں کہ میں تو انہیں دیکھتی ہی رہ گئی۔“

”ہاں! تم تو معاذ سے زیادہ اس کے بابا سے متاثر لگتی ہو، بھئی سے مسکرائیں۔“

”خیر مجھے تو جس سے متاثر ہونا تھا ہو گئی۔ ان کی جیسی خواتین ہی متاثر ہو سکتی ہیں۔“

ان نے خفیف سی شرارت کی بھی، مگر ان کے ہنسنے سے مگر اہٹ کچے کے ہزاروں حصے میں ہونے دیکھ کر وہ خاموش سی ہو گئی۔

گاڑی مطلوبہ مکان کے سامنے رکی اور وہ ان کی طرف کسی حد تک خفا نظروں کو خاطر میں لائے بغیر ان سے اتر کر اطلاعی کھنٹی بجانے لگی، وہ بھی خاصی تھکتی تھی، اس کے ہمراہ دروازے تک آگئی تھیں۔

”اسوہ! اور جیسے ہر سو روشنی سی بکھر گئی۔ معاذ سفید شہ شہلا اور سوٹ میں نکھرا نکھرا سامنے تھا۔

”السلام علیکم! انکل ہیں۔ دس ازمانی ماں، ان سے کہیں۔“ اسے دروازے میں لٹکے دیکھ کر اسوہ لہجے میں کہتے ہوئے گویا اپنی آمد کی وجہ بیان کر رہی تھی، جگہ خفت کا شکار ہو رہی تھیں۔ جانے کیلئے اس نے انتہا خور سے لڑکے کی آنکھوں کو دیکھا، کیوں لگا تھا کہ وہ کہہ رہا ہو۔ کیوں کس نے اسے ایک نظر انہیں دیکھا تھا جو یک نکل اسے

دیکھ رہی تھیں، پھر آہستگی سے ہٹ کر انہیں راستہ دے دیا۔

”بابا تو نماز پڑھنے گئے ہیں۔ بس آتے ہوں گے۔ آپ بیٹھیے۔“

وہ انہیں ہمراہ لیے چھوٹے سے انتہائی سادگی سے سجورائنگ روم میں لے آیا تھا۔

”میں چائے لاتا ہوں۔“ وہ ایک بار پھر ان کی نظروں کے حصار میں آیا تو بڑبڑہو کر کتا پلٹ گیا۔

”سٹھیائی ہوئی ہیں والدہ بھی بیٹی کی طرح۔“ اس نے تپ کر سوچا۔

”بیٹا! تمہاری والدہ یا بہن نہیں ہیں گھر میں؟“

”جی نہیں۔ صرف میں اور بابا ہوتے ہیں، وہ بھی جب وہ تبلیغی دوروں پہ ہوتے ہیں تو میں تنہا رہتا ہوں۔“ اس نے دروازے سے نکلنے سے قبل آہستگی سے جواب دیا اور اگلے ہی لمحے وہ بلینڈ پار کر لی۔

”بابا! کچھ مہمان آئے ہیں آپ سے ملنے۔“

دروازے پہ دستک کے بعد، جب اس نے دروازہ کھولا تو پہلی اطلاع یہی دی۔

”کون؟“ وہ سر سے ٹوپی اتارتے ہوئے بال سہلانے لگے۔

”اسوہ! یاد ہے، اسی کی ماں ہیں۔“ وہ بے نیازی سے کہہ کر خود کچن کی سمت بڑھ گیا، جبکہ وہ مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئے تھے اور سامنے موجود خاتون پہ نگاہ بڑتے ہی وہ پتھر کے مجسمے کی مانند ساکت ہو گئے۔

اسوہ کی کسی بات کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے بھی اس پر نظر اٹھائی تھی اور جیسے زمین آسمان ان کی نگاہوں میں گھوم گئے تھے۔ یہ کوئی الوژن نہیں تھا۔ یہ حقیقت تھی وہی حقیقت جس کی انہوں نے طویل سجدوں میں رب سے التجا کی تھی۔ یہ شکر تھا۔ ان کی دعاؤں کا، یہ اعجاز تھا ان کی ریاضتوں کا، وہ اچانک انھی تھیں اور لڑکھرا کر ان کی جانب بڑھی تھیں۔

”ہاں۔ روسن۔“ یہ نام ان کی زبان سے ٹوٹ کر نکلا تھا اور اگلے ہی بل وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی ان کے قدموں سے لپٹ کر بے اختیار ہو گئی تھیں۔

آپ مجھے معاف کریں گے؟“

آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ ان کے سامنے جوڑ دیے تھے۔ وہ چونکے، انہیں دیکھا، مسکرائے اور بڑھ کر ان کے بندھے ہوئے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لے کر اپنے اسی وقت قدم رکھتا معاذ ٹھنکا تھا۔ چائے کی ٹرے اس کے مضبوط ہاتھوں میں لرزی تھی اور اس کی آنکھیں اس کے عالم میں کھلی رہ گئیں۔ معاذ پلٹا تھا اور ایک جھٹکے سے مڑ کر باہر نکل گیا۔ تب سے اس داستانِ الم کے سوز میں گم اسوہ سب سے پہلے چونکی اور تڑپ کر اس کے پیچھے لپکی، اس کے پیچھے ہی وہ دونوں بھی تڑپ کر کی حالت تو بالکل دیوانوں کی سی تھی۔

”معاذ معاذ بیٹے!“ مگر وہ ہر پکار ان سنی کرتا بیرونی دروازہ پار کر گیا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

”واٹ نان سینس معاذ! یو آر ناٹ اے کڈ۔“ جس وقت اس نے ٹھکے ماند سے شکستہ اعصاب سمیت گھر کی دہلیز پار کی، وہ اسے بلب کی زرد روشنی میں آنگن میں ہی ٹھکتے مل گئے۔ اسے دیکھا تو لپک کر قریب آتے ہوئے خفگی بھری سرزنش کی۔ دروازہ بھی یقیناً اس کے انتظار میں کھلا چھوڑ رکھا تھا۔ اس نے شاکی نگاہ ان پر ڈالی اور قدم گھسیٹتے ہوئے برآمدے میں پڑے تخت پر گر گیا۔

”کیوں تھا ہو بھلا؟“ انہوں نے اس کا بجا ہوا چہرہ دیکھا۔ اس نے شاکی نظر ان پر ڈالی تھی۔ وہ بے ساختہ مسکرائے۔

”میں نے آپ سے کہا تھا۔ وہ اسوہ کی ممانہیں۔“ اس نے منہ پھلا کر نروٹھے پن سے کہا، پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھا اور بو جھل لہجے میں۔

”پتا ہے بابا جانی! جب میں چھوٹا سا تھا نا تب میں چاہتا تھا میرے بابا جانی سب سے بہادر ہوں، ہمارے ہاں طرح۔ سپر مین کی طرح، لیکن پھر جب میں بڑا ہوا تو میرے دل کے برابر آیا تو میرے دل نے ایک اور خواہش

میں بے شک تھی، جاننے ہیں وہ کیا خواہش

میں نے رک کر بو جھل پوٹوں کو اٹھا کر انہیں بہت سنجیدگی سے ایسے دیکھ اور سن رہے

خواہش تھی آپ کے مضبوط اور پختہ کردار میں نے آپ میں یہ خوبی پائی بھی ہے۔ لیکن شخصیت ہے آپ کی۔ میں نے اکثر آپ کی سمت متوجہ ہوتے ٹھٹکتے دیکھا، مگر بہت محتاط زندگی گزار رہی۔ اس کے باوجود کہ موت کی رفاقت کے بغیر زندگی گزار رہے تھے، آج شام بابا جانی تب مجھے اتنا شاک لگا، جب اسوہ کی ممانہ کے ہاتھ تھامے دیکھا۔“

بو جھل لہجہ بھینچ سا گیا تھا۔ ان کی مسکراہٹ

میں کہوں کہ وہ اسوہ کی ممانہیں تمہاری تمہارے اسٹرائنگ بابا جانی نے کسی غیر ممانہیں تمہاری ماں کا ہاتھ ہی پکڑا تھا تو کیا تم اپنے بابا جانی کو اس گستاخی پہ معاف

کا انداز ڈرانا ہی نہیں تھا، البتہ شریر ضرور تھا، مگر حیران سارہ گیا۔

اب مذاق کر رہے ہیں بابا! کچھ دیر بعد اس کے پھنسی پھنسی آواز برآمد ہوئی۔

ایسا سنگین مذاق کیوں کروں گا۔“ وہ پل کے پل کا شکار ہوئے۔

آپ نے انہیں معاف کر دیا، اتنی زیادتی کے

نے، المیہ ذات تو اللہ کی ہے۔ بیٹے! آپ کے بابا جانی کی بہت سی لغزشوں اور

لو معاف کر دے۔“ بجز انکساری ان کے ہر

عیاں تھی۔

نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”میں نہیں پتا چل گیا کچھ پھر بھی وہ ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں۔ کیا

انہیں اس سب سے بچھتاوا نہیں تھا؟“

اس نے عجیب سا سوال کیا، وہ چونکے تھے اور

کاندھے اچکا دیے۔

”وہ تم سے ملنا چاہتی تھیں۔ بہت بے قرار تھیں، مگر تم تو جانے کہاں چلے گئے تھے۔“

”آخر آ ہی جاتا۔ آیا ہوں نا۔ انہیں عادت ہے بابا! ہمارے بغیر رہنے کی۔“ اس کا دل و دماغ تناؤ کا شکار

ہونے لگا۔

”معاذ! ایسی منفی سوچ مت اپناؤ۔ بہت غلط بات ہے وہ کل پھر آئیں گی۔“

انہوں نے اسے سمجھایا تھا، مگر وہ تنگ کر بولا۔ ”مگر میں کل بھی ان سے نہیں ملوں گا۔“ اپنی بات مکمل کر کے وہ رکا نہیں تھا۔ ہارون پریشان سے رہ گئے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور اس کی یہ بدگمانی، یہ شکایت ضویانے پہلی بار ہی

مل کر کچھ اس طرح سے دور کی تھی کہ وہ ان کی محبتوں کی شدتوں اور آنسوؤں کی برسات کے سامنے ہار سا گیا

تھا۔

”تھینک گاڈ فضا کا بو جھل بن تو دور ہوا۔“

جس پل وہ بہت بلا کھانکا ہو کر مسکرایا، اسوہ چائے کی

ٹرائی سمیت اندر آئی تھی اور اسے دیکھ کر لطیف سی

چوٹ کی، مگر معاذ نے اس کی بات پہ کوئی جواب نہیں

دیا۔ اچانک وہ اٹھا اور گھڑی دیکھتے ہوئے جانے کو تیار ہو گیا۔

”بابا جانی! میرا ویٹ کر رہے ہوں گے۔“

”بیٹا کال کر لو تادو انہیں۔ ابھی تو جی بھر کے تمہیں

دیکھا بھی نہیں، کھانا بھی کھاؤ نا ہمارے ساتھ۔“ وہ اس کے پیچھے پیچھے آئی تھیں اور معاذ ایک دم ہی بے حد ملول سا ہو گیا۔ لفظ ہمارے اس کے دل میں پھانس بن کر چبھا تھا اور یہی چھین اس نے ہارون کے سامنے ظاہر کی تھی۔

”وہ میری ماں ہے بابا! جبکہ حق ان پہ دوسرے جتاتے ہیں۔“

اس وقت وہ انہیں وہی معصوم سا بچہ محسوس ہوا۔ جو بہت چھوٹی عمر سے ماں کی آغوش کے لیے ترستا رہا تھا اور اپنے سوالوں سے انہیں زچ کر ڈالتا تھا یہاں تک کہ انہیں اسے سن کر کے اپنی کہانی سنانا پڑی تھی اور وہ اسی آس میں دن کا تباہنا ہو گیا تھا کہ ماما کی بابا سے صلح ہو جائے گی اور پھر وہ سب اکٹھے رہیں گے۔

”وہ ان کی بھی ماں ہیں بیٹے! ذہن اور سوچ کو وسیع رکھنا چاہیے۔“ وہ ناراضی سے انہیں تکنے لگا۔

”وہ صرف میری ماما ہیں بابا! نو کھپو و ماژن۔ میں بالکل شراکت پسند نہیں کروں گا۔“ وہ تنفر سے کہتا اٹھ کر چلا گیا۔ ہارون کچھ سوچ رہے تھے۔



ہلکی بوند باندی موسلا دھار بارش کا روپ دھار گئی تھی جب وہ دوڑتا ہوا لان عبور کرنا اندرونی حصے کی جانب آیا۔ ہر سو خامشی اور سناٹا تھا۔ اس نے ایک دروازہ کھولا۔

”اماں! اماں کہاں ہیں آپ؟“ لاؤنج پورہ ہی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ ایک قدم بڑھا اور کسی شے سے الجھ کر لڑکھڑاسا گیا۔

”افوہ کہاں ہیں سب! اور یہ اندھیرا؟“ معا ساری لائٹیں مل بھر میں آن ہوئیں اور پورا لاؤنج روشنیوں سے بھر گیا۔ سامنے پھولوں سے سجی ٹرائی پر رکھا اس کا من پسند کیک رکھا تھا۔ اور موم بتیاں لگی تھیں۔ یہ سارا ایونٹ معاز کے لیے بے حد حیران کن تھا۔ ٹرائی سے کچھ فاصلے پہ کھڑی اسوہ مسکراتی ہوئی داد طلب نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی اس کے حیرت زدہ چہرے پہ ساری بات سمجھ میں آتے ہی یکایک گہبیر قسم کی سنجیدگی چھا گئی۔ تب ہی ضویا ہاتھ میں سرخ اور گلابی پھولوں کا بالکل تازہ کبے لیے اس کی طرف بڑھی تھیں اور والہانہ انداز میں اس کی پیشانی چوم کر اس کے لیے چوڑے وجود کو اسے بازوؤں میں بھرنے کی ناکام سی کوشش کی اسوہ نے آگے بڑھ کر سی ڈی پلیٹر آن کر دیا تھا بھی برتھ ڈے نوبو سے پورا لاؤنج کو بچنے

لگا۔ وہ لب بچنے کسی قدر خفا نظر آ رہا تھا اسوہ اور ضویا کی آنکھوں میں اس پل جو خوشی کے جگنو جگنو کر رہے تھے ان کی جھلملاہٹ اسے کچھ بھی کہنے سے باز رکھے رہی۔

”آؤ نا بیٹا! ایک کاٹو۔“ ضویا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا تب وہ محض ان کا دل رکھنے کی خاطر آگے بڑھ آیا۔

”کیا بات ہے بیٹا! آپ بہت سیریس ہو۔ تمہارے بابا شریک نہیں ہیں مگر وہ اس طرح کی باتوں کو اچھا نہیں سمجھتے نا۔ میں تو اس لیے...“

”اچھا تو میں بھی نہیں سمجھتا امی! یہ تو انگریزوں کی رسمیں ہیں جو مجھے وقت اور پیسے کے ضیاع کے ساتھ دین سے دوری کا باعث ہی لگتی ہیں۔“ وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔

”اسوہ! مجھے اس قسم کے تکلفات پسند نہیں۔“ اس نے اسوہ کو مخاطب کیا جو اسے گفت پیش کر رہی تھی۔ وہ دھواں ہوتا چہرہ لیے بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹی اور ایک جھٹکے سے پلٹ کر باہر نکل گئی۔

”مجھے تم پر فخر ہے بیٹا! تمہارے باپ نے تمہاری تربیت بہت اچھے انداز میں کی ہے، میں شاید کبھی تمہیں اتنا مکمل اور اسٹرانگ نہ بنا سکتی۔“

ضویا کی آنکھوں میں نمی تھی۔ ”مجھے اپنے بابا پہ فخر ہے انہوں نے بہت جدوجہد کی ہے میرے لیے آپ نے آپ کو پتا ہے مجھے منزل پہ پہنچانے کی خاطر انہوں نے اپنا آرام اپنا سکون اور خوشی سب کچھ مجھ پہ نچھاور کیا وہ دن کو کام کرتے تھے تو رات کو جاگ کر مجھے پڑھاتے تھے وہ کہا کرتے تھے جو میرے پاس نہیں رہا۔ وہ مجھے دلوائیں گے اماں وہ مجھے پولیس ڈپارٹمنٹ میں دیکھنا چاہتے تھے مگر میں نے انکار کر دیا پتا کیوں؟ اس لیے کہ یہ صرف بدنام شعبہ ہی نہیں ہے یہاں واقعی بہت دھاندلی ہے میرے بابا ایک ایمان دار آئیے تھے بہت کچھ کھو کر وہ اس پوسٹ تک پہنچے تھے کہ ایک ذرا سی بات کو بنیاد بنا کر انہوں نے بابا کو برطرف کر دیا۔“

ضویا مجرم سی بنی اسے تکنے لگیں کیا اگر یہ جان لے کہ اس کے بابا کی نوکری ہی نہیں زندگی کی بھی لڑائی کی وجہ سے ہے تو وہ انہیں معاف کر دے گا اتنی ہی بات سے ملے گا ان سے۔

”چپے گئی تھیں۔“

”کے چلتا ہوں اور ہاں اپنی بیٹی سے کہیے گا مجھ پہ۔“

”اور اپنے جذبات ضائع نہ کرے یہاں وال نہیں لے گا۔“ آخر میں وہ کچھ شرارتی سا ہوا تھا۔ ضویا نے ہنسنے سے اسے دھپ لگا دی۔



”کیا ہو رہا ہے؟“ سارے گھر میں انہیں تلاش کر کے جب بچن میں جھانکا تو انہیں مصروف دیکھ کر حیران کیا۔

”ارے بابا جانی! آپ کو کنگ کر رہے ہیں۔“ اسے ایک فحالت نے گھیر لیا۔ کام سے واپسی پہ ٹھکن اتنی تھی کہ وہ بستر پہ ذرا دم لینے کو لیٹا تھا مگر بتا نہیں کب لگا لگ گئی۔

”پینشن آلیٹ بنا رہا ہوں۔ تمہیں پسند ہے نا؟“

”اس نے انڈے توڑ کر باؤل میں ڈالتے ہوئے مصروفیت سے واپس آیا۔

”تمہیں آپ میں کرنا ہوں۔“ اس نے کاندھوں سے تمام کر مٹانا چاہا۔

”ارے یار! تم تو ایسے کانٹھس ہو رہے ہو جیسے میں یہ کام پہلی مرتبہ کر رہا ہوں۔“ وہ مسکرائے۔

”جی! اس نے ٹھنڈی سانس کھینچا اور پھر کسی قدر سے ہوئے لہجے میں بہت دکھ سے گویا ہوا تھا۔

”سے ہاں ہمیشہ سب کچھ انوکھا ہی تو ہوتا آیا ہے جو گول کی اماں میں کرتی ہیں وہ کام ہمارے بابا کو کرنے پہلے ہوئے آلوؤں کے باریک قتلے کاٹتے ہوئے وہ اس کو نکال گیا انہوں نے اس کے چہرے کے شاکی بات کو بغور دیکھا۔ کیا بات ہے معاز! آج سے پہلے تو نے کبھی اس قسم کے شکوے، شکایات نہیں کیے۔“

”آج سے پہلے مجھے ماں کی کمی اس حد تک محسوس بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے کہ میں ماں سے واقف ہی نہیں تھا۔“

وہ کیا کہتے خاموشی سے کھڑے رہے۔

”بابا جانی آپ امی کو لے آئیں۔ میری خاطر اب مجھ سے مزید صبر نہیں ہوتا۔“ وہ بھاری آواز میں کہتا لب کھلنے لگا، کسی معصوم سے ضدی بچے کی طرح۔

”مجھے حوصلہ ہی نہیں ہوا معاز! میں کیسے کہتا۔ یہ بات تو شاید تمہاری ماں کو خود سوچنا چاہیے تھی شاید یہ گھرانے کے رہنے کے قابل نہیں ہے۔ میں پہلے بھی اس سے کہتا تھا اور شاید وہ مجھے اب بھی خود سے کم درجے پہ ہی سمجھتی ہے۔“

معاز نے چونک کر انہیں دیکھا وہ جسے بے خیالی میں کہیں ماضی میں پہنچ گئے تھے معاز آہستگی سے پلٹ گیا۔



”امی! امی!“ وہ اندر داخل ہوتے ہی انہیں پکارنے لگا تھا۔ ضویا جو اسوہ کے ساتھ ایزی کی بری میں چڑھانے والے زورات دیکھ رہی تھیں اس کی آواز پہ بے ساختہ مسکرائیں۔ وہ بھی وہیں آ گیا۔

”امی چلیں میرے ساتھ۔“ ان کا ہاتھ پکڑ کر اسے قدموں واپس ہوا تو ضویا بوکھلا سی گئیں۔

”مگر کہاں؟“ جبکہ اسوہ بس ایک ٹک اسے دیکھ رہی تھی، لگا آسمانی رنگ کتنا بچ رہا ہے اس پہ اسے اس رنگ کے لباس میں دیکھ کر سوچ رہی تھی۔

”جہاں میں لے چلوں۔ چلیں گی؟“ وہ اچانک ان کی جانب پلٹ کر آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ ”غلط جگہ پہ اتنا اچھا ڈانیا لگ بول کر مزہ ہی کر کر کر دیا۔“ اسوہ موجود ہو اور آس پاس معاز بھی پھر بھلا ممکن تھا کہ اس کی شوخی پہ بند بندھے ضویا مسکراتی تھیں جبکہ معاز نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا۔

”تمہیں یاد ہے میں نے ایک بار پہلے بھی تم سے کہا تھا، مجھے بے باک لڑکیاں بالکل پسند نہیں ہیں۔“ اس کا

لجہ کسی حد تک تلخ تھا۔
 ”میری خوش بختی کے لیے یہی کافی ہے کہ تم مجھ سے کئی باتوں کو یاد رکھے ہوئے ہو۔“ اس کی چونچالی عروج پہ تھی۔
 معاذ جیسے زچ سا ہو گیا۔
 ”بالکل چلوں گی بیٹا چلو۔“ ضویا نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی۔
 ”چلیں اور اس گھر سے جو لینا ہے لے لیں میں آپ کو ہمیشہ کے لیے لینے آیا ہوں۔“
 وہ اتنا بڑا فیصلہ تنہا کر کے بھی بہت پرسکون تھا۔
 ضویا نے چونک کر اسے دیکھا۔
 ”کیا لوں گی جہاں جا رہی ہوں۔ وہاں بھی تو میرا سب کچھ ہے۔ تمہارے اور تمہارے پیاسمیت۔“
 وہ اتنے اعتماد سے مسکرا کر گویا ہوئی تھیں کہ معاذ جو واقعی انہیں آزمانے انہیں پرکھنے آیا تھا ایک پل کو حیران رہ گیا۔
 ”اب چلیں۔“ وہ بہت میٹھی مسکراہٹ سمیت اس کے وجہ چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ رہی تھیں۔
 ”ہاں چلیں۔“ وہ حواسوں میں لوٹا جیسے یکایک آسمانوں کی بلندیوں پہ اڑنے لگا۔
 ”آخر میری ماں ہیں بابا تو بس یونہی ڈرتے رہے۔“ اس کا سر لکھت ہی نخر سے بلند ہوا۔
 ”مگر مام! یہ یہ کیسے ہو سکتا ہے میں تو آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی پھر یہ گھر ایزی کی شادی۔“
 جب وہ واقعی اس کے ساتھ چل دیں تو اسوہ جو اس اچانک سچویشن پہ غیر یقینی سے ساکت تھی جیسے ایک دم سے چیخی۔
 ”سب کچھ ہوگا ایزی کی شادی بھی اور تمہاری رخصتی بھی خاطر جمع رکھو۔“
 انہوں نے اس کے سٹپائے ہوئے انداز پر کہا۔
 تب ان کی بات سے اپنی مرضی کا مطلب اخذ کرتے اس کا دل سنبھلا تھا۔
 ”ہی! آپ کو خود یہ خیال کیوں نہیں آیا؟“ راستے میں اس نے دل میں مچلتا سوال پوچھا۔ وہ مسکرائیں۔

”میں تمہارے بابا جانی کی جانب سے پیش رفت کی منتظر تھی، لیکن خیر تم تو مجھے ان سے بھی بڑھ کے ہو۔“ انہوں نے بہت محبت سے کہا۔ معاذ کھل کر مسکرایا۔
 ”اب میں بابا جانی سے آپ کی بات برصا چھا کر پیش کروں گا۔“ اس نے آنکھیں نیچائیں اور ان کی آخری بات پر گرفت کی۔
 ”یعنی لگائی بھائی کرو گے۔ پہلے ان سے ڈھنگ سے صلح تو ہونے دو۔“
 وہ بے اختیار ہنسی تھیں، ان کی ہنسی میں معاذ کی ہنسی بھی شامل ہو گئی۔
 ”یہ تو پاگل ہے ابھی تک بچہ بنا رہتا ہے۔ آپ کو تو سمجھ داری سے کام لینا چاہیے تھا ضویا! اکیلی بچی کو چھوڑ کر چلی آئیں۔“
 ہارون اندر کی کیفیات چھپائے بہت فکر مندی سے گویا ہوئے، جبکہ معاذ بہت مزے لے لے کر اسی گھٹی کھا رہا تھا، جو اس نے ضویا سے فرمائش کر کے وہی مسالے ڈلو کر بنوایا تھا۔
 ”یعنی دوسرے معنوں میں آپ میرے اپنے گھر میں آنے پہ خفا ہو رہے ہیں۔“ ان سے معافی تلافی کر لینے کے بعد وہ بہت مطمئن اور سرشار نظر آ رہی تھیں۔ ہارون ذرا سا خفیف ہوئے۔
 ”یہ بھلا کیوں چاہوں گا میں۔ میں تو اس بچی۔۔۔“
 ”نہ بابا! اس بچی کی اتنی فکر کیوں ہے آپ کو۔ محترمہ تیس سال کی ہو چکی ہیں۔“ معاذ چڑ گیا۔
 وہ کچن میں کسی کام سے گئیں اور واپس آئیں تو ہارون کو ایک بار پھر سوچ میں گم دیکھا تو نزدیک آ کر اپنا ہاتھ ان کے کاندھے پر رکھ دیا۔
 ”پریشان کیوں ہوتے ہیں۔ اسوہ کو یہاں لانے میں کوئی حرج نہیں تھا، مگر میں باضابطہ طریقے سے اسے لانا چاہتی ہوں۔“
 ہارون نے چونک کر ان کی مسکراہٹ دیکھی۔
 ”مطلب؟“
 ”مطلب یہ کہ اپنے معاذ کی دلہن بنا کر۔ وہ بہت پسند کرتی ہے معاذ کو۔“

”یہ بیڑ ہے جو آج میں بالخصوص تمہیں تمہارے اس وجود کو خراج پیش کرنے ہوں گا جانتی ہو کیوں اس لیے کہ تمہیں اپنی اصلیت بتا چل جائے تم نے ایزی سے نکلی تھی بلاؤہ اس کا گھونکھٹ فوج کر زبردستی چہرہ اٹھاتا، اس کی دہشت سے پھٹی آنکھوں میں اپنی سفاک بے رحم نظریں گاڑھ کر بولا، حوریہ کا دل دھڑکنا بھولنے لگا، اب ایزی تمہیں بتائے گا کہ اس روز اگر تمہاری فرزندگی وجہ سے میں کامیاب نہ ہوا تو اسے اب میں پایہ تکمیل تک پہنچاؤں گا۔ عجیب سے انداز میں ہنسنا۔ اس سے پہلے کہ حوریہ اس بدحواسی سے نکل کر اپنا بچاؤ کرتی، وہ تمام لائیں آف کرنا اس تک آیا تھا۔“
 ہارون نے ہست تفاقا تر سے بتایا۔
 ”ہارون ٹھٹکے تھے۔“
 ”میں نے تو کچھ ظاہر نہیں کیا۔ سہرا میں اس کی بے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گی۔ ڈونٹ انہوں نے تسلی دی۔“
 ”تھینکس!“ ہارون واقعی مطمئن ہوئے تھے۔
 ”تھینکس، نو سو ری۔“ کچھ دیر تک یونہی شگوہ بھری نظروں سے تکتے رہنے کے بعد وہ تحقیق سے بولی تھیں، ہارون اسرار بہت عرصے سے دل سے مسکرائے۔
 * * *
 بہت سارے خدشات واپس اور خوف لیے حوریہ نے اپنے باپ کی دلیر چھوڑی اور ایزی کے سنگ اس کے گھر رخصت ہو کر آئی۔ وہ قسمت کی ستم ظریفی پہ ہنسنا ہونے کے بعد اب شاکی ہو گئی تھی۔ اعتماد میں بھروسا مان سب کچھ ہی تو بکھر گیا تھا۔ اب کیا بچاؤ تھا ایک ٹوٹا ہوا دل اور سوختہ بدن۔ وہ ایزی پہ یقین کرنے لگتی، جبکہ اس کے چاہنے والے شفیق باپ نے ان میں اسے خود اس کی نظروں سے گرا دیا تھا۔
 ”اس کے بیڑوم تک پہنچا گئی تھیں۔ ایزی کی طرف اس نے ایک مرتبہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ دل نہیں چاہا، حالانکہ کتنی ہی رسموں کی ادائیگی کے وقت وہ اس کے برابر ہی تو بیٹھا تھا، پتا نہیں وہ واقعی خوش تھا یا خوش نظر آنے کی ایکٹنگ کر رہا تھا۔ کمرہ بہت خوبصورتی سے سجا ہوا تھا، بہت آرٹسٹک انداز میں کپڑوں سے آرائش کی گئی تھی، مگر اس کا بو جھل رازہ دل کچھ بھی محسوس کرنے سے قاصر تھا۔
 ”میرے دھیرے دھیرے بتتی جا رہی تھی۔ رات کا دوسرا بج رہا تھا، ہارون نے اندر قدم رکھا۔ شیروانی اتار کر پھینکی، پھر الماری میں کچھ کھٹ پٹ کر مارا، اس کے بعد اس کے پاس آ گیا۔ حوریہ کے وہی احساسات اب بیکارگی خوف اور وحشت کا شکار ہو گئے۔“

”یہ بیڑ ہے جو آج میں بالخصوص تمہیں تمہارے اس وجود کو خراج پیش کرنے ہوں گا جانتی ہو کیوں اس لیے کہ تمہیں اپنی اصلیت بتا چل جائے تم نے ایزی سے نکلی تھی بلاؤہ اس کا گھونکھٹ فوج کر زبردستی چہرہ اٹھاتا، اس کی دہشت سے پھٹی آنکھوں میں اپنی سفاک بے رحم نظریں گاڑھ کر بولا، حوریہ کا دل دھڑکنا بھولنے لگا، اب ایزی تمہیں بتائے گا کہ اس روز اگر تمہاری فرزندگی وجہ سے میں کامیاب نہ ہوا تو اسے اب میں پایہ تکمیل تک پہنچاؤں گا۔ عجیب سے انداز میں ہنسنا۔ اس سے پہلے کہ حوریہ اس بدحواسی سے نکل کر اپنا بچاؤ کرتی، وہ تمام لائیں آف کرنا اس تک آیا تھا۔“
 * * *
 وہ اپنی خوش بختی پر جتنا ناز کرتی کم تھا، اس نے جو چاہا تھا اسے مل گیا تھا۔ جس بل وہ اپنی پور پور سجائے معاذ کے پہلو میں بٹھالی گئی۔ منٹوں میں وہ اس کی بنا دی گئی۔
 ”آہم!“ اس نے باقاعدہ کھنکار کر اس کی توجہ حاصل کی، جو آج بلیک ٹوپس میں مردانہ وجاہت کا شاہکار نظر آ رہا تھا۔
 ”جیت لیا نا تمہیں بہت اکڑتے تھے۔“ وہ تفاقا خزانہ ہنسی۔
 ”میں نے کہا تھا میں اپنے بابا جانی کی کوئی بھی بات نالتا نہیں ہوں۔ یہ میرے بابا جانی کا حکم تھا، اس کے باوجود مانا کہ میں اسے ماننا نہیں چاہتا تھا۔“ اس نے بہت سکون سے کہا کہ کبھی اس کی ذات کے پرچے اڑا دیے تھے اور اٹھ کر اپنے دوستوں کے پاس چلا گیا۔ اسوہ کم صم بیٹھی تھی۔
 * * *
 ”مجھے مبارک باد دیں امی! آپ کے بیٹے کو ٹیکسٹا یونیورسٹی سے لیکچرر شب آفر ہوئی ہے۔ رہائش کی سہولت بھی ہے اور گاڑی بھی۔“ وہ آتے ہی ضویا سے

پیشا تھا۔
 ”اللہ مبارک کرے میرے چاند!“ ضویا نے نہال ہو کر اس کی پیشانی چومتے ہوئے دعاؤں سے نوازا۔
 ”چلیں جی۔ موصوف پہلے کچھ کم پر اوڑھے۔ رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی۔“ اسوہ نے منہ ہی منہ بڑبڑا کر کہا اس کی یہ بڑبڑاہٹ نزدیک ہونے کی وجہ سے حوریہ نے سنی تھی اس نے چونک کر اسے دیکھا۔
 ”بھابھی کسی کی خوشی پہ جلنے والوں کو کیا کہتے ہیں“ بھلا؟“ وہ حوریہ کو مخاطب کرتا کن اکیوں سے اسوہ کو دیکھنے لگا۔
 ”تمہارا سرا! وہ زور سے چیخی اور پیر پختی اٹھ کر چلی گئی۔
 ”تم نے اسے خفا کر دیا جاؤ مناؤ۔“ ضویا نے کہا۔ وہ مزید پھیل کر بیٹھ گیا۔

”ابھی یہ ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوتی۔“
 پھر ضویا کے آنکھیں دکھانے پہ معصومیت سے آنکھیں ہنپٹا کر بولا۔
 ”ابھی رخصتی نہیں ہوئی نا!“
 ”تو منع کرنے والے بھی تو تم تھے۔“ ضویا نے فوراً ”جتایا وہ جو اب!“ کا دھمے اچکا کر ہنسنے لگا۔



حوریہ نے اس کے کمرے کے پردے ہٹائے۔ کمرہ سمیٹنے لگی۔ کتنا پھیلاوا تھا، چائے کے خالی گک، سگریٹ کی ڈبیاں، لائٹس، کٹن جو بے ترتیب تھے وہ کتنی ہی دیر انہی کاموں میں مصروف رہی اور اس سے لاعلم بھی کہ ایزی کب سے اسے دیکھ رہا ہے۔ کتنی عجیب لڑکی ہے۔ میری اتنی زیادتیوں پر بھی کبھی نہیں کچھ کہا۔ کوئی شکوہ نہ شکایت نہ لگے کیا ہے یہ نفرت مگر نہیں۔ اس نے اپنا خیال خود ہی جھٹک دیا، کیا ہے یہ محبت ہے اس کا دل دھڑکا اور دھڑکتا ہی چلا گیا۔
 کیا یہ دل رباسی لڑکی مجھ سے محبت کرتی ہوگی۔ اس کے دل میں پکڑ دھکڑ سی ہونے لگی۔ اسے اس طرح سے سوچتا اسے دیکھنا اچھا لگنے لگا تھا، جیسی تو حوریہ

جب اپنا کام پختا کر باہر جانے لگی تو ایزی نے بے اختیار اسے پکار لیا تھا۔
 ”جی!“ وہ حیران سی ہو کر اسے دیکھنے لگی، وہ اسی طرح نرمی اور آہستگی سے بھلا کب پکارا تھا اسے۔
 ”کہاں جا رہی ہو، یہیں رہو میرے پاس۔“ وہ دل کی خواہش پہ بند نہیں باندھ سکا۔
 ”آپ کے لیے چائے بنانے جا رہی ہوں۔ بس آتی ہوں۔“ حوریہ نے نرمی سے کہا۔
 ”جلدی آنا، اس لیے کہ میں ان زخموں پہ گلاب بنا کر مہکانا چاہتا ہوں، جو تمہیں مجھ سے ملے ہیں۔“
 اس نے بہت آہستگی سے مسکرا کر کہا، حوریہ پہلے چونکی اور پھر میں اس کی نگاہوں کی معنی خیز شرارت پہ جینپ کر باہر نکل گئی۔



آسمان سیاہ گھٹاؤں سے بھرا ہوا تھا۔ چھما چھم موسلا دھار مینہ برس رہا تھا۔ فضا میں موجود کٹر اس وقت کچھ اور بھی گہرا محسوس ہونے لگا۔ لان میں موجود تمام درخت پودے ہواؤں کی شوریدہ سری پہ اوڑھ اوڑھ جھوم رہے تھے۔ موسم تو بہت اچھا تھا۔ اس کا اپنا ہی دل اور اس تھا۔ اس نے نکاح پہ کھینچی تصویروں کو دیکھا تھا اور گم صم ہو گئی، جو اس وقت بھی سنجیدہ نہیں ہوئی تھی، جب معاذ نے متعدد بار اس پہ اپنی ناپسندیدگی بتائی تھی۔

کیا محبت کے بغیر زندگی گزر سکتی ہے، کیوں زور زور سے اس نے اسے پکارنے پانے کا احساس تو اور بھی تکلیف دہ ہو گا، وہ کل شام بھی آیا تھا۔ ایزی سے ملنے تب وہ موجود تھی، مگر ایک نگاہ غلط بھی نہیں ڈالی تھی ایزی کے کہنے پہ وہ اس کے لیے چائے بنا کر آئی تھی، مگر وہ منع کر چکا تھا۔ اس کے باوجود وہ باہر آئی اور وہ اس سے ملے بغیر چلا گیا۔ ایک وہ تھی جو اسے دیکھنے کے لیے جتن کرتی تھی۔ کیسا کھوڑا تھا وہ۔ خاص طور پہ اس کے لیے، اس سے بات کرتے ہوئے اس کے سمجھے میں دنیا بھر کی ترسی اور کھر در اپن شامل ہو جاتا تھا۔

”خوبصورت ہونا بھی سزا ہو گئی، چڑیل کا سایہ ہو جاتا ہے مجھے مجھ پہ۔“ وہ شریر ہوا اور اسوہ کی انگی سانس بحال ہو گئی۔

”اور جیسے بابا؟“ اس نے بدلہ چکایا۔
 ”میں امی کو بتاتا ہوں۔ تم انہیں کیا کہہ رہی ہو۔“
 اس نے دھمکایا ہی نہیں باقاعدہ اٹھ کر اندر کی سمت چلا گیا۔ وہ بوکھلا کر اس کے پیچھے بھاگی۔

”امی! یہ آپ کی بہو آپ کو پتا ہے کیا کہہ رہی ہے۔“ اس نے اندر جاتے ہی زور سے کہا اور اس نے اتنی سرعت سے بڑھ کر اس کا بازو تھام کر لجا جت سے منع کیا کہ ضویا اور ہارون اسرار بھی معنی خیزی سے ہنس پڑے وہ جھل سی ہو گئی۔

کچھ دیر بعد وہ جب ان کی شادی کی تاریخ فائنل کر رہے تھے۔ ایزی نے بے خیالی میں سگریٹ سلگانا چاہا تھا۔ حوریہ نے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے ٹوکا تھا اور آنکھوں میں نفی کا اشارہ کیا۔ معاذ نے دیکھا اور مصنوعی انداز میں کھانسا۔ دونوں چونکے اور جھل ہو گئے۔ یہی تھے محبتوں کے مان اور استحقاق۔ بالکل ویسے جیسے ایزی نے سگریٹ واپس رکھا تھا، جیسے ابھی مام نے بابا کی جیب سے والٹ نکال کر مطلوبہ رقم لی تھی، جیسے اس نے معاذ کو شرارت سے روکا تھا، ویر سے سہی مگر من چاہا احساس ان سب نے پایا تھا۔



”کیا سوچ رہی ہو اور اس بلبل کی طرح۔“
 اس کی بھاری گھبیر آواز پہ وہ جو اسے ہی سوچ رہی تھی اپنی جگہ زور سے اچھلی اور اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”اس سے کچھ فاصلے پہ بیٹھے ہوئے وہ سنجیدگی سے بولا۔ اسوہ نے جواب دینا ضروری سمجھا اور لب کچل کر آنسو اندر اٹارتی رہی، جو دیکھتے ہی جانے کہاں سے آنکھوں میں جمع ہونے لگی۔

”اس لیے کہ میں کل جا رہا ہوں یا اس لیے کہ میں نہیں لغت نہیں کراتا رہا ہوں۔“ اب اس نے مچلتی مگر اہٹ ضبط کی تھی۔ اسوہ نے غضب ناک نظروں سے اسے دیکھا، مگر آج ان نگاہوں کا رنگ انوکھا تھا۔ وہ بھر سے زیادہ نہیں دیکھ سکی۔ پلکیں حیا سے لرزی لگیں۔

”یار! میرا ارادہ تو مکمل استحقاق کے بعد تمہیں ملنے کا تھا، مگر یہ بابا کا آرڈر تھا۔“

”وہ تو تم ان کے کہنے پہ آئے ہو۔“ وہ جو سب کچھ بھلا کر خوش ہو چلی تھی، چیخ کر بولی۔

”ہاں یہ تو ہے، اس لیے کہ اپنے بابا کی کوئی بات تو میں ماننا نہیں ہوں۔ ورنہ تم جیسی لڑکی۔“ وہ اب اسے دیکھ رہا تھا، ورنہ آنکھیں تو کچھ اور کہہ رہی تھیں۔

”کیا؟“ اس کی پوری بات سے بغیر چیخی۔
 ”تم جیسی محبت کرنے والی لڑکی کو ابھی اور ستانے کا ہوا تھا۔“ اس نے سر کھجایا۔

”میری محبت تو دیکھ لی کچھ اپنی محبت کے بارے میں کہتا ہے؟“ اس نے فوراً ”خبر لی۔“

”اٹو یار! جب ساتھ رہیں گے تو محبت بھی ہو ہی سکتی ہے۔“ وہ بے نیاز بنا۔

”جی جیسے تمہارے بابا جانی کو مام سے۔ سنا ہے مام نے تمہارے بابا سے ایسی ہی طوفانی محبت ہو گئی تھی۔“

”بات کرتے ہوئے اس کا چہرہ دیکھنے لگی، جہاں پہلے تھی۔“

”خفا ہو گئے؟“ وہ ڈری۔

عمران ڈائجسٹ کا ایک حیرت انگیز سلسلہ

ایئر سوسائٹس

اب دو حصوں میں شائع ہو گئی ہے،

مکھوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 2216361

عالیہ بخاری

دلکشا

خیام کا تعلق اس دنیا سے ہے جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ ستارہ نانی، نگینہ خارا اور دلدادہ نانی نے اس کی پرورش بے حد ناز و نعم سے کی ہے۔ پھر بھی وہ اس زندگی سے سخت کبیرہ خاطر ہے۔ حتیٰ کہ ایک دن وہ اس گھر سے کسی کو تلتے بغیر نکل آتا ہے۔ راستے میں اس کا ٹکراؤ سالار سے ہوتا ہے جس سے اس کی سنا سنائی ہے، جو ریڈیو پر کام کرتا ہے۔ سالار تمام معاملہ فی الفور سمجھ جاتا ہے۔ گھر سے نکلے ہوئے خیام رقم کے علاوہ نانی کے زیورات بھی اٹھا لیتا ہے، جس پر اسے کوئی پشیمانی نہیں ہے۔ سالار لڑی اڈتے تک خیام کو چھوڑتا ہے۔ خیام کے لیے سالار کا دلیر حیران کن ہے۔ شہر آکر اسے کئی روز تک بے روزگار رہنا پڑتا ہے۔ وہ بالوشوٹ کے موٹیل میں قیام کرتا ہے۔ زیورات کے ساتھ گئی آرا کی پوزیشن دیکھ کر خیام کو شدید جھٹکا لگتا ہے اور وہ ہلی مرتبا پتے پیچھے رہ جانے والی کا بھر دسا لوٹ جانے کا دکھ ہوتا ہے۔

ریحہ کا تعلق سفید پوش خاندان سے ہے۔ اس کے والد سرکاری محکمے کے ایمان دار میڈیکلرک ہیں جبکہ بھائی معاذ بالکل آبا کا پرتو نانی کا بولیا میں وہ ہر چیز بھولے رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی پڑھائی بھی۔ اماں اور دادی ہر دم معاذ اور ریحہ کے لیے دعا گو ہیں۔

دوسرا گھرانہ اظہار حجاز کا ہے جو ظاہری نمود و نمائش اور پیسے کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ سرکاری محکمے میں کلرک ہونے کے باوجود وہ ادب پر کی کمائی سے اچھا خاصا کمایکے ہیں۔ خاندان بھر میں ان کی اطاعت کی و عوم ہے۔ بچپن میں بڑے بیٹے سلمان کی نسبت ریحہ جبکہ جو یا کی بات معاذ سے ملے ہوئی تھی لیکن بدلے حالات نے اس فیصلے پر خاک ڈال ہے۔ چلنے سلمان کی منگنی شہر کے مقبول بزنس مین یوسف کمال کی بیٹی زویہ کمال سے کر دی، جس پر سب کو صدمہ ہوتا ہے۔ ریحہ اس اقدام پر نسبتاً مطمئن ہے۔ جو یا اور معاذ دل ہی دل میں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں لیکن حالات موافق نہیں ہیں۔



جس جذبات میں وہ یہ بھول رہی تھیں کہ اس خاندان کے یہی چار پیسے کل تک ان کے لیے بھی "وجہ تھی۔"

آج بھی ان کے لیے ہونے قیمتی تحائف کی ہر آئے گئے کے سامنے نمائش کرنا وہ کتنا ضروری سمجھتی ہیں۔

ابو! طبیعت تو ٹھیک ہے؟" "آزام سے بیٹھ جائیں نا کھڑے کیوں ہیں!"

خاموش ہو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ آگے بڑھی تھیں مگر اظہار صاحب بنان کی کسی بات کا لیے تیزی سے باہر چلے گئے۔

سے لگی کھڑی زویا اور پھر جو یا کی طرف بھی نگاہ اٹھا کر انہوں نے نہیں دیکھا تھا شاہرہ بیگم کے رونے کی شدت آ رہی تھی۔

بس بھی کہیں "کون سی نئی بات ہو گئی ہے، کتنے دن پہلے سلمان بھائی بتا چکے تھے کہ وہ لوگ یہاں نہیں آئے پھر بھی آپ ہیں کس۔"

بٹ بٹ بٹ میں کہتے ہوئے زویا نے بات اور صوری چھوڑی۔

اس کے جانے کو کون رو رہا ہے۔ "آپا گل نے خفگی سے زویا کی طرف دیکھا۔ "رونا تو اس بات کا ہے کہ ہمیں کس بات کی سزا دے رہا ہے جو اپنے ساتھ نہیں لے جا رہا بوڑھے ماں باپ کو اکیلا چھوڑنا وہ بھی جو ان کے ساتھ کہاں کا انصاف ہے۔"

"یہاں اور کون کون سی باتوں میں انصاف ہو رہا ہے اتنی بڑی بڑی نا انصافیاں آپ لوگوں نے بھی تو کی ہیں، یہ سب کو بھی کرنے دیں۔"

کہتے ہوئے کمرے کے وسط میں آکھڑی ہوئی۔

بھاشا ہے تمہیں بجائے ماں باپ کی تکلیف کا احساس کرنے کے، طعنے دینے کھڑی ہو گئیں سب سمجھتی ہیں کہ کس کے حق میں بولا جا رہا ہے۔ یہ جو تم دونوں کا گٹھ جوڑ ہے پتا نہیں اور کیا رنگ دکھائے گا۔"

زندہ تاج بیگم کے ہنگامے کو شہر بھر میں خصوصی شہرت حاصل ہے۔ بیٹے کی پہلی جماعت کو یہاں سے عزیز عورتوں کو امداد دی جاتی ہے۔ غلام افزو سعیدہ اور بول جیسی کتنی ہی عورتوں کے گھرانے امداد کے سہارے مل رہے ہیں۔ بوا عظمت، زندہ تاج بیگم کی خاص ملازمہ ہے جو عرصہ دراز سے اس کام کو سنبھالے ہوئے ہے۔ وہ طبعاً سخت مزاج ہے۔

مسلمان رفتہ رفتہ زویا کی امداد سے متاثر ہو کر اس کے زیر اثر آ جاتا ہے۔ زویا اپنی من مانیوں سے ہر ماٹرونا جائز ہر طرح کی خواہشات موزا لیتی ہے۔ اظہار چچا، شاہرہ بیگم اور ناگل سولے تملانے کے کچھ نہیں کر پاتے۔ ان کی تمام امیدیں زویا کو ملنے والے ہنگامے سے وابستہ ہیں۔ اسکول کے نئے ساجد کے معاملے پر معاذ پر تا ملازمہ حملہ ہوتا ہے جس سے وہ شدید زخمی ہو جاتا ہے۔ سلام صاحب کی پوری فیملی شدید کوفت اور پریشانی کا شکار ہوتی ہے۔ ریوینا اس معاملے کے بعد معاذ سے اسکول کے معاملات سے علیحدگی چاہتی ہے۔ اظہار چچا خاندان مع سولے جو یا اور زویا کے اس معاملے سے خوب غصا اٹھاتا ہے۔ جو یا چاہتے ہوئے بھی معاذ کے لیے کچھ نہیں پاتی۔

دلدار تانی کے چرچا کے رشتہ داروں دن بدن بڑھتی جا رہی ہے جس پر نگینہ آئے دن ملتی کڑھتی رہتی ہے۔ شام ہر موقع پر اس کی اشک شونی کرتی ہے۔ نگینہ کی تمام امیدیں اپنی بڑی بیٹی صنابل سے وابستہ ہیں۔ نگینہ زیادہ تر بھائی کی وجہ سے معاملات سے الگ ہی رہتی ہے۔ لیکن خیام کی یاد اس کے خیالوں کی دنیا کو آباد کرتی ہے۔ ستارہ تانی کے یہاں سالانہ آمد و رفت اسے قدم بے قدم چھین کرنے لگتی ہے۔

خیام کچھ عرصے بعد ہی ایک بس سروس کمپنی میں معمولی نوکری کر لیتا ہے۔ دن رات اپنوں سے دوری اسے بھی ستاتی ہے۔ خاص کر نگینہ کی چوڑی اسے ملائی کی کیفیت سے دوچار رکھتی ہے۔ بدنامی کا خوف اسے کسی کے قریب نہیں ہونے دیتا صرف بالوشوکت سے اس کی اجھی دے اسلام ہے کہ اجانک تمام تراختیا طے کے باوجود گھر سے لائے زیورات کی چوڑی ہو جاتی ہے۔ یہ زیورات اس کے مستقبل کی ضمانت تھے۔ اس کے بعد مستقبل پر ایک سوائیہ نشان لگ جاتا ہے۔

زندہ تاج بیگم اپنے کلاس کی دیگر عورتوں کی طرح خود غمانی اور خود ستا لشی کا شکار ہیں۔ بڑھاپے سے باہر مقیم ہے۔ انہیں لباس کی طرح سکرٹ بڑبڑانے کی عادت ہے۔ عالیہ بیکریٹری ہیل سے ان کا "تعلق" برکسی کی نظر میں ہے۔ نیل جسے ڈرا ٹیوڈا لگو کی مدد سے یہ نوکری ملی ہے۔ زندہ تاج بیگم کی دی مراعات سے بھر پورا استفادہ کر رہا ہے۔ بوا عظمت اسے کڑے تیوروں کی زو میں رکھتی ہے جس پر وہ خاصا جزیب ہوتا ہے۔ زندہ تاج بیگم کے بھائی یوسف کمال، نیل کی عیار فطرت کو پہچان کر انہیں محتاط رہنے کا مشورہ دیتے ہیں جسے زندہ تاج بیگم جنگلیوں میں اڑا دیتی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

16 سولہویں قسط

آپا گل کی نگاہ اظہار صاحب کے چہرے پر جم رہی تھی بچن کا چہرہ تاریک پڑتا جا رہا تھا۔ وہ اب تک اسی طرح ساکت کھڑے تھے اور سارے کے لیے صوفے کی پشت پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ بات جتنی بھی سخت تھی اور واقعہ جیسا بھی تکلیف دہ تھا۔

پھر بھی! آپا گل نے اس سے پہلے انہیں کبھی کسی بات پر اتنا شدید رد عمل ظاہر کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ تھن رنجیدہ نہیں تھے بلکہ خوف زدہ تھے ورنہ آپا گل کے حساب سے تو انہیں اب تک سلمان کے پیچھے جا کر اسے اتنی سنانا چاہیے تھیں کہ سارے گھروالوں کے دل میں ٹھنڈک بڑجاتی۔

"اور کرو اس چڑیل کی طرف داری بولنے ہی نہیں دیتے تھے مجھے اب دیکھ لیا نتیجہ!"

شاہرہ بیگم کو اب کس کا ڈر تھا، گل کران ہی کو مور د الزام ٹھہرا رہی تھیں۔ "میں کہتی تھی کہ حتی سے بات کرو زویا سے اتنا سرت چڑھاؤ اب لے گئی نا نکال کر میرے اکلوتے بیٹے خد اعانت کرے اس سارے خاندان کو چار پیسے کیا ہاتھ میں آگے زمین پر پیر ہی نہیں رکھتے۔"

سلمان سامان اوپر سے نیچے لارہا تھا۔

”تنتی جلدی! سلمان تو کہہ رہا تھا کہ وہ لوگ کل جائیں گے۔“ آپا گل کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑنے لگے۔

”شاید اس کی بیوی اپنا سامان وغیرہ لے کر جا رہی ہے۔“

کمرے میں یکدم ہی بڑی گہری خاموشی چھائی تھی معلوم نہیں کتنا سامان تھا۔

ایک کے بعد ایک۔

سلمان اور زوبیہ کی ملی جلی آوازوں کے ساتھ کچھ اور آوازیں بھی شامل ہو رہی تھیں۔

زوبیہ نے اپنے گھر سے ملازم بلوائے تھے شاید ان میں سے کسی کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ جھانک کر سلمان کی رخصتی کے اس منظر کو دیکھ سکے۔

دکھ کا بڑا دل توڑنا احساس تھا جو ان سب نے ہی یکساں طور پر محسوس کیا تھا۔

زویا نے دیوار کی طرف منہ پھیرتے ہوئے چپکے سے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

”میں دیکھتی ہوں جا کر ایک بار تو اس زوبیہ کی وہ خبر لوں گی کہ یا وہی کرے گی۔“

شاکرہ بیگم ایک آخری کوشش کے خیال سے اپنی ساری ہمت سمیٹ کر کھڑی ہونے لگی تھیں۔ اس بار حیرت انگیز طور پر آپا گل آڑے آئیں۔

”رہنے دیں امی! بے کار میں اپنی بے عزتی کروانے کی ضرورت نہیں ہے، ہونا تو وہی ہے جو وہ لوگ چاہ رہے ہیں تو بس ہونے دیں۔“

زویا اور جویا دونوں نے آپا گل کی طرف ایک ساتھ ہی دیکھا تھا۔

ان کے چہرے پر بڑی عجیب سی کیفیت تھی۔

غصہ، مخالفت، ناکامی اور ساتھ ہی دلی دلی سی تپش۔

”آج ان کی سہمی، لیکن کل ہماری بھی باری آئے گی“ آپ دیکھتی جا رہے تھے۔ میں کس طرح سے اس زوبیہ کو! ”

”ارے اس وقت تو سارا محلہ اس زوبیہ کا سامان جاتا دیکھ رہا ہو گا گل میں کھڑا ہوا“ اب دیکھنا سارا دن تانا بندھا رہے گا“ پوچھ کچھ کے لیے۔

شاکرہ پچی کا صدمہ اتنا بڑا تھا کہ وہ اس وقت آپا گل کے پلان میں بھی دلچسپی لینے کو تیار نہیں تھیں۔

”دیکھ کر میرا بہت قیمتی سامان ہے، ذرا بھی نقصان ہوا تو تم سے ہی وصول کروں گی۔“

زوبیہ نے چلا کر کسی ملازم سے کہا تھا۔

شاکرہ بیگم نے بے ساختہ ہی ٹھنڈی سانس لی۔

اور ان کا سب سے قیمتی سامان! جس کے لیے نہ وہ کسی کو وصولی کی دھمکی دے سکتی تھیں اور نہ ہی خود حفاظت کر سکیں۔ آنکھوں کے سامنے دن بھر ڈاکہ بڑھا تھا۔

انہیں بڑی شدید کمزوری محسوس ہو رہی تھی یا ہر اب آوازیں ہلکی پڑ رہی تھیں اور پھر بہت زور سے گیت بند ہونے کی آواز آئی۔

ان سب نے ہی چونک کر کمرے کے کھلے دروازے کی طرف دیکھا جہاں کوئی نہیں تھا۔

کتنی ناقابل یقین بات تھی کہ سلمان نے جاتے ہوئے انہیں خدا حافظ بھی کہنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔



سلمان کی ٹیبل کا شیشہ پرانا سہمی، مگر اس کا عکس پوری آب و تاب کے ساتھ جگمگا رہا تھا گہرے نیلے اور سرخ کی کانچی اور م ساڑھی جو اس نے نالی ستارہ کے سمت سنبھال کر رکھے ہوئے قیمتی ملبوسات کے صندوق سے باہر نکالنے کے بعد منتخب کی تھی بہت سی جیسے ساری شخصیت ہی بدل گئی تھی۔

نے حیران نگاہوں سے خود کو دیکھتے ہوئے پلو کو اپنے ہاتھ پر لیا۔

ساڑھی مرحومہ فیروزہ کی تھی جو اس کے شوہر نے خاص طور پر کلکتہ سے منگوا کر دی تھی، قیمت سن کر اس نے وہاں کے دکانداروں میں انگلی دبائی تھی اب تو یقیناً لاکھوں کی ہوگی۔

تھی تھیں کہ کانچی اور م ساڑھیوں کی اہمیت بیش قیمت زیورات سے کم نہیں ہوتی، کتنے ہی موقعے آئے، کے دل پر صبر کا بھاری پتھری بوجھ رہا۔

تاشوں، خوشی، دل لگی سے بھری اس زندگی میں سنبھلنے سنورنے سے زیادہ اہم کام اور تھا بھی کیا! اندر سے روتی روح کو خوش رنگ اور خوشبو دار پیرہن ہی کامیابی سے چھپائے رکھتا ہے۔

میں بھی ہنسا رہتا ہے اور چار پیسے کمانے میں بھی آسانی رہتی ہے۔

لیکن اس کی بد نصیبی نے تو اس کی مہلت بھی نہیں دی تھی۔

پندرہ سال کی عمر سے ایکسٹرا ڈانسرز کی لائن میں کھڑی ہوئی تو ہوتی۔

سی اچھے وقت! اچھی ساعت کی امید میں اس نے وقت کو کاٹا تھا یا وقت نے اس کو کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

زیورات، اچھے کپڑے، ذات کا غرور، ایک ایکسٹرا کی اوقات ہی کیا تھی۔

تاشوں لائن میں لگ کر انتظار کرنا، ڈانس ڈائریکٹر کی جھڑکیاں، پچلے درجے کے لوگوں کے اور بھی نچلے مذاق سے جاتا تھا کہ وہ مور کے پتلے لگا بھی لیتی تو اور بھی مصلحہ خیز لگتی، سو ساری عمر وہی کیا، جو اس کی بارہ آنے والی تھی۔

تے ریشمی کپڑے، نقلی زیورات اور سستی سستی میک اپ کٹس۔

نے وقت کی نامور مصنفہ اور ستارہ نواز، ستارہ جان اور موتی سی چھب دکھا کر چھپ جانے والی فیروزہ جان کے دل میں گیند کی حیثیت باندی کی سی تھی اور اس نے ہمیشہ خود کو وہی سمجھا۔

اب کہیں جا کر اس کے بخت کا سورج بھی چمکا تھا۔

ت چاہے کے ساتھ گھوم گھوم کر اس نے خود کو آئینہ میں ہر زاویہ سے دیکھا۔

ت بال پہلی بار سستے ہیرے اور کالی مندی کے بجائے، کسی امپورٹڈ ہیرے سے رنگے ہوئے تھے اور اس نے سب سے اچھی بیوٹیشن کو بلا کر اپنا میک اپ بھی کروایا تھا۔

تو وہ سست اچھی بہت مختلف اور کرو فر والی عورت دیکھنا چاہتی تھی۔

سے گل نثار، گل رخ۔

سے بھی کہیں زیادہ۔

ت ہی اندر خوف زدہ ہونے کے باوجود اس نے وہ سب کیا جو شخصیت کی دل کشی بڑھانے میں معاون ثابت ہوئی۔

ت اب نتیجہ سامنے تھا۔

”باجی! تانی کہہ رہی ہیں اگر آپ تیار ہو گئی ہیں تو۔“ شاما کہتے ہوئے اندر آئی اور پھر مارے بوکھلاہٹ کے، تانی کا پیغام بھی ادھورا ہی چھوڑ دیا۔

”ہائے میں مرحاؤں یہ آپ ہیں باجی گھینہ! قسم لے لیں جو پہچانی جا رہی ہوں بالکل ایسے لگ رہی ہیں جیسے جیسے۔!“

شاما کی کوڑھ مغزی نے کوئی فوری مثال بھی نہیں سوچھنے دی۔

گھینہ بڑی متانت سے مسکرائی۔

”چل بس اب ریمت کر پہلے دن تو وقت پر پہنچنا چاہیے بعد میں تو اگر دیر سے نہ جائے تو ہیروئن ہیروئن ہی نہیں لگتی ایکسٹرا گرل لگتی ہے۔“

وہ اس وقت کو یاد نہیں کرنا چاہتی تھی مگر وہ ساری دوڑ دھوپ اب بھی پیروں تلے جل رہی تھی۔

”آپ کے نیلے ٹکوں والے جھمکے نکال دوں اس کے ساتھ پنسنے کے لیے؟“

شاما کہتے ہوئے ڈریننگ ٹیبل پر رکھے گھینہ کے نقلی زیورات والے ڈبے کی طرف بڑھی۔

”پاگل ہو گئی ہے کیا اس ساڑھی کے ساتھ وہ سو روپے والے جھمکے لٹکاؤں گی کیا تو جا کر زور اماں کی الماری میں سے زیورات کا ڈبہ تو نکال کر رکھ مدت سے ارمان تھا ان زیورات کے شایان شان لگنے کا۔“

پلو کو پھر سے سیٹ کرتے ہوئے اس نے شاما کو ہدایت جاری کی۔

”تانی کے زیور! شاما کا دل جیسے دھک سے رہ گیا۔“

”اور اب یہ سارے نقلی والے تو لے لے۔ تجھے تو اب ہاتھ نہیں لگانا نہیں اللہ نے میری مراد پوری کی ہے اب کھنا کیسے جلاؤں گی ساروں کو۔“ اپنی بات کہہ کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

شاما جو بڑے سے بڑے دکھ میں اس کی ساتھ ہی رہی تھی اس وقت چھوٹی سی خوشی کو نبھانے میں ناکام رہی تھی۔ گھینہ نے نوٹ بھی رکھ لیا۔

”تجھے کیا ہوا ہے یقین نہیں آ رہا کیا؟ سچ کہہ رہی ہوں سارے کے سارے تیرے نقلی ہیں تو کیا ہوا! مل ملا کر تو دو چار ہزار کے بن ہی جائیں گے ابھی تو اور بھی لے کر دوں گی تجھے۔“

وہ مکمل طور پر سخاوت کے موڈ میں تھی۔

شاما نے ہلکے سے ہاتھ جوڑ کر احسان مندی کا اظہار کیا اور تا کوئی لفظ کہے کمرے سے باہر نکل گئی۔

”پاگل کہیں کی! گھینہ کی ہنسی میں بڑی کھنک تھی۔“

شاما کی جان تانی کے سیف میں رکھے زیورات کے ڈبوں میں انکی تھی جن میں سے اب آٹھ سے زیادہ ڈال ہو چکے تھے۔

گھینہ کے حکم پر وہاں سے نکالتی تو کیا نکالتی۔

کم از کم آج تو کوئی دل دکھانے والی بات ہرگز نہیں ہونی چاہیے تھی۔

وہ بڑی پریشان سی تانی کے کمرے میں داخل ہوئی تھی مگر وہ پہلے ہی اس مسئلے کا حل نکالنے بیٹھی تھیں، مسخ اور نیلے ٹکوں کا ایک خوبصورت سونے کا سیٹ اسی ساڑھی کے ساتھ بیچ کر تا ہوا انہوں نے بچا کر رکھا تھا شاما کو کمرے میں داخل ہوتے ہی تانی کی مسہری پر اس کا کھلا ہوا ڈبہ نظر آ گیا تھا۔

”شکر ہے میں تو پریشان ہی ہوئی تھی کہ باجی گھینہ کہیں ساری الماری کھول کر نہ بیٹھ جائیں۔“ شاما آہلی ہوئی سکون حاصل ہوا۔

تانی مسکرا دیں۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ گھینہ کے صبح سے ”جلدی جلدی“ کے شور کی وجہ سے سب ہی الرٹ تھے، لیکن خود وہ ہی آخری وقت تک اپنی تیاری سے مطمئن نہیں ہو پارہی تھی۔

”بس اب جلدی کر گھینہ! پالی کی بیجی ہوئی گاڑیاں کب سے آئی کھڑی ہیں۔“

”میں تو خود کب سے کہہ رہی ہوں۔“

گھینہ کا زیورات پہننے کا مرحلہ ختم ہوا تو وہ قدرے مطمئن ہوئی۔

تانی ستارہ اس کے بالکل قریب آکھڑی ہوئیں۔

”صندل کو شروع سے وقت کی پابندی اور لوگوں کے ساتھ میل جول میں ادب ادب کی تلقین کرتی رہنا یہ نہ ہو کہ آج کل کے چھپھورے طریقے اپنانا شروع کرے۔“

وہ خود ساری عمر بڑے رکھ رکھاؤ اور وضع داری کے ساتھ چلی تھیں اور اب دوسروں سے بھی یہی توقع رکھتی تھیں۔

گھینہ کے ساتھ تو خیر بڑی مجبوریاں رہی تھیں، لیکن صندل کو گھرانے کی روایات کو آگے بڑھانا ہی چاہیے تھا۔ وہ کچھ ایسی ہی نصیحتیں کر رہی تھیں، مگر گھینہ نے پہلے ایک آدھ فقرے کے علاوہ مجال ہے جو کچھ سنا ہو اس کی ساری توجہ تانی ستارہ کی شخصیت پر تھی، بہت ہی ہلکے سے رنگ کا ساہ، مگر دلکش سوٹ پہنے ہوئے ہاتھوں میں

پیلے کا ایک خوبصورت گجر اور بہت نازک جیولری۔

وہ ہمیشہ اسی طرح تیار ہوتی تھیں، لیکن چہرے پر آج ہمیشہ سے زیادہ تمکنت تھی۔

ایسی تمکنت جو سامنے والے کو خود بخود ان کی عزت کرنے پر مجبور کر دیتی تھی۔

اسے تو ساری عمر حسرت ہی رہی کہ وہ ان جیسی کبھی دکھائی دے۔

کانچی ورم ساڑھی، سونے کا وہ بھاری سیٹ اور محنت سے کرایا ہوا میک اپ۔ سب ہی کچھ تانی ستارہ کی شخصیت کے آگے ماند تھا۔

”کچھ بھی سہی ہیں تو میری ماں ہی۔“ گھینہ کے گرے گرے مورال کو یہی ایک فخر ہمیشہ سہارا بنا چلا آیا تھا۔

”اماں! وہ جوڑیاں۔“ دفعتا ہی اسے ایک اور سنبھال کر رکھا ہوا ارمان یاد آیا۔

تانی کے ساتھ کمرے سے نکلتی ہوئی شاما بوکھلاہٹ میں گرتے گرتے بچتی۔

”آج تک ہاتھ میں ہی نہیں ڈالیں، یہی سوچا تھا کہ صندل کی فلم کے مہورت پر پہنوں گی، چاشاما نکال کر تو لا۔“

”وہ تو باجی۔!“ شاما کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ ان چوڑیوں کی بابت کیا کہے جو مینوں پہلے موٹی محل جیولر کے ہاں ہی جا چکی ہیں۔

”اوں ہنہ!“ اسے اپنے ہاتھ پر دیاؤ محسوس ہوا، تانی تنبیہی نگاہوں سے اس کی طرف سدیکھ رہی تھیں۔

شاما کو بات پوری کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ تانی اپنے ہاتھ سے ایک کنگن اتار کر، گھینہ کو تھما رہی تھیں۔

”یہ ڈال لو ہاتھ میں ایک ساتھ اتنی چیزیں پہنوں گی تو کہیں نظر ہی نہ لگ جائے۔“

”واقعی یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا اماں!“

گھینہ کے چہرے پر ہلکا سا خوف ابھرنے لگا۔ تقدیر کے اس سب سے خوشگوار موڑ پر اسے اب سب سے زیادہ نظر لگ جانے کا خطرہ لاحق تھا۔ حاسدوں کی بھلا کیا کمی اور یہاں تو گھر میں ہی مخالف کیمپ کھلا ہوا تھا۔

میں بیٹھ کر، نیچے پھیلی خوشگوار چل پھل میں مصروف ہوئیں۔
اور خاموشی میں ڈوبے اس انتہائی پچھلے کمرے میں دیوار کی طرف کروٹ لیے لیٹی، گیتی نے آہستگی سے اپنی
کھوپڑی کے کونے خشک کیے۔

کاش وہ اپنی بہن کی خوشی میں پورے دل کے ساتھ خوش ہو سکتی، مگر وہ تو سما "بھی ایسا کچھ نہ کر سکی" اور خود
صندل نے بھی ایسا کب چاہا۔

اس کے تصور میں صندل کا خوشی سے دکھتا ہوا چہرہ تھا۔

اپنے کی سرشاری میں ڈوبا ہوا۔

کچھ پانے کی ابتدا ہمیشہ وہیں سے ہی کیوں ہوتی ہے جہاں کوئی دوسرا اپنا سب کچھ کھورتا ہے۔

اس نے اپنی زندگی میں چلتے ہوئے اس بھید بھرے سلسلے کو کھوجنا چاہا۔

پہلے خیام۔

اور اب صندل۔

ایک کوہ کھو چکی تھی اور دوسرے کو کھونے والی تھی۔

آج اسے احساس ہوا تھا، کل کو تانی اور گمینہ امی بھی اسی احساس سے گزرنے والی تھیں۔ یہی یہاں کی روایت
تھی۔

سامنے کھلا آسمان ہے تو یہاں کے پرندے ہمیشہ لمبی اڑان ہی بھرتے ہیں۔

صندل بھی اب زیادہ عرصے یہاں رکھنے والی نہیں تھی۔

گیتی کو اپنے اندر سے اٹھتی اس آواز پر گہرا یقین تھا۔

سالار کے آنے کی خبر پر وہ بالوں کو سمیٹتی ہوئی کتاہیں سنبھال کر تانی کے کمرے میں چلی آئی۔

سالار تانی کے میوزک کلیکشن کو الٹ پلٹ کر رہا تھا۔

"استاد بڑے غلام علی، زہرہ بانی کلکتہ والی، سہگل، تانی کا ٹیسٹ لاجواب ہے۔" اسے دیکھ کر وہ دل کشی سے
سکرایا۔

"پتا نہیں مجھے میوزک کی ذرا بھی سمجھ نہیں ہے، مجھے تو ان آج کل کے بینڈز وغیرہ کے بارے میں بھی کچھ زیادہ
پتا نہیں۔" وہ اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ چکی تھی۔

"چراغ تلے اندھیرا اسی کو کہتے ہیں۔" وہ روانی میں کہہ رہا تھا۔ مگر وہ اپنی حساسیت سے مجبور تھی۔

"مظنر کر رہے ہیں؟"

"میری مجال۔" وہ ہنس پڑا۔ "ویسے تم ذرا سا مثبت نہیں سوچ سکتیں، جن جن کر دل دکھانے والے مطلب اخذ
کرتی ہو، چلو کتاب اٹھاؤ۔"

وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔

"آپ کیوں نہیں گئے صندل کے مہورت شارٹ میں، ان سب لوگوں نے بہت اصرار کے ساتھ آپ کو اور
اسر بھائی کو انوائٹ کیا تھا۔"

"اسر بھائی کو انوائٹ کیا تھا۔"

"اسر بھائی گئے ہیں! میڈیا کے لوگ ایسے موقعے نہیں چھوڑتے ہیں۔"

"میں آپ کا پوچھ رہی ہوں۔"

"نہیں! وہ پل بھر کے لیے رکا۔" پتا نہیں کیوں شاید میں ابھی تک خود کو معاف نہیں کر سکا، حالانکہ دونوں

اس کی نگاہ پچھلے دروازے سے ہوتی ہوئی اس طرف گئی، جہاں آج کھل سنا تھا۔
وہاں سے کسی نے بھی آج صندل کے مہورت شارٹ کے لیے دی جانے والی اس کی دعوت کو قابل قبول
نہیں سمجھا تھا۔

بیاری مصروفیت بہانوں کی کیا کی تھی۔

مگر گمینہ بھی ٹھانے ہوئے تھی کہ آج خیریت کے ساتھ کام پورا ہو جائے پروہ صندل کو ان کے ہاں سلام
کروانے کے لیے ایسے ہی لے کر جائے گی جیسے گلناز الماس کو وہی کاڑپ کروانے کے بعد واپسی پر لائی تھی۔

سامنے استادی اور تانی صندل کا صدقہ اتار رہے تھے۔

"اب اور کتنی دیر ہے آخر دوبارہ بانی صاحب کا فون آچکا ہے تانی! وہاں کتنے لوگ انتظار کر رہے ہیں۔ سارے
میڈیا والے آئے بیٹھے ہیں۔"

صندل میں تک مزاجی تو فطری تھی، لیکن اس وقت ہیروئن والا غرہ بھی آواز سے جھلکنے لگا تھا۔

گمینہ نے غرہ نگاہ بیٹی پر ڈالی۔

صندل کی دل کشی میں کیا کلام تھا۔

رہی سہی کس اس تمکنت کی تھی، جو تھوڑی بہت خوش قسمتی سے تانی ستارہ کی طرف سے اسے ملی تھی۔ وہ
ایکسٹرا ڈانس گمینہ جان کی بیٹی سے زیادہ ماضی کی معروف فنکار ستارہ جان کی نواسی زیادہ لگتی تھی۔

اور گمینہ اس کی اسی شناخت کو زیادہ اہمیت دینے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

سامنے کے آرائشی برآمدے میں سے گزرتے ہوئے گمینہ نے جھانک کر اطمینان کیا کہ بانی کی بھیجی ہوئی وہ
دونوں شاندار گاڑیاں بیڑھیوں کے ساتھ ہی کھڑی ہیں۔

ابھی "کام" کا وقت یہاں شروع نہیں ہوا تھا، اس لیے ہر کھڑکی اور بالکونی میں سے کوئی نہ کوئی چہرہ جھانک رہا
تھا۔

گمینہ کو پتا تھا کہ وہ سب صندل کے اترنے کی منتظر ہیں، جو راتوں رات "سیلیبرٹی" بن چکی تھی۔

یہاں ساری لڑکیاں عزت و شہرت کے ایسے "معیار" کی متمنی رہتی ہیں، جو خوش قسمت ہوتی ہیں، منزل پالیتی
ہیں، ورنہ تاریک راہوں میں مارے جانے والوں کی یہاں کون سی گی تھی۔

وہ بھی تو۔

سر کو ہلکے سے جھٹک کر اس نے ناک میں کھڑی زور نچی کو جھٹکا۔

صندل نے نیچے جانے والی بیڑھی پر قدم رکھا تھا کہ تانی ستارہ کو کچھ یاد آیا۔

"یہ گیتی کہاں ہے، کیا اکیلی رک رہی ہے گھر پر، میں نے کہا بھی تھا اسے چلنے کے لیے۔" ان کے لہجے میں ہلکی
سی خشکی تھی۔

"سو گئی ہے اماں! اور بختاں سلوٹی ہیں یہاں پر، تھوڑی دیر میں وہ سالار بھی آجائے گا، پڑھانے کے لیے۔"

"اور وہ وہاں جا کر کرے گی بھی کیا، یوں ہی منہ بنا کر ایک طرف بیٹھی رہے گی، میڈیا والوں نے نوٹس لے لیا تو
اور مصیبت۔"

صندل کو اس وقت اپنے علاوہ کسی کا بھی موضوع گفتگو بننا گوارا نہیں تھا۔

آگے پیچھے اترتے ہوئے وہ سب ہی رخصت ہو میں تو پیچھے بڑا کھرا ستارہ گیا۔

حفاظت کے لیے چھوڑی جانے والی بختاں اور سلوٹی کاسنی اور سفید نیٹ کے پردوں والے آرائشی برآمدے

غلطیاں انجام دینے میں ہی سرزد ہوئیں، صندل کو افسر بھائی تک پہنچانے کی بھی اور خیام کو سزا دینے کی بھی ہمت نہ تھی۔ گیتی نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ”چھا ہوا جو وہ چلا گیا دو چار سال اور یہاں رک جاتا تو ہم سب کی توقعات اور بھی بڑھتیں، اب کم از کم سب کی آنکھیں تو کھل گئی ہیں۔“

ان سارے دنوں میں جتنی بار بھی سالار نے دانستہ یا نادانستہ خیام کا ذکر چھیڑا تو اس طرح بے زاری کا اظہار کرتی دکھائی دی، پھر بھی سالار کو اس کی آنکھیں الفاظ کا ساتھ دیتی دکھائی نہیں دیتی تھیں۔

دل پر رکھا ہوا بوجھ اور بھی بڑھتا۔

”اور مہربانی کر کے خیام کے بارے میں کوئی بات نہیں کہنے کا بڑی مشکل سے انہوں نے خود پر قابو پایا ہے، یہاں اب کوئی خیام کے بارے میں بات نہیں کرتا۔“ وہ اپنی کتاب کھول چکی تھی۔

”بات نہ کرنے سے بات ختم تو نہیں ہو جاتی، اور کیا خبر کل کو وہ آئی جائے سب کو یہاں سے لے جانے کے لیے۔“

وہ اسے مکمل مایوسی کی نذر نہیں، ہونے دے سکتا تھا، اسی لیے کسی خوشگوار امکان کا سرا تھا، اسے رکھنا چاہتا تھا۔

گیتی کا سر ہلکے سے نفی میں ہلا۔

چائے لے کر سلونی اندر آ رہی تھی اور اس کے پیچھے بخانا تھی، اور چائے دے کر وہ دونوں باہر نہیں گئی تھیں، وہیں ذرا ہٹ کر تانی کی مسہری کے پاس بیٹھ کر ہلکے ہلکے باتیں کرنے میں مصروف ہو گئیں۔

گیتی کو پتا تھا کہ اب وہ دونوں جب تک وہ پڑھے گی، یہیں بیٹھی رہیں گی۔ یہاں کے اصول قاعدے بڑے متضاد قسم کے تھے۔

بھرپور آزادی کے کھلے ڈالے مظاہرے کے ساتھ عذریوں کی بڑی سخت نگرانی بھی تھی۔

تانی کچھ زیادہ ہی سخت رہی تھیں۔

سب کہتے تھے کہ فیروزہ کے قصہ سے انہوں نے بڑا گرا سبق لیا تھا۔

”اب معلوم نہیں سینت سینت کر رکھی گئی صندل کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا تھا۔“

گیتی نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دباتے ہوئے سوچا اور کاپی سالار کی طرف بڑھا دی۔



دیوار سے ٹیک لگائے وہ کب سے ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی تھی۔

چھوٹا سا صحن دھوپ سے بھرا ہوا تھا۔ اور ہوا کے نیم گرم جھونکے یہاں تک آرہے تھے، سامنے کے کمرے میں نواب اسی گہری نیند کے مزے لوٹ رہا تھا، جس سے سعیدہ کو سخت نفرت تھی۔

زری کا دل چاہا کہ وہ اٹھ کر نواب کو جگا دے، سعیدہ کب کی دونوں بچوں کو لے کر نکلی ہوئی تھی، سلائی کے کپڑے دینے کے لیے، اب اس کے آنے کا وقت ہو چکا تھا، نواب کو اب تک سو تا دیکھتی تو آتے ہی اس کا موڑ اور بھی خراب ہو جاتا، بے چین سا ہو کر اس نے پہلو بدلا اور پھر آخر اٹھ کھڑی ہوئی۔

سعیدہ سے وہ سچ بچ ڈرنے لگی تھی۔

بات بے بات وہ اس پر چلاتی، اور جو منہ میں آتا کئے میں سیکنڈ نہ لگاتی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کیسے خوش رکھے۔

حیدرآباد سے جب وہ یہاں آ رہی تھی تو چچی نے یہی نصیحت کی تھی کہ بھابھی کی بے حد خدمت کرے گی تو وہ

بھی بدل سے لگا کر رکھے گی۔

مگر نہ تو وہ خدمت سے خوش ہوتی تھی اور نہ ہی اس کی بے بسی پر رحم کھاتی تھی۔

اس کا بس چلتا تو وہ زری کو کب کا واپس چچا، چچی کے پاس چھوڑ آتی ہوئی۔

”بھائی بھائی!“

دیسے دھیسے پکارتے ہوئے اس نے نواب کا کندھا ہلایا۔ مگر اس پر تو موت کی سی غفلت طاری تھی، کسی کسی وقت تو اس کی نیند سے خوف آنے لگتا تھا، سعیدہ تو صاف کہتی تھی کہ کسی دن وہ یوں ہی سوتے کا سوتا ہی رہ جائے۔

”نواب بھائی! اٹھو نا!“ خوف زدہ سی ہو کر زری نے اس بار پکارا بھی زور سے تھا، مگر وہ ”اوں ہنہ“ کر کے دوسری طرف کروٹ لے چکا تھا۔

”یا اللہ کیا کروں آخر!“ وہ بے چارگی سے زیر لب کہتی ہوئی واپس باہر آئی۔

پکانے کے لیے بھی کچھ نہیں تھا، جو وہ پکا کر ہی رکھ دیتی، سعیدہ کہہ کر گئی تھی کہ وہ واپسی میں سبزی لیتی ہوئی آئے گی۔

آنے کے کنستری تہہ میں تھوڑا سا آنا خوش قسمتی سے باقی تھا، اس نے گوندھنے کے لیے وہی نکال لیا۔

تب ہی کسی نے دروازہ زور سے بجایا۔ یہ انداز نہ سعیدہ کا تھا اور نہ ہی کسی محلے والے کا، یہ تو کوئی اور ہی تھا۔

”پتا نہیں دروازہ کھولنا بھی چاہیے یا نہیں۔“ وہ دروازے کے پاس جا کر ہی سوچ کر رہی تھی، سعیدہ کی سختی سے ممانعت تھی، دروازے کے قریب بھی جانے کی پتا نہیں کیا کیا خدشات لاحق تھے اسے، دستک دوبارہ ہو رہی تھی، اور اس بار پہلے سے زیادہ بلند تھی۔

زری کو دروازہ کھولنا ہی پڑا۔

سامنے وہ جو کوئی بھی تھا اس کے لیے تو قطعی اجنبی تھا۔

”آپ، میرا مطلب ہے جو آپ سے پہلے یہاں رہتی تھیں وہ۔“ زری نے اس کے لمبے کی الجھن کو صاف محسوس کیا۔

”یہاں ہم ہی رہتے ہیں، شروع سے ہی۔“ اسے لوگوں سے عام بات چیت کا موقع کم ہی ملتا تھا، سوزبان تھوڑا سا لڑکھڑاہی گئی۔

”لیکن میں نے آپ کو پہلے یہاں نہیں دیکھا، وہ خاتون جن کے دو چھوٹے بچے ہیں، اور ان کا نام۔“ اسے فوری طور پر یاد نہیں آ رہا تھا۔

”سعیدہ!“ زری بے ساختہ ہی اس کی مشکل آسان کی۔ ”وہ میری بھابھی ہیں، اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔“ کہتے ہوئے اس نے دروازہ بند کرنا چاہا، مگر وہ تیزی سے آگے بڑھا۔

”میری بات سن لیجئے پلیز بہت ضروری کام ہے۔“

انھہ کھلے پٹ لی اوٹ سے زری نے تھوڑا عورت سے اس کی طرف دیکھا، جس کی آنکھوں کی نرمی اس کے دل کی بھائی کی گواہی دیتی تھی۔

”آپ کے برابر والے گھر میں جو بچہ رہتا ہے ساجد۔“ اپنی بات کہتے ہوئے وہ ذرا رکاوٹ زری نے جلدی سے بات میں سر ہلایا۔

”بس آپ اس سے کہہ دیجئے گا کہ اس جمعے کو سہرا بھائی کے گیارہ پر ضرور آجئے، کہہ دیں گی نا، وہ شاید

اس کے رویہ سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔
 ”جی! اتنا سا کام تو وہ کر ہی سکتی تھی۔
 ”بہت شکریہ، آپ اسے کہہ دیجئے گا کہ معاذ بھائی آئے تھے۔“ وہ کہہ کر تیزی سے واپس کچھ آگے کھڑی اپنی موٹر سائیکل کی طرف بڑھ چکا تھا۔
 ”معاذ!“ زری کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔
 ”تو یہ معاذ تھا؟“

دروازہ بند کر کے بعد بھی وہ وہیں کھڑی سوچے گئی۔
 سعیدہ اور بتول کے درمیان جب بھی ساجد کے بارے میں کوئی بات ہوتی، معاذ کا ذکر ضرور ہوتا تھا۔ وہ بھی ایسے کڑے الفاظ میں کہ انسان خود ہی دلچسپی لینے پر مجبور ہو جائے۔
 وہ بھی جان چکی تھی کہ معاذ ہی ساجد کو نگاڑنے پر تلا ہوا تھا اور ایک بار چھوٹے کو سو روپے پکڑا کر گیا تھا تو سعیدہ نے نواب سے اس کے عوض کیسی گری ہوئی باتیں سنی تھیں۔
 معاذ کا نام زری کے لیے اجنبی نہیں تھا اور آج وہ خود بھی نہیں رہا تھا۔
 ”کتنے اچھے تو ہیں۔“ اس کا سراپا نگاہوں میں گھوما تو وہ ہلکے سے مسکرا دی۔
 ”بھابھی اور بتول باجی تو یوں ہی خواجواہ کسی کے بھی پیچھے پڑ جاتی ہیں جیسے میرے پیچھے پڑی رہتی ہیں۔“
 معاذ کی دل کش شخصیت میں اس کی دلچسپی بڑی بے ساختہ اور فطری تھی۔
 ”ساجد تک پیغام ہی تو پہنچانا ہے، پہنچاؤں کی چپ چاپ۔ وہ بھی سمجھ دار ہے، کسی کو بتائے گا بھی نہیں، درنہ سعیدہ بھابھی سے معاذ کے بارے میں کچھ کہا تو وہ تو پہلے میرا ہی گلا دبا میں گی کہ اتنی دیر دروازے پر کھڑے ہو کر بات ہی کیوں کی۔“

تب ہی ایک بار پھر دروازہ بجنے لگا۔
 یہ سعیدہ کی دستک تھی۔
 ”آتی جلدی کیسے کھول دیا، کیا دروازے کے ساتھ لگی کھڑی تھیں۔“ وہ کڑے تیوروں کے ساتھ اسے گھورتی ہوئی اندر آئی۔
 ”وہ میں پانی پی رہی تھی بھابھی!“ دیوار کے ساتھ رکھے کولر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے بروقت برمانا سوچھا۔

”میرے لیے بھی لاشٹنڈا اسما“ اتنی گرمی میں خواری اٹھاتی پھرتی ہوں، اور حاصل کیا۔۔۔“
 وہ سر پر سے چادر سرکاتی ہوئی اندر کمرے کی طرف چلی گئی۔
 پسینے میں شرابور گرمی اور چھکن سے بے حال دونوں بچے ابھی بھی اسی کے پیچھے تھے۔
 اس وقت بڑی آسانی سے بچت ہو گئی تھی، زری نے شکر ادا کیا۔
 پانی لے کر جب وہ اندر کمرے میں آئی تو لاشٹ جاچکی تھی، اور سعیدہ بڑی بے بسی سے رنگ رنگ کر چا ہوئے پٹکھے کو دیکھ رہی تھی۔

”اس لاشٹ کو بھی ابھی جانا تھا، ذرا سے ہوش بحال ہو جاتے تو کیا ہو جاتا۔“
 زری نے ہمدردانہ نگاہوں سے اسے دیکھا اور خود سبزی کی ٹوکری لے کر واپس باہر نکل آئی۔
 ”خدا کرے آج شام ہی ساجد دکھائی دے جائے تو اسے معاذ کا پیغام پہنچاؤں!“ اسے پھر سے معاذ کا خیال آنے لگا۔

”بات کتنی نرمی سے کرتے ہیں!“ اس کی روکھی پھینکی زندگی میں یہ چھوٹی سی ملاقات بھی خوشگوار تھی۔
 ”جی۔۔۔“



”شش، شش۔۔۔“

ہانوس سی سرگوشی پر وہ بری طرح چونکی، سامنے بچن کی کھڑکی کے دوسری طرف سے راجو اشارہ کر رہا تھا۔
 روزی نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ یہاں اس کے علاوہ اس وقت کوئی اور نہیں موجود تھا۔
 ”یہاں کیوں آ گیا؟“ کسی نے دیکھ لیا تو مصیبت کرویں گے میری اور تیری دونوں کی۔“
 کھڑکی کے قریب جا کر وہ تیزی سے بولی۔
 ”کیا کروں پھر، اندر آنے پر تو سختی سے پابندی لگادی گئی ہے، ورنہ اس سے پہلے تو کبھی نہیں ہوا، اتنے سال سے یہاں کام کر رہا ہوں اب لگتا ہے بوا عظمت نے شکایت لگائی ہے۔“
 راجو بھنجلیا ہوا تھا۔

بوا جس حساب سے اس سے خفا رہتی تھیں، اس بنا پر اس کا شک ان ہی پر جاتا تھا، مگر روزی پچھلے کئی ہفتوں سے بدلی بدلی سی لگتی تھی۔ پہلے کی طرح اس کی ہر بات پر آنکھ بند کر کے تصدیق کرنا چھوڑ چکی تھی۔
 اس وقت بھی تڑپ کر فوراً ”ہی کہہ اٹھی۔“
 ”بوا عظمت کا نام مت لینا، راجو! وہ جو کچھ بھی کریں گی ہماری بھلائی کے لیے ہی کریں گی، ان کے علاوہ میرا ہے ہی کون۔“

”کیوں میں مر گیا ہوں کیا؟“

”خدا نہ کرے، بس تو بوا کو مت کچھ کہا کر۔“ روزی بات اس سے کر رہی تھی، مگر نگاہیں بار بار بچن کے دروازے کی طرف تھیں، جہاں سے کسی وقت بھی کوئی آسکتا تھا۔
 راجو کو اس کی یہ بے توجہی کھل تو رہی تھی، مگر مجبوری تھی۔
 ”مجھے ضروری بات کرنی ہے، آکر سن جا پانچ منٹ کے لیے۔“
 ”ہی اس وقت۔۔۔“

”ہاں، کیونکہ رات کی ٹرین سے تو میں جا رہا ہوں، پنجاب۔ بس دن کی چھٹی پر۔“
 لوہر پچھلے کسٹاؤنڈ میں ملازمین کی آمد و رفت جاری رہتی تھی، کوئی بھی زیادہ دیر اسے کھڑا رکھتا تو ٹولس لیے بغیر نہ رہتا، سو اپنی بات کہہ کر وہ مزید نہیں رکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اب روزی اس کام چھوڑ کر بھی آئے گی۔
 ”دروازہ کھلی آ بھی گئی۔“
 ”ایک دم پنجاب جانے کی کیا سوچھی ہے تجھے، میں تو بالکل ہی تنہا ہو جاؤں گی یہاں۔“ روزی کی آنکھوں میں آنسو شروع ہو چکے تھے۔

”کیسی کیوں وہ تیری بوا عظمت تو ہیں تیرے پاس۔“ وہ اس وقت بھی بوا کا طعنہ دینے سے باز نہ آیا۔
 درخت کے تنے سے ٹیک لگائے کھڑی روزی چپ چاپ اپنے آنسو صاف کیے گئی۔
 بوا کا ضعف و وجود اس شکار گاہ میں آخر کب تک حفاظت کر سکتا تھا، اس نے بمشکل ہی راجو کو کچھ کہنے سے روکا۔

یہ الفاظ یہ انداز روزی کا نہیں تھا پھر بھی اس سمجھ داری پر اسے بڑا پیار آیا۔
 ۴۱ تہی عقل آگئی ہے تجھے چل یہ بھی شکر ہے۔ وہ کھل کر ہنس پڑا۔ ۴۲ چھا اب جا بوا آگئی ہیں سامنے کھڑکی
 میں۔ ۴۳ اس نے اشارہ کیا۔
 اس بار روزی نے بتنا سمجھ کے وہاں سے دوڑ لگائی۔



سلمان کے گھر چھوڑ کر جانے کی خبر شام کے اخبار کی سی سنسنی پھیلاتی ہوئی پورے خاندان میں نشر ہوئی۔
 محلے والوں کے لیے تو سارا قصہ آنکھوں دکھا ہی تھا، لیکن خاندان والوں کی ”سورس آف انفارمیشن“ بھی
 نصب کی تھی۔
 بات کی تصدیق کے لیے تو فون اس رات سے ہی آنے شروع ہو چکے تھے، اگلے دن سے لوگ افسوس کرنے
 ہی آئے لگے۔

”کیسے چلا گیا تم سب کو چھوڑ کر۔“

”۴۴ کلوتا بیٹا اور وہ بھی ایسا خود غرض۔“

”ہم تو پہلے ہی کہتے تھے کہ اتنے پیسے والے لوگوں میں رشتے جوڑ کر آخر آدمی پھینکتا ہی ہے۔“

”کیسا جادو کر دیا اس عورت نے۔ نہ شکل نہ صورت پتا نہیں تم لوگوں نے کیا دکھا تھا۔“

وغیرہ وغیرہ۔

وہ سب تو اتر سے اسی طرح کی باتیں کرتے اور قطعی بھولے رہتے کہ کچھ عرصہ پہلے وہ ہمیں اسی گھر میں بیٹھ کر
 سلمان اور گھر والوں کی خوش قسمتی کا پہاڑا پر بھا کرتے تھے اور زویہ جیسی بھول جانے کی دعا کیا کرتے تھے۔

زخم اتنا تازہ تھا تھا کہ اس پر نمک برداشت کرنا ناممکن ہو رہا تھا۔

آپا گل اور شاکرہ بیگم دونوں کی کئی سے جم کر لڑائی ہوئی اور کچھ سے ہوتے رہ گئی۔ سواب کچھ دنوں سے
 آنے جانے والوں کا سلسلہ بھی موقوف تھا۔

”خس کم جمال پاک! شاکرہ بیگم ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے صوفے پر آ بیٹھیں۔“

”یہ اب زویہ بھابھی کے لیے کہہ رہی ہیں۔ انہوں نے جو اباً ایک کھا جانے والی نگاہ زویا پر ڈالی، جو ٹیلی فون
 بند کر کے ابھی ابھی فارغ ہوئی تھی۔“

”کس سے بات کر رہی تھیں اتنی دیر سے؟“

”زویہ سے۔“ مختصر سا جواب دیتے ہوئے وہ ملاؤنچ سے نکل رہی تھی مگر ان کے ٹوکنے پر رکنا پڑا۔

”کیا ضرورت تھی منع بھی کیا ہے کہ ان لوگوں سے راہ و رسم مت رکھا کرو مگر تمہارے اور جو یا کی سمجھ میں
 نہیں آتا ہے کچھ بھی۔“

وہ بری طرح جھنجھائیں جب سے دادی نے جو یا کی بابت دوبارہ کھلویا تھا، انہیں معاذ کے گھر کے کسی فرد کا نام
 سننا تک گوارا نہیں رہا تھا۔

”ان ہی کی نظر کھا گئی ہے میرے گھر کو، یہی سب سے بڑے دشمن ہیں ہمارے، ورنہ اچھی بھلی تھی زویہ شادی
 سے پہلے، کیسی خوش اخلاقی سے پیش آیا کرتی تھی مجھے تو پورا یقین ہے کہ اس روز دعوت میں ان ہی کے گھر زویہ
 ہمارے خلاف بھڑکایا گیا ہے۔“

”لن کے ہاں کوئی ایسی بیماری نہیں ہے کسی کو کہ لوگوں کو بھڑکایا جائے اور زویہ بھابھی تو ویسے بھی سب کچھ

ضبط کیا، نیم گرم ہوا کے جھونکے، اس کے روکھے بالوں کو بالکل ہی بے ترتیب کیے دے رہے تھے، نہ جانے کتنے
 دن سے اس نے کنگھی تک نہیں کی تھی، راجو نے ایک گہری نگاہ اس کے بے ترتیب چیلے پر ڈالی۔

وہی تلکچے سے کپڑے ادا اس چہرہ مستکھار کے نام پر ہاتھ میں ایک چوڑی تک نہیں۔
 وہ شوخ رنگوں سے بھری لڑکی جسے اس نے پورے دل سے چاہا تھا معلوم نہیں کہاں کھو گئی تھی!

اب تو اس نے روزی سے پوچھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔
 ”تھوڑے سے دنوں کی بات ہے، ماموں کی طبیعت خراب ہے، اماں کو لے کر جا رہا ہوں، دونوں بہنوں کے
 رشتے بھی وہاں طے کر کے آئیں گے، اسی لیے ماموں زور دے رہے ہیں آنے پر۔ سمجھا کر بات کو۔“

اپنی ذمہ داریوں کے ہلکا ہوجانے کا احساس ہی راجو کو پرجوش کیے دے رہا تھا۔ ”پھر ہماری شادی میں زیادہ دن
 نہیں لگیں گے، ادھر بہنوں کی رخصتی ہوگی اور میں نے بیگم صاحبہ سے تیرا ہاتھ مانگا۔“

راجو کو پورا یقین تھا کہ اس بار وہ اس کی اداسی دور کرنے میں سو فیصد کامیاب ہو جائے گا۔
 مگر ایسا نہیں تھا۔

وہ اب بھی اتنی ہی اداس تھی۔
 ”جلدی واپس آجانا راجو، دس دن تو بہت ہوتے ہیں۔“ اس نے کہا بھی تو یہ۔

”ارے یوں گزرتے ہیں دس دن۔“ روزی کے چہرے کے سامنے اس نے چٹکی بجائی۔ ”نیل صاحب کی مہرانی
 ہے جو۔“ وہ ذرا رکا، نیل کے نام کے ساتھ ”صاحب“ لگاتے ہوئے اسے ابھی بھی عجیب سا ہی لگتا تھا۔ ”۴۵ صل
 میں مالکوں سے چھٹی ملنا آسان تھوڑی ہے، یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے کہ اتنے اچھے لوگوں کے پاس کام کر رہے
 ہیں۔ شادی کے بعد بھی ہم اس گھر کو نہیں چھوڑیں گے، پیچھے کو اڑنے لیں گے، بیگم صاحبہ سے۔“

”نہیں!“ ایک جھٹکے سے روزی نے سر اٹھا کر اسے دکھا تھا۔ ”ہم یہاں سے بہت دور چلے جائیں گے، اور
 کبھی اس شہر میں بھی واپس نہیں آئیں، وعدہ کرنا جو! یہاں نہیں رہے گا، کہیں اور کام ڈھونڈے گا، اس شہر سے
 بہت دور، کہیں بھی۔“

راجو کو اس کے چہرے پر پھیلا خوف اس بار اتنا نمایاں دکھائی دیا تھا کہ نظر انداز کرنا مشکل ہو رہا تھا کیا ہو گیا ہے
 تجھے روزی، کس سے ڈر رہی ہے، کھل کر کیوں نہیں بتاتی ہے تجھے، کسی نے کچھ کہا ہے، سچ بتا۔“ اس کے کندھے
 پر ہاتھ رکھے وہ بڑی فکر مندی سے پوچھ رہا تھا۔

اس کے انداز میں کچھ ایسا تھا جو تحفظ کے احساس کو گہرا کرتا تھا، ساری مصلحتیں بالائے طاق رکھ کر اپنی ہر فکر
 اس کے حوالے کر دینے کو دل کرتا تھا، روزی بھی شاید کہہ ہی جاتی، مگر۔

”۴۶ مگر کسی نے کچھ ایسا ویسا کہا ہے تجھے، تو خون پی جاؤں گا، زندہ نہیں چھوڑوں گا اس کو، تو بتا تو سہی۔“ روزی نے
 ایک گہرا سانس لیا۔

”کسی نے کچھ نہیں کہا، بے کار میں ہی جذباتی مت ہو جایا کر۔“

”پھر یہ سب کیا ہے، کیا حال بنا لیا ہے تو نے اپنا، کتنی بدل گئی ہے تو، شاید اندازہ ہی نہیں ہے تجھے۔“
 وہ تھوڑا سا مطمئن ہوا، لیکن پھر بھی اسے ٹوکے بغیر نہیں رہ سکا۔

”۴۷ ایسے ہی بس اب دل نہیں چاہتا پھر وہاں کو بھی میں بیگم صاحبہ کے پاس سارا دن بولوں کا آنا جانا رہتا ہے،
 اچھا نہیں لگتا کہ سچ سنو کر لوگوں کے سامنے آؤں۔“

اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پا کر وہ بڑے نارمل سے انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔
 راجو بہت غور سے اس کے الفاظ اور چہرے کے تال میل کو دیکھ رہا تھا۔

وہ غصہ میں آئے تو بولتے چلے گئے۔ ”اور کلرک ہوں سرکاری محکمے میں سارے عیش اور کی آمدنی میں کرائے ہیں تم لوگوں کو وہ تو یہاں کوئی پوچھنے والا نہیں، ورنہ جس دن کوئی اچھی آؤٹ ٹیم آگئی تو جان چھڑائی مشکل ہو جائے گی۔“

”اللہ نہ کرے کوئی تو اچھی بات منہ سے نکال لو۔“
شاگرہ بیگم کو ان کی صاف گوئی بری لگی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے پیسے خرچ کرتے ہوئے وہ کب کا بھول چکی ہیں کہ ان کے شوہر کی جائز آمدنی کتنی محدود ہے، اپنے طور پر اس درمیانہ درجے کے محکمے اور خاندان میں سب سے ممتاز حیثیت کی حامل تھیں۔

”کوئی گھڑی قبولیت کی بھی ہوتی ہے انسان کو یوں ہی رہنا سوچے سمجھے بھی نہیں بولنا چاہیے۔“
”ٹھیک ہے ٹھیک ہے تم سلمان کو ذرا فون کرو ابھی، کمو آکر مل جائے اور پیسے بھی ساتھ لیتا آئے۔“
اظہار صاحب نے کہا تو وہ بنا کچھ کے فون کرنے اٹھ کھڑے ہوئیں۔
دل بے حد بھاری ہو رہا تھا۔

”وہ کہہ رہا ہے کہ ابھی تک اس کے سر نے اسے کوئی تنخواہ نہیں دی ہے اور مانتے ہوئے اسے شرم آتی ہے۔“ خلاف توقع وہ جلدی واپس آئی تھیں۔

”بکواس کرتا ہے۔“ وہ یکدم بڑے زور سے چلائے۔ ”وہ انتہائی خود غرض اور گھٹیا ثابت ہوا ہے اس نے ہم سے جان چھڑائی ہے شاگرہ! اب ہم اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے۔ وہ اپنی بیوی اور سرکاری خوشنودی کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔“ ان کا چہرہ بے حد سرخ ہو رہا تھا۔

”میں اس سے پھر بات کروں گی، تسلی کے ساتھ ہم اتنی مینشن مت لو۔ وہ کچھ نہ کچھ انتظام کر دے گا۔“
شاگرہ چچی کالج پست تھا جیسے انہیں خود بھی اپنے کے الفاظ پر یقین نہ ہو۔ ”یا پھر میں گل سے بات کرتی ہوں، لی حال اس سے لے لیتے ہیں بعد میں جب سلمان بڑے گا تو پھر اس کو واپس کر دیں گے۔“
”نہیں دے گی وہ بھی؟“ انہوں نے مایوسی سے سر ہلایا۔

”وہ دونوں بہن بھائی ایک سی فطرت کے ہیں، میری بات پر یقین نہ ہو تو پوچھ کر دیکھ لو، تمہیں بھی پتا چل جائے گا۔“

شاگرہ بیگم چپ چاپ ان کی شکل دیکھے گئیں۔ سلمان اور گل۔
دونوں ہی پر انہیں خود اپنے سے زیادہ بھروسہ تھا، سلمان بدل سکتا تھا بیٹا تھا، مگر گل بیٹی تھی، نفی میں سر ہلاتے ہوئے انہوں نے خود کو تسلی دینا چاہی تھی۔



”می! راجہ کمرے میں چائے کا کپ لیے داخل ہو رہی تھی، انہوں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور ہلکے سے مسکرائیں۔“

”کتے گھنٹے ہو گئے ہیں، اب بس کرویں، صبح سے مشین پر بیٹھی ہوئی ہیں۔“
چائے کا کپ ان کے قریب رکھتے ہوئے وہ پیچھے کھڑے ہو کر ان کے کندھے دبائے لگی۔

”شادی کا کام ہے، کل لازمی واپس کرنا ہے، قارغ ہو جاؤں گی تو ان شاء اللہ ایک دو دن آرام ہی کروں گی۔“
”بس ایک دو دن۔“ وہ خوش ہونے کے بجائے اداس ہوئی۔ ”آپ کا دل نہیں چاہتا کہ آپ بھی دوسری آدمیوں کی طرح آرام کریں، خاندان میں ملیں جلیں، شاپنگ کریں دل کھول کر۔“

اپنی پلاننگ کے حساب سے کرتی آرہی ہیں اور آگے بھی کرتی رہیں گی۔“
زویا بے نیازی سے کہتے ہوئے سیڑھیوں کی جانب جانے لگی۔

”اور امی! وہیں کھڑے کھڑے وہ ان کی طرف مڑی۔“ سارے خاندان میں یہی ایک گھر ہے جس نے سلمان بھائی کی شادی سے لے کر اب تک کوئی ایک بات بھی آپ لوگوں سے اس بارے میں نہیں کی، یہاں تک کے راجہ کے ٹھکرائے جانے کا جملہ تک نہیں کیا، پھر بھی آپ کا دل صاف نہیں ہوتا۔“ اپنی بات کہہ کر وہ تیزی سے اوپر چڑھتی چلی گئی وہ منہ کھولے دیکھتی رہ گئیں۔

”یہ زویا کی زبان کچھ زیادہ ہی چل پڑی ہے، کل سے کہہ کر کسی دن ٹھیک کرواتی ہوں۔“
وہ شاید اسی وقت آپا گل کو فون کرنے کھڑی ہو جاتیں، مگر کیٹ پر گاڑی کی آواز سن کر ارادہ موقوف کیا، اظہار صاحب آج آفس سے وقت سے پہلے واپس آئے تھے۔

”خیریت تو ہے طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ وہ تشویش سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔
جب سے سلمان اور زویا گئے تھے وہ بہت خاموش رہنے لگے تھے، گھر میں ہوتے تو سارا وقت اپنے کمرے میں گزارتے۔

مگر اس وقت وہ سیدھے کمرے میں جانے کے بجائے لاؤنج کے صوفے پر بیٹھ چکے تھے۔
”کیا ہوا بتاؤ تو سہی یوں چپ کر کے کیوں بیٹھ گئے ہو، کوئی اور بات ہو گئی کیا؟“
ان کی داؤد بچانے کی عادت بہت بختہ تھی۔ اظہار صاحب نے بمشکل ہی اپنا غصہ ضبط کیا۔
”سلمان کا فون آیا تھا؟“

”نہیں۔“
”تو تم کر لیتیں۔“

”کیا تھا، مگر وہ جلدی میں تھا، زیادہ بات نہیں ہو سکی۔“ وہ ان کے سوالوں سے کوئی نتیجہ تو اخذ نہیں کر سکی تھیں، لیکن پریشانی میں کمی آنے لگی تھی۔

”پیسوں کے بارے میں کچھ کہہ رہا تھا، تنخواہ تو مل گئی ہوگی اسے اب تک۔“
”ایسی تو کوئی بات نہیں کی اس نے اور کیا پتا ابھی تنخواہ ملی ہی نہیں ہو اسے۔“

”نہیں ملی تو مانگ لے اپنے سر سے، اسے فون کر کے کہو کہ مجھے لون کی قسط جمع کرانی ہے دو دن میں وہ اور کچھ نہیں تو ہمیں اپنی تنخواہ میں سے پیسے تو دے سکتا ہے۔“ وہ تلخ ہو رہے تھے۔

شاگرہ بیگم نے پہلی بار ان کے منہ سے ”لون“ کا لفظ سنا تھا، ہکا بکا ہو کر دیکھنے لگیں۔
”کون سا قرضہ لے لیا تم نے، پہلے تو کوئی ذکر نہیں کیا؟“

”یہ لاکھوں روپیہ جو ابھی تم خرچ کر کے بیٹھی ہو، وہ کہیں سے تو آیا تھا، گھر پر قرضہ لیا تھا میں نے، اسی کی قسط پچھلے دو ماہ سے نہیں دے سکا ہوں۔“

”گھر گروی رکھ دیا؟“ شاگرہ بیگم کو بڑا گرا صدمہ پہنچا۔ ذرا دیر کو تو سلمان، زویا، تنخواہ، کمال خاندان سب ہی کچھ کہیں پیچھے چلا گیا۔ ”بینک میں اتنا پیسہ رکھا تھا، پھر تمہاری اتنی کھلی آمدنی، کوئی کمی تو نہیں تھی، جو تم نے اتنا چھا گھر اوپر لگا دیا۔“ ان کا دل بچ بچ بیٹھا جا رہا تھا۔

”قارون کا خزانہ بھی کم پڑتا ہے شاگرہ بیگم ایسے بے تکی خرچوں میں، یاد ہے کتنے لاکھ تو زویا کو دلوائے تھے، پھر اتنا بھاری بھر کم و لیمہ، اس سے پہلے کی جانے والی شاپنگ، جسے بعد میں یوں ہی فضول قرار دے دیا تھا، نہایت کم

جنون سوار تھا تم سب پر۔“

”سب کچھ ہو گا ان شاء اللہ بس ذرا معاذ کو جا ب مل جائے پھر یہی سب کرنا ہے جو تم کہہ رہی ہو۔“ میمن میں لگے کپڑے کا دھاگہ توڑتے ہوئے وہ اطمینان سے بولیں۔ ”اب آگے تو آرام ہی آرام ہے۔ ایک دلع معاذ کو جا ب مل گئی تو پھر وہ کہاں کام کرنے دے گا مجھے یا تمہارے ابا کو۔“

معاذ کی تمام لاپرواہی کے باوجود گھر کے تینوں بڑے اس کی طرف سے سخت خوش فہمی کا شکار تھے۔ ربیعہ چپ چاپ ان کے کندھے دباتی رہی۔

”بہت آرام ملا اب بس۔“ انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سامنے بٹھایا۔

”امی! آپ کو لگتا ہے کہ معاذ جا ب ڈھونڈ رہا ہے؟ کسی بھی وقت وہ کوئی ایسا ذکر نہیں کرتا جس سے پتا چلے کہ وہ جا ب کے معاملے میں کتنا سیریس ہے۔“

کوئی فائدہ نہیں تھا پھر بھی وہ کئے بغیر نہیں رہ سکی۔

”ڈھونڈ رہا ہے، لیکن ملے تو سہی میرا بچہ لاپرواہ ضرور ہے، لیکن بے جس نہیں ہے وقت آئے گا تو وہ ہم سب کے لیے بہت کچھ کرے گا۔“

”اظہار صاحب اتنا انتظار نہیں کریں گے جو یا کے ویسے بھی بہت رشتے آتے ہیں۔“ اس کی فکر مندی برقرار تھی۔

امی خاموشی سے چائے گھونٹ گھونٹ کر کے پیتی رہیں، ربیعہ منتظر نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھیں۔

”صرف دادی کے کوشش کرنے سے کیا ہو گا، نہ تو معاذ سنجیدہ ہوتا ہے اور نہ ہی آپ اور ابا ہی اظہار چچا پر کوئی زور ڈالتے ہیں۔“ وہ تھوڑا سا پریشور بھاری تھی تب ہی ایک گہری سانس لیتے ہوئے انہوں نے ہاتھ میں تھاما ہوا کپ ایک طرف رکھا۔

”سچ بات تو یہ بیٹا کہ میں اب اس رشتے کے حق میں ہی نہیں ہوں۔ اباں کی خوشی کی وجہ سے مخالفت بھی نہیں کر رہی، لیکن اظہار بھائی اور شاکرہ بھابھی سے تعلق جوڑنا ایک مستقل درد سر مول لیتا ہے۔ دونوں احساس برتری کے نشے میں چور ہیں اور جہاں عزت نہ ہو وہاں کسی محبت اور لحاظ کا بھی کیا سوال اٹھتا ہے۔“

”جو یا تو بہت اچھی ہے امی۔“

”تم بھی بہت اچھی تھیں۔“ انہوں نے بمشکل ہی خود کو یہ کہنے سے روکا۔

”اور پھر معاذ خود بھی تو اسے پسند کرتا ہے۔“ ان کی لانا تعلق پر ربیعہ کو مایوسی ہوئی تھی۔

”پسند کرتا ہے تو ان لوگوں کے معیار کے مطابق خود کو ڈھال لے، اس کی خاطر ہم اظہار بھائی کے گھرانے کو برداشت کرنے کی کوشش کر لیں گے۔“

وہ دوبارہ مشین میں لگے کپڑے کی طرف متوجہ ہو رہی تھیں اور چہرہ بالکل بے تاثر تھا۔

ربیعہ کو یقین ہو رہا تھا کہ وہ اب اپنی اس دیرینہ خواہش سے دستبردار ہو چکی ہیں۔

”ہم جیسے بھی ہیں اپنے حالات پر قانع اور شاکر ہیں، انہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ ہمیں حقارت سے دیکھیں۔“

انہیں اس روز کی اپنے گیٹ پر اظہار چچا سے ملنے بھینسا د تھی اور ان کی طنزیہ مسکراہٹ اور دل توڑتے جملے بھی۔ ”اس میں جو یا کا کیا تصور ہے امی! ربیعہ کی آواز پتلی تھی۔

”مسز! ہمیشہ تصور وار کو نہیں ملتی ہے، کبھی کبھی انسان کو دو سروں کا کیا ہوا بھی بھگتتا رہتا ہے۔“

”لیکن اگر فرض کریں اظہار چچا مان گئے تو پھر تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔“

کم از کم امید تو رکھی جاسکتی تھی۔

”وہ کبھی نہیں مانیں گے۔“

موٹر کی گھر گھر میں ان کی آواز دب رہی تھی۔ ربیعہ چائے کا خالی کپ اٹھا کر باہر چلی آئی۔

سامنے تیز قدموں سے چلتا ہوا معاذ اسی طرف آ رہا تھا۔

”امی کمرے میں ہی ہیں نا؟ ربیعہ سے کفرم کرتا ہوا وہ سیدھا اندر چلا گیا اس کے ہاتھ میں دبے چند بڑے بوٹ اسے دکھائی دے گئے تھے۔

”امی! تھوڑے میسے دیجئے گا مجھے، آپ کو مل تو گئے ہوں گے بہت ضروری کام پڑ گیا ہے۔“ ربیعہ کو اس کی آواز باہر سنائی دے رہی تھی۔

”یہ اور ان کے ضروری کام۔“ وہ کوفت سے برہنہ تھی۔

آج اس نے خلاف عادت معاذ کو نصیحت کرنے کے لیے یہاں رکنا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔ دادی اپنے کمرے میں جیسے اس کی منتظر تھیں۔

”اے ربیعہ! ذرا اظہار کے گھر کا نمبر تو ملا دو بیٹا! اتنے دن ہو گئے آیا تک نہیں۔“

”نہیں ملی ہوگی فرصت لوگوں کو بہت کام ہوتے ہیں دادی۔“ وہ سخت بے زار ہو رہی تھی۔

”کام تو اتنے ہی ہیں، بس وقت میں سے برکت ختم ہو گئی ورنہ پہلے بھی یہی چوبیس گھنٹے تھے کام بھی ہو جاتے تھے، ملنا ملنا بھی اور سکون سے عبادت بھی کر لیتے تھے اب تو سارا دن بھاگ دوڑ رہے بس۔“

وہ چند لمحے یوں ہی اظہار خیال کیے گئیں۔

ربیعہ کا خیال تھا کہ اسی طرح شاید ان کے ذہن سے فون والی بات اتر جائے، لیکن ایسا نہیں ہوا۔

”تم فون ملا کر دے رہی ہو یا نہیں۔“ اس بار وہ خاصی خفا تھیں۔ ربیعہ کو اٹھنا ہی پڑا۔

”کیا بات کریں گی؟“

”خیر خیریت پوچھوں گی اتنا تعلق تو رہنا ہی چاہیے، کل کو جب خیر سے معاذ کی شادی ہوگی تو۔۔۔!“

”یہاں میرے اور آپ کے علاوہ کسی کو فکر نہیں ہے۔ خود معاذ کا رویہ دیکھا ہے، مجال ہے جو ذرا سیریس ہو رہا ہو۔“

وہ بے حد بددل ہو رہی تھی امی کی ناپسندیدگی کا ذکر جان بوجھ کر نہیں کیا تھا، دادی کو سخت برا لگ جاتا تھا۔

”اظہار حتمی جواب دیں، پھر معاذ کو بتاؤں گی تم کو کھنا وہ کتنا خوش ہو گا جو یا اسے شروع سے پسند ہے۔“

”کمال ہے، آپ یہ اندازے بھی لگاتی ہیں۔“ دادی کی بات پر وہ ہنس پڑی۔

”کسی لڑکے لڑکی کی پسند کا اندازہ لگانا کون سا مشکل کام ہے، خود ہی ظاہر ہو جاتا ہے، تم نمبر ملاؤ۔“

ربیعہ نے اس بار بنا مزید کچھ کے نمبر ڈائل کر کے فون دادی کو تھمایا اور خود باہر والے برآمدے کی سیڑھیوں پر آ گیا۔

سامنے احاطے میں شام پوری طرح اتر چکی تھی۔ فضا میں سبزے کی منک تھی اور بیرونی دیوار پوری کی پوری جی سفید بوگن ویلیا سے تقریباً ڈھکتی جا رہی تھی۔

”اور کچھ نہیں تو دیواروں کا اکٹھا ہوا پلستر ہی چھپا رہتا ہے۔“ اس نے ان پر نگاہ جماتے ہوئے سوچا۔

گھر میں کتنے ہی کام توجہ طلب تھے۔

رنگ اڑی دیواریں۔

اپنی مدت پوری کرتا ہوا فرنیچر۔

آئے دن خراب ہوا، ریفریجریٹر۔
اور بھی بہت کچھ۔۔۔ صرف وہی تھی جس کا دل گھر کی حالت زار پر کڑھتا تھا۔
باقی لوگ اتنے قانع تھے کہ انہیں ان سب باتوں سے کب فرق پڑنے والا تھا۔
تھوڑا سا احساس ذمہ داری، اگر معاذ ہی میں ہوتا تو بھی صورت حال خاصی بہتر ہوتی، مگر وہ تو خود اپنے لیے بھی
کچھ نہ کرنے کی قسم کھائے ہوئے تھا۔

ایک کے بعد ایک ذہن میں کئی باتیں گنڈھ ہورہی تھیں۔
کوئی اچھا وقت کبھی آنا بھی تھا یا بس لمحہ لمحہ گزرتی زندگی مہمبر و قناعت کا پہاڑا پڑھتے ہوئے، آخر کار اپنے منطقی
انجام تک پہنچ جائے گی۔
کبھی کبھی ساری خوش امید یوں ہی ہاتھ چھڑا کر بھاگ لیتی تھی، داوی پیچھے آکھڑی ہوتی تھیں۔
”اتنی جلدی!“ اس نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

”ہاں، وہ اظہار گھر پر نہیں تھا۔“
داوی مختصر سا جواب دیتے ہوئے تھوڑی سی شرمندہ ہوئیں، انہوں نے خود اظہار صاحب کی آواز ریسیور میں
سنی تھی، مگر جو شا کر کہہ رہی تھیں اسے جھٹلانا بھی ناممکن تھا۔
آنا گل نے پیسوں کے معاملے میں تو حسب توقع معذرت کر لی تھی۔
لیکن بقول خود وہ اپنے فرائض سے غافل ہرگز نہیں تھیں، سو پچھلے ایک ہفتے میں وہ جو یا کے لیے ایک کے بعد
ایک تین رشتے لے کر آئی تھیں، وہ بھی بنا کسی پیشگی اطلاع کے۔

جو یا گھر پر ہی ملی اور ہر بار دھلی گئی۔
گھر آئے اچانک مہمانوں کی خاطر تواضع بھی کرنی پڑی، اور تھوڑی دیر بیٹھ کر ان کے اٹھے سیدھے سوالوں کے
جواب بھی دینے پڑے۔
ان کا طریقہ کار اب اچھی طرح سمجھ میں آ رہا تھا، پہلے سے اطلاع کرتی تھیں تو جو یا پہلے ہی مورچہ بند ہو کر بیٹھ
جاتی تھی، یا تو کمرے سے ہی نہ نکلتی یا پھر کسی سہیلی یا کام کا بہانا بنا کر زویا کے ساتھ چل پڑتی، لیکن اب ایسا نہیں
رہا تھا۔

وہ کتنا بھی جھنجھلاتی کام ان کے حسب منشاء ہی ہو جاتا۔
”مجھے تو پورا یقین ہے کہ اسی طرح کسی دن وہ تمہارے ہاتھ میں سلامی کی رقم بھی پکڑا دیں گی کسی سے بات
پکی کام ختم۔“

زویا بڑے معتبر انداز میں اس کے سامنے بیٹھی پیشین گوئی کر رہی تھی۔
”اللہ نہ کرے۔“ جو یا نے بے حد برامان کر اس کی طرف دیکھا۔
”ایسا ہی ہوگا اور سچ پوچھو تو اس میں غلط بھی کیا ہے، بی ایس سی کے بعد بظاہر تمہاری شادی میں کوئی حرج بھی
نہیں ہے، سو ہوتی ہے تو ہو جائے دو۔“

وہ اتنی بے غرضی سے کہہ رہی تھی کہ جو یا کو لگا جیسے وہ کسی اور کے بارے میں بات کر رہی ہے۔
”اٹے، ہیلو!“ اس نے اپنا ہاتھ زویا کی آنکھوں کے آگے لہرایا۔

”یہ تم مجھے کہہ رہی ہو؟“

”ظاہر ہے یہاں اور کون ہے۔“ اس کا انداز بے نیازی بدستور تھا، ”پھر وہ تینوں رشتے بھی ٹھیک ٹھاک ہیں، یہ تو
شکر ہے کہ تم ان تینوں کو پسند آگئیں، ورنہ آج کل تو لڑکوں کے گھر والے لڑکوں سے زیادہ نخرے دکھاتے ہیں لڑکی

اس سے بات نہیں کرتا اس کی طرف بطور خاص متوجہ بھی نہیں ہوتا پھر بھی اپنائیت کا ایک گہرا احساس سے اپنے اور معاذ کے بیچ ہمیشہ ہی شدت کے ساتھ محسوس ہوا تھا۔

احساس اس کا یقین تھا۔
 اس تم سے چھوٹی ہوں جو یا! لیکن شاید تم سے زیادہ سمجھ دار۔ ”زویا اٹھ کر اس کے قریب آئی تھی۔ ”معاذ اتنے ہیں۔ یقیناً ”لیکن کوئی ایک بات بھی کہی ان کی طرف سے ایسی نہیں ہوئی جو اس بات کا احساس نہ دلائی ہو۔ تمہاری پروا ہے یہی دیکھ لو کہ اب تک وہ ایک ڈھنگ کی نوکری بھی نہیں ڈھونڈ پائے۔“

معاذ اب بہت نرم ہو رہا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ جو یا کو تکلیف پہنچانے کا سبب بن رہی ہے۔ نوکری ڈھونڈ رہا ہے زویا! لیکن اس کی قسمت میں شاید جدوجہد زیادہ لکھی گئی ہے۔ قسمت پر الزام رکھنا سب سے آسان راہ فرار ہے۔ ”وہ شاید معاذ کے لیے ہر رعایت ختم کر چکی تھی۔ انکھوں سے دنیا کو دیکھو، صرف خواب دیکھنے سے کام نہیں چلتا، تعبیر پانے کے لیے کوشش بھی ضروری ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ خواب کوئی دکھتا ہے اور تعبیر کسی اور کے حصے میں آجاتی ہے۔“

معاذ کے لیے زویا! ”اس بار جو یا نے اس کے آگے بے ساختہ ہی ہاتھ جوڑ دیے ”ایسی باتیں تو منہ سے بچنے سے زور زور سے سلمان کے بولنے کی آواز بڑھ دو دونوں ایک ساتھ ہی چونکی تھیں۔

”آج یہ کیسے راستہ بھول گئے۔“ زویا پہلے اٹھ کر کھڑی ہوئی۔
 ”میں تم جتنی جلد ممکن ہو سکے معاذ بھائی کے ارادے جاننے کی کوشش کرو، یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔ میں نے سیرتھیاں اترنے سے پہلے ایک بار پھر مڑ کر یاد دہانی کروائی اور پھر تیزی سے نیچے چلی گئی۔

”کیا بات کرے وہ معاذ سے؟“ ایک بڑا سا سوالیہ نشان اس کے آگے آکھڑا ہوا۔
 ”کہ وہ کب اسے اس قابل سمجھے گا کہ اپنی نظر کرم سے نوازے گا دھت۔“
 ”میں بھی بڑا تو ہیں آمیز سا تھا۔

”بالکل اس نے اپنی فیلنگ کو بہت چھپا کر بھی نہیں رکھا ہوا تھا، پھر بھی اس طرح براہ راست پوچھنا اس نے سے نفی میں سر ہلایا۔
 یہ کام اس کے بس کا نہیں تھا، لیکن جو کچھ نتائج زویا ابھی ابھی اخذ کر کے گئی تھی۔ اگر سچ ثابت ہوتا تھا تو پھر ہونے کا کون سا جو ازیب باقی رہ جاتا تھا۔

”میں بھی سوچے گئی۔ نیچے سے آتی آوازوں میں شدت آرہی تھی۔
 سلمان بھی کبھی آتا تھا اور جب بھی آتا ایک لمبی بحث ضرور ہی بھگتا کر جاتا تھا۔

”زلیات اور جو بات کا ایک لاکھ حاصل سلسلہ شروع ہوتا۔ اور پھر کئی دن کی خاموشی چھا جاتی فی الحال لون کی قسط کے کڑے بیچ کر ادا کی جا چکی تھی لیکن اب تک سب ہی جان چکے تھے کہ وہ اپنی کوئی ذمہ داری نہیں

”میں نے مانی نا اظہار۔
 ”بہ بی والدین اولاد پر خرچ کرتے ہیں، آپ نے کون سا احسان کیا ہے جو بار بار مجھے خرچ گنوانے کھڑی ہیں۔“ نیچے سے اس کی آواز سماں تک سنائی دے رہی تھی۔
 ”میں وقت ہوتا تو وہ شاید اب تک اٹھ کر نیچے جا بھی چکی ہوتی، مگر زویا کے بخشنے ہوئے خدشات دل پر بھاری

”میں نے دھرتے تھے۔
 ”ہے یا نہ چاہے لیکن وقت آگیا تھا کہ معاذ کے ارادوں کے بارے میں جان ہی لیا جائے۔ جو یا نے بے چینی

پسند کرنے میں۔“
 یہ جملہ قطعی آبا گل کا تھا جسے وہ کوٹ کر رہی تھی۔
 ”شرم کرو زویا! ایک آبا گل کم ہیں میرے لیے جو تم بھی۔“ پورا ہفتہ سخت ٹینشن جھیل کر اس کے اعصاب اب تھک چکے تھے۔

زویا کو لگا جیسے اب وہ رونے ہی والی ہے۔
 ”آبا گل تمہاری دشمن نہیں ہیں اپنے طور پر جو کر رہی ہیں ٹھیک کر رہی ہیں، گھر کے حالات تیزی سے بدل رہے ہیں اور سلمان بھائی سے کوئی امید نہیں ہے تو کم از کم وہ تمہیں ایک اچھی زندگی دینے کی کوشش تو کر رہی ہیں۔“

وہ بے حد سنجیدہ تھی۔ اور اس کے لہجے میں آبا گل کے لیے کوئی طنز یا خفگی نہیں جھلک رہی تھی۔
 ”تو اب زویا بھی۔“ جو یا کا سوچ کر ہی دل بیٹھنے لگا۔
 ”گھر میں اول و آخر ایک ہی جماعتی دستاویز تھا، سوا اب وہ بھی ہاتھ سے جاتا محسوس ہو رہا تھا۔
 ”کسی کو میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور میں کسی سے بھی شادی نہیں کروں گی بس۔“

”کسی سے نہیں کروں گی یا معاذ بھائی کے علاوہ کسی سے نہیں کروں گی۔“
 زویا کی نگاہ میں بڑی اجنبی سی چھین تھی۔
 ”ٹھیک ہے، یہی سمجھ لو۔“ ڈر اس اسخ موڑتے ہوئے وہ ہلکے سے بولی۔
 ”سمجھ لیا۔“ اب یہی بات تم معاذ بھائی کو بھی سمجھا دو، تاکہ ان کا پوائنٹ آف ویو بھی پوری طرح کلیئر ہو جائے تم پر یہ انتظار ختم ہو آخر۔“

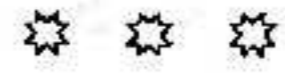
جو یا نے بہت حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔
 ”آج وہ آخر کیسی باتیں کر رہی تھی، جانے بوجھے بھی کہ وہ معاذ سے۔“
 ”بہت سی باتیں اب اچھی طرح سمجھ میں آنے لگی ہیں جو یا! آبا گل کا طریقہ غلط ہو سکتا ہے، مگر وہ میرا تمہارا برا نہیں چاہ سکتیں، جو حالات چل رہے ہیں ان میں اگر وہ تمہاری شادی کی فکر کر رہی ہیں تو کیا غلط ہے۔“

”میں کچھ نہیں جانتی، لیکن ان سے کہہ دو کہ وہ میری ”فکر“ نہ کریں۔“
 ”ٹھیک ہے، پھر اس سے بھی کہو، جس کی فکر میں تم کھل رہی ہو۔ تم معاذ بھائی سے ایک بار بات کیوں نہیں کرتی ہو جو یا! اور کچھ نہیں تو یہ کنفیوژن تو دور ہو۔“

”جو بات زویا کو بہت دن سے چھ رہی تھی آج صاف صاف کہنے سے خود کو نہیں روک پارہی تھی۔
 ”میں کیا بات کر سکتی ہوں، میری اس سے کون سی ایسی بے تکلفی ہے۔“ اپنے دفاع کے لیے اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔
 ”تم بات نہیں کر سکتی ہو اور خود انہیں ساری زندگی خیال نہیں آئے گا اور جو کبھی یہ نیک کام کرنے کی بات تو اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ تم سے ہی کریں گے۔“

”جو یا کا دل بہت زور سے دھڑکا۔
 کیسی عجیب بات کی تھی زویا نے۔
 نا قابل یقین۔
 ایسا کیسے ممکن تھا بھلا۔“

کے ساتھ پہلو بدلا۔



کیمبرج اسکول کے احاطے میں بڑی رونق تھی۔ سارا دن بل بھر کر چھڑکاؤ کیا گیا تھا۔ سو فضا میں مٹی کی بل فریب خوشبو بس رہی تھی، ترتیب سے رکھی کرسیاں اور چھوٹا سا خوب صورتی کے ساتھ سجایا ہوا اسٹیج ساری محنت ان ہی بچوں کی تھی مجنوں نے یہاں سے ابتدا کی اور لکھنار پڑھنا سیکھ کر آج فارغ ہو چکے تھے۔

ان تھک محنت میں گزرنے والے شب و روز میں سے کچھ وقت نکال کر انہوں نے بڑی ہمت سے یہ کام مکمل کیا تھا۔ وہ سب آج بھی وہی کام کر رہے تھے جو پہلے کر رہے تھے، ٹرننگ سکلز کے درمیان بھاگ کر اخبار اور پھول بیچنا، گیراج اور ورکشاپ میں کام کرنا، دکانوں یا رکشوں میں صفائی کرنا اور اسی نوعیت کے دوسرے کام۔ مگر ایک خاموش سی تبدیلی اپنا جاؤ جگانے لگی تھی۔

”ان بچوں کے چروں پر غمخوار اعتماد دیکھ رہے ہو سبحان؟ یا وہ ہے جب پہلے روز یہ لوگ آئے تھے تو کتنے گھبرا رہے تھے۔ انہیں بولنے پر مجبور کرنا پڑا تھا اپنے بارے میں بات کرنے سے بھی گھبراتے تھے اور آج دیکھو۔“

معاذ نے اپنے قریب کھڑے سبحان سے کہا تو وہ بھی ہلکے سے ہنس پڑا۔

”شکر ہے ایک چھوٹا سا کام ہم نے بخیر و خوبی انجام دیا اب کم از کم یہ لوگ آئندہ زندگی میں اپنے بارے میں بہتر طور پر سوچنے کے قابل تو ہوں گے کچھ تو بہت سنجیدگی سے آگے پرائمری تعلیم مکمل کرنے میں دلچسپی لے رہے ہیں۔“ وہ سب بے حد خوش تھے۔

اپنے مختصر سے دائرہ کار میں انہوں نے آخر کچھ تو کرو دکھایا ہی تھا۔ آگے امید کی لو اور بھی تیز ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔

”اب دیکھو خدا کرے کچھ بات بن جائے۔ زرتاج بیگم چاہیں تو ان بچوں کو خاصی مدد دے سکتی ہیں۔ تعلیم کے حوالے سے آج کل بڑی سرگرم ہیں۔“

سبحان کی خواہش پر آج زرتاج بیگم کو مہمان خصوصی کے طور پر مدعو کیا گیا تھا، اسے یقین تھا کہ شرت کے شوق میں وہ کچھ نہ کچھ ضرور ہی کر دیں گی۔ معاذ تھوڑا سا خائف تھا۔

گوٹھ جمالی والے اسکول سے جزی داستانیں اب کی وجہ سے اس کے زیادہ علم میں رہی تھیں مگر زرتاج بیگم کے پہلی والے شوق سے بھی اچھی طرح واقف تھا، سو اگر اسی زمانے ان کے ہاتھ سے کوئی بھلا کام ہو سکتا تھا تو اس سے اچھی بات کیا تھی۔

”ابھی تک آئی نہیں ہیں گھر سے تو کب کی نکل چکی ہیں۔“ سبحان گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”ہاں میرا خیال ہے کہ بس۔“ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

”ساجد! کرسیوں کی لائن کے سب سے آخری سرے کے پاس کھڑے ساجد کو اس نے بڑی محبت سے گلے لگایا۔ ”مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ تم آگئے آتے عرصے میں ایک بار ملنے تک نہیں آئے، ہم سب کتنا انتظار کرتے رہے۔“

ساجد کے ہونٹوں پر ہلکی سی کپکپاہٹ ابھری۔

بھلا وہ کیسے معاذ بھائی کو بتائے کہ اگر وہ یہاں آتا تو اس کے ابا کے جنگلی دوست، معاذ بھائی کو اور کتنا نقصان پہنچا سکتے تھے۔

دل ہی دل میں اس نے اپنے ابا کی دوہمکیوں کو یاد کیا اور تھوڑا سا اور سہم گیا۔

معلوم نہیں اس وقت بھی اس نے یہاں آکر کوئی غلطی تو نہیں کی تھی ایسی غلطی جو معاذ کو بھائی کو نقصان پہنچا دے اور نہیں کچھ نہیں ہوتا، مجھے خوشی ہے کہ تمہیں میرا پیغام مل گیا تھا۔“ معاذ اس کی کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔

”معاذ بھائی نے چپکے سے بتا دیا تھا کہ آپ وہاں آئے تھے۔“

”کوہ سیدھی سادی سی لڑکی یاد آئی جس کا نام بھی اسے ابھی ابھی پتا چلا تھا۔

سری طرف سے ان کا شکریہ ادا کر دینا۔ چلو اب اپنے دوستوں سے مل لو اور یاد رکھنا اس بار تمہیں بھی ان سے ہونا ہے۔“

بچے ساجد کو دیکھ کر اس کے گرد جمع ہو رہے تھے، معاذ انہیں وہیں چھوڑ کر آگے کی طرف آیا جہاں چند دوستوں کے ساتھ زرتاج بیگم کا منتظر تھا۔

ساجد کو تم نہ بلا تے تو اچھا ہوتا، ایک تو ویسے بھی اس کا احساس محرومی بڑھے گا اور پھر اس کے پیچھے بڑے ہلکے لوگ ہیں۔“ سبحان فکر مندی سے کہہ رہا تھا، اسے معاذ کا ہفتوں ہسپتال میں پڑے رہنا بالکل بھی نہیں

تھا۔

اسے احساس دلانا چاہتا تھا کہ ہم اب بھی اس کے ساتھ ہیں۔ اور دیکھنا کبھی نہ کبھی وہ بھی ہمارے ساتھ

نہیں نہیں لگتا۔“ سبحان کی نگاہیں دور سے بھی ساجد پر ہی جمی رہی تھیں۔ ”ویسے یہ لڑکا کچھ زیادہ ہی کمزور

ہو گیا ہے معاذ! پھر مجھے ہی لگ رہا ہے۔“

اسل ان بچوں میں کون تندرست ہے یا راتھوڑے سے پیسوں کے لیے بارہ چورہ گھنٹے پلوشن زہ ماحول میں

تھے ہیں صحت تو خراب ہونی ہی ہے۔“

اپنے زرتاج بیگم کی گاڑی آکر رک رہی تھی وہ دونوں ہی اس طرف متوجہ ہو چکے تھے استقبال کے لیے

ہونے والے بچوں نے صحت پٹ اپنی لائن بنائی اور جن کے ذمہ اسٹیج کو سنبھالنا تھا وہ دوڑتے ہوئے ادھر

سب کچھ کسی سیٹ کی طرح تیار تھا۔

سرف ساجد ہی تھا جو اکیلا اپنی جگہ کھڑا رہ گیا تھا۔ تب ہی معاذ نے آواز دے کر اسے استقبالیہ میں کھڑے بچوں

کا ہاتھ آکر کھڑا ہونے کو کہا تو وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ان کے ساتھ آگیا۔

زرتاج سب کے ساتھ ملتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں۔ وہ ان کے نام و مقام سے واقف نہیں تھا پھر بھی یہ

باقی آئینہ شمار ہے

دل سے سچے عیار

لو پچی نیچی پگڈنڈیوں پر سچ سچ کر قدم رکھتے ہوئے وہ کن اکھیوں سے اطراف کے کھلیانوں میں تندی سے کیاس مچھنے میں مصروف سمجھتے کش عورتوں کو دیکھتی اپنے گھر کی طرف جارہی تھی۔ فصل ایک کرتار ہو چکی تھی۔ تپتے سورج کے تلخ ساہبان میں زندگی کی حرارت کا سامان کرتی عورتیں راز و نیاز سے بے نیاز سرعت سے کام نبھانے میں جتی ہوئی تھیں۔ ان دنوں بھوک اور مفلسی کا احساس سوا ہو جاتا تھا۔ اس لیے زیادہ کی طلب وقتی طور پر اپنی ذات سے بھی غافل سا کر دیتی تھی۔ اس نے منہ ہی منہ میں شکر کا کلمہ پڑھا کہ کسی نے اس کی موجودگی کو محسوس نہ کیا تھا، وگرنہ سلونے رخساروں پر پھلکتی سرخی تو اپنے افسانے کی گواہی خودی تھی۔ مچھی میں دبے اس مختصر سے کاغذ کو متاع جاں کی طرح سمیٹتے ہوئے اس نے اوڑھنی کو ہوا کے زور پر اڑنے سے بچایا تھا۔

”محبت اس کائنات کی سب سے بڑی سچائی ہے میرا! اس کے بنا تو زندگی ایک تاریک صحرائی طرح ہے۔ میں نے زندگی کو بہت پرکھا ہے۔ بڑا حسن دیکھا ہے شہر میں گاؤں میں پر محبت پہلی داری دیکھی ہے۔ تو تو سر تپا محبت ہے ایک اچھے بھلے انسان کو پاگل بنا کر رکھ دیا ہے۔ بھلا مجھے کہاں چین آتا تھا کہیں اور اب تو تیرنی محبت نے ایسا باندھا ہے کہ یہاں سے جانے کو کہیں دل ہی نہیں کرتا۔ حالانکہ ارشد چاچو کب سے باہر ہے ہیں مجھے اپنے پاس۔ پر تو ہے نایاں وہاں تو بس یادیں اور تمنائیں ہیں۔“

شدید ظالم تھا اس کے لہجے میں۔ وہ جو سر تپا محبت تھی۔ اس کی یاسیت زدہ باتوں پر اس سے زیادہ اواس ہو گئی یہ بھی نہ بتا سکی کہ میں نے بھی تو تجھ سے سیکھا ہے یہ لفظ ”محبت“

دگر نہ اپنے تین کمروں کے مختصر سے مکان میں سلین زدہ دیواروں پر خواب تراشتے ہوئے کب سوچا تھا کہ کبھی یہ دل بھی طلب گار محبت ہو جائے گا۔ اپنے سات عدد بن بھائیوں کی فرمائشیں پوری کرتے ان کے لاڈ پیار اٹھاتے دتے کی مریض ماں کی خدمت میں بلکان غصہ و رباپ کی جھڑکیاں کھاتے کب دھڑکنوں کے سر تال پر توجہ دی تھی۔ کب اتنی فرصت ملی کہ دھندلے آئینے میں اپنے نقوش کی خوب صورتی چاچتی پھرے؟ کب غزال آنکھوں کی ساحری کا شعور تھا۔ کب گھنی زلفوں کو محنت سے سنوارا تھا۔ وہ جو اس کے ایک ایک نقش پر دیوان لکھنے کا دعوا کرتا تھا اسے کیا خبر تھی کہ بے خبری کتنی بڑی نعمت ہے۔ آگے کے دروا ہو جائیں تو تلخیاں دکھوں کا لہارہ اوڑھ لیتی ہیں مچھائی اشک بن جاتی ہے۔ راز منکشف ہو جائے تو اپنے آپ سے خوف آنے لگتا ہے۔

ہاں۔۔۔ کتنی عظیم نعمت ہے بے خبری۔ اس کے قدموں کی رفتار میں تیزی آتی تھی۔ کب بخش ڈیرے سے آنے والا تھا یا شاید آجھی چکا ہے۔ خوف کی ایک تیز لہر ریزہ کی ہڈی سے سر سے ابلدہاں زرد پتے کی طرح کانپتے دل تک آتی تھی۔ آج سر سر سے کس قدر دور محسوس ہو رہی تھی وگرنہ عام دنوں



میں وہ چھ سات منٹ میں وہاں پہنچ جاتی تھی۔ پتا نہیں کب کبیں جلد پہنچنے کی جلدی ہو تو زمین پیچھے کیوں لٹکتی ہے۔

”خیر تو ہے سائیں۔! اتنی جلدی میں کیوں ہو؟“

کلی کے کڑپہ بیٹھے غلام اصغر نے عادت کے مطابق شوش سے پوچھا تھا اور وہ ان سنی کرتی اپنے سبز دھواڑے والے گھر کی دہلیز پار کر گئی۔ ڈیوڑھی میں سائیکل کھڑی تھی۔ پل بے ساختہ ہول گیا۔

”کہاں رہ گئی تھیں۔ ابا کب سے آئے بیٹھے ہیں۔“ چھوٹی زہرہ اس کی منتظر تھی جیسے۔ اسے دیکھتے ہی جو لمبے کپاس سے اٹھ گئی۔

”وہ بس۔۔۔“ اس سے کوئی بات نہ بن پڑی۔ ہاتھ سے پسینہ پونچھ کر وہ آگ سلگانے لگی۔ زہرہ لسی ہانے میں لگن ہو گئی تھی۔ پلٹ کر اس کا چہرہ دیکھا۔

”ماچس میں آخری تیلی بجی ہے بس۔“ اس نے رات اٹھا کر سامنے رکھی۔ ذرا سی دیر مزید ہو جاتی تو ابا کا رنگ اس پر نازل ہونا تھا۔ وہ جانے کیوں باقی اولاد کی نسبت اس سے خار زیادہ کھاتا تھا۔

”یہ کیا ہے میراں؟“ زہرہ کے ہاتھ میں وہ سفید کاغذ کا چو ا نجانے میں اس کے ہاتھ سے نکل کر زمین پر جاگرا تھا۔ وہ کھول کر عبارت دیکھ رہی تھی۔

اپنا ساتھ دے یا قید تمنائی دے

”کچھ نہیں۔ ایسے ہی شاعری لکھی تھی۔“ اس نے کاغذ آگ میں جھونک دیا۔

سینے سے بھی آگ کے شعلے نکلنے لگے تھے۔ محبت کے اس کھیل میں کسی کو ہمارا بنانا اسے منظور نہ تھا۔

”میں نے دل کو بڑا سمجھایا ہے میراں! پر یہ کوئی سبیل کوئی جواز سننے پر راضی نہیں ہوتا۔ محبت کوئی سوچ سمجھ کر تھوڑی کی جاتی ہے یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ کتابوں میں بہت پڑھا اس کے بارے میں۔ اب خود پر مبنی ہے تو دل چاہتا ہے سارا کرب بے تابی اور درد کاغذ پر اماروں۔“

گھاس کے تنکے کو بے دردی سے نوچتے ہوئے اس نے نارنجی آسمان کی زرد شعاعوں میں اس کا سلوتا چہرہ بہت غور سے دیکھا۔ سورج کی زردی اس کے رخساروں پر چھا گئی تھی۔

”ماں کتنی سے ارشد چاچو کی فضیلت تیرے بچپن کی منگ ہے۔“ کچھ دیر پہلے ہی اس نے ایک اور راز عیاں کیا تھا اس پر۔ وہ پہلے سے زیادہ خوف زدہ ہو گئی۔

”تو اب۔۔۔ اب کیا ہو گا ابدال؟“

”ہونا کیا ہے۔ میں نے تو ماں کو صاف کہہ دیا ہے کہ شادی میں نے اپنی مرضی کی کرنی ہے۔“ وہ پھر سے گھاس نوچنے لگا۔

”بھلے سے چاچو کے بڑے احسان ہیں ہم پر۔ ابا کے مرنے کے بعد ہماری آوھی ذمہ داری اٹھالی۔ ابا کا بیاہ کیا۔ مجھے اپنے ساتھ شہر لے گیا مگر اس کے احسانوں کے بدلے زندگی بھر کا سودا کیسے کر لوں میراں! تو خود ہی بتا یہ ممکن ہے کیا؟“ وہ کیا کہتی اسے تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ ہجر اور جدائی کتے کتے ہیں۔

”جب تجھے خبر تھی کہ تیری منگنی ہو چکی ہے تو تو

میری طرف کیوں آیا ابدال؟" میرا نے ناراضی سے کہا۔

"میں خود سے تھوڑی آیا ہوں تیری یہ کالی آنکھیں کھینچ لائی ہیں مجھے تیری طرف۔" اس میں بھی وہی قصور وار تھی۔

"اور پھر مجھے تو خود چند ہفتے پہلے پتا چلا ہے کہ فضیلہ میری منگیت ہے۔ وہ سبز مچ جس سے لمحہ بھر نہیں بنتی میری، جنگلی بلی سے بچے جھاڑ کر پیچھے پڑ جاتی ہے۔ مجھے نہیں پسند ایسی لڑکیاں۔ مجھے تو دھیسے مزاج کی سنجیدہ مزاج لڑکیاں پسند ہیں میراں! بالکل تیری طرح۔" اور وہ اپنی تعریف پر خوش بھی نہ ہو سکی۔

"خیر تو پریشان نہ ہو میں نے اہل سے کہا تو ہے کہ وہ چاچی سے بات کریں احمد بھی تو ہے اس کا جوڑ بھی بنتا ہے فضیلہ کے ساتھ۔"

"تو کیا تیری چاچی مان جائے گی۔" میراں نے دھیرے سے پوچھا۔

"اب ماننا تو بڑے گانا اور میرا خیال ہے فضیلہ بھی میرا ساتھ دے گی۔"

"اور میرے ابا ان سے کون بات کرے گا ابدال! وہ تو مجھے زندہ گاڑ دیں گے اگر کچھ بھنگ بھی پڑے گی۔" اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"او کچھ نہیں ہوتا یار! ساری دنیا محبت کرتی ہے۔ ہم نے کوئی انوکھا کام تو نہیں کر لیا۔"

"مگر ابدال! وہ کچھ کہنے کے لیے لب کھولنے لگی مگر ابدال پھر سے وہ خواب و دہرائے لگا تھا جو ان دونوں نے نیلے کے سائے میں بیٹھ کر بنے تھے۔ ان دونوں کا ٹاکرا بھی نہیں ہوا تھا۔

وہ اسکول سے واپس آ رہی تھی جب محبت کی سبز کونپل نے اس کے دل کی سر زمین کا انتخاب کیا۔ ساری سکھیاں خوش کہیوں میں مشغول اس سے آگے نکل گئی تھیں اور وہ میڈم نور جہاں کی ڈانٹ پر اداس تھی۔ اسے ریاضی بالکل سمجھ میں نہیں آتی تھی اور میڈم نور جہاں کے پیریڈ میں وہ ہمیشہ کھڑی ہوتی۔ پتا نہیں وہ حساب میں اتنی کوری کیوں تھی؟ آج تو میڈم

کی سخت سست سنانے پر اس کے آنسو بھی برسے نکلے تھے۔ یہی نئی آنکھوں کا کاجل پھیلا کر انہیں سحر انگیز بنا گئی تھی اور شہر سے واپس آنا ابدال حسن وہیں پر پتھر ہو گیا تھا۔ وہ تو اپنے دکھ پر اشک بہانی گھر کی طرف بڑھ گئی تھی مگر ابدال حسن کے پاؤں اسی راستے پر آ پڑے۔ وہ ہر روز اس کا رستہ تکتا۔ بس دیکھتا رہتا کچھ کہتا نہیں تھا مگر محبت کی سوندھی منک اس کے احساس کو جگانے لگی تھی۔ پھر وہ بھی اس راستے پر اس کی ہم سفر ہو گئی۔

کتنی حیران ہوئی تھی وہ پہلے پہل "محبت" کو جان کر۔

اور اب تو محبت جان بن گئی تھی۔ پھر آنکھوں کے سالانہ امتحان ہوئے اور وہ اگلے درجے میں آ گئی۔ نویں میں داخلے کے لیے شہر جانا پڑا تھا۔ ابا نے انکار کر دیا اور اس نے کتابیں طاق میں سجادیں۔ اسے کون سا کراہ کا ہنر آتا تھا۔ تین سالوں سے وہ بس "محبت" پڑھ رہی تھی باقی ساری دنیا کے نصاب سے اسے چنداں دلچسپی نہ رہی تھی۔

ابدال شہر کے کالج میں بی اے کا طالب علم تھا۔ ماں بہن اور چھوٹا بھائی۔ بیس گاؤں میں تھے اور وہ اپنے چاچو کے پاس چلا گیا تھا۔ تھوڑی سی زمین تھی جس سے اتنی آمدن ہو جاتی کہ گھر چلتا رہے۔ تین بہنوں میں سے دو کی شادی ہو چکی تھی۔ اس کے سر پر سہرا سجانے سے پہلے ماں چھوٹی کے ہاتھ بھی سیلے کرنا چاہتی تھی۔ اسے کون سا جلدی تھی شادی کی نہیں میراں کو اپنے نام سے منسوب کرنا چاہتا تھا اور جب ماں سے ہتھیارتے ہوئے دل کی بات کسی تو انہوں نے بتا دیا کہ ارشد چاچو کو اگر ان سے عقیدت اور محبت سے تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ ان کا ہونے والا دام ہے۔ مگر نہ فی زمانہ لوگ اتنی ہمدردی اور سخاوت کے متحمل نہیں ہوتے۔ وہ بالکل چپ ہو گیا تھا۔ ماں ایک ایک احسان دہرائی رہی تھی کہ وہ نمک حرامی نہ کر جائے۔ دل کو سمجھانا مشکل ترین ہوتا جا رہا تھا۔ وہ جب بھی میراں سے جدائی کا خیال ذہن میں لاتا

سے روح نکلتی محسوس ہوتی۔ پھپھرنے کا خیال بھی ان روح تھا۔ خود میراں کی حالت بھی اس سے مختلف نہ تھی۔ دونوں نے بار بار وفا نبھانے کی قسمیں کھینچی تھیں۔ وہ پرامید تھے کہ تقدیر پر دعا غالب پڑے گی۔

ہم ان خاندانی رسموں، روایتوں اور ذات پات فرق کو ہمیشہ کے لیے مٹا دیں گے میراں! ابدال نے نم مٹی کی کوکھ میں ایک عزم رکھا تھا۔ وہ اس کے خسار کو تھپتھپا کر مولے سے ہنس دی۔

"واہ رے۔ خوش گمان محبت!"



صراحی کے گلے میں کلیوں کا ہار پہناتے ہوئے اس نے بہت دنوں بعد ماں کی آنکھوں میں زندگی کی روشنی دیکھی تھی۔ چارپائی پہ کلیوں سے کمر نکائے وہ سید چادر پر سرخ پھول کاڑھ رہی تھی۔ بس یہی شوق خزان کی بے زار اور بیمار زندگی کا۔

"ماں! ایسی چادری مجھے بھی بنا کر دو نا!" زہرہ کتابیں میٹ کر اس کے پاس آ کر لیٹ گئی۔

"جب تیری باری آئے گی تو تیرے لیے بھی کاڑھ دوں گی ابھی تو میں اپنی میراں کے جینز کی تیاری کر رہی ہوں۔" میراں دھالے کو گرہ لگانا بھول گئی۔

"میراں کا جینز کیا میراں کی شادی ہو رہی ہے ماں؟" زہرہ اشتیاق سے پوچھنے لگی۔ وہ بجائے شہانے کے ٹکر ٹکر ماں کی صورت دیکھ رہی تھی۔

"ہاں نا۔ تیرے ابا نے ماں کو کہہ دی ہے ناصرہ کیا کہہ وہ لوگ جمعہ کو آئیں گے بات کی کرنے۔" ناصرہ پھوپھو۔ مگر ان کا بیٹا۔ ماں! انہیں بھائی کے ساتھ۔" اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

کے نصیب پھوڑنے کے لیے مگر گرم بخش شروع سے اپنی من مانی کرتا آیا تھا۔ اس کے بیمار وجود سے اسے کہاں دلچسپی تھی۔ بس خود ہی فیصلہ کر کے ہر لگا رہتا اور وہ بے بسی سے تماشا دیکھتی رہتی۔

"ماں! کیا ناصرہ پھوپھو نے ایسا کہا۔ آپ نے ابا سے بات تو کرنا تھی ماں! میراں کے لیے وہ ہی رہ گیا ہے۔" زہرہ کو فکر لگ گئی۔ اور وہ کمرے میں چلی آئی۔ پتا نہیں کیوں رونا آئے جا رہا تھا۔

"تیرے ابا نے پہلے کبھی کوئی صلاح مشورہ کیا ہے مجھ سے۔"

"مگر ماں! یہ تو ظلم ہے جتنا ابا کا حق ہے ہم پر اتنا آپ کا بھی ہے۔ آپ ابا سے بات کریں۔ پہلے کی بات اور تھی مگر یہ تو زندگی بھر کا فیصلہ ہے۔ کہاں پر یوں جیسی بہن میراں اور کہاں وہ انہیں بھائی سا بچ جمانتیں بھی نہیں پڑھا۔ ایک سیڈنٹ میں ٹانگ بھی ٹوٹ گئی۔ دو سال پہلے تک تو پھوپھو اس کی منتہی ناصرہ پھوپھو کے سر ایلوں میں کرنا چاہتی تھیں کہ کھاتے پیتے لوگ ہیں جی بھر کر چیز دیں گے بیٹی کو۔" زہرہ نے تیز لہجے میں کہا۔

"تیرے ابا بس فیصلہ بنا کر چلے گئے ہیں مجھے جمعہ کو آئیں گے وہ لوگ۔" ماں کے لہجے میں بے بسی تھی۔

"ماں! ماں! میں خود۔" وہ چپ سی ہو گئی۔ اتنی جرات تو کسی میں بھی نہیں تھی کہ گرم بخش کے جلال کو آواز دیتے۔

"ایک بار تو ابا سے بات کریں پلیز ماں!" "ناگہ جو رہا سا بھرم ہے وہ بھی جاتا رہے۔ اسے باپ ہو کر خود کوئی احساس نہیں ہے تو پھر میری بات کیوں سنے گا وہ۔"

"ماں! ابھی تین بیٹیاں اور ہیں آپ کی۔ ابا پھر سب کے ساتھ ہی۔" وہ دہل گئی۔

"اپنے نصیب کی بات ہے زہرہ!" "ہمارے تو تینوں بھائی بھی چھوٹے ہیں۔ کوئی ابا کو صحیح غلط بھی نہیں بتا سکتا اور پھوپھو کا مزاج! ماں! اپنی

وہ بڑی بہوؤں کو کس طرح کھینچ کر رکھا ہے انہوں نے۔ یہاں آتی ہیں تو وہ دن برداشت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسی نکتہ چینی والی طبیعت، میرا پوری زندگی کیسے گزارا کرے گی ان کے ساتھ؟" زہرہ کے لہجے میں تشویش تھی۔

"کیا تیرے ابا کو نہیں پتا بہن کے مزاج کا۔ خود کی اس سے ہمتی نہیں ہے اور بیٹی۔"

"اماں! آپ تو اپنی خوشی سے چیز بنانے لگی ہیں جیسے۔" اس نے شکوہ کیا۔

"بیٹی کو دواع تو کرنا ہے زہرہ! ایک ماں کی خوشی تو پوری کرنا ہے نا۔"

"جب بیٹی کے دل کی پروا نہیں کسی کو تو ارمان کیا اماں! میرا کچھ کہے گی نہیں اماں! لیکن اس کے ساتھ یہ ظلم میں برداشت نہیں کروں گی۔"

اٹھارہ سالہ زہرہ اپنی بہن کے مقابلے میں قدرے بے خوف اور نڈر تھی۔ اماں کے سامنے سے اٹھ کر وہ کمرے میں آئی جہاں مسہری سے پشت نکالے میراں نیرہانے میں مصروف تھی۔

"آنسو کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتے میراں! حق بات کہنے کے لیے زبان کھولنا پڑتی ہے۔ تم تو اللہ میاں کی گائے ہو۔ جس نے جو کہا جو سنایا چپ چاپ سن لیا۔ ویسے تو بڑے مذہبی اور دین دار لوگ بنتے ہیں ہمارے بڑے۔ جہاں شریعت کی بات آئے وہاں اپنی مرضیاں یاد آجاتی ہیں۔" وہ کتابیں پٹخ کر اپنا غصہ ان پر نکال رہی تھی۔

"تمہیں پتا تو ہے ابا کا۔ ایک فرمائش کرنے کی تو جرات نہیں ہے ہم میں اور تم۔"

"تو محبت کرنے سے پہلے بھی یہ سوچ لینا تھا۔"

"زہرہ! اشک پلکوں سے اٹکے رہ گئے تھے۔ وہ ششدر تھی۔ جو راز خود سے کبھی چھپایا تھا اس کی خبر زہرہ کو کیسے ہو گئی۔

"تھی کاکی نہیں ہوں میں۔ آنکھیں کھلی رکھتی ہوں۔ پرسوں میں نے تمہیں ابدال حسن کے ساتھ دیکھا تھا نر کے پاس۔ جب میں لوہا پارو خالہ کی طرف

جاری تھیں۔"

"زہرہ! اس نے آگے بڑھ کر اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔" بس خاموش ہو جاؤ پلیز۔"

"میرے خاموش ہونے سے تمہاری زندگی برباد ہونے سے بچ جاتی ہے تو ٹھیک ہے میں اپنے لب سے لیتی ہوں، مگر میراں جو تم کرتی ہو وہ غلط ہے۔ صحیح طریقہ جو ہے اس پر عمل کرو۔ ابدال حسن سے کہو اپنے ماں باپ کو بھیجے۔" وہ اس کے سامنے آئی تھی۔

"زہرہ! آنسو پھر سے بننے لگے۔ مجھے بھی پتا ہے ہمارا طریقہ غلط ہے لیکن ہم بے بس ہو جاتے ہیں اور صحیح طریقہ ابدال حسن خود کسی سے بندھا ہوا ہے۔"

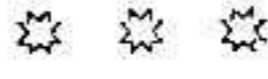
"کیا تمہیں شروع سے ہی یہ بات پتا ہے۔" زہرہ نے بے تاثر چہرے سے پوچھا۔

"نہیں۔ پرسوں بتایا تھا اس نے۔"

"کیا وہ اسے چھوڑ نہیں سکتا؟"

"چھوڑ بھی دے مگر ابا۔ برادری کا مسئلہ۔"

"تم اسے کو تو سہی کہ وہ اپنی ماں کو بھیجے۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ احتجاج کا حق سب کو ہے میراں! اور حق کے ساتھ دینا انسانیت ہے۔ میں ہر ممکن تمہارا ساتھ دوں گی۔" وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی تھی۔ میراں اس کے کانڈھے سے آگلی۔



"ناصرہ پھوپھو کے دیور کا ایک سیڈنٹ ہو گیا ہے۔" وہ بدھ کی ادا اس شام تھی جب ولید نے آکر اطلاع دی۔ ابا کے ہاتھ سے چائے کی پیالی لیتے ہوئے اس کا دل سینے میں سکڑ کر سٹھا۔

"خاصی جوئیں آئی ہیں۔"

وہ تفصیلات بتا رہا تھا۔ کریم بخش کچھ دیر ہی بیٹھا گیا تھا۔ انہیں ناصرہ کے دیور سے ذاتی دستخطی نہ تھی لیکن یہ ہوا کہ اس ایک سیڈنٹ کی وجہ سے رسم و غیرہ کا معاملہ مل گیا تھا کہ ابھی تو ابدال حسن اپنی بات واضح نہ کر پایا تھا۔ وہ تو پہلے بھی کبھی کبھار ہی ملتے تھے اب تو

سے زائد ہو گیا تھا۔ ابدال حسن شہر میں ہی تھا۔ طرح کے واسے اور خدشات دل کو سہاتے۔ اسے محبت، یقین تو تھا مگر تقدیر سے خائف تھی۔ وقتی طور پر کریم بخش کی توجہ بھی اس کے سے ہٹ گئی تھی۔

ابدال حسن آج کل گاؤں آیا ہوا ہے میراں! وہ اس میں کپڑے بھگور رہی تھی جب بازار سے واپسی پر نے اسے اطلاع دی۔ وہ سب نئے کپڑوں کے ساتھ دیکھنے لگی تھیں۔ زہرہ ساتھ والی ارم باجی کے بازار جاتی تھی۔ اسے تو جھوم سے ویسے ہی ہمت ہوتی تھی۔ سب اپنے آپ میں مگن تھے۔

"میں روینہ سے مل کے آتی ہوں۔ اس کی تاریخ کتنی تھی آج کل میں۔" وہ اماں کو اطلاع دے کر باشر کے ساتھ نکل آئی۔

باشر کو گلی کے کنارے ہی بندر کا تماشہ دیکھنے کو مل گیا۔ وہ ہاتھ چھڑا گیا۔ ابدال حسن کے گھر کے دروازے اس کی چھوٹی بہن پر دے کی اوٹ میں کھڑی تھی۔ وہ صبح دو سہری بار ان کے گھر آئی تھی۔ رقیہ سخن میں ہی دال چن رہی تھی۔

"السلام علیکم خالہ! اس نے دھیمے سے سلام کیا خالہ۔ بسمد جلدی سے کرسی اٹھلائی۔

"وعلیکم السلام۔" رقیہ کے لبوں پر ہمیشہ کی طرح سکر اہٹ تھی۔ ابدال حسن بھی اپنی ماں پر گیا تھا اس کی طرح ہر وقت لبوں پر مسکان سجائے رکھتا۔ رقیہ اپنے بیٹے کی پسند سے آگاہ تھی۔ اسے خود بھی کامنی سے سراپے والی کم گو میراں پسند تھی مگر ایک طرف بیٹے کی محبت تھی تو دوسری طرف دیور کا ماں۔ فضیلہ کی تو لڑکی تھی وہ کیسے اس کی آنکھ سے سینے چرائیتی۔ اس کی طبیعت میں چھپتا تھا مگر خیر اس کا بھی محبت کی ن سے اٹھایا گیا تھا۔

"خالہ! مجھے تو مل ہی نہیں رہی یہ بسمد کی بیٹی۔" وہ ہاتھ میں گلابی شلوار اٹھائے کمرے سے باہر آئی تھی اور پھر اس پر نگاہ پڑتے ہی ٹھنک کر رک گئی۔ "یہ فضیلہ ہے میری بیٹی۔ ابدال کے چچا کی

بیٹی۔" رقیہ نے تعارف کروایا تھا۔ "اور یہ میراں ہیں۔ ہے نا! وہ کہتے ہوئے آگے بڑھ کر اس سے سلام دعا کرنے لگی۔

میراں بھونچکی رہ گئی۔ فضیلہ قدرے بھاری جسامت کی گلابی رنگت کی حامل انیس بیس سال کی دو شیزہ تھی۔ اس کے چہرے پر پھیلی معصومیت اسے پرکشش بنا رہی تھی۔

"ایک خوب صورت خدو خال کی مالک لڑکی ابدال حسن کی منگیتر تھی اور وہ پھر بھی میری طرف آنکلا۔ ان کا بچپن کا ساتھ تھا۔ وہ لڑکی کسی کا بھی خواب ہو سکتی تھی تو پھر ابدال حسن کا کیوں نہیں؟"

وہ اب اس کے سامنے بیٹھی خوش دلی سے اس کی پسند ناپسند اور مشاغل وغیرہ پوچھ رہی تھی۔ بسمد چائے بنانے لگی تھی اور رقیہ کو دال چڑھانا بھی۔ دونوں بادرجی خانے میں چلی گئیں۔

"مجھے یقین تھا کہ ابدال کی پسند ایسی ہی ہوگی۔ اسے شروع سے ہی سوہرے میچور اور کم گو لڑکیاں پسند ہیں۔ مجھے تو کہتا ہے تمہاری بیٹری بھی ڈاؤن بھی ہوئی ہے۔ ہر وقت زبان چارج رہتی ہے لڑکیوں کو زیادہ نہیں بولنا چاہیے۔" وہ ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی تو ان کے درمیان "مخوالہ" بھی متعارف تھا۔

"میں ضد کر کے آئی ہوں ابدال کے ساتھ مجھے لے کر نہیں آ رہا تھا۔ ابا سے سفارش لگوائی تب مانا۔ مجھے بس تم سے ملنے کا شوق تھا۔ ایک بار ملنا چاہتی تھی تم سے۔ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ ابدال کو واقعی ویسی لڑکی مل گئی ہے جیسی وہ چاہتا تھا۔ ویسے ہے شروع سے ہی لگا۔ جو چاہتا ہے پالیتا ہے۔" وہ اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں دبا لے کر رہی تھی۔

"تم بھی تو کچھ بولو نا! اب سے میں ہی بولے جا رہی ہوں۔ ابدال بھی کیا سوچے گا کہ کب سے اپنی ہانکے جا رہی ہوں اور اس کی "سہمان" کو موقع ہی نہ دیا۔" ابدال حسن کی بانیک اندر داخل ہوئی تھی۔ میراں کو یوں لگا کہ جیسے وہ غلط وقت پر آگئی ہے۔ اسے ندامت کا احساس ہونے لگا۔

”تم کب کے گئے ہو۔ یہ وقت ہے آنے کا مجھے واپس بھی جانا تھا۔“

”صبح چلی جانا۔ ہر وقت جلدی نہ بچائے رکھا کرو۔“ وہ سامان اتارنے لگا۔

”تو اور کیا تمہاری طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہا کروں۔ ہر کام میں دیر نہیں کرتے ابدال! وقت کسی کا انتظار نہیں کرنا۔“

”چھا۔ مس فلسفی!“ ایک گہری نگاہ سیاہ چادر کے پالے میں مقید میراں پر ڈال کر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

”میں چلتی ہوں۔“ وہ جانے کے لیے اٹھی۔

”تو جلدی۔ ابھی تو میں نے تم سے باتیں بھی نہیں کیں۔ بس یہ کی بچی! چائے بنا رہی ہو پاپائے۔“

”میں پھر آجاؤں گی۔ بلکہ تم میرے گھر آجانا۔“

”میں تو آؤں گی خالہ کے ساتھ ابدال کا رشتہ ڈالنے۔ تم بس اپنے آبا کو منا کر رکھنا۔“ وہ بے تکلفی سے ہر بات کے جارہی تھی وہ ٹھیک سے حیران بھی نہ ہو پائی۔

”تم یقیناً میری باتیں سن کر حیران ہی ہو رہی ہو۔ مگر

کیا کروں مجھے گھما پھرا کر بات کرتا نہیں آتی۔ یہ ابدال تو ایک دم گھونچو ہے۔ دل کی بات بتانے میں ہفتہ لگا دیا۔ میں جان تو گئی تھی کہ یہ کچھ کہنا چاہتا ہے مجھ سے۔ پھر بھی منتظر رہی کہ خوب بات کرے مگر یہ بھی نہ

1960ء کا ہیرو۔ یہ محبت و جنت کا چکر میری سمجھ میں نہیں آتا، لیکن دل والوں کی قدر بہت کرتی ہوں۔ مجھے کون سا عشق و شوق تھا ابدال سے۔ میں نے کہا، تو پر اہم! محبت پر کسی کا زور کہاں۔ جو تمہاری خوشی وہ

میری۔ ویسے بھی میں نے بہت سارا پڑھنا ہے ابھی، ہاں بس ایک بار ابدال کی پسند دیکھنا ضرور چاہتی تھی۔ تم واقعی اس قابل ہو کہ تمہیں چاہا جائے۔“ وہ اس کا

رخسار تھپتھا کر اٹھ گئی۔

”میں بس یہ کہہ رہی ہوں۔ آج کی تاریخ میں اس کی

چائے بن جاتی ہے کہ نہیں۔“

میراں اپنی جگہ گم صم بیٹھی رہ گئی تھی۔



کہتے ہیں جہاں مایوسیوں کے گھنیرے بادل حالات کی دھوپ میں سرسرا میں وہیں قدرت معجزہ دکھاتی ہے۔ ابدال حسن نے تو اپنا کما سچ کر دکھایا تھا اور اس نے اپنے سخت گیر باپ کا دل موم کرنے کے لیے اپنے مشکل کشا اور حاجت روا رب کی ذات سے لو لگائی تھی۔

جس روز ابدال حسن کا رشتہ آیا۔ کریم بخش نے پہلی بار سوچا کہ میراں اس کی بیٹی اس کے وجود کا حصہ ہے۔ اس نے صفا چٹ انکار نہ کیا تھا۔ میراں تو رہی

ایک طرف زہرہ اور اس کی ماں کو کریم بخش سے اتنی ”زری“ کی بھی امید نہ تھی۔ ساکت بھیل کے کائی جسے کناروں پر پہلا پتھر پڑا تھا۔

ناصرہ پھوپھو کو خبر ہوئی تھی خوب داویلا کیا۔ وہ تو یہ طے کیے بیٹھی تھی کہ میراں انیس کی ہی دلہن بنے گی۔ بھلا میراں جیسی صابر و شاکر ہو کہاں ملتی تھی۔

بھائی نے تو کبھی بیوی کو اہمیت نہ دی تھی اولاد کو کہاں دیتا؟ اس گمان میں دلہن پکڑ کر بیٹھ گئی۔

”میراں تو میرے انیس کی ہی دلہن بنے گی۔ میں صاف کے دیتی ہوں کریم بخش! تو زبان دے چکا ہے مجھے۔ یہ شہر کے لوٹڈے لپاڑے ان کا کوئی آگاہ نہ

پہنچا۔“

”افضل، سلیم بھائی کا جاننے والا تھا۔ بہت اچھا گھرانہ ہے۔ سلیم بھائی نے خود گارنٹی دی ہے اور پوری چوہہ جماعتیں پاس ہے۔ اپنی دکان ہے الیکٹرونکس کی شہر میں۔ لڑکا بھی بہت شریف۔“

”ہاں ہاں! میرے انیس میں تو اب عیب ہی نظر آئیں گے وہ تو بد معاش ہے کوئی۔“

ناصرہ تو بھرے پالے کی طرح چھٹک گئیں۔ پھر تو شروع ہو میں تو شام تک بڑبڑاتی ہی رہیں۔

”بھئی اس دلہن پر قدیم نہ رکھوں گی اگر مجھے نامراد لوٹایا۔“ صاف دھمکی تھی کہاں کا دل ہوتا رہا۔ میراں

کو نے میں دیکھی خدا کے حضور سجدہ ریز تھی۔

”انیس کا بھی ہو ہی جائے گا آیا! میں کہیں بات چلاتا ہوں۔“ آج تو کریم بخش کے اطواری حیران کن تھے۔

”میں بھرپائی تمہاری ہمدردیوں سے۔ کتنی سکی کا سنا کرنا پڑے گا مجھے انیس کے ابا اور اپنے سسرال

وں کے سامنے کہ بڑی بڑھکیں مارتی تھی کہ بھائی نے بلاچوں چرا کیے لاج رکھی۔ یہ ضرور اس گھنٹی کی

یاست ہے کوئی۔“ روئے سخن بھانج کی طرف مڑ گیا۔

”آپا! بہت اچھے لوگ ہیں۔ میں یہ رشتہ گنونا نہیں چاہتا۔“

”تو یہ زہرہ بھی تو ہے۔ اس کا کر دے۔“ نئی راہ بھائی۔ زہرہ نے دل کر ابا کی طرف دیکھا اعتبار بھی

آتے آتے آتا ہے۔

”انہوں نے میراں کی ہی بات ڈالی ہے اور زہرہ تو ابھی چھوٹی ہے۔ پڑھ رہی ہے۔ اس کا تو داخلہ بھی

کروانا ہے شہر جا کر۔“ زہرہ پر تو شادی مرگ طاری ہوئی۔

”یہ واقعی ہمارے ہی ابا ہیں۔“ ثمنو نے سرگوشی میں ابا سے پوچھا۔

”بڑا بد نصیب ہوں آپا! اللہ نے اتنی نیک فرماں بردار بیوی دی اولاد دی اور کبھی قدر نہ کرے گا۔“ وہ

تاسف سے سر ہلاتے کہہ رہا تھا۔ ناصرہ کو پتے لگ گئے۔

”ہاں جی بڑی جلدی خیال آگیا۔ ضرور اس کلمہ ہی نے کوئی تعویذ گنڈا کر لیا ہے۔ میرا بھائی میری بات

نہیں موڑ سکتا ہائے اللہ! یہ دن بھی دیکھنا تھا۔“ وہ

بدنے لگی تھی مگر ہم بخش بیانی زمین پر رکھ کر اٹھ گیا۔

”آپا! دیر تو واقعی ہو گئی مگر اتنی بھی دیر نہیں ہوئی اور پھر نصیب کی بات ہے ساری۔ جہاں میری دھی کے

نصیب جڑے ہیں۔ بڑا ہی بخت اور قدیم ہے افضل کے گھر والوں کا۔ مجھے پہلی داری اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ نصیبوں کے کھیل ہیں سارے۔“ وہ کہتے ہوئے

ڈیوڑھی پار کر گیا۔ ناصرہ بھی تن فن کرتی اس کے پیچھے ہی چلی گئی تھی۔ مختصر سے آنگن میں بہت سالوں بعد

چاندنی چٹکی تھی۔ سب باہر اکٹھے ہو گئے۔

”یہ ابا کو کیا ہو گیا ہے بھی۔ یہ ہمارے ابا تو نہیں لگ رہے۔“ زہرہ نے ہی بات شروع کی۔

”ہاں ابا! تو نے سچ سچ تو تعویذ نہیں کروا دیے۔“

عید نے آنکھ کا کونا دبا کر معاذ کو دکھا وہ حلق پھاڑ کر ہنسنے لگا۔

”چل ہٹ بد تمیز۔ شرم نہیں آتی ماں سے مخول کرتے۔“ وہ جھینپ گئی۔

”سچ ابا! مجھے بھی شک ہو رہا ہے پھوپھو کے تعویذوں کا الٹا اثر ہو گیا ہے۔“ وہ سب مل کر ہنس

رہے تھے۔ گھٹے گھٹے۔ باحول میں آزادی کا احساس ہو رہا تھا۔ گدلی فضاؤں میں سے کناقت چھٹ رہی

تھی۔ وہ بھی ڈھیلے ڈھیلے قدم اٹھاتی باہر چلی آئی۔

”واہ بھئی آپا! یہ تو معجزہ ہی ہو گیا۔ ابا نے پھوپھو کو صاف انکار کر دیا۔ قسم سے سوا آگیا۔“

”دیکھا میں نے کہا تھا ناں کہ کوشش تو کرنی چاہیے بندے کو۔ پہلے ہی ہمت ہار کر بیٹھ جاؤ تو قسمت خاک

ساتھ دے گی۔“ زہرہ کا چہرہ چمک رہا تھا۔

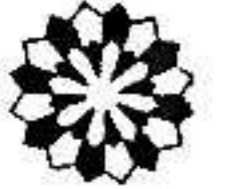
”بڑی بانصیب سے میری بچی! ابا نے اس کا سر اپنے کندھوں سے لگا کر ماتھے پر بوسہ دیا۔ اس کی

آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر گئیں۔

”واقعی! اپنے بخت آور ہونے کا تو مجھے آج یقین آیا ہے ابا! اور یہ سب محبت کا کرشمہ ہے۔ ابدال

حسن کی محبت نے مجھ سے پتھر کو انمول ہیرا بنا دیا۔“

اسے ابدال حسن کی محبت پر فخر ہو رہا تھا۔ اور سچ ہے کہ ہر محبت کا انجام جدائی نہیں ہوتا۔



تکوا لٹ

کسی چیز کے ٹوٹنے کی زوردار آواز سے میری آنکھ کھلی تھی۔
آنکھ تو خیر اپنے معمول کے وقت یعنی فجر کے وقت بھی کھلی تھی مگر شیطان نے کچھ ایسے دلبرانہ انداز میں تھپکیاں دیں کہ پھر کہاں کی نماز کہاں کی جاگنگ۔
”لگتا ہے پھر اس شرفاں نے کچھ توڑ دیا ہے۔“
میں نے جھنجھلاتے ہوئے گردن ذرا سی گھما کر وال کلاک کی طرف دیکھا۔ دس بج چکے تھے۔
اسی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔
”ہوں آجاؤ کون ہے؟“ میں ذرا سا اٹھتے ہوئے

عرض ہے حضور! وہ لہجے میں کچھ عاجزی بھرتے ہوئے دو قدم مزید آگے بڑھا۔
اور مجھے اس کی ”عرض“ کے بارے میں بھی علم تھا۔
”ہاں بولو۔“ میں نے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے سستی سے کہا۔
”حضور۔ یہ بد بخت شرفاں۔ حضور گھر کی دشمن ہے پوری پکن کے برتن اور دوسری چیزیں کچھ بھی اس نامراد کے ہاتھوں سے محفوظ نہیں۔ لے کر قیمتی سب سے منگے والے ڈز سیٹ کی بڑی

رخسانہ نگار عدنان



بولی۔
”سلام صاب! میں فرزند۔!“ اس نے پہلے اپنے خرگوش جیسے لمبے دودھیادانتوں سمیت منہ دروازے کے درازے اندر سے داخل کیا اور پھر خود اندر آ گیا اور مجھے اس کے انداز سے فوراً پتا چل گیا کہ فرزند صاحب کیوں تشریف لائے ہیں۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔
”آئیے اٹھے نہیں صاب؟“ اس نے بھی کھی کرنے کی کسر تھی ورنہ اس کے دانتوں کی نمائش سے تو یہی لگتا تھا کہ وہ ابھی قہقہہ مار کر ہنس پڑے گا۔
”اٹھ گئے فرزند صاحب حکم؟“ میں باقاعدہ ناتلس لٹا کر سیلپراڑنے لگا۔
”توبہ میری اللہ توبہ۔ جو آپ کو حکم دوں۔ بس ایک

پلیٹ۔ ایک نہیں حضور دو توڑ ڈالیں۔ حضور کیا اول درجے کی چینی تھی اور کیا زبردست ڈیزائن منہ اور جو سیٹ برباد ہو اوہ علیحدہ۔ حضور بڑھی کھوسٹ کو کچھ نظر نہ آوے اس کی تنخواہ سے ہلشوں کے پیسے کا نہیں اور فارغ کریں اس سردرد کو۔“ فرزند میرے ڈھیلے ڈھالے انداز اور یکسو ہو کر سننے سے شہہ پا کر بولتا چلا گیا۔
”دیکھو فرزند! ہمارے مذہب میں ہے کہ ٹوٹنے والی چیزوں کا غم نہ کرو ہماری طرح ان کی بھی عمر مقرر ہے اور۔“
”پر صاب ہر روز ہر وقت جب گھر میں دھندلہ ہوتی رہے تو کیا تب بھی شکوہ نہ کریں۔ چیزیں ساتھ



Junaid-Ansar

رہیں یا انسان۔ جی الفٹ تو ہو ہی جاتی ہے ان کا جانا
تھوڑا سی غم، تکلیف تو دیتا ہے۔
”صحیح کہا فرزند تم نے اور تم نے خود ہی جواب بھی
دے دیا کہ چیزیں ہوں یا انسان ساتھ رہیں، الفٹ تو
ہو ہی جاتی ہے۔ اب بے چاری شرفاں کو اوھر کام کرتے
ڈیڑھ سلل ہونے کو آیا۔ اب اسے باہر جا کر ایک دم
سے نوکری سے جواب دے دوں۔“ پھر میں نے بڑی
چالاکی سے ساری گوٹ فرزند کے خانے میں ڈال دیں
وہ کچھ لا جواب سا ہو کر سر کھجانے لگا۔
”وہ تو صحیح بات ہے صاحب! پر آپ اس کا کچھ
سوچو۔“
”چھو بھی کچھ کرتے ہیں تم ناشتہ لگواؤ۔ میں ہاتھ
لے کر آتا ہوں پھر بات کریں گے۔“
میں نے اٹھتے ہوئے اسے تسلی دی تو وہ سر ہلاتا باہر
نکل گیا۔



میں فریش ہو کر ڈائننگ روم میں آیا تو ناشتہ لگ چکا
تھا۔
جمازی سا زڈائننگ ٹیبل کے ایک حصے میں ناشتے
میں دنیا جہان کی چیزیں موجود تھیں باقی ٹیبل ویران
تھی۔
کرسی سنبھال کر بیٹھتے بیٹھتے ہی میرا جی ہر چیز سے
اچاٹ ہو گیا۔ فرزند نے گرم گرم سلائس اور پھولا ہوا
دو اقسام کا آلیٹ میرے آگے رکھا۔
”صاب پراٹھا لیں گے ساتھ؟“ اس نے اپنے
مخصوص محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔
میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔
میں اسے کیسے بتاتا۔ اس لمحے میرا دل کس چیز کو چاہ
رہا ہے۔ خواہ مخواہ ہی آنکھوں کے گوشے تم سے
ہو گئے۔
”پہلے آپ جوس لے لیں، میں چائے بعد میں

لاؤں گا۔“ وہ مستعدی سے اور سچ جوس میرے گلاس
میں اندھلکتے ہوئے بولا اور میں خالی نظروں سے تیزی
سے بھرتے گلاس کو دیکھتا رہا۔
”کیا کسی بھی چیز کو ”بھرا“ اتنا آسان ہوتا ہے جس
تیزی سے یہ گلاس بھر گیا۔“ میں نے لبالب بھرے
اور سچ جوس کے گلاس کو دیکھ کر رشک سے سوچا۔
”نہیں جگہیں چیزوں سے مختلف ہوتی ہیں۔
انہیں اتنی جلدی نہیں ”بھرا“ جاسکتا فقط انسانوں سے
بھرا ہوا تو کچھ مشکل نہیں مگر محبت سے بھرا شاید
ناممکن! میں نے خود ہی نفی میں سر ہلا دیا۔
میرے لیے میز پر موجود ہر چیز بے ذائقہ بے رنگ
ہو چکی تھی۔
”یہ وہی لذت کام و وہن کا سامان تھا جس کے لیے
ایک ایک نوالے پانے کے لیے خدائی خوار ہوتی پھر
رہی ہے۔“ میں نے ناشتے کے لوازمات کو دیکھتے ہوئے
سوچا۔
”دور کیوں جائے کبھی میں بھی۔“ میرے اندر کوئی
ہولے سے ہنسا۔ میں نے سر اٹھا کر اپنے شاندار پر
آسائش لگژری ڈائننگ ہال کو دیکھا۔
اور یہ سجا سجا کر مجھے ایک دم سے خالی لگا۔ بالکل
خالی! ویران اجڑا ہوا۔ ایسی زور آور کیفیت تھی جس
نے میرے پورے کے پورے وجود کو جکڑ لیا۔
”یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔“ میں نے وحشت سے اپنا
سر ہاتھوں میں لے کر زور سے جھٹکا۔
ہاں جس گھر میں محبت نہ ہو وہ گھر خالی ہی ہو کرتے
ہیں۔ ویرانوں کی طرح وہاں اداسی اور وحشتوں کے
آسیب سیرا کرنے لگتے ہیں، مجھے اپنے اندر سے ہی
جواب بھی مل گیا تھا کہ مجھے یہ گھر خالی کیوں لگنے لگا
ہے؟
”صاب پراٹھا گرم گرم۔“ فرزند نے بھاپ اڑاتا
خوشبو دار پراٹھا میرے سامنے رکھ دیا۔
”صاب! کچھ لے کیوں نہیں رہے؟“ اسے یکدم

میں میز کے اسی طرح بھرے ہونے کا احساس ہوا۔
”فرزند! دل نہیں چاہ رہا۔ طبیعت بو جھل سی
رہی ہے۔ تم بس مجھے ایک کپ چائے بنا کر اوھر
دے دو۔“ میں کسی بھی چیز کو ہاتھ لگانے بغیر اٹھ گیا۔
* * *
بارہ تیرہ سال کی عمر کے لڑکے نے اسٹیل کے گلاس
میں ٹھنڈا پانی بھر کر میرے سامنے رکھا اور مڑ کر جانے
لگا۔
”سنو کیا نام ہے تمہارا۔“ میں نے بے اختیار سا
پوچھا۔
”نا صرچی!“ اس نے مختصراً کہا۔
”تم پڑھتے نہیں ہو؟“
اس نے یوں میری طرف دیکھا جیسے میرا داغ چل
گیا ہو۔
”سارا دن اوھر ڈیوٹی دیتا ہوں اور رات کو گھر جاتا
ہوں۔“ اس نے کچھ بے چین سی نظروں سے آوازیں
دیتے ہوئے مالک کی طرف دیکھ کر کہا۔
”تمہارا باپ کیا کرتا ہے؟“
”نہیں۔“ اس نے پھر مختصراً کہا اور میرے اگلے
سوال سے بیشتر ہی وہاں سے چل دیا۔
یقیناً اس کے دو چار اور بہن بھائی ہوں گے ماں
ہوگی گھر کا کرایہ، بجلی کا بل اور سب سے بڑھ کر پیٹ
کے ایندھن کا انتظام!
”یا خدا! ان سب غریبوں کی کہانیاں ایک ہی کیوں
ہوتی ہیں۔ روٹی سے شروع ہو کر روٹی پر ختم ہونے
والی! میں نے بے بسی سے سوچا اور سچ پانی کا گلاس
میں لے کر لیوں سے لگا لیا۔
وہ لڑکا اب پھرتی سے ہال میں پچھی میزوں کے
درمیان گرم گرم روٹیاں سرو کرتا پھر رہا تھا۔
اگر فرزند مجھے یہاں اس پس ماندہ علاقے کے ہوٹل
میں بیٹھے ننان چنے کے ساتھ اسٹیل کے اس پرانے
سے گلاس میں پانی پیتا دیکھ لے تو یقیناً بے ہوش

ہو جائے
میں کھانا کھانے کے بعد بھی بہت دیر وہاں بیٹھا رہا
اور یوں ہی بے مقصد اس نو عمر لڑکے کو بڑی مستعدی اور
ذمہ داری سے اپنی ڈیوٹی نبھاتے دیکھتا رہا۔
بچ میں ایک بار وہ میری میز پر بھی آیا مزید کچھ
منگوانے کا پوچھنے کے لیے۔
”تمہیں پڑھنے کا شوق ہے؟“ میں نے اس کے
آنے کو غنیمت سمجھتے ہوئے جلدی سے پوچھا۔
”نہیں صاب!“ اس نے عجلت میں جواب دیا اور
دوسری طرف مڑ گیا۔
ان سب محنت کش نو عمر لڑکوں کی صورتوں میں اپنا
چہرہ بڑا واضح دکھائی دیتا تھا۔
محض چند سال بیشتر میں بھی تو ان کی طرح اپنے
کنزور وجود پر محنت کی ڈھال تانے خود کو زندگی سے
منوانے کے لیے کیسی تنگ و دو میں لگا ہوا تھا۔
وہ دور بیت گیا تھا مگر چپکے سے کہیں اندر ہی چھپ کر
بیٹھ گیا تھا اور جب بھی اس طرح کے لڑکے مجھے دکھائی
دیتے وہ مشقت بھرا وقت مجسم ہو کر میرے سامنے
آجاتا۔
ان میں اور مجھ میں بس اتنا فرق ہے کہ انہیں کو لہو
کے تیل کی طرح اسی دائرے میں آنکھوں پر مشقت کی
ٹی باندھے گھومتے ہوئے اپنے وجود کی اہمیت کا احساس
نہیں ہوتا، ہوتا بھی ہے تو صرف اپنے کنبے کو وہ وقت کی
روٹی بہم پہنچانے تک کی اہمیت کا احساس۔ جبکہ مجھے
اس مشقت اور محنت کے ساتھ چھٹی ذلت بھرے
احساس سے چھٹکارا پانے کی لگن بھی تھی۔
”کبھی پڑھنے کو دل چاہے یا کسی باعزت نوکری کو تو
اس پتے پر چلے آنا۔“ میں نے باہر نکلتے ہوئے اسے
ایک چند سمٹپ اور اپنا کارڈ دیتے ہوئے کہا۔
اور یہ میری علوت تھی۔ اس طرح کے کسی بھی
لڑکے کو دیکھ کر اسے یہ آفر کرتا۔
اور ایسی آفرز کے جواب میں عموماً ”جتنے بھی لڑکے
بعد میں مجھ سے رابطہ کرتے وہ صرف موٹی سی مالی مدد

کون

ماہنامہ

جون 2009 کے شمارہ کی ایک جھلک

- ☆ معروف شخصیات سے شاہین رشید کی ملاقات،
- ☆ اداکار و پریزٹر "دانش نواز" دو کے پہاڑے کے ساتھ،
- ☆ FM-103 کے پریزٹر "ابوراشد" سے بھارتی کی گفتگو،
- ☆ "میا کا گھر پیارا گئے" میں "تحريم فيصل خان" سے گہری باتیں،
- ☆ "ماں جی" سیاست عام کے قلم سے،
- ☆ قارئین سے دلچسپ سروے،
- ☆ "بساط دل" آنت ریاض کا سلسلے دار ناول،
- ☆ "خواب، خواہش اور زندگی" راجہ زوق کا سلسلے دار ناول،
- ☆ "میں ہاری بیا" نایاب جیلانی کا دلچسپ ناول،
- ☆ "سلسلے دقاکے" نادیہ چغتایہ کا ناول،
- ☆ "روشن سویرا" فرحان ناز کا دلچسپ ناول،
- ☆ "کیسی لاگی یاری" سائرہ عارف کا ناول دلچسپ موڑ پر،
- ☆ "ایک دعا" شمع جبین کا ناول،
- ☆ رضیہ مہدی، اہقرہ رانا، سیدہ اقبال، میرا گل اور صبا جاوید کے افسانے اور مستقل دلچسپ سلسلے،



اسی شمارے کے ساتھ کون کتاب

کون کتاب
"کون ہکوان"

کون نے ہجرت کے ساتھ طوطے کی قتل شدت ہے،
استعارہ کیجئے۔

گڈ مارٹنگ سر! زیدی صاحب بے ساختہ اپنی سیٹ سے اٹھتے ہوئے پوئے لے تو دوسری چیمبر جس کی دروازے کی طرف پشت تھی اس پر بیٹھی لڑکی بھی ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ دھانی آپٹل اسی کے کندھوں سے ڈھلک کر کیبن سے نکلا جا رہا تھا۔

"گڈ مارٹنگ سر!" اس کی مہین سی آواز میرے کانوں سے ٹکرانی مناسب قدم کی عام سے خدو خال والی لڑکی تھی جس کا رنگ بہت صاف تھا اور جسم چھریرا کچھ جھینپی جھینپی سی کھڑی تھی۔

"زیدی صاحب! آپ پلیز ذرا میرے آفس میں آئیے۔ اے کے بلڈرزنگی فائل لے کر۔" میں نے لڑکی پر سرسری سی نظر ڈالی اور زیدی صاحب سے کہہ کر باہر نکل آیا۔

"یہ لڑکی کوئی نیو اپائنٹ منٹ ہے آپ کے آفس میں؟" زیدی صاحب فائل لے کر جانے لگے تو میں نے یونہی سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

"جی سر! آپ کو یاد نہیں پچھلے دنوں ہم نے کمپیوٹر سیکشن کی ایک خالی سیٹ کے لیے ایڈ دیا تھا۔ آپ انٹرویو والے دن مینٹنگ میں تھے۔"

"اوکے، ٹھیک ہے آپ جانتیں۔" میں نے زیدی صاحب کے تفصیلی جواب پر کہا اور اپنے آگے رکھی فائل کھول کر دیکھنے لگا۔

اس عام سی لڑکی میں کچھ خاص بات تھی کیا؟ فائل کو پوری توجہ کے ساتھ پڑھتے ہوئے بھی مجھے بار بار یہی بات تنگ کرتی تھی۔

"آخر کیا خاص بات ہو سکتی ہے اتنے عام سے چہرے پر۔" میں نے جھلا کر فائل بند کرتے ہوئے خود سے کہا۔ "وہی سیاہ گہری آنکھیں۔"

وہی گندمی سے ذرا صاف رنگت مناسب ناک، قدرے بھرے ہوئے ہونٹ، ناک۔ ناک کے عین درمیان میں وہ سیاہ تل، میں اسے سوچتے ہوئے یکدم چونکا۔

"ہوں کہو۔" میں بیٹھنے سے قبل شیشے کو تھام کر بولا۔ "صاب آپ شادی کر لیں۔ مکمل فیملی۔ گھر۔ پھر آپ کو گھر بہت اچھا لگنے لگے گا۔" اس نے بریف کیس اندر رکھتے ہوئے ذرا ڈرے ہوئے انداز میں کہا اور میرے چہرے کے تاثرات دیکھے بغیر واپس مڑ گیا۔

"کیا فرزند کو بھی پتا چل گیا ہے کہ یہ سلمان سے بھرا پر اگر مجھے خالی آسیب زدہ ویرانہ لگنے لگا ہے؟" میں فرزند کے انداز سے بر حیران سا تھا۔

"شادی، فیملی، گھر۔" کتنے متضاد الفاظ ہیں اور ان تینوں کی میرے ساتھ میچنگ۔ کتنی ناممکن سی بات ہے شادی کا مطلب۔ عورت کا ساتھ عورت کی محبت اور عورت۔ "میرا حلق کڑوا ہو گیا۔"

میں عورت ذات سے خائف نہیں کہ مجھے جنم دینے والی ایک عورت ہی تھی اور دنیا میں میری پسندیدہ ہستی۔ جس کے جانے کے بعد اس کا خلا آج تک میرے اندر سے پر نہیں ہو سکا مگر مجھے زندگی کی ذلتوں سے روشناس کرانے والی بھی تو ایک عورت تھی۔

ایسی عورت جس نے مجھے اس صنف سے ہی نفرت کرنے پر مجبور کر ڈالا تھا۔

میں تنہی سے سوچ رہا تھا۔ میں نے ایک تنہا زندگی گزارنی تھی بے حد تنہا۔ صرف میں اور میری محنت اور بس۔ کوئی دوست کوئی عزیز کوئی ہمزاد اور سب سے بڑھ کر کوئی خیر خواہ بھی تو نہیں۔ سوائے اس فرزند کے۔

میں نے سر جھٹک کر ان لائینی سوچوں سے پیچھا چھڑایا اور کھڑکی سے باہر بھاگتی دوڑتی زندگی کو دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ اپنے چیمبر کی طرف جاتے ہوئے زیدی صاحب کے کیبن کے سامنے آ گیا۔

میرے سیاہ بوٹوں کے پاس دھانی رنگ کا آپٹل کیبن کے کونے سے نکلتا ہوا پتھے کی ہوا سے پھر پھرا رہا تھا۔

میں لمحہ بھر کو ٹھنک سا گیا۔ اور ذرا اکھٹا کر آگے ہوا۔

کے چکر میں رابطہ کرتے اور جب میں ان سے پڑھنے اور شام کو کوئی پارٹ ٹائم جاب کے لیے کہتا تو وہ دوبارہ میرے پاس آنے کی کم ہی زحمت کیا کرتے تھے۔ سوائے تین چار کے۔

"ہاں یہ تین چار لڑکے نعمان، وحید، آصف اور جاوید میری تمام زندگی کا حاصل تھے۔"

آج وہ میری حوصلہ افزائی اور مناسب مالی مدد کے ذریعے پڑھ بھی رہے تھے اور اپنے گھر والوں کا بوجھ بھی اٹھائے ہوئے تھے جب میں ان چاروں سے ملتا ہوں تو مجھے ان میں اپنا چہرہ بہت روشن، بہت پر امید نظر آتا ہے۔

سہ پہر کی دوپہا اب پہلی پڑتی ہوئی سرسئی شام میں بدل رہی تھی جب میں اپنے گھر میں داخل ہوا۔

شاید وہ لڑکا کل مجھ سے ملنے آئے اور میری بات سمجھ کر آمادہ ہو جائے اور میری کامیابی کا فکرو پانچ ہو جائے۔

مجھے اگلی آس بھری صبح کا شدت سے انتظار تھا اور صبح جس وحشت کے عالم میں میں گھر سے نکلا تھا اس کی کیفیت میرے دماغ سے یکسر محو ہو چکی تھی۔



اگلی صبح بے حد تازہ دم اور روشن تھی۔ کل جس طرح میرا دل بوجھل اور وحشت زدہ ہو رہا تھا آج اس بات کا نشان بھی نہیں تھا۔

صبح فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد میں حسب معمول جاگنگ کے لیے گیا ناشتہ بھی اپنی روٹین کے مطابق کیا۔ فرزند اور شریفان کے درمیان ہونے والے نئے تازے کو اخبار دیکھتے ہوئے غائب و ماغی سے سنتا رہا اور چائے کا خالی کپ لے کر ہشاش بشاش سا گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

آج میری تازگی کا واحد سبب "مصروفیت" تھا۔ "صاب! ایک بات بولوں!" فرزند میرا بریف کیس پکڑے گاڑی تک آیا تھا۔

”ہاں یہی بات تھی وہ شاید جس نے اس عام سے چہرے کو خاص بنا رکھا ہے۔“
اس ناک کے تل نے اس کی اچھی خاصے چائیز ناک کو انوکھی سی اٹھان دے رکھی تھی۔ دیکھنے والی نظر اس کی چھٹی ناک پر ٹھہرنے کے بجائے سیدھی اس سیاہ تل پر جا کر رکھتی تھی۔
شاید یہی وجہ ہو، میں نے مطمئن سا ہو کر پھر سے فائل کھول لی مگر میرے اندر ابھی بھی کوئی پن سی گڑھی تھی۔
میرا چونکنا محض اس تل ہی وجہ سے نہیں تھا۔ تو پھر کس سبب سے تھا؟ تمام دن آفس میں مختلف کاموں کے دوران مصروفیت میں بھی یہ سوال میرے اندر سر اٹھاتا رہا جسے میں سر جھٹک کر بھلانے کی کوشش کرتا رہا اور بالآخر کامیاب بھی ہو گیا۔ مگر رات کو جب سونے کے لیے لیٹا تو پچھم سے وہ سیاہ تل والی ناک اور عام سی صورت والی لڑکی میرے سامنے آکھڑی ہوئی۔

”کیا مصیبت ہے؟“ میں نے جھنجھلا کر روٹ بدلی اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔
اگلی صبح اٹھتے ہی پہلا خیال مجھے یہی آیا تھا۔



”چھو ڈویار کیا بات کرتے ہو۔ تم تو ہونا چھڑے چھانٹ جب جہاں منہ اٹھایا چل دیے۔ ہم سے پوچھو گھر سے اندر باہر آنے جانے کے لیے بھی بیگم پوری انکو ازنی ٹیم کی طرح جرح کرتی ہے۔ تم اچھے ہو تمہیں دیکھتا ہوں تو رشک آتا ہے۔“

احسن میرے اچھے کاروباری دوستوں میں سے تھا۔ آج کل ان کی کمپنی کے ساتھ بھی ہمارا ایک پروجیکٹ چل رہا تھا اور پچھلی میٹنگ پس ڈنر میں وہ آ نہیں سکا تھا۔ آج اس سے فون پر بات ہوئی تو میں نے کہہ ڈالا۔ تو وہ تو جیسے بھرا بیٹھ تھا۔ اور تو میں جو آج صبح سے ہی فرزند کے مشورے پر مسلسل کام کی مصروفیت کے دوران بھی غور کرتا رہا تھا ایک دم سے پیچھے ہٹنے

لگا۔
”کیا شادی ایسی پابند کر دینے والی چیز ہے؟“ میں لہو بھر بعد یونہی پوچھ بیٹھا۔
”ایسی ویسی اہلقتہ تم کرو۔“ وہ بے دھڑک بولا۔
”کیوں نہیں کیوں کر لوں؟“
”دوبار تمہارے گھر ڈنر انوائٹ تھا تو میری بیگم کو مسلسل یہ شک رہا چونکہ تم کنوارے ہو تو یقیناً ایسی ویسی سرگرمیوں میں ملوث ہوں گے سو مجھے بھی ”خراب“ کرو گے۔“

”لا حول ولا قوۃ“ میں نے جھنجھلا کر فون بند کر دیا۔
”جی عائشہ نام ہے میرا۔“ وہ کسی کام سے اندر آئی تو میرے پوچھنے پر تانے لگی۔
”پہلی بار جا رہی ہیں؟“ میں نے عکھے کی ہوا سے بکھرتے پیپرز کو پیپر کلب لگاتے ہوئے سرسری لہجے میں پوچھا۔
”نہیں جی۔ اس سے پہلے دو جگہ کی ہے۔“ وہ صاف گوئی سے بولی۔

”کہاں؟“
”ایک وہاب سنز میں صرف تین دن اور ”بی سروڈ“ میں دو ہفتے۔“
میں خفیف سا مسکرا دیا۔

اس کی ناک کے بتوں بیچ وہ سیاہ تل کیسا روشن تھا پھر وہی خیال مجھے چبھنے لگا میں اسے دیکھ رہا تھا بے خیالی میں۔
وہ کچھ نروس ہو کر اپنا نوپہ درست کرنے لگی۔
”ٹھیک ہے آپ جاؤ۔“ میں نے کہہ کر سن پھیر لیا۔

”سہو! سہو! اف یو ڈونٹ مائنڈ ایک بات پوچھوں۔“ وہ وہیں کھڑی تھی اور کچھ ہکلاتے ہوئے ڈرے سے انداز میں بولی۔
”ہوں بولیے۔“ وہ شاید میری اتنی سنجیدہ ہو جانے والی صورت سے خائف ہوئی تھی۔
”سر آپ۔ آپ کا۔ میرا مطلب ہے آپ کا نام سہارون ہے۔ آپ کا پورا نام۔ آپ کی فیملی۔“

”واٹ؟“ مجھے جیسے اس کی آخری بات پر زبردست جھٹکا لگا تھا۔
میری دھاڑ سے ہی وہ فٹ بھرا چھل گئی تھی۔
”واٹ ڈویو مین۔“ میں اب باقاعدہ اسے کھور رہا تھا۔

”نتہنگ سر۔۔۔ آئی ایم سوری ایک مشورہ ملی سوری۔“ وہ جلدی جلدی معذرت کرتی وہاں سے چلی گئی۔
”یہ لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ ان سے دو باتیں کرو تو پھیلنے لگتی ہیں یعنی ان کو میرا فیملی ڈیٹا چاہیے تاکہ۔۔۔ یہ آگے تک سوچ سکیں یعنی کس۔۔۔ میرا دماغ جیسے کھول رہا تھا۔ حالانکہ شکل سے وہ ایسی لڑکی نہیں لگتی تھی۔ پر شکلوں کا جتنا دھوکا مجھے ہو چکا تھا اب تو میں نے شکلوں پر اعتبار کرنا ہی ختم کر دیا تھا۔
مگر اگلے دن دو ایسے واقعات اوپر تلے ہوئے جس سے مجھے لگا یا تو وہ لڑکی بہت گھاگ اور شاطر ہے یا حد درجہ بے وقوف۔

ڈرائیور صبح مجھے آفس لے کر آیا اور پارکنگ ایریا میں گاڑی پارک کر کے میرا بریف کیس ہاتھ میں لیے میرے آگے جا رہا تھا۔ میں اپنے سیل پر آنے والی مسئلہ کال چیک کر رہا تھا جب وہ اچانک کھلے گیٹ سے اندر آتے ہوئے میرے پاس رکی۔

”السلام علیکم سر۔ گڈ مارننگ۔ سر آپ اوپر جا رہے ہیں نا آفس؟“
اس نے پیچھے سے آکر ایک تو اتنا اچانک سلام اور گڈ مارننگ آگے کہا پھر اگلا سوال۔ ظاہر ہے میں آفس ہی جا رہا تھا۔

میں نے ذرا ہی گردن ترچھی کر کے اسے دیکھا۔ وہ کم از کم آفس آنے کے لیے شاید تیار ہو کر نہیں آئی تھی کاسی کھر تھا شاید وہ کہ مجھے رگڑوں کی کچھ ایسی پہچان نہیں یا شاید گہرا گلابی مگر شکن آلود اور اس کے بالوں کی بکھری لٹیں پیچھے لگے کلب یا پھر کچھ سے نکل نکل کر چہرے کے اطراف میں پڑی تھیں۔ لگتا تھا اس نے منہ بھی نہیں دھویا تھا۔ میں نے ناگواری سے

اسے دیکھا۔
”سر! آپ پلیز یہ میری ایبل کیشن۔ پلیز زیدی صاحب کو دے دیں۔ میں اپنی امی کو اسپتال لے کر جا رہی ہوں۔ وہ باہر رکشے میں ہیں پلیز۔“ اس نے میرے جواب کا مزید انتظار کیے بغیر عجلت میں کہا اور ہاتھ میں پکڑا کانڈ زبردستی میرے ہاتھ میں دے کر تقریباً دوڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔
میں نے غصے میں ہاتھ میں پکڑے کانڈ کو دیکھا۔
”حق لڑکی میں اس کا پون لگا ہوں جو اس کی چھٹی کی درخواستیں جمع کرانا پھوں۔“ جانے مجھے کیوں اتنا غصہ آیا۔

میں نے بے اختیار وہ کانڈ پڑھے بغیر دو ٹکڑے کر کے راستے میں اچھال دیا۔
”ابھی ملازمت پر آئے دو دن نہیں ہوئے اور باس کو اس نے چپراسی کی طرح حڑت کرنا شروع کر دیا ہے۔ ان جیسی لڑکیاں جا ب بھی محض ہالی کے طور پر کرتی ہیں آج زیدی صاحب سے بات کرنا ہوں۔“ لفٹ میں کھڑے کھڑے میں نے عائشہ کو جا ب سے فارغ کرنے کا پختہ فیصلہ کر لیا۔

مگر آفس میں دس اور بجے میرے منتظر تھے اور اتنی مصروفیت میں میں یکسر بھول گیا کہ مجھے زیدی صاحب سے بات کرنی ہے بلکہ انہوں نے کام کے دوران ایک بار عائشہ کے نہ آنے کا ذکر کرتے ہوئے کچھ تشویش کا اظہار کیا۔

”یہ آپ نے کس قسم کی لڑکی کو لپائنٹ کیا ہے۔“ مجھے اس کی بات پر اپنا غصہ یاد آگیا۔
”بہت ضرورت مند ہے سر! اگرچہ تعلیم اور تجربہ دونوں کم تھے مگر۔“

زیدی صاحب بات کرتے کرتے رکے
”اور سر! ایک بات اور۔۔۔“
”جی کہیے۔“ میں نے بے زاری سے کہا۔
”وہ غفار صاحب ہیں نا! ایڈمن میں ۴ نہیں آج صبح ہارٹ اٹیک ہو گیا آج اگر آپ مجھے تھوڑا جلدی جانے کی اجازت دیں تو میں گھر جانے سے پہلے ان کی عیادت

کرتا جاؤں۔“

غفار صاحب میرے اسٹاف کے بہت ایمان دار اور محنتی شخص تھے۔ مجھے ان کے ہارٹ اٹیک کا سن کر تکلیف ہوئی۔

”زیدی صاحب! میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔“ میں نے ذرا توقف سے کہا تو زیدی صاحب کا چہرہ کھل سا گیا۔



یہ ایک درمیانے درجے کا اسپتال تھا جہاں صفائی کا نظام بھی ناقص تھا اور اسٹاف بھی خاصا غیر ذمہ دار۔ غفار صاحب کی حالت اب قدرے بہتر تھی مگر ابھی بھی وہ انتہائی نگہداشت کے کمرے میں تھے اور کمرے کی حالت دیکھ کر کہیں سے نہیں لگتا تھا کہ یہ آئی سی یو ہے۔

میں تھوڑی دیر بیٹھ کر پھولوں کا بکے اور سفید لفافے میں کچھ رقم غفار صاحب کے سرہانے رکھ کر نکل آیا۔

زیدی صاحب ابھی وہیں بیٹھے تھے۔ میں اسپتال کی حالت دیکھتا باہر کی طرف جا رہا تھا جب اچانک برآمدے کے موڑ پر مجھے عائشہ مل گئی۔ اس کے ہاتھ میں نسخہ تھا۔ شاید وہ دوائیاں لینے جا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ کچھ پریشان سی ہو گئی۔

”تو واقعی اس کی والدہ بیمار ہیں۔“ میں نے اسپتال میں اس کی موجودگی پر کچھ ہمدردی سے سوچا۔

”سر آپ یہاں۔“ وہ گھبرا کر بولی۔

”ہاں وہ ہمارے ایک اسٹاف ممبر اوہرائڈ مٹ تھے۔ ان کی عیادت کو آیا تھا۔ آپ کی مدر یہاں ایڈ مٹ ہیں؟“

”نہیں۔ سر۔!“

”میں انہیں دیکھ سکتا ہوں۔ آئی مین ان کی خیریت پوچھنے کے لیے۔“

”نہیں۔ سر۔ وہ میرا مطلب ہے، ابھی وہ ہوش میں نہیں۔“ وہ یکدم گھبرا گئی۔

”کیا حالت زیادہ خراب ہے۔“

”نو سر۔ ٹھیک ہیں۔ سو رہی ہیں۔“ وہ فوراً سے پیشتر بیان بدل کر بولی۔

”مگر ابھی تو آپ کہہ رہی تھیں وہ بے ہوش ہیں۔“

”نو سر! پہلے تھیں۔ اب تو بہتر ہے مگر سو رہی ہیں۔“ وہ صاف مجھے ٹر خارا ہی تھی۔

”او کے پھر میں چلتا ہوں۔ آپ ان کو میری طرف سے بوجھ لیجئے گا اور اگر میرے لیے کوئی خدمت ہو تو بلا جھجک کہہ دیجئے گا۔ خدا حافظ۔“ میں کہہ کر جانے لگا۔

”سر پلیز۔“ وہ میرے سامنے آتے ہوئے بولی۔

”آپ نے شاید مانسڈ کیا ہے۔“

”نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں اگر وہ سو رہی ہیں تو انہیں آرام کرنے دیں۔ اس میں مانسڈ کرنے والی کون سی بات ہے۔“ میں خلاف طبیعت برامانے بغیر بولا۔

شاید اس کی اسپتال میں موجودگی نے میرے دل کو نرم کر دیا تھا۔

”سر۔ میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں اگر آپ برانہ مانیں۔“ وہ اس دن کی طرح کچھ بے چین سی ہو کر بولی۔

”جی پوچھئے۔“ میں ہمہ تن گوش ہو کر بولا۔

”شاید آپ برامان جائیں گے۔“ وہ بڑبڑائی۔

”او کے سر! پھر بات کریں گے۔ میں ذرا یہ میڈیسن لے آؤں۔ امی اکیلی ہیں ادھر۔“

وہ یک دم معذرت کر کے آگے بڑھ گئی اور میں اس کے عجیب و غریب رویے کے بارے میں سوچتا رہ گیا۔

وہ مجھ سے کیا پوچھنا چاہ رہی تھی پھر اس نے اپنی امی سے بھی مجھے ملنے تمہیں دیا۔ کہیں نہ کہیں کچھ گڑبڑ ہے یا تو یہ لڑکی۔ کوئی سائیکل پر اہل کم ہے اس کے ساتھ یا پھر کوئی چکر۔ کیا چکر ہو سکتا ہے۔“ میں خود ہی سوال اٹھاتا اور خود ہی نفی کرتا رہا۔



”زیدی صاحب! مس عائشہ آئی ہیں؟“ اگلے دن

میں نے زیدی صاحب سے پوچھا۔
”نو سرائی کی مدر اسپتال میں ایڈمٹ ہیں اس لیے“

”اچھا!“
”اسی اسپتال میں سرائی صاحب غفار صاحب ایڈمٹ ہیں۔ میں کل عائشہ کی مدر کو بھی دیکھنے گیا تھا۔ بے چاری خاصی بیمار ہیں اور عائشہ۔ اس کی تو حالت دیکھی نہیں جاتی۔ سب ہی کچھ اسے ہی تو رکھنا پڑتا ہے۔ اس کی مدر بیٹی کی طرف سے بہت فکر مند ہو رہی تھیں۔ کافی دیر مجھ سے اس کے متعلق باتیں کرتی رہیں۔“ زیدی صاحب متاسف لہجے میں کہہ رہے تھے۔

اور میں! میری کچھ عجیب سی حالت ہو رہی تھی۔ اس نے کل زیدی صاحب کو اپنی مدر سے ملوایا اور میں نے کہا تو صاف ٹال گئی کہ وہ سو رہی ہیں۔
”کل آپ کس وقت گئے تھے ان سے ملنے؟“ میں نے دل کی کھولن دبا کر نارمل لہجے میں پوچھا۔
”اسی وقت۔ آپ کے غفار صاحب کے پاس سے اٹھ آنے کے دس بارہ منٹ بعد میں بھی اٹھ گیا تھا۔ پاپر نکلتے ہی مجھے عائشہ مل گئی۔ میڈیسن لے کر آ رہی تھی اسٹور سے۔ میں نے کہا آپ کی مدر کی عیادت کر لوں تو بے چاری بہت شکر گزار ہو رہی تھی۔“
زیدی صاحب خائلیں اٹھا کر کھڑے ہو گئے۔
”آخر اس نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا؟“ یہ سوال رات تک میرے دماغ میں کسی ہتھوڑے کی طرح بجاتا رہا۔

اگلا پورا ہفتہ وہ آفس نہیں آئی۔
آٹھویں روز وہ آفس میں موجود تھی۔
میرے پاس اس وقت احسن بیٹھا تھا جب وہ گیارہ بجے کے قریب کچھ پیپر ز پر میرے سائٹ لینے کے لیے آئی۔
وہ پہلے کی نسبت مجھے خاصی کمزور اور بھٹی بھٹی

سی لگی۔

براؤن یا گرے بچھے ہوئے رنگ کی شلوار قمیص کے ساتھ بلیک ووش اس کے چہرے کی سوگواری کو اور بھی برہا رہا تھا۔ میک اپ سے بالکل بے نیاز صاف رنگت والا سا چہرہ اور اس کی ناک کے نیچوں بیچ بڑی شان سے چمکتا وہ سیاہ تل۔
”السلام علیکم سر۔!“ مجھے وہ سلام کر چکی تھی۔ سائٹ کرتے ہوئے میں نے سنا تھا اب وہ دوسرا سلام احسن کو کر رہی تھی۔
”کیسی ہیں مس عائشہ آپ؟“ وہ بھی خوش دماغ سے بولا۔

”فائن سر۔“

”اوہر ایڈجسٹ ہونے میں کوئی پر اہلم تو نہیں ہوئی؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔
”نو سر۔!“ اس کا انداز جان چھڑانے والا تھا۔ وہ مجھ سے پیپر لے کر جلدی سے باہر نکل گئی۔
”تم جانتے ہو اسے؟“ اس کے باہر جاتے ہی میں نے احسن سے پوچھا۔

”ارے یہ یہاں جا ب کرنے سے پہلے سال بھر شجاع انکل کے آفس میں رہی ہے۔ اچھا خاصا سیٹ تھی اور اچھا سلیبریٹی بھی لے رہی تھی پھر جانے کیوں بغیر کسی وجہ کے اوہر ریٹائر کر کے اوہر آگئی۔“
وہ کہہ رہا تھا اور میں کچھ حیران سا رہا تھا۔
”اور اب مجھے سمجھ میں آگیا کہ یہ انکل شجاع کا آفس بغیر کسی وجہ کے کیوں چھوڑ کر آگئی۔“ وہ مطمئن سے انداز میں بولا۔

”کیا مطلب؟ کیوں؟“ میں قطعاً نہ سمجھ سکا۔

”دیکھو نایار! کہاں وہ انکل شجاع جیسا بڑھا کھوسٹ ایک دم چڑچڑے اور سڑیل مزاج کا پاس اور کہاں آ جیسا بیگ اسٹارٹ ہینڈ سم گڈ لکٹنگ اور سب سے بڑھ کر بالکل ”فارغ البال“ پاس۔ اب بولو تمہارا ہیکج زیادہ انٹریکٹو سے یا بے چارے شجاع انکل کا۔“ وہ جتانے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔
”سٹ اپ یار! کیا فضول ہانک رہے ہو۔“ میں

جل سا ہو کر یہی کہہ سکا۔ ”ارے بڑی گھاگ ہوتی ہیں۔ آج کل کی لڑکیاں۔ ایک آفس سے دوسرے آفس ایک پاس سے دوسرے پاس تک کا سفر بڑی سہولت اور بہتر سے بہتر ہیکج کے چکر میں بڑے آرام سے کرتی ہیں۔“ وہ گھنٹیاں سے کہہ رہا تھا۔ میری سوچ ایسی کبھی بھی نہیں رہی تھی۔

”لگتا ہے آج تمہارا کام کاموڈ نہیں مجھے ذرا ایک کام سے جانا ہے قارخ ہو تو چلو باقی بھڑاس رستے میں نکال لیتا۔“ مجھے سر شجاع ہی سے ایک ضروری کام یاد آگیا سو اٹھتے ہوئے بولا تو وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔
اور اگلی شام مجھے لگا اس کی ساری پینشن گویاں حرف بہ حرف سچ ثابت ہو گئی ہیں۔

”صاحب! آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔“ میں لیپ ٹاپ کھولے مصروف تھا جب فرزند نے آکر مجھے اطلاع دی۔
”کون ہے؟ اس وقت ایسے موسم میں کون آگیا۔“ میں سستی سے اٹھتے ہوئے بولا۔

باہر موسم کے تیور اچھے نہیں تھے۔ دوپہر بھر میں اکٹھے ہونے والے بادل اب شام گئے گھٹائیں بن چکے تھے جو کسی بھی لمحے برس سکتی تھیں۔
”ڈرائنگ روم میں بیٹھایا ہے جی۔ چائے لے آؤں؟“ وہ میرے سوال کو نظر انداز کر کے۔
دانت نکالتے ہوئے بولا۔

”ہاں لے آؤ۔“ میں سر ہلا تا ڈرائنگ روم میں آگیا اور سامنے کمرے کے بیچوں بیچ دو دریا روشنی میں کھڑی عائشہ کو دیکھ کر میں لمحہ بھر کو ساکت سا ہو گیا۔
”آپ۔۔۔ سر!؟“ میری حیرت میں ناگواری کا عنصر غالب تھا۔

”السلام علیکم سر۔ سوری آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا میں نے۔“ وہ سبز رنگ کے لباس میں تھی اور یہ رنگ اس کی صاف رنگت پر خوب کھل رہا تھا مگر اس کے باوجود وہ مجھے قطعاً ”اچھی نہیں لگی۔“

کچھ احسن کی باتیں دماغ میں گردش کرنے لگیں۔
”ایسی لڑکیوں کا سفر۔ بہتر سے بہتر پاس۔ بہتر سے بہتر ہیکج کی طرف کتنی سہولت سے ملے ہوتا ہے۔“ میں بدقت اپنی ناگواری پر قابو پاتے ہوئے آگے بڑھا۔
”کوئی ضروری کام تھا آپ کو تو صبح درنگ ڈے ہی تھا۔“

میں نے صاف جتانے ہوئے کہا کہ مجھے اس کا یوں گھر تک چلے آنا اچھا نہیں لگا۔
”سوری سر۔ مگر کام مجھے پرستل نوعیت کا تھا۔“ وہ ابھی تک کھڑی تھی اور میرے رویے سے قدرے نروس بھی ہو رہی تھی۔ میں نے بھی اسے بیٹھنے کو نہیں کہا۔

اب مجھے فرزند کے خواخوہ نکوستے دانتوں کی وجہ سمجھ میں آگئی۔
”جی کہیے۔“ میں رکھائی سے بولا۔
باہر لمحہ بہ لمحہ موسم کے تیور بدل رہے تھے۔ بادل مگر بننے لگے تھے۔

”سر! میری والدہ بہت بیمار ہیں۔“ اس کی آواز میں نمی سی تھی۔
”اوہ!“ میں سمجھ گیا۔ اسے مالی مدد کی ضرورت تھی۔

”یہ بات اس روز آپ مجھے اسپتال میں بھی جتا سکتی تھیں یا آفس میں زیدی صاحب سے کہہ دیتیں اس طرح کے کاموں کے لیے الگ سے اکاؤنٹ موجود ہے۔“

وہ میری بات سن کر تیزی سے پلکیں جھپکنے لگی۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیاں شاید کپکپا رہی تھیں جو وہ انہیں بار بار موڑ رہی تھی۔
”نو سرائی یہ بات نہیں ہے۔“ وہ بھاری آواز میں بولی۔

”تو کیا بات ہے صاف کہیے۔“ ڈرائنگ روم میں دو دریا روشنی تھی جو مرکزی فانوس سے چھن چھن کر آ رہی تھی مگر ہر اندھیرا لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔

”سز میری مدد سے ڈاکٹر زکتے ہیں وہ شاید چند ہفتے یا چند دن۔۔۔ انہیں کینسر ہے اور آخری اسٹیج پر۔“ وہ بے دردی سے ہونٹ کاٹتی آنسو پتی بڑے حوصلے سے کہہ رہی تھی۔

ایک پل کو مجھے اپنے رویے پر بے حد ندامت ہوئی۔

”ان کے پاس شاید زیادہ وقت نہیں ہے۔“ اس نے لمحہ بھر کو بھیگی پلکیں اٹھائیں۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور پانیوں سے لبالب تھیں۔

”اور مجھے آپ سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔“

اس نے رک رک کر بات کھل گئی تھی۔

”مجھ سے مگر کیوں؟“ میں حیرت سے بولا۔

”یہ آپ ان سے ملیں گے تو جان جائیں گے۔“ وہ ایک قدم میری طرف بڑھی۔

اسی وقت فرزند چائے کے ساتھ لوازمات کی ٹرالی دھکیلا اندر لے آیا۔

وہ خاموشی سے فرزند کے باہر جانے کا انتظار کرنے لگی۔

”مگر میں ان سے کیوں ملیوں۔ اس روز میں نے خود آپ سے ریکونسٹ کی تھی کہ میں ان کی عیادت کر لوں تو آپ نے صاف مجھے ٹال دیا تھا اور بعد میں زیدی صاحب۔۔۔“

میں منافق کبھی بھی نہیں رہا تھا۔ سول میں باتیں رکھ کر ان کو کینہ نہیں بناتا تھا اس لیے صاف گوئی سے کہہ ڈالا۔

”آپ ان سے ملیں گے تو میرے ٹالنے کی وجہ بھی جان جائیں گے۔ یہ میرے گھر کا ایڈریس ہے، کل شام میں آپ کا انتظار کروں گی۔“ اس نے چھوٹی سی چیٹ میرے آگے کی جسے میں نے پڑھے بغیر مٹھی میں بند کر لیا۔

”بس اتنا یاد رکھیے گا سرب! میری ماں کے پاس وقت کم ہے اور۔۔۔ آپ سے ملے بغیر وہ اس دنیا سے جانا نہیں چاہتیں۔“

تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

میں کتنی دیر حیران و ساکت کھڑا رہ گیا۔

باہر زور سے بادل گرتے تو مجھے خیال آیا باہر موسم کتنا خوف ناک ہو رہا ہے اور وہ عجیب سی لڑکی ایسے موسم میں اکیلی کہاں جائے گی۔

میں تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔

”صاحب! باہر تو وہ کہیں بھی نہیں ہیں۔“ فرزند تھوڑی دیر میں واپس آ کر بولا۔

تیز ہواؤں کے ساتھ موٹی موٹی بوندیں گرنا شروع ہو چکی تھیں۔

”یاد آیا۔ وہ رکشے میں آئی تھیں اور ان کے اندر آنے پر وہ رکشہ باہر ہی کھڑا رہا تھا۔ اسی میں گئی ہوں گی۔“ فرزند جاتے جاتے واپس پلٹ کرتا لگا۔

یہ موسم اور اس طرح کی لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی بارش مجھے ہمیشہ ہوش و خرد سے بیگانہ کر دیا کرتی تھی۔

ہر بار یہ موسم مجھے اس ظالم رات کی یاد دلا دیتا تھا جب تقدیر کی طرح یہ موسم بھی میرا دشمن بن چکا تھا۔

برسوں پہلے کی اس رات کا ایک ایک منظر اپنی پوری جزئیات کے ساتھ مجھے یاد آتا چلا گیا۔

مجھے علاقہ ڈھونڈنے میں تو کوئی خاص دشواری نہ ہوئی مگر گھر ڈھونڈنے میں بہت وقت لگا۔

گھر کیا تھا شاید ایک کمرے پر مشتمل تھا جس کے آگے چھوٹا سا برآمدہ اور دوسری طرف شاید باتھ روم تھا۔

دستک دینے سے پہلے میں کافی دیر وہاں کھڑا رہا کہ شاید میں غلط جگہ پر آ گیا ہوں۔

میں نے ابھی دستک دینے کے لیے دروازے پر ہاتھ ہی رکھا تھا کہ دروازہ فوراً کھل گیا۔

وہ کل والے لباس میں اپنا روشن چہرہ اور ناک پر چمکتا ہل لیے کھڑی تھی۔

”آئیے پلیز۔“ اس نے سلام کرتے ہوئے مجھے راستہ دیا۔

”یقیناً گھر ڈھونڈنے میں آپ کو خاصی دشواری ہوئی ہوگی۔“ وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے آہستگی سے

بولی۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

چوتھے قدم پر کمرے کا دروازہ تھا جس پر معمولی جالی کا سفید پردہ لہرا رہا تھا۔

”سر ایک منٹ۔“ وہ دروازے سے دو قدم پر ہی رک کر بولی۔ ”سر آپ سے ایک التجا ہے۔“

”جی کہیے۔“ میں اب اس کی باتوں سے کافی متحسّس ہو چکا تھا اور جلد از جلد اس سسپنس سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔

”سر! صرف اتنا یاد رکھیے گا۔ کوئی انسان خواہ کتنا ہی طاقت ور اور با اختیار کیوں نہ ہو قدرت نے اسے ایک مقررہ ٹائم لٹٹ دے رکھا ہوتا ہے کہ اس کی طاقت اور اختیار کی حد اس ٹائم تک ہے۔ اس مقررہ ٹائم لٹٹ کے گزرتے ہی قدرت اس سے ساری طاقت، سارا اختیار چھین کر اسے بے بس اور لاچار بنا دیتی ہے اور اگر اس نے اپنے ٹائم لٹٹ میں طاقت اور اختیار کے گھنڈے میں لوگوں کے حقوق کو پامال کیا ہوگا تو پھر اس کی بے بسی و لاچاری بہت قابل رحم ہوگی۔“

میں اس کی بات سن تو رہا تھا مگر سمجھ کم ہی رہا تھا جانے وہ کس حوالے کے پس منظر میں بات کر رہی تھی۔

”سر! صرف اتنا یاد رکھیے گا کہ میری ماں کے پاس تھوڑے سے دن ہیں وہ بھی اس نے قدرت سے رو رو کر مانگے ہیں۔ صرف آپ سے معافی مانگنے کے لیے کہ اس کی طاقت ٹائم لٹٹ گزرتے ہی اسے بے حد قابل رحم بنا چکی ہے پلیز۔“ وہ اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

اس نے اندر جا کر کمرے کی لائٹ جلائی اور مجھے اندر بلائے لگی۔

”ای! اٹھیے دیکھے کون آیا ہے آپ سے ملنے۔“

بارون جاوید۔ بارون بھائی آئے ہیں۔“

کمرے میں مجھے اکلوتے بیڈ پر حرکت سی ہوئی۔

اور عائشہ کے آخری جملے نے کسی پچھو کے ڈنک کی

طرح مجھے کانٹا تھا۔

”میں نے سامنے بستر تکیے کے سہارے بیٹھی اس عورت کو دیکھا جو کسی بھی زندہ وجود کا محض سایہ ہی لگ رہی تھی۔ اتنی کمزور اور مدقوق کہ بغور دیکھنے پر بھی معلوم پڑتی تھی۔“

اور اس کے باوجود میں اسے پہلی نظر میں پہچان چکا تھا۔

”وہ وہ تھی جس نے مجھے عورت ذات سے نفرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔“

میں بارون جاوید اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ابا میرے بچپن میں ہی جب میں تین چار سال کا تھا ایک روڈ ان ایکسپلنٹ میں دنیا سے گزر گئے۔ میرے ذہن میں ان کی ہلکی سی شبیہ بھی نہیں ہاں جس کو میں نے ابا کہا اور ابا سمجھا اور اس نام کے ساتھ جس کا تصور میرے دماغ پر ابھرتا تھا وہ میرے باپ کا سا بھائی میرا چچا ہاشم تھا۔

”ہاشم چچا نے ابا کے بعد مجھے یوں اپنی محبت بھری چھاؤں میں سمیٹا کہ میں ایک عرصے تک لوگوں کے بتا دینے کے باوجود انہیں ہی ابا سمجھتا رہا اور ماں نے بھی مجھے یہی سمجھایا۔ یہی بتایا کہ ”بارون! یہی تمہارے ابا ہیں۔ ہمیشہ ان کو اپنے باپ کا سار تہ اور عزت دینا۔“

شاید میری ماں کو علم تھا کہ اس نے اتنی جلدی اس دنیا سے چلے جانا ہے اس لیے بار بار یہ نصیحت میرے کانوں میں اتارتی رہتی تھی۔

چچا ابا کے گھر ہمیں کوئی تکلیف نہیں تھی۔

ماں لوگوں کے کپڑے سی کر مقدور بھر چچا ابا کی مدد کر دیا کرتی تھی۔ اس گھر میں ہمارے لیے محبت اور تحفظ تھا مگر اس احساس کے ساتھ دن رات بچوں کے دینے والا ایک دھیمادھیماسازلت بھر احساس بھی تھا۔

وہ تھی چچی امی کی نفرت!

انہیں مجھ سے میری ماں سے بے تحاشا نفرت تھی۔

ہم ان کی بلا شرکت غیرے حکومت میں حصہ بٹورنے جو چلے آئے تھے وہ بھی بغیر عورت کے ابا کی وفات سے پہلے ہم ساتھ والے گھر میں رہتے تھے۔ ابا کی وفات کے بعد چچا ابا نے بیچ کی دیوار گرا کر دونوں گھروں کو ایک کر دیا تھا۔

بس یہیں سے چچی کی نفرت کا دور شروع ہو گیا۔ وہ برلا کہتی تھیں کہ اس دو ٹکے کے چھو کرے کا وجود کل کو ان کے بچوں کا حق غصب کرنے کا باعث بنے گا۔

چچا ابا کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔

دونوں بیٹے ماں کا پر تو تھے۔ غصے اور بد مزاج جبکہ عائشہ چچا ابا کے مزاج و شکل کی تجیسی جانتی فوٹو کاپی تھی۔

سوائے اس کی ناک کا وہ ذرا سا تل جسے میں ”دیکھو عشو! جو ہا تمہاری ناک پر بونی کر گیا ہے۔“ کہہ کر چھیڑا کرتا تھا جس پر وہ پہلے لڑتی پھر گھٹنوں رویا کرتی تھی اور ہر بار ماں مجھے خوب ڈانٹا کرتی۔

اور مجھے یاد ہے ماں اکثر چچا ابا سے کہا کرتی تھی ”بھائی! یہ عشو تو میری بیٹی ہے۔ میری امانت ہے آپ کے پاس۔ چند سالوں کے لیے اور چچا ابا ہاں ہاں کیوں نہیں۔“ کہہ کر زور سے سر ہلا دیا کرتے تھے۔

اس وقت میں نہ ”امانت“ کا مفہوم سمجھتا تھا نہ ماں کی باتوں کا۔

پر شاید ماں کو بھی علم تھا اس کی زندگی تھوڑی سے سو وہ دو چار دنوں بعد چچا ابا کو یہ والی بات یاد دلانا نہ بھولتی۔

اور ایسے میں چچی امی بچپن میں برتن اٹھا اٹھا کر پھینکتیں بچوں کو بلاوجہ مارنے لگتیں کوسنے لگتیں اور ماں کچھ نرمندہ کچھ خوف زدہ سی منظر سے ہٹ جاتی۔

ان دنوں مجھے کسی چیز سے ڈر نہیں لگتا تھا نہ چچی امی سے نہ ان کے غصہ سے۔

میرے آگے میری ماں کی مضبوط ڈھال جو تھی۔

”تم نے خوب پڑھنا ہے بارون! تمہارے ابا کا خواب تھا کہ وہ تمہیں بہت پڑھا میں گے مگر زندگی نے انہیں مہلت ہی نہ دی۔“ ماں اکثر جب میں پڑھ رہا

ہوتا۔ میرے پاس آکر بیٹھ جاتی اور حسرت بھرے انداز میں مجھ سے کہتی۔

مجھے خود بھی پڑھنے کا شوق تھا اور ذہن بھی بہت اچھا تھا میں دو سری جماعت میں تھا۔ جب ایک رات اچانک ماں چھت سے سوکھے کپڑے اتارنے گئی موسم خراب ہو رہا تھا۔ سب گھر والے سونے کے لیے لیٹ چکے تھے اور کپڑوں کے ڈھیر کے پچھپے سے ماں صحیح طور پر قدم نہ رکھ سکی اور آٹھ ذہنوں سے یوں لڑھکتی ہوئی نیچے آئی کہ اس کے منہ سے ایک آخری زور دار چیخ نکلی۔

وہ سارے کپڑوں کا ڈھیر اس پر پڑا تھا اور سر کے نیچے سے خون کی نہری نکل چلی آ رہی تھی۔

ہسپتال لے جانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ماں نے آخری دو تین سانس لیں اور مجھے حیرت سے دیکھتے ہوئے ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند لیں۔ وہ رات۔ وہ ساہ گرجتی برستی رات۔ پھر اگلے اٹھارہ سالوں کے لیے میری زندگی میں ٹھہر گئی۔

چچا ابا کی شفقت مجھ پر کچھ اور بھی بڑھ گئی مگر چچی امی کی نفرت من کے غصے میں دن بدن اضافہ ہی ہو جا چلا گیا۔

میں صرف اس وقت امان میں ہوتا تھا جب چچا ابا گھر میں ہوتے تھے۔ ان کے گھر سے باہر جاتے ہی میں چچی امی اور ان کے دونوں سرچڑھے بیٹوں کے عتاب کا نشانہ بن جاتا۔

صرف وہ چھوٹی سی عشو تھی میری ماں کی چچا ابا کے پاس امانت جو ایسی عتاب کی گھڑی میں میرے آگے کمزور سی ڈھال بننے کی کوشش کرتی اور اکثر چچی امی کے دو تین ہاتھ بھی کھا جایا کرتی۔

”یہ گھر میرے بیٹوں کا ہے۔ یہ چھٹکا ابھی چھوٹا ہے۔ تم ابھی سے اپنے بچوں کے نام کرو۔ کل کو کوئی آفت کھڑی کر دے گا۔“ چچی امی چچا ابا سے کہہ رہی تھیں۔

”کلثوم بی بی! یہ گھر بارون اور ہمارے بچوں کی مشترکہ ملکیت ہے۔“ چچا ابا محل سے بولے۔ اور چچی

ای غصے میں بولتی چلی گئیں۔
 ”ماں باپ میرے اور گھڑی ہمارے سردھر گئے ہم نے کیا یہاں یتیم خانہ کھول رکھا ہے۔ پالو پھر زہاؤ لکھاؤ اور کل کو جائیداد کا حصے دار بھی بناؤ۔ میں کہتی ہوں آج ابھی یہ فیصلہ کرو یا یہ اس گھر میں رہے گا یا میں اور میرے بچے۔“ چچی شدید غصے میں تھیں۔
 ”یہ رہے گا اس گھر میں اور میرے بچے بھی۔ تمہارا جو دل کرتا ہے کر لو۔“ چچا ابانے انہیں چیلنج کرنے والے انداز میں کہا تو چچی کتنی دیر غصے کی شدت سے بول ہی نہ سکیں۔

”تو پھر ہاشم! تم لکھ لو۔ اس گھر میں صرف میں اور میرے بچے رہیں گے یہ نہیں رہے گا۔ میں اپنے بچوں کے حصے کا اسے ایک لقمہ تو کیا ایک انچ زمین بھی نہیں دوں گی۔“ انہوں نے بڑے دنگ لہجے میں چچا ابانے کا چیلنج قبول کیا تھا اور پھر انہوں نے سچ کر دکھایا۔
 اس دن سے میرا اس گھر میں رزق سکتے سکتے باسی لکڑیوں پر آ گیا۔ وہ بھی عانت چھپا کر مجھے دے دیا کرتی ورنہ چچی تو شاید مجھے زہر بھی دینا نہ پسند کرتیں۔
 چچا ابانے سے باہر گئے ہوئے تھے۔ انہیں اگلے روز آنا تھا۔ کیسی طوفانی رات تھی جیسے اس طوفان میں سب کچھ اڑا لے جائے گی۔ مجھ سے ایک معمولی سا شیشے کا گلاس ٹوٹ گیا اور چچی کو ایک ٹھوس بہانہ مل گیا۔

چچی نے یا سر اور وسیم نے مل کر مجھے اتنا مارا کہ میرے منہ اور سر سے لہور سے لگا۔
 ”نکل یہاں سے جان چھوڑ ہماری۔ میں تجھے ایک پل کے لیے اس گھر میں نہیں برداشت کر سکتی۔ تو یہاں رہے گا تو میرے بچوں کے حصے کا رزق تیرے پیٹ کا دوزخ بھرتا رہے گا۔ میرے بچوں کے حصے کی محبت ان کا باپ ساری تجھ پر لٹاتا رہے گا اور کل کو اس سانپ کو پال پوس کر اس گھر کا مختار کل بنا دے گا۔ میں اس سنیو لیے کا سرا بھی کیوں نہ کچل دوں۔ نکل۔ نکل یہاں سے۔“
 ان کے ہاتھ میں جلتی لکڑی تھی اور میرا کمزور

وجود۔ وسیم اور یا سر کے ٹھڈے اور اوپر گرتا برستا آسمان۔

”ای۔ ای۔ ای۔ نہ مارو۔ اسے امی بھائی۔ پلیز اباکو آنے دو۔ ہارون بھائی کو نہ مارو۔“ وہ پانگلوں کی طرح کبھی ماں سے لپٹ کر اس کے ہاتھ تھامنے کی کوشش کرتی اور کبھی دونوں بھائیوں کے ساتھ۔ اور وہ ہر بار اسے دھکا دے کر پیچھے کر دیتے۔

”چچی امی۔ چچی امی میں کہاں جاؤں گا۔ باہر بارش ہے اور سروی بھی پلیز مجھے رات۔ بس ایک رات رہنے دیں۔ میں صبح چلا جاؤں گا۔ چچا ابانے کے آنے سے پہلے اللہ کے لیے مجھے مت مارو۔“

ایک نو سالہ بچے کی کمزور فریاد۔ آخری ضرب میرے سر میں لگی اور میں نے ذلت کی زندگی سے عزت کی موت مرنے کے لیے بارش کے طوفان میں چھلانگ لگادی۔ اور اندھا دھند اس اندھیری سڑک پر دوڑتا چلا گیا اور دل میں قسم کھائی کہ ادھر اب کبھی نہیں آؤں گا۔

اس رات مجھے کوئی رحمت کا فرشتہ کس بڑی گاڑی کا مالک نہیں نکرایا تھا بلکہ ایک مفلوک الحال گدڑی پوش فقیر تھا جو مجھے اپنے ساتھ لگا کر اپنی پٹکتی ہستی چھوٹی سی کٹیا میں لے گیا تھا۔ جہاں اس نے مجھ سے بن پوچھے میرے زخموں پر مرہم رکھا۔ دودھ کا گرم پھالہ دیا اور میرے آنسو پونچھ کر مجھے لٹا دیا۔ میں سسکیوں سے رو رہا تھا اور وہ میرا سر تھپک رہا تھا۔

”سب آزمائشیں ہیں۔ سب امتحان جو سمجھ گیا وہ پار لگ گیا جس نے جی کا روگ بنا لیا۔ وہ ڈوب گیا۔ سو جاؤ گھڑی کو۔ سب بھول کر سو جا۔“

وہ مجھے بھکتے ہوئے کے جا رہا تھا اور میں ذرا دیر بعد چوٹوں سے اٹھنے والی ٹیسوں سے بے خبر سوچا کرتا تھا۔

”دور راستے ہیں تیری زندگی میں۔ مٹی اور سونا۔ مٹی میں مل کر مٹی بن جا۔ یا مٹی کو سونا بنا دے۔“ اس نے اگلی صبح مجھے چائے کے ساتھ روکھی روٹی دیتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ صرف جسم و جان کا رشتہ قائم رکھنا ہے تو یہ کاسہ پڑا ہے پکڑ اور میرے

ساتھ چل۔ شہر میں بھکاری بہت پڑ دینے والے بھی بے شمار ہیں۔ تجھے بھی تیرے حصے کی بھیک مل جائے گی۔

نہیں تو دوسرا راستہ شہر میں جگہ جگہ جیب کتروں اور ڈاکے ڈالنے والوں کی تربیت گا ہیں ہیں۔ یہاں لے چلتا ہوں تجھے چند دنوں میں ”ہنرمند“ کر دیں گے تیسرا راستہ۔“

وہ رک کر اپنی میلی سی کھچڑی نما سینے تک جھاڑیوں کی مانند بکھری داڑھی میں کھجاتے ہوئے بولا۔

”تیسرا راستہ لمبا طویل ترین اور بہت صبر آزما۔ جس کے اختتام پر عزت ہی عزت، رزق ہی رزق کہ شہر بھر کے بھکاریوں میں بانٹے اور کمی نہ آئے۔ محنت کا راستہ صبر اور جانفشانی کا راستہ۔ ایمان داری اور جفاکشی کا راستہ۔ علم اور عمل کا راستہ۔ عمر تیری چھوٹی ہے پر شعور تیرا بلوغت کی ڈیوڑھی پر کھڑا ہے کہ میرا رب سامنے جن کو بن ماں باپ کا بنا تا ہے ان کے اندر عجب طرح کی روشنی بھر دیتا ہے۔ ایسی روشنی جو ہر اندھیرے رستے کو اجال سکتی ہے۔ چاہے تو آزما کر دیکھ لے۔ لوگ یتیموں مسکینوں کو حقیر جانتے ہیں۔ دھکے دیتے ہیں۔ رذیل جانتے ہیں اور ذرا سی دیر کے لیے یہ نہیں سوچتے وہ ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والا نہیں کس مقصد کے لیے یتیم بناتا ہے۔ چنے ہوئے ہوتے ہیں یہ سب یتیم مسکین میرے مولا کی خاص محبت سے چنے ہوئے یہ ایسی قابل نفرت دھتکارنے والی مخلوق ہوتے تو کیا وہ اپنے پیارے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یتیم پیدا کرتا۔ ہرگز نہیں بات صرف سمجھ کی ہے۔ برائی کسی میں بھی نہیں۔ صرف انتخاب کا فیصلہ گڑ بڑجاتا ہے۔“
 وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”یہ دوسرا کاسہ چھوڑے جا رہا ہوں۔ دل چاہے تو پہلا راستہ اختیار کر لینا۔ بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے صرف عزت نفس کو قتل کر کے دو وقت کا رزق۔ دوسرا راستہ اپنانا چاہے تو شام تک میرا یہاں انتظار کریو۔“ وہ رکا اور اگر تو نے تیسرا راستہ اختیار کیا تو۔“ اس نے

مصافحہ کے لیے میرے سامنے اپنا میلا کچیللا بھدا سیاہ ہاتھ برہایا۔

”تیری میری یہ آخری ملاقات ہے۔ چلتا ہوں۔“ وہ اپنی رنگ برنگی بدبودار گدڑی سنبھالتے ہوئے باہر نکل گیا۔

وہ میری اس گدڑی پوش سے پہلی اور آخری ملاقات تھی کیونکہ میں نے تیسرا راستہ اپنایا تھا۔

ایک لمبا طویل ترین صبر آزما مشقتوں سے بھرا سیلف میڈ میں کا راستہ اور آج میں وہ کچھ ہوں۔

وہ بڑیوں کا پنجر اس رات کی شقی القلب عورت چچی امی تھیں۔ جو مجھ سے کچھ بھی کہے بغیر اپنے استخوانی ہاتھ میرے آگے باندھے بس زار و قطار روئے جا رہی تھیں۔

اور مجھے۔ مجھ پر بہت پہلے یہ منکشف ہو چکا تھا کہ ایسا لمحہ میری زندگی میں آئے گا اور میں پہلے سے طے کر چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔

”مجھے کم از کم اس عورت کو معاف نہیں کرنا۔ ہرگز نہیں۔“

میں اپنے پہلے سے سوچے ہوئے فیصلے کے تحت جھٹکے سے اٹھا اور باہر جانے لگا۔

”ہارون۔ ہارون۔ بھائی۔ سو۔“ وہ اس رات کی طرح میرے پیچھے روٹا ہوا ہو کر لپکی تھی۔

اور میرا پہلے سے سوچا ہوا فیصلہ جیسے رست کی دیوار بن گیا اور میرے قدموں میں پھٹتا چلا گیا۔

صرف ایک لمحہ۔ جیسے دعا کی قبولیت کا ایک لمحہ ہوتا ہے، اسی طرح انسانوں کے قوی ترین فیصلوں کو بدل جانے کے لیے بھی صرف ایک لمحہ چاہیے ہوتا ہے۔

اور میرا قوی ترین فیصلہ اس ساحر لمحے میں بدل چکا تھا۔ میں مڑا اور اسے دیکھنے لگا۔

اس کی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو بہ رہے تھے اور لب کچھ بولنے کے لیے پھر پھڑپھڑا رہے تھے۔

”میں گاڑی دروازے پہ لے کر آ رہا ہوں۔ تم چچی امی کو باہر تک لے کر آؤ انہیں ابھی میں اپنے گھر لے

کر جاؤں گا اور پھر ہسپتال۔“

یہ میں بولا تھا یا میرے اندر سے کوئی اور۔
بول چکنے کے بعد بھی میں کتنی دیر بے یقینی کی سی
حالت میں گھڑا رہا۔



”شام کو جلدی گھر آجائے گا۔ امی کو ڈاکٹر کے پاس
لے کر جانا ہے۔“

وہ خوب صورت شاید نہیں بلکہ یقیناً ”تیز گلانی
رنگ کے سوٹ میں ہم رنگ لب اسٹک لگائے بڑے
استحقاق بھرے انداز میں مجھ سے کہہ رہی تھی (عائشہ
میری زندگی میں کیا آئی مجھے رنگوں کی پہچان بھی
ہو گئی۔)

”آپ کہتی ہیں تو میں جاتا ہی نہیں۔“ میں
رومانٹک انداز میں اس کی طرف کھسکتے ہوئے بولا۔
اس نے ہنستے ہوئے مجھے پرے دھکیلا۔

”بس زیادہ پھیلنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ میرے
ساتھ پورچ تک آئی اور گاڑی میں بیٹھ کر میں نے
اسے ہاتھ ہلایا اور وہ گیٹ بند ہونے تک وہیں کھڑی
مجھے محبت پاش نظروں سے دیکھ دیکھ کر مسکراتی رہی۔
میرا گھر ہی نہیں میرا دل بھی محبتوں سے لبالب بھر
گیا تھا۔

دل کشادہ کرنے سے معاف کر دینے سے۔ محبتوں
سے دلوں کو تسخیر کر لینے سے ویران آسیب زدہ گھر کیسے
آباد ہو جاتے ہیں۔

یا سارا اور وسیم نے وہ گھر جس کے لیے چچی امی نے
برسوں پہلے مجھے دھکے دے کر نکالا تھا۔ انہوں نے باہر
جانے کے لیے اس گھر کو بیچ ڈالا۔ چچا ابا اس عم سے جو
بستر سے لگے تو اٹھ نہ سکے۔

”ابا ہر روز صبح اٹھتے اور دکان پر جانے سے پہلے گھر
آنے سے پہلے دو تین گھنٹے آپ کی تلاش میں سارے
شہر میں پھرا کرتے تھے اور اپنی موت کے آخری لمحات
میں انہوں نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں آپ کو تلاش
کر کے ایک بار ان کے لیے اور امی کے لیے ضرور

معافی مانگ لوں۔“

”عشو بیٹی! اس دنیا کی معافی آسان۔ اس دنیا میں
معافی ناممکن۔“ وہ پہروں روپا کرتے تھے۔ ان کے
آنسوؤں نے میرے دل میں زخم بنا دیے تھے۔

اور سر شجاع کے پاس جب کے دوران ہی میں نے
آپ کو ان کے آفس میں دیکھا۔ مجھے شک گزرا اور
مکمل نام جاننے کے بعد میرا شک یقین میں بدل گیا۔
اسی لیے سر شجاع کی جب چھوڑ کر میں نے آپ کا
آفس جوائن کیا مگر آپ سے بات کرنے کی ہمت نہیں
ہوتی تھی۔ کس طرح سے اپنی ماں کے گناہ کی معافی
مانگتی۔

اور میں جو دل میں سوچتا تھا کہ کبھی اس عورت کو
معاف نہیں کروں گا ایک لمحہ کے آگے پار گیا تھا۔ رہا
سہا ماں کے قول نے مجھے پسپا کر ڈالا کہ ”ہاشم بھائی! عشو
میری امانت ہے آپ کے پاس۔“

صرف ایک معافی کے بدلے مجھے کتنے فائدے
ملے تھے۔ لیکن صرف نظر لگ جانے کے ڈر سے ان
فائدوں کو نہیں گنتا۔

مجھے خدا نے اس لمبے طویل صبر آزار راستے کے
انتخاب پر کیسا خوب صورت انعام دیا تھا۔ پھر میری
طاقت میرا اختیار بھی تو ایک ٹائم تک میرا تھا اور اگر
میں اس ٹائم لمٹ میں خدا کے بندوں کے حقوق
پہچاننے کے بجائے پامال کرنا شروع کر دیتا تو پھر اس ٹائم
لمٹ کے گزر جانے کے بعد یقیناً ”میری بے بسی و
لاچارگی قابل رحم ہونا تھی اور یہ سراسر نقصان کا سودا
تھا۔

ایک معافی کے عوض میں نے کیسے نفع کا سودا کیا۔
آپ بھی اس بات کو مانتے ہیں نا۔



زندگی اور موت

لیکن خوبصورت زندگی کی امید بھی توڑنا اس کے بس میں نہ تھا۔ وہ اس امید کے سارے ماٹھ کو زندگی کی خوشیوں کی تلاش میں آگے بڑھنے پر اکساتی تھی۔ جیسی تو ہر سال کے آغاز پر اس کی سالگرہ کے موقع پر ”زندگی خوبصورت ہے“ پر کارڈ پر لکھی تحریر اس کے نام کرتی تھی۔

کتنے ہی بل۔ ان گنت۔ لاتعداد۔ تمہیں تو پتا ہے نا! تمہیں تو علم ہے نا؟“ کمرے کی خاموش فضا میں ماٹھ کی آواز ابھری تھی اور صائمہ جے ہوئے بھی اس کی بات کی نفی نہیں کر پاتی کہ اگر اس وقت اس کی بات سے انکار کرتی تو وہ جھوٹ کے رے میں آتا اور وہ جھوٹ بولنا نہیں چاہتی تھی۔

”ہاں! تو وہ سچ ہی تو ہے نا! زندگی خوبصورت ہے۔“ ایک نظر کارڈ پر ڈال کر وہ قدرے مسکرائی۔

”نہیں۔ زندگی بد صورت ہے، کم از کم میرے لیے تو۔ اور اب تم اس کی وجہ مجھ سے نہ پوچھنا۔“ ماٹھ قدرے الجھتے ہوئے بولی۔ اس کی آنکھوں سے یاسیت عیاں تھی۔

”اس“ نہ پوچھنے کی وجہ؟“ صائمہ نے استفہامیہ انداز میں کہا۔

”کیونکہ۔ کیونکہ۔ زندگی بد صورت ہے۔ میرے لیے۔“ پھر قدرے توقف کے بعد بولی۔

”اور اب مجھے تم سے یہ کہنا ہے کہ زندگی خوبصورت ہے۔“ صائمہ کی نگاہیں اب بھی اس کے چہرے پر گڑھی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے موقف پر ڈٹی ہوئی تھی۔

”پھر بحث۔“ ماٹھ جھنجلا کر بولی۔

”بحث نہیں، حقیقت۔ محض حقیقت۔“ صائمہ کا انداز وہی تھا۔ لیکن اس مرتبہ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ماٹھ کے قریب آتے ہوئے بولی۔

جواب میں ماٹھ خاموش ہو گئی تھی۔ لب بھینچے خاموش کتنے ہی بل اس خاموشی کی نذر ہو گئے تھے۔

صائمہ جانتی تھی۔ اسے علم تھا۔ ماٹھ کی زندگی کا ایک ایک دکھ۔ ایک ایک لمحہ جو اس نے خوشی کی آس میں کانا تھا۔ اس امید پر گزارا کہ کیا پتا اگلے لمحے زندگی کا کوئی بل اس کے نام خوشیاں لے آئے۔ اس لئے

یل کی اس میں کتنے ہی بل وہ گزار آئی تھی، زندگی

”تمہیں پتا ہے کہ زندگی۔“ صائمہ ابھی اپنا فقرہ مکمل بھی نہ کر پاتی تھی، ماٹھ بول اٹھی۔

”خدا کے لیے اب تم ہر سال کی طرح وہی گھسا پٹا جملہ دہرانے نہ بیٹھ جانا۔“ ماٹھ کے انداز میں تنبیہ تھی۔ صائمہ اس کے بیڈ پر براجمان ہو چکی تھی۔

”سچ تو سچ ہی ہے نا! کیا تمہیں اس سے انکار ہے؟“ وہ بھری دہر اس کے کمرے میں ہاتھوں میں ابھی برتھ ڈے کا کارڈ لیے موجود تھی۔

”مجھے سچ سے انکار نہیں۔ لیکن۔“ ماٹھ نے اس کے ہاتھ سے کارڈ پکڑ لیا۔

”لیکن کیا؟“ جواب میں صائمہ ماٹھ کو ٹوک کر بولی، کیونکہ اسے علم تھا کہ وش کارڈ کھولتے ہی ماٹھ کا موڈ ہر سال کی طرح آف ہو جائے گا۔

”تمہارے اس جملے سے مجھے سخت کوفت ہوتی ہے۔“ ماٹھ کارڈ کھول کر ایک نظر اس پر لکھی تحریر پر ڈالتے ہوئے قدرے چڑ کر بولی۔

”کیوں ماٹھ! یہ بھی تو سچ ہی ہے نا!“ وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

”نہیں۔ یہ سچ نہیں ہے۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”اچھا تو پھر کیا سچ ہے؟“ سوالیہ انداز میں صائمہ نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”جو تم کہنا چاہتی ہو اور پچھلے کئی سالوں سے مجھ سے کہتی آرہی ہو۔“ وہ کارڈ پلٹ کر اس کے اندر لکھی تحریر صائمہ کی نظروں کے سامنے کرتے ہوئے بولی۔

”میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے۔ تمہیں تو علم ہے نا! تمہیں تو اس بات سے انکار نہیں ہے نا؟“ اس مرتبہ نظروں میں سوال لیے ایک جتانے والے انداز میں ماثر نے صائمہ کی جانب دیکھا۔ کیا تھا اس کی نظروں میں ایک گہری سانس لیتے ہوئے اس نے اپنا دایاں ہاتھ ماثر کے کندھے پر رکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔ لیکن زبان چپ تھی۔ بہت گہری چپ ایک جلد خاموشی۔



بچپن ہی میں ماثر کے ماں باپ کا کار ایگسڈنٹ میں انتقال ہو گیا۔ پھوپھو کے گھر پرورش پائی، ماثر کے حصے میں نفرت کے لاتعداد موسم چلے آئے۔ جنہیں شمار کرنا بھی چاہتی تو ماثر کو کتنی ہی بھول جاتی تھی پھر جب اسکول جانے کی عمر آئی تو اس کے حصے میں پرائیویٹ اسکول کے بجائے گورنمنٹ اسکول آیا تھا۔ اس کی پھوپھو کا کہنا تھا۔ ”میری تو بہت خواہش تھی کہ میرے بچوں کے ساتھ اس کا بھی داخلہ اچھے اسکول میں ہوتا۔ لیکن پڑھائی میں اس کا ذہن نہیں چلتا تو اسے گورنمنٹ اسکول میں ہی بڑی مشکل سے داخلہ ملا ہے۔“

گھر میں ہر آئے گئے کو اس کی پھوپھو کا یہ جواب اس کے ذہن کو سوچنے کے کام میں الجھا دیتا۔ آخر پھوپھو نے ان انکل کو ایسا کیوں کہا؟ میرا ایڈمیشن تو اسکول کے پرنسپل نے ٹیسٹ لے کر کیا ہے اور اس میں میری فرسٹ پوزیشن تھی۔“ اس کی پھوپھو کے مطابق اس کا کام نہ کرنے والا ذہن اسے بچپن ہی سے بہت سے کام کرنے سکھا گیا تھا۔ اور سب سے بڑا کام تھا خاموشی۔ ہر بات کے جواب میں خاموشی۔ ہر سوال کے جواب میں چپ۔ ہر جبر کے جواب میں گہری سر دآہ۔ اس نے خود کو کتابوں کی دنیا میں گمن کر لیا تھا۔ ایک خول۔ ایک حصار جس میں اس نے خود کو قید کر لیا اور

اس حصار کو توڑنے والی صائمہ کی ذات تھی۔ کب؟ کیسے؟ کس طرح سے؟ کس انداز سے؟ اس نے ماثر کے گرد بے حصار کو توڑا تھا۔ اکیلے پن کا حصار جسے اس نے کتابوں کی دنیا کا نام دیا تھا اور پھر بچپن سے لے کر جوانی تک اس حصار کو کوئی اور نہیں توڑ پایا تھا۔ ہاں کوشش کی تھی، لیکن کوئی کامیاب نہیں ہو پایا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نے زندگی کے ہر رخ کو منفی انداز میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے ذہن کی تبدیلی کو روکنے کی کوشش میں صائمہ اس کی بچپن کی سہیلی بھی کامیاب نہیں ہو پائی تھی۔

”زندگی میں کچھ نہیں رکھا۔ نفرت ہے مجھے۔“
 ”زندگی میں بہت کچھ باقی ہے۔“
 ”اس سے کہیں کم۔ بہت ہی کم جو میں نے کھویا ہے۔“ ایک دن کالج پوائنٹ سے واپسی کے راستے اس نے صائمہ سے کہا تھا، لہجے کی تلخی نے صائمہ کو چونکا دیا تھا۔

”یہ کیسے کہہ سکتی ہو اور تم نے تو ایسے کہا ہے جیسے کہ میں بھی تمہاری زندگی کی بے رونق کا حصہ ہوں۔“ قدرے منہ بناتے ہوئے مصنوعی ناگواری لہجے میں صائمہ بولی۔

”یہ تم نے کیسے سوچ لیا۔ تم ہی تو ہو جس نے مجھے زندگی میں جینا سکھایا ہے۔ مجھے میرے اکیلے پن کو دور کرنے میں مدد کی ہے۔ اس اکیلے پن کو جو بچپن میں میرے ماں باپ کی موت کی صورت مجھے ملا۔ پھر اس دنیا کے رویوں نے میرے حصے میرے نام وہ اکیلا پن کیا۔ اور تم۔ تم نے یہ فضول بات کیسے سوچ لی۔“ ماثر خفگی سے بولی۔

ان میں سے ہے؟“
 ”نہیں۔ تم ایسی نہیں ہو۔ اس دنیا سے مختلف۔ از کم میرے لیے تم بہت اچھی ہو۔“ مدھم سی مسکراہٹ ماثر کے ہونٹوں پر ابھر آئی۔

”میرے جیسے اور بھی اس دنیا میں بہت ہیں جو بے لیے اچھے ہیں اور تمہیں ان کا احساس ہے۔“ صائمہ کے لہجے میں گہرائی تھی۔
 ”مثلاً“ کوئی ایک نام لو۔ میری پھوپھو۔ ان کی اولاد، میرے ماں باپ کا کوئی ایک رشتہ دار۔ کوئی۔“ ماثر جھنجھلا ہی تو پڑی۔ ماتھے پر ناگواری سے ہاتھ آئے۔

”سرفیاء۔“ بے ساختہ ہی صائمہ کی زبان سے سلا تھا۔ جواب میں وہ خاموش ہو گئی تھی۔
 دل میں ایک لفظ سرگوشی کی مانند ابھرا۔ ”شاید۔“
 ”وہ ہیں اسی لمحے اسی دل کے کسی ایک گوشے میں دفن ہو گیا۔“

وہ اردو لیکچرر سرفیاء کی نظروں میں اپنے لیے بندھ گیا کی رفق دیکھ چکی تھی۔ لیکن کتنے ہی عرصے سے وہ دل ہی دل میں اس بات کو جھٹلاتی آرہی تھی کہ اس کی ایگزیمز کے بعد ہی سرفیاء نے اس کو شادی کے لیے پروپوز کیا تھا۔

وہ حیران ہوئی تھی۔ اس بات کا اس نے صائمہ سے کہا تھا۔ ”کیا تم کو ہمیشہ وہ بھی اسی کی طرح حیران ہوئی۔“
 ”کیا کروں؟“
 ”کرنا کیا ہے۔ شادی۔“ صائمہ لاپرواہی سے بولی۔
 ”داغ خراب ہے۔“ ماثر نے گھورا۔
 ”میرا تو بالکل ٹھیک ہے کوئی شک۔“
 ”شک نہیں یقین۔“ اس نے الفاظ پر زور دیتے ہوئے ماثر بولی۔ ”لیکن تم نے سر کو کیا کہا؟“ چند لمحے کے بعد صائمہ نے پوچھا۔
 ”کچھ نہیں۔“ جواب آیا تھا۔
 ”کیا مطلب۔ یعنی کہ تمہیں پروپوز کیا۔ اور تم

یعنی کہ تم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ واپس چلی آئیں۔
 ”نہیں میں نہیں مان سکتی۔“ اس کی بات پر نفی میں سر ہلاتے ہوئے صائمہ بولی۔
 جواب میں ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ابھر آئی تھی۔
 ”وہ ٹھیک تو ہیں نا۔؟“ قدرے اس کے قریب ہوتے ہوئے صائمہ نے نہایت راز دارانہ انداز میں پوچھا۔

”کون؟“
 ”سرفیاء کہیں ان کا سر تو نہیں پھاڑ آئیں۔“ آنکھوں میں شرارت کی لیے اس نے پوچھا کہ اس کا جواب سن کر ماثر کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔
 ”نہیں کیا ہے کہ اگر شادی کرنی ہی ہے تو گھر والوں کی مرضی سے۔“
 ”کیا؟ گھر والوں کی مرضی سے۔“ صائمہ قدرے حیرت سے چونکی۔

”ہونہ۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔
 ”میں نے ٹھیک کہا نا؟“
 ”کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ مان جائیں گے؟“ سوال کا جواب دینے کی بجائے الٹا سوال کیا گیا تھا۔
 ”ہاں۔ انہیں کیا اعتراض ہوتا ہے۔“
 ”لیکن تم خود ہی تو۔ ماثر کیا تمہیں نہیں پتا۔ اور پھر۔“

”مجھے امید ہے کہ پھوپھو اس مرتبہ ایسا نہیں کریں گی۔ اور اس مرتبہ زندگی مجھے ناامید نہیں کرے گی۔“
 ”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ صائمہ کے دل سے دعا نکلی تھی۔
 لیکن درحقیقت ایسا ہی ہوا تھا۔ سرفیاء کی والدہ کو سختی سے انکار کر دیا گیا تھا، الزام بھی ماثر ہی کے سر آیا کہ وہ ایک مرتبہ پھر سے کہہ اٹھی۔
 ”زندگی ہے ہی بد صورت۔“

اس وقت بھی اس کے کمرے میں موجود صائمہ ایسے ابھی برتھ ڈے کارڈ کے ساتھ وش کرنے آئی تھی۔
کچھ دیر بیٹھنے کے بعد صائمہ واپس چلی گئی۔ وہ نہ صرف اس کی بچپن کی سہیلی تھی۔ اسکول میٹ تھی بلکہ ان کی ہمسایہ بھی تھی۔ اسی لیے اس کی زندگی کے ups and downs سے اچھی طرح واقف تھی۔

صائمہ کے جانے کے بعد کتنی ہی دیر تک ماہرہ اپنی زندگی کے بارے میں سوچتی رہی۔ حال میں رہتے ہوئے کتنی ہی دیر ماضی کے ڈھیروں واقعے جو اس کی اپنی زندگی سے جڑے تھے۔ جنہیں وہ اب تک فراموش نہیں کر سکی تھی۔ لمحہ بہ لمحہ ڈہرا رہی تھی۔ اور اس کی ماضی کی اس فلم کا still بن جیسے سر ضاء تک آکر رک سا گیا تھا۔ یک دم ہی اس کی آنکھوں میں مریچیں سی لگنے لگی تھیں۔ اور پھر کئی آنسو اس کی پلکوں کی باڑھ توڑے رخساروں کو بھگو گئے تھے۔

شام وہ واک کے لیے معمول کے مطابق پارک چلی آئی تھی۔ آج اس کے ساتھ صائمہ نہیں تھی۔
واکنگ ٹریک پر چلتے ہوئے وہ پارک کے درمیان لگی گھاس پر اتر آئی، دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے ہوئے اس کا دھیان پھر سے صائمہ کی جانب چلا گیا تھا۔

”میرا انتظار کر رہی ہوگی واک پر آنے کے لیے۔
بیشہ تو میں ہی اسے گھر سے لیتی ہوں۔ اب اسے کیا پتا کہ آج میں اس کی کوئی بھی بات سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ اس لیے اسے بتائے ہی چلی آئی۔“

سوچتے ہوئے اس نے سامنے جھولوں پر کھیلتے بچوں کی جانب نظر کی۔

”کینے۔ کیا یہ اکیلا پن ختم ہو سکتا ہے میری زندگی سے۔“ ایک یاسیت بھری مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بکھر گئی اور اس نے جوئے کی نوک سے گھاس پر زور سے پاؤں مارا۔

ایک گہری سانس اس کے ہونٹوں سے خارج ہو کر پارک کی فضا میں مدغم ہو گئی تھی۔ اس کے قدم رک گئے۔ سامنے پارک میں کھیلتے بچوں پر سے ڈوبنے سورج کی شعاعوں کی شفیق لالی پر اس کی نظریں جم ہی تو گئی تھیں، دل سے اک آواز ابھری تھی۔

”کتنا حسین منظر ہے۔ قدرت کا شاہکار۔“ اور پھر اگلے ہی لمحے سر جھٹک کر وہ قدم بڑھاتی واکنگ ٹریک پر چلی آئی۔

”کیا فائدہ اس حسین موسم کا؟ ہو سکتا ہے کہ زندگی حسین نظر آنے کی بجائے واقعی اس وقت پارک میں موجود کسی شخص کے لیے حقیقت میں حسین ہو۔ درحقیقت میرے لیے اس زندگی کا کوئی ایک بھی حسین لمحہ میرے لیے نہیں ہے۔ اور یہ بات چاہتے ہوئے بھی میں صائمہ کو نہیں بتا سکتی کہ مجھے بھی زندگی خوبصورت لگتی ہے۔ ایسا محسوس بھی ہوتا ہے، لیکن زندگی کے تلخ تجربوں اور رویوں نے اس احساس پر زخم کے کھرند کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے، کبھی کبھی میرا بھی دل کرتا ہے میں بھی زندگی کو خوبصورت کہوں، اسی طرح جیسے میرا دل گواہی دیتا ہے، لیکن میری زبان میری آنکھیں ساتھ نہیں دے پاتیں۔“

آنکھوں کے سامنے چھائی آنسوؤں کی دیز تہہ اس احساس پر ایک دھند کی سی کیفیت طاری کر دیتی ہے۔
”کیا کروں؟ کیا کروں میں؟“ ایک سرگوشی کے انداز میں زیر لب اس نے کہا تھا۔ بلکہ اس کی زبان سے ادا ہوا تھا۔

”وہی جواب ابھی کر رہی ہیں۔“
”جی۔“ اسے اپنے پیچھے آواز سنائی دی تھی۔ اور وہ اچھل ہی تو پڑی تھی۔
”واک۔ آپ کو واک ہی کرنا چاہیے۔ لیکن کیا

کو ٹھنڈ محسوس نہیں ہو رہی اور اندھیرا بھی پھیل رہا ہے۔ پھر آج اکیلی بھی آئی ہیں۔“

وہ جو کوئی بھی تھا اسے دیکھتے ہی وہ چند لمحوں کے لیے اپنی جگہ ساکت ہو گئی تھی۔
”کیا ہوا آپ رک کیوں گئیں؟ چلیں نا۔ ویسے بھی ناہت ضروری ہے اور زندگی میں چلنا تو اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ درست سمت۔ درست وقت۔“

”ذو معنی لمحے میں وہ اس سے کہہ رہا تھا۔“
”کیسے پتا چلے کہ کون سی سمت درست ہے اور کون سا وقت آپ کے لیے اچھا۔“ بے ساختہ ہی اس کے ہونٹوں سے ابھرا تھا۔
ساتھ چلتے وجود کے قدم قدرے آہستہ ہوئے تھے اور اس نے چہرہ ماہرہ کی جانب موڑا۔

”دل جو کہے۔ ایمانداری سے اٹھا قدم۔ محنت سے کیا کام، آپ کی زندگی کو خوبصورت بنا دیتا ہے۔ آج نہیں تو کل۔ کل نہیں تو برسوں۔ کوئی جانے یا نہ جانے۔ کوئی آپ کی محنت کو مانے یا نہ مانے۔ ایمانداری سے اٹھے قدم کو کوئی لاکھ روکنے کی کوشش کرے، لیکن خدا کی ذات سے کچھ بھی مخفی نہیں ہے۔ کچھ بھی تو نہیں۔“ وہ جواب میں خاموش رہی تھی۔

”کچھ سمجھ آئی یا نہیں۔ یا پھر جو سمجھ تھی وہ بھی گئی؟“ وہ مسکرایا۔

”ہوں۔ مجھے تو جتنی سمجھ آئی ہے وہ تو آئی ہی ہے۔ لیکن سر ضیاء لگتا ہے آپ کو میری پچھو کی بات ابھی تک سمجھ میں نہیں آئی یا پھر آپ کی امی نے آپ کو بتائی ہی نہیں۔“ یہ کہنے کے ساتھ ہی اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

”نہیں، مجھے علم ہے، لیکن شاید آپ کو علم نہیں کہ آپ کی پچھو کو کوئی اعتراض نہیں ہے اور آج آپ کے کہنے کے مطابق آپ کے گھر والوں کی مرضی سے میں یہاں آیا ہوں اور ماہرہ! میں آپ سے ایک مرتبہ پھر سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ مجھے اپنی زندگی میں ہم قدم دیکھنا چاہتی ہیں۔“

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے پارک سے باہر نکل

آئے تھے اور سڑک کے ساتھ چلتے فٹ پاتھ پر سر ضیاء کی بات سننے ہی ماہرہ کے قدم ٹھم گئے تھے۔

”کیا مطلب؟ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“
”یہی کہ آپ کی پچھو کو کوئی اعتراض نہیں ہے اور میری یہاں موجودگی کی وجہ بھی یہی ہے۔ میری امی اس وقت آپ کی پچھو کے پاس بیٹھی ہیں اور مجھے یہاں بھیج دیا ہے۔ آپ کی تسہیل۔ عزیز از جان دوست آپ کے انتظار میں آپ کے گھر تک چلی آئیں تو امی اور میں آپ کی پچھو کے پاس بیٹھے تھے۔ وہیں سے پتا چلا کہ آپ گھر میں موجود نہیں ہیں۔ اور اسی نے مجھے آپ کا یہاں واک پر آنے کا بتایا۔“
”لیکن یہ سب کیسے ہوا؟“ زیر لب ادا ہوا تھا۔
”اب ایک دم سے تو ساری باتیں نہیں بتا سکتا، کچھ تو سبسبس بھی رکھنا ہے۔“

”کیوں؟“
”آپ کو تنگ کرنے کے لیے۔“
”کیا میں ہی ملی ہوں تنگ کرنے کو؟“
”نہیں اور بھی تھیں، لیکن انہیں تنگ کرنے میں اتنا مزہ نہیں آتا، جتنا کہ آپ کو۔“ وہ ہنساتھا۔
”سرا! تینہی انداز میں کہا گیا۔“
”کیا سر کا دم چھلاہٹ نہیں سکتا۔“

جو اب میں وہ خاموش ہو گئی۔ ہلکی سی مسکراہٹ نے اس کے ہونٹوں کو چھو لیا تھا۔
”کیا اب بھی آپ کو زندگی خوبصورت نظر نہیں آتی؟“

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔“ اس نے نگاہ اٹھا کر اپنے ارد گرد کے ماحول پر ڈالی۔ سڑک پر آتی جاتی گاڑیاں۔ فٹ پاتھ پر چلتے لوگ۔ پارک میں کھیلتے بچے۔ زندگی سے بھرپور گہما گہما کے بیچ میں اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے والا وجود۔

”زندگی خوبصورت ہے۔“ بے ساختہ ہی اس کے ہونٹوں سے نکلا تھا۔ اور زندگی میں پہلی مرتبہ اس کے دل کے ساتھ ساتھ اس بات کی گواہی اس کی زبان نے بھی دی تھی۔



وہ بزرنگ حکایت بحال کی جائے
مکالمے کی روایت بحال کی جائے
ہمارا حال نہ پوچھو، بس اک گزارش ہے
ہماری خاک سے نسبت بحال کی جائے
یہ میرادل، یہ مرانا مراد وحشی دل
یہ کہہ رہا ہے کہ وحشت بحال کی جائے
ہر ایک ضابطہ منسوخ ہو علی زریون
زریں پہ صرف محبت بحال کی جائے

علی زریون

وہ مرنے پاس ہے کیا پاس بلاؤں اس کو
دل میں رہتا ہے کہاں ڈھونڈنے جاؤں اس کو
آج پھر پہلی ملاقات سے آغاز کروں
آج پھر دُور سے ہی دیکھ کے آؤں اس کو
قید کر لوں اسے آنکھوں کے نہاں خانوں میں
چاہتا ہوں کہ کسی سے نہ ملاؤں اس کو
چلنا چاہتے تو رکھے پاؤں مرے سینے پر
بیٹھنا چاہتے تو آنکھوں میں بیٹھاؤں اس کو
وہ مجھے اتنا سبک اتنا سبک لگتا ہے
کبھی گر جائے تو یلکوں سے اٹھاؤں اس کو
یہ میرادل مراد دشمن مرا دیوانہ دل
چاہتا ہے کہ سب ہی زخم دکھاؤں اس کو
شہزاد احمد

مجھے کمال کی دُمن ہے کمال کر دوں گا
نظر ملاؤں گے جب عرض حال کر دوں گا
وہ دل ہو، دل کی دُعا ہو کہ حرف چاہت کا
تمہیں جو دوں گا بہت دیکھ بھال کر دوں گا
ہے عاجزوں کی محبت میں یہ صفت تو ضرور
تمہارے چہرے کو نخوت سے لال کر دوں گا
فریفتگی بڑی نایاب چیز ہوتی ہے
میں اس چمک سے تمہیں مالا مال کر دوں گا
ادھر سے گزریں اگر گردشیں زمانے کی
قسم خدا کی طبیعت بحال کر دوں گا
بہت سوال نہ کر مجھ سے داور محشر
کہ میں بھی کوئی اَدق سا سوال کر دوں گا
فسا پذیر نہیں آدمی کا حُسن عدم
جسے چنوں گا اسے لاڈ وال کر دوں گا
عبدالحمید عدم

اُسے آواز دینا ہے،
اُسے آواز دینا ہے
اُسے ہنس کے بلانا ہے
اگر چہ اب ہمارے درمیاں دیوار حائل ہے
ہے میرا راستہ کچھ اور اُس کی اور منزل ہے
اُسے آگے نکلنا ہے
مجھے پل پل ٹھہرنا ہے
مگر گزرے زمانوں میں
ہمارے درد و غم بھی ایک تھے خوشیاں بھی سانجھی تھیں
ہماری زندگی کا خواب نامہ ایک جیسا تھا
الگ کر دار تھے دونوں فسانہ ایک جیسا تھا
سو اُس کو تے تعلق کے حوالے سے
گلہ ہرگز نہیں کرنا
نہ اب حرف شکایت لب پہ لانا ہے
اگر وہ اتفاقاً راستے میں مل بھی جائے تو
اُسے آواز دینا ہے
اُسے ہنس کے بلانا ہے
طالب انصاری

ہیں لیکن وہ انہیں چلا نہیں سکتے“

قصور

گھوکارنے اپنے ہمسائے سے شکایت کی۔
 ”جب بھی میں گاتا ہوں آپ کا گنا بھونکنا شروع کر دیتا ہے“ ہمسائے نے جواب دیا۔
 ”دیکھیں جی اس میں اس بے چارے کا کیا قصور ہے؟“
 شروعات تو آپ خود ہی کرتے ہیں نا!“
 مصباح گل - سرگودھا

شریک حیات

شوہر بے حد بیمار تھا جسے ڈاکٹروں نے بھی جواب دے دیا تھا اس کی بیوی بہت پریشان اور فکر مند رہتی تھی۔ وہ خدا سے دعا کرتی تھی کہ اے اللہ! میری جان بچا لے اور میرے شوہر کی جان کو بخش دے۔ ابھی عورت یہ دعا مانگ ہی رہی تھی کہ کپڑے میں مٹی نے دودھ میں منہ ڈالا جس سے برتن گر پڑا۔
 عورت گھبرا گئی اور سمجھی کہ ایک الموت آگے ہیں۔ یہ خیال آیا کہ شاید میری دعا قبول ہوگئی ہو۔ بہت ڈری اور کہنے لگی کہ حضرت! ادھر خیال نہ کریں۔ جس نے لیے آپ آئے ہیں اسے ہی لے کر جائیں۔ وہ اندر بڑھے۔
 ہر دین افضل شاہین - بہاول نگر

ستم ظریفی

بیل نے جب جگنو کو اپنے پاس سے خاموشی سے گزرتے ہوئے دیکھا تو وہ بڑا حیران ہوا کیونکہ پہلے کی طرح اس نے اسے نہیں کہا تھا کہ آؤ بھائی میں آپ کو آپ کے کھولے تک چھوڑاؤں۔ آخر بیل خود ہی جگنو سے بولا۔

”بھائی جگنو! اندھیرا بہت ہے، مجھے میرے گھر تک چھوڑ آؤ۔“
 یہ سن کر جگنو بولا۔ ”بھائی بیل! پہلے تو میرا روشنی پر کوئی خرچ نہیں آتا تھا مگر جب سے چاند والوں نے مجھے روشن دیکھا ہے، انہوں نے مجھے بھی بل بھیجا شروع کر دیا ہے۔“

مصباح طارق - گوجرانوالہ

موجود تمام

انسٹروٹیو میں ایک امیدوار سے پوچھا گیا۔
 ”اگر ایک آدمی انگلینڈ میں پیدا ہوا ہو، اس نے چین میں شادی کی ہو، فرانس میں ملازمت کی ہو، ساؤتھ امریکا میں بزنس کیا ہو۔ آپ کے خیال میں وہ اس وقت کہاں ہوگا؟“
 ”قبر میں“ امیدوار نے سوچ کر جواب دیا۔

یوں بھی ہوتا ہے

میں کتاب خریدنے جا رہی ہوں“ عینی نے کہا۔
 ”کیوں؟“ عینی کی دوست افسی نے پوچھا۔
 ”دراصل میرے منیجر نے مطالعہ کے لیے مجھے ایک خوبصورت بیل لمپ کا تحفہ دیا ہے۔“
 گرڈ یا شاہ - کہر وڈ پکنگ

نیادیراٹن

شہزاد کے منے جوتے میں کتے نے دانت گاڑ دیے۔
 جوتا مہنگا تھا، شاہ نے سوچا مرقمٹ کر لیا جائے۔ اس نے جوتا موچی کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔
 ”اسے ٹھیک کر دو۔۔۔ اس پر کتے نے دانت مار دیے ہیں۔“

موچی نے جوتے کو الٹ پلٹ کر دیکھا پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔
 ”اس کی مرقمٹ تو نہیں ہو سکتی۔ بہتر ہے کہ آپ دوسرا جوتا بھی کتے کو جانے کے لیے دے دیں۔
 دونوں جوتے ایک جیسے بنو جائیں گے، لوگ سمجھیں گے نیادیراٹن ہے۔“

سیدہ نسبت نہرا - کہر وڈ پکنگ

چالیسواں

خرم نے جوش سے احسن کو بتایا۔
 ”میں نے غلم نجوم سیکھ لیا ہے۔“
 احسن نے حیرانگی سے اسے دیکھ کر پوچھا۔
 ”اچھا یہ بتاؤ میرا چالیسواں کب ہوگا؟“
 خرم نے کہا۔ ”تمہارے مرنے کے چالیس دن بعد۔“
 حورین زینب - کہر وڈ پکنگ

معصومیت

بارش میں ایک طالب علم اپنے ہاسٹل کے کمرے واپس آیا تو دیکھا کہ اس کا دوست اس کی برساتی ریل پر نکل گیا۔ ہاتھ اس نے گرج کر پوچھا۔
 ”تم نے میری اجازت کے بغیر میری برساتی استعمال کی جرات کیسے کی؟“

دوست معصومیت سے بولا۔ ”کیا تم پسند کرو گے ارا سب سے خوبصورت سوٹ بارش میں بھیک رہا ہو جائے۔“

صائمہ جیسی - کراچی

دھمکی

ایک شخص کی بیوی گم ہوگئی تو اس نے اپنی بیوی شدگی کے بارے میں اخبار میں یوں اشتہار دیا۔
 ”میری بیوی پھلے جمعہ سے گم ہوگئی ہے۔ اگر کسی اطلاع دینے کی کوشش کی تو میں اسے جان سے مار گا۔“

اعتراف گناہ

میں خرابی گپ ٹپ کر رہی تھی۔ سنجیدہ موضوعات پر بحث آگئے۔
 ایک خاتون بولیں۔ ”آج کل زندگی کا کوئی بھرپور نہیں بالکل اچانک آ سکتی ہے۔ ہمیں کم از کم ایک سب سے سلسلے اپنی سب سے بڑی برائی یا گناہ اعتراف کر لینا چاہیے۔ ابتدا میں کرتی ہوں۔ میرا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ میں نے جو رفاہی تنظیم بنائی ہے، اس کے تمام فنڈز میں خرد خرد کر چکی ہوں۔“
 دوسری خاتون نے جھجکے ہوئے اعتراف کیا۔
 ”میرا گناہ یہ ہے کہ میں چھ سال سے اپنے شوہر سے نفی کر رہی ہوں۔“

میری خاتون بولیں۔ ”مجھ میں سب سے بڑی برائی ہے کہ مجھے جس کا راز معلوم ہوا ہے وہ میں ادھر ادھر بتاتی ہوں۔ اچھا اب میں چلتی ہوں۔“

جمہوریت

مینجنگ ڈائریکٹر نے اپنی کمپنی کے بورڈ آف ممبران

کے اجلاس میں کسی منصوبے کے بارے میں اپنی کئی تجاویز پیش کیں اور کہا۔
 ”میں اپنی رائے کسی پر مستند کرنا نہیں چاہتا۔ میری خواہش ہے کہ میں اس سلسلے میں آپ لوگوں سے ووٹ لے کر اس کام کا آغاز کروں۔“

بورڈ کے ممبروں نے نہایت پسندیدگی سے اپنے مینجنگ ڈائریکٹر کو دیکھا تب ڈائریکٹر نے دوبارہ کہا۔
 ”ہاں تو اب وہ تمام ممبران جنہیں میری تجویز سے اتفاق نہ ہو اس اعلان کے ساتھ اپنے ہاتھ بلند کر دیں جو اس بات کا اشارہ ہوگا کہ وہ استعفیٰ دینا چاہتے ہیں۔“
 نعل تاج - کراچی

ملاقات

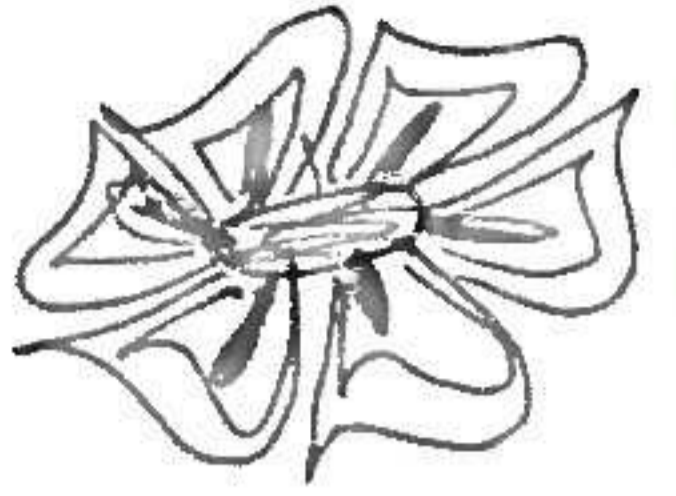
ایک صاحب پتی بانڈھے ہوئے جا رہے تھے۔ ایک شخص نے اس سے پوچھا۔
 ”جنریت تو ہے، یہ پتی کیوں بندھی ہے؟“
 ان صاحب نے کہا۔ ”میری کار سے ایک آدمی کو ٹکر لگ گئی تھی۔“

وہ صاحب بولے۔ ”تو پھر جوٹ تو اس آدمی کو لگنا تھی اور پتی بھی اس کے بندھی ہونا تھی؟“
 ان صاحب نے کہا۔ ”ہاں کل اس شخص سے میسر ہی ملاقات ہوگئی تھی۔“

گھر بلو ملازم

میدم کی ڈانٹ سن کر ملازم پکار اٹھا
 ہر چند سنگرزہ ہوں گو ہر نہیں ہوں میں
 لیکن سلام کیجئے مجھے سے ادب کے ساتھ
 نوکر ہوں آپ کا شوہر نہیں ہوں میں
 شہلا گلزار - کراچی





شگفتہ جاہ ملفوظات حضرت مولانا

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،
حضرت انس سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”بیماری کا متعدی ہونا کوئی چیز نہیں۔ بد فال کچھ نہیں، اور میں اچھی فال کو پسند کرتا ہوں“
قولائد مسائل۔۔

- 1- اہل عرب کسی کام کے لئے ملتے تو راستے میں بیٹھے ہوئے کسی پر بندے یا ہرن وغیرہ کو ٹکر مارتے اور دیکھتے کہ وہ کس طرف جاتا ہے۔ اگر وہ دائیں طرف جاتا تو کہتے کام ہو جائے گا۔ اگر بائیں طرف جاتا تو کہتے یہ کام نہیں ہوگا، یا اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔ اور کام کیے بغیر واپس ہو جاتے۔
- 2- اس انداز سے فال لینا شرعاً منع ہے۔
- 3- ہندوؤں اور جڑوں پر آنکلی رکھنا، طوطے سے فال نکلوانا اور اس قسم کے مختلف طریقوں سے فال نکالنا سب منع ہے۔
- 4- جائز فال صرف اس قدر ہے کہ بلا امداد کوئی اچھا لفظ کان میں پڑے اور انسان اس کی وجہ سے یہ امید رکھے کہ اللہ مجھے میرے مقصد میں کامیاب کر دے گا۔ اس میں سننے والے کے قصد و ارادے کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

الوجہل کا غرور توڑنے والے،

حضرت عبدالرحمن بن عوف فرماتے ہیں۔
”جنگ بد شروع تھی۔ میں نے میدان جنگ میں ادھر ادھر دیکھا، میرے دل میں بائیں دور کے معاذ اور معوذتے میں نے سوچا کہ تم کہیں لڑو گے جنگ میں کیا کریں گے اعدان کا کیا کردار ہوگا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک لڑکا میرے قریب آیا اور سرگوشی میں پوچھنے لگا۔
”چچا! وجہل کون سے اور کہاں ہے؟“
ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہ چاہتا ہے کہ اس بات کا

دوسرے لڑکے کو بتانا چلے۔ ابھی میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ دوسرا لڑکا بھی میری جانب دوڑتا ہوا آیا اور اس نے بھی وہی سوال کیا جو پہلے نے کیا تھا۔ میں حیران ہو کر ان دونوں بچوں کا منہ تک رہا تھا اور دل میں کہہ رہا تھا کہ ان بچوں کی الوجہل جیسے جنگجو کے رو برو کیا بسا طے ہے۔ خیر میں نے اشارے سے بتایا کہ وہ الوجہل ہے۔ بجلی کی تیزی سے یہ دونوں تناہیں پختے جیسے اودان کی آن میں کسی ایک بہاد جگجوؤں کے درمیان سے صفیں چیرتے ہوئے الوجہل پر پل پڑے اور اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ مصباح گل۔ سرگودھا

گناہ

حضرت ابن عباس فرماتے فرمایا۔
”اسے گناہ کرنے والے اگناہ کے لئے انجام سے مطہق نہ ہو جانا کیونکہ گناہ کرنے کے بعد بعض ایسی باتیں ہوتی ہیں جو گناہ سے بھی بڑی ہوتی ہیں۔ گناہ کرتے ہوئے نہیں اپنے دائیں بائیں کے فرشتوں سے شرم نہ آئے تو تم نے جو گناہ کیا ہے یہ اس سے بھی زیادہ بڑا گناہ ہے۔ تمہیں معلوم نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ کیا کریں گے اور پھر تم سننے ہو تمہارے گناہ سے بھی بڑا ہے اور جب تمہیں گناہ کرنے میں کامیابی حاصل ہو جاتی ہے اور تم اس گناہ پر خوش ہوتے ہو تو تمہاری یہ خوشی اس گناہ سے بھی بڑی ہے اور جب تم گناہ نہ کر سکو اور اس پر تم غمگین ہو جاؤ تو تمہارا یہ غمگین ہونا اس گناہ کے لئے سے زیادہ بڑا ہے۔ گناہ کرتے ہوئے ہوا کے چلنے سے تمہارے دروازے کا پردہ ہل جائے اس سے تم ڈرتے ہو اور اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے اس سے تمہارا دل پریشان نہیں ہوتا تو یہ کیفیت اس گناہ کے لئے سے زیادہ بڑا گناہ ہے۔ تمہارا بھلا ہو۔ کیا تم جانتے ہو۔

حضرت ابوہریرہ علیہ السلام سے کیا چونک ہوئی تھی جس کی وجہ سے اللہ نے ان کے جسم کو ایک بیماری میں مبتلا کر دیا تھا اور ان کا سارا مال ختم کر دیا تھا۔ ان سے چونک یہ ہوئی تھی کہ ایک مسکین پر ظلم ہو رہا تھا۔ اس مسکین نے حضرت ابوہریرہ سے مدد مانگی تھی اور کہا تھا کہ یہ ظلم رکوا دیں۔ حضرت ابوہریرہ نے اس کی مدد نہیں کی تھی اور ظالم کو اس مسکین پر ظلم کرنے سے نہیں روکا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں اس آزمائش میں ڈال دیا تھا۔

لمحہ فکر یہ

کیا یہ شرمناک بات نہیں کہ انسانوں پر خطیب حکومت کریں، جو لمبی تقریروں سے اس طرح سے گونجتے رہتے ہیں جس طرح سے پتیل کے برتن، جو ضرب گھٹکے بعد اس وقت تک گونجتے رہتے ہیں، جب تک ان پر کوئی ہاتھ نہیں رکھ دیتا۔
(افلاطون)
سمیرا ام۔ قمبر (سندھ)

مرحلہ در مرحلہ

ایک شاہی دعوت کے موقع پر بادشاہ سلامت نے اپنے وزیروں اور صاحبوں سے سوال کیا۔
”ہر چند کہ ہم نے ٹیکسوں میں اضافہ کر دیا ہے مگر اس کے باوجود سرکاری خزانے کی آمدنی میں اضافہ نہیں ہوتا۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟“

ایک وزیر نے دست بستہ عرض کیا: ”جہل پناہ! جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں؟“
بادشاہ نے فرمایا: ”کہو! کیا کہنا چاہتے ہو؟“
تب وزیر نے برف کا بڑا سا ٹکڑا ڈالا اٹھایا اور جوڑیز پیش کی کہ دعوت میں جتنے لوگ موجود ہیں، ان کے ہاتھوں سے گندے ہونے پر ڈالا بادشاہ سلامت تک پہنچے۔
اس طرح جب ڈالا ہاتھوں سے گرتا ہوا بادشاہ سلامت کی خدمت میں پہنچا تو وہ مہر کے دانے کے برابر ہوا گیا تھا۔
شمرہ شعیب بٹ۔ گوندلا نوالہ

اپنی تعظیم چاہتا،

دسویں عباسی خلیفہ المتوکل علی اللہ نے ایک دفعہ ملک کے بڑے بڑے علماء کو بغداد بلا بھیجا۔ جب سب علماء آگئے

اور ایک مجلس میں جمع ہوئے تو خلیفہ بھی اس کی مجلس میں شریک ہونے کے لیے آیا۔ ایک عالم کے سوا باقی سب علماء خلیفہ کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے۔ خلیفہ نے اپنے ساتھ آنے والے ایک کوزہ پر سے کھڑے نہ ہونے والے عالم کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

”کیا اس شخص نے ہماری بیعت نہیں کی؟“
وزیر نے جواب دیا: ”امیر المومنین! انہوں نے بیعت ضرور کی ہے مگر ان کی نظر کمزور ہے۔ اس لیے کھڑے نہیں ہوئے۔“

یہ سن کر وہ عالم دین جن کا نام احمد بن محمد بن معدی تھا، فرمایا: ”اے امیر المومنین! میری نظر بالکل درست ہے اور میں اچھی طرح دیکھ سکتا ہوں۔ میں اس لیے آپ کی تعظیم کے لیے کھڑا نہیں ہوا کہ آپ کو اللہ کے عذاب سے بچانا چاہتا ہوں شاید آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا علم نہیں ہے کہ جو شخص لوگوں سے یہ امید رکھے کہ وہ اس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوں وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنائے۔“

یہ سن کر خلیفہ چپ چاپ ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہ ڈرنے والے علماء پر زمانے میں موجود ہے ہیں۔ لیکن ایسے فرماں بردار بہت کم ہوئے ہیں جنہوں نے رعایا کے کسی فرد کی سچی اور کھری کھری باتیں برداشت کر لی ہوں۔
نمرہ، افسر اور کلرچی

یہ کائنات

یہ کائنات ایک حادثہ نہیں ہے۔ حادثے میں اس قدر حسن نہیں ہو سکتا کیونکہ حسن، حسن ترتیب کا نام ہے اور حادثہ کسی ترتیب کے بکھر جانے کا نام ہے۔

(واصف علی واصف)
مہوش ملک۔ گنگا پور

مطالعہ

مطالعے کی عادت ڈالنا ایک طرح سے تقریباً تمام دنیاوی غم و فکر سے نجات کے لیے اپنے لیے ایک پناہ گاہ تعمیر کرنا ہے۔ (سمرٹ ماہم)
شازیہ آصف ملک۔ جڈا نوالہ



ترک کا اطلاق،

آدم ثانی حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹے تھے۔ جن کے نام حام، سام اور یافث تھے۔ یافث کی اولاد میں ایک شخص ترک نامی ہوا اس کی اولاد چین و ترکستان میں پھیل گئی اور وہ سب ترک کہلائے۔ ترک بن یافث کی اولاد چین و ترکستان و چین وغیرہ میں خوب پھیل گئی تو انہوں نے امن و امان قائم رکھنے کے لیے ایک شخص کو اپنا سردار تجویز کرنا ضروری سمجھا۔ رفتہ رفتہ ان کے بہت سے قبیلے اور گروہ پیدا ہو گئے۔ ہر قبیلے اور گروہ نے اپنا اپنا ایک سردار بنایا اور یہ تمام سردار ایک سب سے بڑے سردار کے تحت سمجھے جاتے تھے لہذا ترک بن یافث کی اولاد کے ہر قبیلے پر ترک کا لفظ بولا جاتا ہے اور تمام باشندگان چین و ترکستان و چین "ترک" کہلائے۔

ماخوذ از: تاریخ اسلام - جلد سوم
مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی
اقراء امین - منڈو جان محمد

اخلاص،

بنو امیہ کے پانچویں خلیفہ عبدالملک کے ایک بیٹے کا نام مسلمہ تھا۔ وہ بڑا بہادر و دلاور تھا اور نہ صرف ہر قسم کے ہتھیار چلانے کا ماہر تھا بلکہ دشمنوں سے لڑنے کا فن بھی خوب جانتا تھا۔ اسی لیے والد عبدالملک نے اسے سب سے بڑے فوج کے ایک حصے کا سپہ سالار بنا دیا تھا۔

ایک دفعہ مسلمہ بن عبدالملک نے ایک رومی قلعے کا محاصرہ کیا لیکن کافی عرصہ گزر جانے کے باوجود قلعہ فتح ہونے میں نہ آیا۔ ایک دن مسلمہ فوج کے ایک خاص دستے کو ساتھ لے کر قلعے پر ایک زوردار حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ قلعہ میں موجود رومی فوج نے اس دستے پر تیروں اولاد گولہ کے گولوں کی بارش کر دی جس سے اس کے لیے آگے بڑھنا مشکل ہو گیا۔ اس وقت لوگوں نے دیکھا کہ ایک مجاہد جان بقیلی پرورد گھر تیروں اولاد گولہ کی بارش میں دیوانہ وار تعلق کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یہاں تک کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس نے جان کی بازی لگا کر دیوار میں نقب لگائی۔ یہاں تک کہ اس میں شگاف ہو گیا۔ اس انانی حملہ کرنے

دلا فوجی دستہ بھی دھالوں کی آڈ لیتا ہڈ مار کر قلعے کی دیوار کے نیچے پہنچ گیا۔ چند بہادروں نے اس شگاف سے قلعے کے اندر داخل ہو کر اس کا دروازہ کھول دیا۔ اب ساری فوج بکیر کے نعرے لگاتی قلعے میں داخل ہو گئی۔ رومیوں نے ہتھیار ڈال دیے اور قلعے پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

اب سارے لوگوں کی نگاہیں اس بہادر مجاہد کو تلاشی کر رہی تھیں جس نے جان پر کھیل کر قلعے کی دیوار میں نقب لگائی تھی لیکن کوئی اسے پہچانتا نہ تھا۔ مسلمہ نے پورے لشکر کو جمع کیا اور اس کے سامنے اعلان کیا کہ جس مجاہد نے قلعے کی دیوار میں نقب لگائی وہ سامنے آئے۔ لیکن اعلان کے جواب میں پورے لشکر پر ستانا چھایا اور کوئی بھی سامنے نہ آیا۔ اب مسلمہ نے بلند آواز سے کہا۔

"میں اس مجاہد کو اس کے رب کی قسم دیتا ہوں کہ وہ سامنے آجائے"

اچانک فوج میں سے ایک نقاب پوش (چہرے کو کپڑے سے ڈھانپے ہوئے) مجاہد آگے بڑھا۔ اس کی طرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ وہ مسلمہ کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور کہا۔

"اے امیر! نقب میں نے لگائی۔ اگر آپ مجھے رب کی قسم نہ دیتے تو میں کبھی اپنے آپ کو ظاہر نہ کرتا۔ اب یہی آپ کو رب کی قسم دیتا ہوں کہ مجھ سے میرا نام نہ پوچھیے گا اور اگر آپ کو معلوم ہو بھی جائے تو کسی کو نہ بتائیے گا۔ کیونکہ میں نے جو کچھ کیا اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے کیا۔ میں اس کام کا صلہ اللہ تعالیٰ ہی سے چاہتا ہوں اور کسی قسم کے انعام کی مجھے خواہش نہیں ہے۔"

مسلمہ اب خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد وہ جب دعا کرتا تو کہتا۔

"اللہ! مجھے نقب لگانے والے اس مجاہد کے ساتھ کر دیجیے گا"

راج نیتی،

دنیا میں صرف وہ قوم راج کرتی ہے۔ جو دلیل سے قائل ہو جاتی ہے۔ جو عذر کو قبول کر لیتی ہو۔ جو اختلاف رائے کو محفل کا حصہ گردانتی ہو۔

- 6 جو تحقیق کی مداح ہو۔
 - 6 جو تجربے کو ہمدرد ہم نشین رکھتی ہو۔
 - 6 جو سر پر عزت نفس کا کلمہ باندھتی ہو۔
 - 6 جو کوشش کے جوئے پاؤں سے لپٹائے رکھتی ہو۔
 - 6 جو قانون کو زندگی کی طرح عزیز رکھتی ہو۔
 - 6 جو مذہب کی مشعل ہاتھ میں لے کر چلتی ہو۔
 - 6 جو ہر دقاع کو سوچنے اور ہر بات کو مثبت کام کرنے کی آزادی دیتی ہو۔
 - 6 جو جید لوگوں کو حکمران رکھتی ہو۔
- نفس - صادق آباد

بڑے لوگوں کی سٹہری باتیں،

- دوست کی ناکامی پر غمگین ہونا اتنا مشکل نہیں جتنا اس کی کامیابی پر مسرور ہونا۔
- جوش اور ہوش بہت کم یکجا ہوتے ہیں لیکن جس میں یہ دونوں وصف موجود ہوں اسے کبھی لغزش نہیں ہوتی۔ (ایمرسن)
- میسر کرنا ایک صداقت ایک جامدیل طے شدہ امر نہیں۔ سچائی تغیر پذیر ہے جہاں یہ بڑھتی ہے وہیں بدلتی رہتی ہے۔ (ایمرسن)
- حسن سیرت بڑا بڑوں سے پرہیز کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ ذہن میں بڑائیوں کے ارتکاب کی خواہش نہ پیدا ہونے کا نام ہے۔ (برنارڈ شا)
- بد بختی کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے لیکن اپنی کوتاہیوں اور غلط کاریوں کا خمیازہ زندگی کو تلخ بنا دیتا ہے۔ (آسکر وانڈلڈ)
- ادھورا علم خطرے کا موجب ہوتا ہے۔ علم کے چشمے کا پانی میر ہو کر ہو یا پھر اس سے الگ ہی رہو، چند گھنٹے پینے سے آدمی مد ہوش ہو جاتا ہے میر ہو کر پینے سے دل و دماغ روشن ہو جاتے ہیں۔ (پوپ ایگننڈر)
- سیدہ نسبت زہرا۔ کہوڑ پکا

علم کے درجے،

حضرت فضیل ابن عیاض بہت عبادت گزار عالم

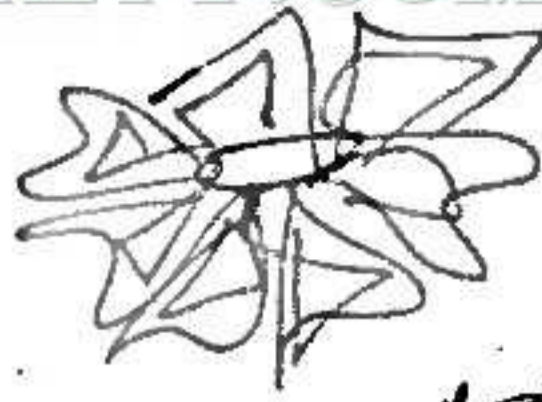
- تھے فرمایا کرتے تھے کہ علم کے پانچ درجے ہیں۔
- پہلا درجہ یہ ہے کہ آدمی خاموش رہتا سیکھے۔
- دوسرا درجہ یہ ہے کہ توجہ سے سنتا سیکھے۔
- تیسرا درجہ یہ ہے کہ جو کچھ سنتے اسے یاد رکھے۔
- چوتھا درجہ یہ ہے کہ جو کچھ معلوم ہو جائے اس پر عمل کرے۔
- پانچواں درجہ یہ ہے کہ جو علم حاصل ہو اسے دوسروں تک پھیلانے۔

قرہ احمدیٹ۔ پتوکی

مختصر مختصر،

- اگر کیفیت یا کیفیت نہ بھی میسر ہو تو بھی نماز ادا کرنا چاہیے۔ نماز فرض ہے کیفیت نہیں۔
- شکر و نعمت محفوظ ہو جائے گی، دست خوان کشادہ کر دو، لذت بڑھے گا۔ سجدہ کرو، تقرب ملے گا۔ عزت کرو، عزت ملے گی۔ صدقہ دو، بلائیں جلتے گی۔ توبہ کرو، گناہ معاف ہو جائیں گے۔
- انسان جس کیفیت اور عقیدے میں مرے گا اسی میں دوبارہ اٹھایا جائے گا۔ دعا کریں کہ وقت رحمت کلمہ نصیب ہو۔
- جو شخص اس لیے اپنی اصلاح کر رہا ہے کہ دنیا اس کو تعریف و عزت کرے، اس کی اصلاح نہیں ہوگی۔ اپنی نیکیوں کا صلہ دنیا سے مانگنے والا انسان نیک نہیں ہو سکتا۔ دیا کا لاس عابد کو کہتے ہیں جو دنیا کو اپنی عبادت سے مرعوب کرنا چاہے۔ (واصف علی واصف)
- شہادہ عنایت چغتائی۔ لہذاؤن





خالد جیلانی

دلگسٹوں میں دل لکھنا

سونیا ربانی کا قیام ہمیں پچھاڑ کے کیا حیثیت تمہاری تھی وہ جنگ تم نے بھی نہ جیتی جو ہم نے اری تھی ادب ہمیں بھی ایک شخص اچھا لگتا ہے گھٹے دلوں میں یہی کیفیت ہماری تھی

نمن چغتائی کا خیال شہروں کی دیواروں جیسے ہوتے ہیں کچھ چہرے اخباروں جیسے ہوتے ہیں کچھ لوگوں کو دیکھ کے منزل پائی ہے کچھ انسان ستاروں جیسے ہوتے ہیں

یسری فاطمہ لاہور اتنے بن مٹھن کے کب آپ آتے ہیں میرے گھر میں باخدا ادد کہیں آپ کو جانا ہو گا! آپ کے بیٹے تکلم سے عیاں ہے بالکل آپ نے پھر کوئی احسان چڑھانا ہو گا

صائمہ سعید فیصل آباد ڈالیے مت نقاب چہرے پر روشنی پر زوال آتا ہے! آئے تو عاجزوں پر ہی اکشر حاکموں کو جلال آتا ہے

بشری اقبال کراچی ذرتے خود دار ہوں تو پاس ان کے چل کے خود آفتاب آتے ہیں ظلم جب انتہا سے بڑھ جائیں لازماً انقلاب آتے ہیں

شازیہ اقبال ملک عزالی پارک حیت سے وہ برسوں کی ہوا بانہ رہے ہیں ہم کو تو بھر دسا نہیں آتے ہوئے دم کا

مقدس رباب بچوال آنکھیں مصروف ہو جاتی ہیں بھلا دینے ہیں لوگ بہت دور جا نکلنے ہیں منزلیں گنوا دیتے ہیں لوگ دست طلب اٹھا کے مانگتے ہیں محبت خدا سے جو ہو دسترس میں تو خود ہی گنوا دیتے ہیں لوگ

طیبہ کریم بخش بدین رخصت ہوا وہ تو میں نے دیکھا پھول اتنے بھی خوشنما نہیں تھے

خاسلم اعوان آخون ہانڈی بری پور ہزارہ تھا گیا ہے مسلسل سفر اداسی کا ادب بھی ہے مرے شانے پہ سرا داسی کا میں تجھ سے کیسے کہوں یاد مہرباں میرے کہ تو علاج نہیں میری ہر اداسی کا

ساجی چودھری منڈو آدم ریلو یا ہم پہ ہمیں کیا نہ کہیں گے دشمن آشنا جب تیرے پیغام سے جل جلتے ہیں جب بھی آتا ہے مرانا تیرے نام کے ساتھ جلنے کیوں لوگ میرے نام سے جل جاتے ہیں

شازیہ رحمن کراچی کسا ایسے کم سخن سے کوئی گفتگو کرے جو متفل سکوت سے دل کو لہو کرے تیرے بغیر بھی تو قیمت سے زندگی خود کو گنوا کے کون تری جستجو کرے

فاطمہ حسین اسلام آباد روز کی مسافت سے چور ہو گئے دیا پتھروں کے سینے پر تھک کے سو گئے دیا بچھ گئی ہیں قندیلیں خواب ہو گئے چہرے آنکھ کے جزیروں کو پھر ڈبو گئے دیا

قرنارہ سہیل میاں چنوں حال دل تو کھل چکا اس شہر میں ہر شخص پر ہاں گھراس شہر میں آگ بے خبر بھی دیکھنا جب گزر جاؤ سسکتی بستیاں سے ایک دن قرینہ جاں میں بھی آنا یہ نگر بھی دیکھنا

دخشاں بی چوناہ شہر کی دُھوپ سے بوجھیں کبھی گاؤں طلے کیا ہوئے لوگ وہ زلفوں کی گھاؤں والے اب کے بستی نظر آتی نہیں اجڑی گلیاں اڈ ڈھونڈیں کہیں درویش دعاؤں طلے

ام عمیرہ ڈنگ روڈ کراچی کوئی موسم ہو دل میں ہے تمہاری یاد کا موسم کہ بدلا ہی نہیں جانا تمہارے بعد کا موسم نہ کوئی موسم خزاں کہے نہ خواہش ہے بہار دل کی ہمارے ساتھ ہے امجد کسی کی یاد کا موسم

عائشہ رانا خانیوال شام ہوتے ہی یادیں اُتر آتی ہیں جیسے جڑیاں کہیں دور سے گھر آتی ہیں دھڑلے جاتی ہیں اک خواب ہوا نہیں ادب ایک ہی شخص کی ویلینز پلکھ آتی ہیں

سلی ملک قاد پور نہ دید ہے نہ سخن، اب نہ حرف ہے نہ پیام کوئی بھی حیلہ تسکین نہیں اداس بہت ہے امیند یار، نظر کا مزاج، درد کا رنگ تم آج کچھ بھی نہ پوچھو کہ دل اداس بہت ہے

ندنا شہید شیرازی جڑوالہ مجھ سا جہاں میں کوئی نادان بھی نہ ہو کر کے جو عشق کہتا ہے نقصان بھی نہ ہو دونا تو یہی ہے کہ اسے چاہتے ہیں ہم سعد جس کے ملنے کا امکان بھی نہ ہو

نمرہ افسانہ کراچی پہلے شکوہ تھا یہاں کوئی رونق بازار نہیں اب جو بازار کھلے ہیں تو خسریا نہیں سب کے ہاتھوں میں یہاں زہر کا پیالہ ہے مگر کوئی سچ بولنے کے واسطے تیار نہیں

عقیدہ گبانہ حجرہ شاہ معین مجھے اچھا لگے محسن اسے پا کر گنوا دینا

عفت جبین فیصل آباد کالج کنواری عمروں کو جب مٹی میں دل جاملے پھر کیوں رضایہ پل بھر کے میلے لپٹے گئے ہیں

امبر گل جھنڈ (سندھ) میری گفتگو کے گلاب سے ہو دلوں میں ایسی شگفتگی کوئی ایسی نکہت خاص ہو کہ ہلک اٹھیں دروہام سے میری آرزو ہے کہ موم ہوں کبھی ان کے دل بھی میرے لیے جہیں پیر ہے میری ذات سے جو ہیں بدگماں جہ نام سے

اسماء عروج گھوٹکی دل بھی بچھا ہو شام کی پرچھائیاں بھی ہوں مرجائے جو ایسے میں تنہائیاں بھی ہوں ہر سخن سادہ لوح نہ دل میں اُتر سکا کچھ تو مزاج یار میں گہرائیاں بھی ہوں

فوزیہ رحیم کوٹ ادو نکا ہیں بولتی ہیں بے ستماشا محنت پاگلوں کی گفتگو ہے نکل آئے وہ میرے پاس شاید تجھے کس شے کی اتنی جستجو ہے

شازیہ رانا دیپال پور تیری نفرتیں بھی عجیب تھیں تیرا فیض بھی تھا کمال پر کبھی سب کچھ ملا بسنا طلب کبھی کچھ نہ ملا سوال پر

ثمینہ شیخ منڈی پنجاب ہم لوگ تو خوشبو کی طرح ہیں تیرے اطراف ہم سادہ دلوں سے تو سیاست نہیں کرنا میں خود کو میسر نہیں آیا ہوں ابھی تک تم سے بھی نہ مل پاؤں تو حیرت نہیں کرنا

شاعری سچ بولتی ہے

سمیعہ لیاقت

اجدا سلام اجد کی غزلوں کی خوبصورتی سے کون انکار کر سکتا ہے۔ ان کے مجموعہ کلام "اتنے خواب کہاں رکھوں گا" سے ایک خوبصورت غزل قارئین کی نذر ہے محبت کا سلسلہ کچھ اور درد کچھ اور ہے دو کچھ اور غم کا صحرا عجیب صحرا ہے جتنا کالما یہ بڑھ گیا کچھ اور

عمر ساری تضاد میں گزری ہو نا کچھ اور سوچنا کچھ اور کیسی قسمت ہے آنکھ والوں کی ہر تماشے میں دیکھنا کچھ اور بھیڑ میں آنسوؤں کی سن نہ سکا تم نے شاید کہا تو تھا کچھ اور دل کسی شے پہ مطمئن ہی نہیں مانگتا ہے۔ آرزو ہا، کچھ اور

تیرے غم میں حساب عمر رواں جتنا جوڑا، بکھر گیا کچھ اور

یہ تو اصولِ فطرت ہے کہ دکھ کے بیچ وہیں جان بکرتے ہیں جہاں توقعات کے دریا ٹھانٹیں ہاتھ نظر آتے ہیں۔ جہاں بہت زیادہ توقع اور مان ہو وہیں دل کا کاغذ پیالہ ہر دم میں ٹوٹتا ہے۔ یونہی ہنسی ہنسی میں ہم دلوں سے کیل جاتے ہیں کوئی چھوٹی سی ٹیکس بات کوئی چھتا ہوا جملہ کوئی زہر آلود لہجہ

زندگی میں بعض لمحے ایسے بھی آتے ہیں جب دل کا بوجھ بہت بڑھ جاتا ہے۔ ایسے میں شاعری مونس و غمگسار کی حیثیت سے ساتھ دیتی ہے۔ دلدل دکھ، پھین اور بے گلی نے جب لفظوں کا خوبصورت پیرا میں زیب تن کیا تو شاعری نے جنم لیا۔ ابتدا ایک خوبصورت شعر سے۔ سب بانوق بہنوں کے لیے۔

کھول یوں مٹھی کہ اک ملک تو نہ نکلے ہاتھ سے آنکھ کو ایسے جھپک کہ کوئی اوجھل نہ ہو پہلی سیرھی پہ قدم رکھ، آخری سیرھی پہ آنکھ منسزلوں کی جستجو میں، راتیں گال کوئی پل نہ ہو

آج کے تیز رفتار زمانے میں جدید ٹیکنالوجی نے ناصیے تو سمیٹ لیے ہیں لیکن دلوں میں فاصلے بڑھا دیے ہیں۔ بہت سے لوگوں کے دلوں کی ترجمانی کرتی ہوئی نڈا فاضلی کی بہت خوبصورت غزل۔

کبھی کسی کو مکمل جہتوں نہیں ملتا کہیں زمین تو کہیں آسماں نہیں ملتا

جسے بھی دیکھیے وہ اپنے آپ میں گم ہے زباں ملی ہے مگر ہم زباں نہیں ملتا

بچھا سکا ہے بھلا کون وقت کے شعلے یہ ایسی آگ ہے جس میں دھواں نہیں ملتا

تیرے جہان میں ایسا نہیں کہ پیار نہ ہو جہاں امید ہو اس کی، وہاں نہیں ملتا

کوئی بے خبر سی ذومعنی بات سننے والے کے دل پر گھاؤ لگا جاتی ہے پھر کہتے ہی تلافی کے سرجم لگاؤ قطرہ قطرہ خون چکلتا ہی رہتا ہے وہ آنسو جو آنکھ سے گرتا ہی نہیں اندر ہی اندر جم جاتا ہے برف برزے موم کے قطرے کی طرح اور وہ برف تو شاید وقت کی گرمی سے پگھل جاتی ہے مگر وہ قطرہ جب پگھلنے لگتا ہے پھیل جاتا ہے، بڑھ جاتا ہے اور یونہی ہنسی ہنسی میں ہم دلوں سے کیل جاتے ہیں

عالم انسانی پر کچھ عجیب وقت ٹھہر گیا ہے۔ چہاں سو پھلی دھندانی دبیز ہے کہ آنے والے کل کا چہرہ دیکھنا دشوار ہوا جا رہا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ انسان کہاں کھڑا ہے۔ عجیب بے یقینی، لامکانی اور حیرانی کا عالم ہے۔ اس آج اسے آنے والا ہر کل خوفزدہ ہے۔ اس خوف کی گونج فراق گورکھ پوری کی اس غزل میں بازگشت پائی ہوئی ہے۔

وہ سراٹھائے موج فنا آ رہی ہے آج کانوں میں زلزلوں کی دھمک آ رہی ہے آج

اک موج درد سینے میں لرزاں ہے اس طرح ناگن سی جیسے شیشے میں لہرا رہی ہے آج

بیتے بگلوں کی چھاؤں ہے امروز پر فراق ہر چیمیزاک فسانہ ہوئی جا رہی ہے آج اور ایک خوبصورت شاعر۔

اندھیروں کو برا کہنے سے کچھ نہیں ہوگا اپنے حقے کا دیا خود ہی جلانا ہوگا

بشرِ بد کے اس شعر میں جو محدودی ہے جو تشنگی ہے اس کو بڑھ کر دل ڈوب سا جاتا ہے۔ خدا کی اتنی بڑی کائنات میں، میں نے بس ایک شخص کو مانگا کافی مجھے نہ ملا

اب ایک ایسی نظم جس میں غلوں کی جاشنی گھٹی ہوئی ہے جو بے اختیار یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے کہ کاش یہ سچ ہو "فرحت عباس شاہ کہتے ہیں۔

کبھی کبھی ایک شدید خواہش

جو کسی کے گھر چلتے ہیں جس کے گھر کے دروازے پر دربانوں کا راج نہ ہو جس کے گھر نوں جانے میں ہم کو کوئی لاج نہ ہو جس کے گھر کی دیواروں پر

اکتاہٹ کا رنگ نہ ہو جس کے ہونٹوں پر خوشبو ہو جس کی پیشانی کشادہ ہو لیکن جس کا سینہ تنگ نہ ہو جس کی روشن روشن آنکھیں ہم کو دیکھ کے کھل جائیں اتنی خوشی سے وہ طے ہم کو جیسے صدیوں کے پھڑے دو دوست اچانک مل جائیں چلو کسی کے گھر چلتے ہیں

اب کچھ آپ کو اپنا تعارف بھی کر دیتے ہیں۔ نام وہی ہے جو آج سے اٹھارہ اسی سال قبل ہمارے والدین نے رکھا تھا یعنی سمیعہ لیاقت اور رہنے کا اعزاز تختا ہے ہم نے ضلع قصور کے ایک پیالے گاؤں "تھروڈانہ" کو۔ بی۔ اے کے پیر دیے ہوئے ہیں اور رسائل و ذرائع کتب میں کچھ لکھے ہوئے ہیں۔ ہر قسم کے مطالعہ کو فرض اولین سمجھتے ہیں۔ جو اور جیسے دو کو اپنا اصول سمجھتے ہیں۔ آج کل فارغ ہیں اور ذمہ اعلیٰ کے قوال کام اور کام پر عمل کرتے ہوئے کام ہی کرتے رہتے ہیں جن میں گھر کے کام کاج کے علاوہ ادھر ادھر سے لگنے والے کام بھی شامل ہے۔



رضیعیل حیات

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37- اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
Shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔
آپ کی عافیت اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔
اللہ تعالیٰ ہم کو 'ہمارے شکر کو' ہمارے پیارے ملک کو
دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھے۔ اور وہ لوگ جو پاکستان
کے دشمن ہیں اسے توڑنا چاہتے ہیں۔ انہیں نیست و نابود
کر دے۔ آمین۔

اب آتے ہیں آپ کے خطوں کی طرف۔
بیگم عائشہ فیاض بغیصل آباد سے تشریف لائی ہیں۔
آج کل چیزیاں داجنبہ، ہائل کے گھر آنگن میں اتر اہوا
ہے۔ سو شہ روز میں عجیب سا شمار ہے۔ امی کی گود میں
سر رکھ کر لیٹنا، اتنا اچھا تو کبھی کتوار اپنے میں بھی نہیں لگتا
تھا۔ جتنا سکون اب لگتا ہے۔

ابھی تو جاتی بہار کے پھول باقی ہیں۔ کیا ہو تا جو انہی کے
زور سے جی سنوری، کوئی کاشن کا ہلکے رنگ کا جوڑا اپنے
دو تیزہ کو لیا جاتا۔

کنیز نبوی، اتنا اچھا نام اور ایسا پیارا کام 'سندھ' میرا پہلا
عشق، میرے خوابوں کی زمین کا سب سے حسین پڑاؤ، کنیز
تمہارے لکھے ہر لفظ کو اول روز سے میری آنکھیں چوم کر
پڑھتی ہیں کہ مجھے ان میں 'اپنے سندھ کی خوشبو آئی ہے'
محبت کی مٹھی اور سوندھی خوشبو، میں کبھی سندھ نہیں گئی
لیکن پھر بھی 'بند آنکھوں سے جان تھی ہوں پانچ دریاؤں
کے سنگم سے بنا سندھ ہو دیا اپنی لہروں میں تصوف کے کیسے
راز چھپائے ہوئے ہے۔

"آنکھیں وہی رکھو جس سے محبوب حقیقی کا دیدار کر
سکو۔ کسی دوسرے کی طرف مت دیکھنا کیونکہ محبوب حقیقی
بہت غیرت مند ہے۔"

کاش کہ ہم اس بیت کو سمجھ لیں ورنہ اس دنیا کا عشق
جتنا بھی شدید ہو انجام کرناک ہی ہو گا۔ سندھیا شاہ کی
طرح۔ فائزہ افتخار نے کہانی کو ایسا موڑ دیا ہے کہ اب تو گل
سے دوبارہ ہمدردی ہونے لگی ہے۔ دیوارِ شب میں 'عالیہ
نے انتہائی غریب گھرانوں کے مسائل کو مؤثر انداز میں بتایا
ہے۔ ہاں معاذ اور جو یا کی معصوم سی محبت، مجھے بے حد
اچھی لگتی ہے۔

"دس فیصد" ایک ایسا سبق جو میری نانی اماں نے ہمیشہ
خود بھی یاد رکھا اور آج ان کی تیسری نسل تک اس سے
مستفید ہو رہی ہے۔ بات ہے دل کے پورے یقین اور

نیک نیتی کی۔ اسماء قادری کا آشنایاں کیا کیا جانے کیوں
دل کو چھوتے چھوتے رہ گیا۔ شاید حازق اور شارق آپس
میں گڈنڈ سے ہو گئے تھے، برامت ماننا اسماء میں جانتی ہوں
تم اس سے بھی کہیں زیادہ اچھا لکھ سکتی ہو۔ نا!

قائمتہ رابعہ، ہمیشہ کی طرح 'خاموشی سے میرا ہاتھ نوم لہ
اللہ جی کے سامنے کھڑا کر دیتی ہیں کہ لو 'اب کو' جو بھی کہنا
ہے۔ دل کی ہر بات، آنکھ کا ہر خواب اور سانس کا ہر دھڑکا
اس سے جو تمہیں بے حد حساب چاہتا ہے۔

* عائشہ! خوب صورت انداز میں تبصرے کا شکریہ۔
حیرت ہے کہ ابھی تک آپ نے کہانیاں لکھنے کی طرف توجہ
نہیں دی۔ خود احساس نہیں ہوا تو کیا کسی اور نے بھی
احساس نہیں دلایا؟ ہمارا خیال ہے کہ آپ لکھنے کی فطری
صلاحیت رکھتی ہیں۔ اس طرف توجہ دیں۔
آپ کی تعریف و تہنید متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے
ہیں۔

آئندہ تبصرے کے ساتھ ساتھ آپ کی کہانیوں کا بھی
انتظار رہے گا۔

مسز عنبر سعید، ٹاؤن شپ لاہور سے لکھتی ہیں۔
مئی کا شمارہ ہاتھ میں ہے۔ ٹائٹل پیارا تھا۔ محمود ریاض
صاحب سے باتیں کرتے ہوئے تو میں ایک پل کو بالکل
بھول گئی کہ یہ شخصیت اب ہم میں نہیں۔

"دس فیصد" بلاشبہ ایک اچھا افسانہ تھا۔ صبحی جیسے
لوگ جو تنگی میں بھی دس فیصد کا خیال رکھتے ہیں وہ ہمیشہ
کامیاب ہوتے ہیں اور خالہ جی جیسے خوار۔ لو جناب! اب
ہم "زرد موسم" پر پہنچے تو حیرتوں کے پہاڑ ہمارے راستے
میں کھڑے تھے، پہلی حیرت ایمین اچھی بیوی بننے کی
کوشش کر رہی ہے۔ تو ساتھ ہی کسی کافون اور بڑا دے کر
جانا حیران کر گیا۔ "دای ڈھولن یار دی" میں گل پر بہت
ترس اور یاسر پر بہت غصہ آیا، ساتھ ہی چھوڑ پر پہلے غصہ اور
آخر میں ہمدردی۔ آگے دیکھیے کیا ہوتا ہے۔

سب سے آخر میں ذکر کروں گی اپنے پسندیدہ ناول
"تفنگی کا سفر" کا۔ پیارے صوبہ سندھ کے باسیوں پر مشتمل
کہانی سندھ کی یاد تازہ کر گئی۔ میں آپ کو ایک بات بتاؤں
پیداہنی طور پر میرا تعلق سندھ سے ہے اور بچپن سندھ
ہی میں گزرا۔ بعد میں کچھ وجوہات کی بناء پر لاہور آگئے۔
اب بھی سندھ کے حوالے سے کوئی کہانی 'ناول' یا ڈرامہ
واپس اپنے گونڈ لے جاتا ہے۔ ناول بڑھ کر اپنا وہ بڑا سا گھر
بے اختیار یاد آیا اور وہ اسکول جہاں ہم کے درخت اور
لسوڑی کے نیچے بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔ وہ دن یاد آئے۔

بہر حال شاہ عبداللطیف بھٹائی کے بیٹوں پر مبنی یہ ناول
بہت اچھا رہا، بس انجام کچھ الجھا سا لگا۔ سمجھ میں نہیں آیا
کہ کراڑ جھیل پر ماروی گئی یا سندھیا اور ماروی کو کس سے
محبت ہوئی؟

* پیاری عنبر! ماروی کو کس سے محبت ہوئی؟ یہ آپ کنیز
نبوی کے آئندہ ناول میں جان لیں گی۔ جب ماروی کی کہانی
شائع ہوگی۔ کراڑ جھیل کے کنارے ماروی ہی گئی تھی
سندھیا نہیں۔

شعاع کی محفل میں شرکت کا شکریہ۔ امید ہے آئندہ
بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔
ٹڈو محمد خان سے صاعقہ جیلانی شریک محفل ہیں۔

سب سے پہلے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری
باتیں پڑھیں جو میرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ کنیز نبوی کا مکمل
ناول زبردست تھا۔ کہانی طویل ہونے کے باوجود دلچسپ
رہی! انہوں نے سندھ کی ثقافت اور ماحول کی بہت اچھی
طرح عکاسی کی 'خاص طور پر چیچی کا کردار بہت خوب
صورت تھا۔ اللہ اور اس کے حبیب کا عشق ہی سچا عشق
ہے، بندے کا عشق تو لا حاصل ہوتا ہے۔ شاہ لطیف کے
بیٹوں کو انہوں نے بہت خوب صورتی سے ناول میں
استعمال کیا۔ شاہ سائیں کی شاعری کا لفظ لفظ بھید ہے۔ بندہ
اس کی گہرائی میں جا بے تو دنیا کا بھید پالیتا ہے۔ نور العارفین
جیسے مرد ہمارے معاشرے کا حصہ ہوتے ہیں۔ اسماء قادری
کا مکمل ناول بھی بہت اچھا لگا۔ باقی افسانے بھی اچھے تھے۔

* پیاری صاعقہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ کنیز
نبوی اور دیگر مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے
ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر
اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

ایڈووکیٹ مدیحہ عدنان، راولپنڈی سے لکھتی ہیں۔
عالیہ بخاری کے ناول میں سالار کا کردار پر اسرار سا لگا۔
ہمارا اندازہ ہے کہ خیام کا تعلق کہیں نہ کہیں زویہ کے
والد سے ہو گا۔ "زرد موسم" میں شاید مومو کی صورت میں
قدرت نے مہر النساء سے انتقام لینے کی ٹھانی ہے۔ کنیز نبوی
کے ناول میں کچھ باتیں اوھوری رہ گئیں۔ ماروی کے باپ
اور اس کی ماں کے متعلق شروع میں ذکر کر کے بعد میں کچھ
نہیں بتایا گیا۔ مرتضیٰ کے اغوا کے متعلق بھی کچھ نہ بتایا گیا
کہ اسے کس نے اور کیوں اغوا کیا تھا۔ بہر حال ناول میں
تصوف کی جھلک نظر آئی جس نے ناول کو خوب صورت بنا
دیا۔ اسماء قادری کی کہانی کی وہی پرانی تہمید تھی۔ ثانیہ اور
دانیہ کے ناموں کی از حد مماثلت نے کہیں کہیں کنفیوژ
محبت ہوئی؟

بھی کیا۔

☆ پیاری مدیحہ! خوش آمدید، مرتضیٰ کو کسی نے غلط فہمی میں اغوا کر لیا تھا، وضاحت ناول میں موجود بھی تھی شاید آپ نے توجہ نہیں دی۔ ماروی کی کہانی علیحدہ مکمل ناول کی صورت شائع ہوگی۔

نامعلوم شہر سے ایسا مسکان سعید نے لکھا ہے۔
گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ لکھنے کی خواہش میرے اندر ننھی سی کوپیل سے تادور رخت بنتی جا رہی ہے۔ آپ کے کوئی بھی رسالہ نہ دینے کے باوجود بھی بہت بہت اور صبر سے اس وقت کا انتظار کر رہی ہوں جب میرا کچھ لکھا ہوا اشعار میں جگہ پائے گا۔

☆ ایسا! دعائیں۔ بہت نہ ہارنا ہی اصل کامیابی ہے۔ کوشش کرتی رہیں ان شاء اللہ ضرور کامیاب ہوں گی۔

اینلا کلثوم، آزاد کشمیر سے تشریف لائی ہیں۔

حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبول بہت پیاری تھی۔ ”پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں“ پڑھ کر ایمان کو تازہ ہوا کا جھونکا ملا۔ بڑے عام فہم انداز میں قائل و مقول کے بارے میں لکھا گیا۔

”مقتول کے وارث اگر قاتل کو معاف کر دیں تو کیا دنیاوی سزا کے ساتھ آخرت کی سزا بھی معاف ہو جاتی ہے؟“

سلسلے وار ناولز میں سب سے پہلے ”زرد موسم“ راحت جبین کا ناول پڑھا، موجودہ ناولز میں سے یہ میرا فیورٹ بلکہ ہارٹ فیورٹ ناول ہے۔ جبین سسٹرز کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ ایسے جان دار انداز میں منظر نگاری کرتی ہیں کہ ایک ایک لفظ ایک ایک سین آنکھوں کے سامنے پھرنا نظر آتا ہے۔ ایک اور بات مجھے اس ناول نے ابھی تک ذرہ برابر بور نہیں کیا۔ اور نہ ہی بے جا طوالت کا شکار محسوس ہوا۔

”دیوار شب“ عالیہ بخاری کے ناول میں زویہ اور سلیمان نے جلد ہی اپنا آپ دکھا دیا۔ اور نامعلوم لاش یقیناً ”روزی کی ہوگی۔ مکمل ناولز میں اسماء قادری کا ”آشنائیاں کیا کیا“ حازق صاحب کا وہی روایتی انداز پہلے شدید نفرت پھر اچانک معلوم ہوا کہ جدید احساسات میں یہ

”دیوار شب“ عالیہ بخاری کے ناول میں زویہ اور سلیمان نے جلد ہی اپنا آپ دکھا دیا۔ اور نامعلوم لاش یقیناً ”روزی کی ہوگی۔ مکمل ناولز میں اسماء قادری کا ”آشنائیاں کیا کیا“ حازق صاحب کا وہی روایتی انداز پہلے شدید نفرت پھر اچانک معلوم ہوا کہ جدید احساسات میں یہ

شدید محبت کا پہلا وار ہوتا ہے تو جھٹ سے عشق کا بخار چڑھ گیا۔ اور ثانیہ بی بی کیسے مس بے خبر بنی ”شارق ٹرسٹ“ میں مدرٹریا بنی رہی۔ دانیہ بیگم سر جھاڑتے پھاڑتے صحران کی خاک چھاننے بیٹھ گئی۔ اور ناول کے آخر میں تو حازق صاحب نے معصومیت کے سارے ریکارڈ ہی توڑ ڈالے۔ فنکشن شیرازی ہاؤس میں منعقد ہے اور صاحب بہادر کو خبر ہی نہیں۔ کنیز نبوی کا ”تشنگی کا سفر“ ہمارے لیے بھی تشنگی چھوڑ گیا۔ میں ماروی کو بیرون سمجھتی رہی۔ اور اس کی والدہ کی ٹریجڈی کو ختم کیے بغیر ناول ختم ہو گیا۔ زہرہ ممتاز کا ناولٹ ”اندھیرے میں اجالا“ اچھی کاوش تھی۔

افسانوں میں قاتلہ رابعہ کا ”احسان“ بس اچھا تھا۔ متعامل تادوش کا ”مکانات عمل“ ایک زبردست تحریر تھی۔ سبق آموز اور قدم قدم پر یاد رکھنے والی اس ماہ کی سب سے اچھی تحریر (میرے مطابق) سیما بہت عاصم ”دس فیصد“ کے ساتھ سو فیصد تھی۔ جتنی تعریف کروں کم ہے۔ زبردست بہت ہی زبردست۔

انٹرویوز میں ایف ایم 101 کے صداکار سجاد نواز کی باتیں پسند آئیں۔ ایف ایم کے صداکاروں سے انٹرویوز کا یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔

محمود ریاض صاحب سے ناصرہ تنسیم کی ماضی میں ہونے والی ملاقات کا احوال پڑھا۔ اتنے بڑے انسان اور اتنی عاجزی۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے (آمین ثم آمین)

آپ سے ایک درخواست ہے کہ آپ برصغیر پاک و ہند کے ادب دوست خواتین و حضرات جو آج سے پچاس سال قبل ادب کو زندہ رکھے ہوئے تھے ان کے لیے گئے عرصہ قبل کے انٹرویوز ان کی تصاویر کے ساتھ ایک بار پھر سے شائع کریں۔

☆ اینلا! آپ کی تجویز نوٹ کر لی ہے۔ ہم نے خواتین ڈائجسٹ کے آغاز میں جن ادبوں کے انٹرویوز شائع کیے ہیں۔ وہ انٹرویوز اس سلسلے میں شامل کیے جاسکتے ہیں۔

کنیز نبوی کے ناول میں آپ کو تشنگی اس لیے محسوس ہوئی کہ ماروی کی کہانی ابھی لکھی ہی نہیں گئی ہے۔ کنیز نبوی ماروی کی کہانی لکھ رہی ہیں۔ یہ مکمل ناول کی صورت شائع ہوگی۔ اگر اسی ناول میں شامل کی جاتی تو ناول ”

تسطوں پر محیط ہو جاتا۔

اگر مقتول کے وارث قاتل کو معاف کر دیں تو دنیاوی سزا کے ساتھ آخرت کی سزا بھی معاف ہو جاتی ہے کیونکہ جن گناہوں کا تعلق بندے کے ساتھ ہے یا ان سے کسی بندے کو نقصان پہنچا ہے تو وہ گناہ اسی صورت معاف ہو سکتا ہے جب پہلے بندہ معاف کرے۔

ثمینہ نازویشانی، فتح جنگ (انک) سے شریک محفل ہیں۔
”زرد موسم“ میں ایمین کا کردار مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ ”وای ڈھولن یاروی“ فاترہ افتخار کا بڑا زبردست چل رہا ہے۔ میری خواہش ہے کہ میں کوئی ناول یا افسانہ لکھ کر بھیجوں کیا آپ شائع کریں گے؟

☆ پیاری ثمینہ! اشعار کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ کا تبصرہ کچھ ادھورا سا لگا۔ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ آئے گا۔

کہانی بھجوانے کے لیے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے فوراً بھجوائیں۔ اچھی تحریروں کے ہم ہمیشہ منتظر رہتے ہیں۔

حافظ آباد سے نوشی چوہدری لکھتی ہیں۔

مجھے شعاع پڑھتے ہوئے تقریباً 10 سال ہو چلے ہیں اور آج میں فخر سے کہہ سکتی ہوں حقیقی معنوں میں زندگی کو برتاؤ رشتوں کی نزاکتوں کو نبھانا مجھے شعاع نے سکھایا ہے۔ شعاع بلاشبہ زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتا ہے۔

فرحت اشتیاق، فاترہ، نمبر، زرخسانہ نگار، عمیرہ اور تازہ اضافہ ہیں نمبر احمد۔ یہ تمام رائٹرز میری ہاٹ فیورٹ ہیں۔

مسی کے شمارے کا ٹائٹل بس ایویں سا ہی تھا۔ ”زرد موسم“ بہت ہی رنگ رنگ کے چل رہا ہے۔ راحت جی سے درخواست ہے تھوڑا پیٹرول ڈالیں۔

”دیوار شب“ کی کہانی بھی رفتہ رفتہ واضح ہو رہی ہے۔

عالیہ جی کردار نگاری خوب کرتی ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر ناول اپنا سحر طاری کرنے میں ناکام ہے۔

مکمل ناول ہمیں اسماء قادری کا بہت پسند آیا۔ اسماء قادری کا طرزِ تحریر خوب ہے۔

”ڈھولن یاروی“ میں ہماری تمام تر ہمدردیاں گل کے ساتھ ہیں۔

زہرہ ممتاز اور سیما بہت عاصم ہمیشہ کی طرح بہترین تحریر لائیں۔ آبی پیلر، تنزیلہ ریاض کو کہیں سے ڈھونڈ لائیں اور انیسہ سلیم سے کہنا ہے کہ ہم ”ہمارا ایش ہے ترک رسوم“ کی صورت ان کے قلم کی کاٹ اور بولانی کے منتظر ہیں۔

☆ نوشی! تفصیلی تبصرہ کے لیے شکریہ۔ آپ کی تجویز نوٹ کر لی ہیں۔ تنزیلہ ریاض اور انیسہ سلیم تک آپ کی فرمائش ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہیں گی۔

امبر گل، بھٹنڈو سے تشریف لائی ہیں۔

ہم نے تو بہت کوشش کی اور کئی حد تک کامیاب بھی رہے۔ مگر اس بار شائع ہونے والے ایک ناول نے ہماری ساری مختوں پر پانی پھیر ڈالا ہے۔ بقول شاعر۔

تجھے بھول جانے کی کوششیں کبھی کامیاب نہ ہو سکیں تیری یاد شاخ گلاب ہے، جو ہوا چلی تو چل اٹھی! بالکل یہی حالت ہوئی تھی ہماری بھی جب ہم نے خوب صورت دل اور خوب صورت سچے جذبے رکھنے والی سوٹ کنیز نبوی کا پیارا سا ناول پڑھا تھا ”تشنگی کا سفر“ کو پڑھ کر ایک طویل عرصے بعد ہماری بھی تشنگی دور ہو گئی اور ہمارا دل، ذہن اور روح بے ساختہ چلائے کہ اب چھوڑو تم اپنی انا کو مارو گولی اور اس پیاری رائٹرز اور تحریر کی تعریف نہ کی تو ان کے ساتھ یہ زیادتی کرو گی، سو قلم تمام لیا ہے، محبت جیسے عام اور پرانے موضوع پر بہت سے لوگ لکھ رہے ہیں، مگر کنیز جی نے جس طرح اپنی دھرتی سے اپنی

اعتذار

ناولٹ ”وای ڈھولن یاروی“ اختتامی مراحل میں ہے۔ کہانی میں تجسّس عروج پر ہے اور قارئین بے چینی سے قسط کی منتظر ہوں گی لیکن بے حد افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ فاترہ ناسازی طبع کے باعث اس ماہ قسط نہ لکھ سکیں۔ ان شاء اللہ آئندہ ماہ ناولٹ ”وای ڈھولن یاروی“ کی قسط شامل اشاعت ہوگی۔

محبت کا ثبوت پیش کیا ہے وہ قابل تعریف اور قابل محبت ہے۔

مجھے بہت بہت محبت فخر محسوس ہوا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ وہ آئندہ بھی ایسی تحریریں لکھتی رہیں اور یہ بات بھی ان کی بہت پسند آئی تھی کہ انہوں نے اپنے ناول کے ذریعے جو سبق دیا ہے۔ وہ بھی اتنے اچھے طریقے سے کہ

جس کی تعریف لفظوں میں ممکن نہیں۔ میں اس ناول کو اور لکھنے والی کو ابی شاد اللہ تعالیٰ ماعز نہ بھلاؤں گی۔

بیاد محمود ریاض کو پڑھا تو اچھا بھی لگا اور دل اس بھی ہوا یہ سوچ کر ایک اتنا اچھا انسان اب ہمارے درمیان نہیں ہماری پیاری مصنفہ راحت جنہیں کے ناول کے بارے میں کچھ لوگوں نے سست روی کی شکایت کی ہے اگر یہ طوالت نہ اختیار کرتا تو پھر کہا جاتا کہ جی کچھ تشنگی سی رہ گئی ناول میں پلیر اپنے تبصروں میں تنقید مثبت انداز میں کریں۔

☆ پیاری امبرا ہمیں احساس ہے کہ آپ کے پچھلے کئی خط شائع نہ ہو سکے لیکن خط شامل نہ ہونے کی بنا پر آپ نے تبصرہ لکھنا ہی چھوڑ دیا۔ یہ بات ہمیں اچھی نہیں لگی ہم بار بار لکھ چکے ہیں کہ سارے خطوط شامل کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہوتا لیکن ہم سارے خط پڑھتے ضرور ہیں تاکہ آپ کی رائے جان سکیں۔

کنیز نبوی اور راحت جنہیں تک آپ کی تعریف پہنچائی جا رہی ہے۔

سونیا ربانی نے قاضیاں سے لکھا ہے۔

اس بار سارا شعاع کمال کا تھا۔ مجھے سجاد علی سے ملاقات بہت اچھی لگی۔ اور "داسی ڈھولن یاردی" نے تو اس بار بھانگنا شروع کر دیا۔ لیکن بہت مزہ آیا۔ مجھے لگ رہا ہے کہ اب "زرد موسم" بھی جلد ہی ختم ہو گا۔

میرا خیال ہے کہ "مکافات عمل" ایسا افسانہ تھا کہ کسی نہ کسی کو سبق ضرور حاصل ہوا ہو گا۔ "شاعری سچ بولتی ہے" میں عائشہ جمال کا انتخاب بہت پیارا تھا۔

☆ پیاری سونیا! ہمیں افسوس ہے کہ آپ کا پہلا خط شائع نہیں ہوا۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

کول زہرا نے شمداد پور سے لکھا ہے۔

دلن کا سرورق دکھا تو بہت بوریت ہوئی سب سے پہلے پیارے نبی کی پیاری باتوں سے فیض یاب ہوئے اس کے بعد سلسلے وار ناول میں "زرد موسم" کی قسط پڑھی۔ مجھے یہ ناول بہت پسند ہے مکمل ناول میں کنیز نبوی کا "تشنگی کا سفر" بہت ہی اچھا لگا۔ حیرت ہوئی کہ کوئی سندھیوں کے بارے میں اتنا جان سکتا ہے۔ کیا کنیز نبوی سندھی ہیں؟ ویسے تو ناول مجھے ہر لحاظ سے اچھا لگا۔ سیما بہت عاصم کا افسانہ "دس فیصد" بہت ہی پسند آیا اور اس بات پر اور زیادہ یقین پختہ ہوا کہ مال خرچ کرنے سے بڑھتا ہے۔ میں کافی عرصے سے آپ کے اور ان پرچوں کی خاموش قاری ہوں مگر خط پہلی بار لکھ رہی ہوں۔

☆ پیاری کول! آپ نے خاموشی تو ذکر قلم اٹھایا اور شعاع کے لیے تبصرہ لکھا، بہت خوشی ہوئی۔ کنیز نبوی کا تعلق سندھ سے ہے لیکن اس سے پہلے وہ مختلف موضوعات پر بھی لکھتی رہی ہیں۔

راحت جنہیں تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرنی رہیں گی۔

سعیدہ حسن قادر پورا ملتان

دس گیارہ سالوں سے میں آپ کے رسائل کی قاری ہوں مگر رائے دینے کی ہمت آج کر رہی ہوں۔ تو اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو جنابہ کنیز نبوی صاحبہ کا ناول ہے نام جو "تشنگی کا سفر" رکھا تو تشنگی چھوڑ بی دی۔ خاص طور پر ماروی کے کردار میں جو کہ بہت پاور فل کردار تھا۔ اس پر زیادہ نہیں لکھا بہر حال بہت پیارا بہت خوب صورت ناول ہے۔ ایک ایک لفظ دل میں اتر گیا۔ بہت سے لوگوں کے لیے اس میں بہت سارا سبق ہے۔ ایک بات جو میں ان سے کہنا چاہتی ہوں کہ معذرت کے ساتھ کہ آپ نے صرف سندھ دھرتی کی بات کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں جو کچھ آپ نے لکھا۔ وہ سچ ہے مگر صرف صوبائی حدود کی بات نہ کریں ایک اکائی کی بات کریں۔ پاکستان کی بات کریں۔ خط لکھنے کی دوسری وجہ ہے ایک اہم مسئلے کی طرف نشاندہی کرنا ہم لوگ اللہ کے صفائی ناموں کا احترام نہیں کرتے، شکور، غفور، رحمان، رحیم اور دوسرے ناموں

کے ساتھ عبدل نہیں لگاتے یہ سخت گناہ ہے۔ رائٹرز اس بارے میں توجہ دیں۔ ماہانہ کے "ریگ زار تمنا" میں رافع، مانع، مومن ناموں کے ساتھ عبدل نہیں لگایا۔ یہ غلط بات ہے۔ پورا درست نام ہونا چاہیے اب بھی انہیں چاہیے کہ درست کر لیں۔ رائٹرز میں تمینہ عظمت مجھے بہت پسند ہیں۔ عالیہ بخاری کی تو کیا ہی بات ہے۔ فائزہ افتخار، رخسانہ نگار بہت اچھا لکھتی ہیں اور آپ کے ادارے کے اصول بہت اچھے ہیں۔ آپ سب کی محنت اور کاوشوں کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔

☆ پیاری سعیدہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ ایک طویل مدت بعد خاموشی توڑی ہے تو اب باقاعدگی سے شرکت کرتی رہے گا۔

کنیز نبوی کا ناول شاہ بھنائی کے اشعار اور سندھ کے تہذیبی پس منظر میں لکھا گیا تھا اس لیے اس میں سندھ کا ذکر تھا۔ آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے اس طرف توجہ دلائی۔ ہم خود اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں۔ آئندہ مزید خیال رکھیں گے۔

کنیز نبوی ماروی کی کہانی علیحدہ مکمل ناول کی صورت میں لکھیں گی۔ اگر اس ناول میں ماروی کی کہانی شروع کی جاتی تو یہ ناول دو قسطوں میں شائع ہوتا۔

عارف والا سے انیلا اکرم شریک محفل ہیں۔

شعاع میں سلسلے وار کہانیاں بہت اچھی ہیں۔ خاص طور پر راحت جنہیں کی "زرد موسم" یہ ایک رائٹرز کا کریڈٹ ہے جو اتنے کم کرداروں کو ساتھ لے کر اتنی اچھی کہانی اتنے موثر انداز میں بیان کرتا ہے۔

"تشنگی کا سفر" کنیز نبوی نے کافی عرصے بعد محبت پہ اتنا زبردست لکھا کہ میں دنگ رہ گئی۔ بہت بہت مبارک ہو۔ آپ اس دفعہ کی بیسٹ کہانی رائٹرز ہیں "آشنائیاں کیا کیا" بھی بہت اچھی تھی اور اس کا میسج بھی بہت اچھا تھا۔

فائزہ افتخار نے اس دفعہ تو میدان ہی مار لیا۔ وہ کہانی کو بہترین انداز میں سمیٹ رہی ہیں۔ باقی سب کہانیاں بھی اچھی تھیں مگر "دس فیصد" سیما بہت عاصم کا افسانہ انتہائی اچھا تھا۔ اس طرح کی اخلاقی کہانیاں ضرور چھاپا کریں۔ قتیل شفائی میرے پسندیدہ شاعر ہیں ان کی غزل پڑھ کر دل صوم اٹھا۔

☆ پیاری انیلا! آپ نے خط لکھا، بہت خوشی ہوئی متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

الماس گلاہور سے لکھتی ہیں۔

اللہ کے کرم سے لکھنے کی صلاحیت سے مالا مال ہوں۔ میرے پاس کچھ حقیقی کہانیاں ایسی موجود ہیں کہ اگر میں انہیں کاغذ براتار کر پڑھنے والوں تک پہنچاؤں گی تو یقیناً وہ پسند کریں گے۔

اس ماہ کا رسالہ بہت اچھا لگا۔ اسماء قادری کا "آشنائیاں کیا کیا" پڑھا تو لگا کہ یہ اس ماہ کی بہترین کہانی ہے۔ مگر حسب اس کے بعد "تشنگی کا سفر" پڑھا تو یقین کریں بہت اچھی کہانی لگی مگر دونوں کے پڑھنے کے بعد "آشنائیاں کیا کیا" کی کہانی بہترین تر لگی۔

☆ پیاری الماس! کہانی لکھنے کا طریقہ تو آپ جانتی ہیں، بھجوانے کا طریقہ یہ ہے کہ کہانی ایک لفافے میں ڈال کر اس پر ایڈریس لکھیں اور رجسٹر میل سروس کے ذریعے بھجوادیں۔ ایڈریس یہ ہے۔
خواتین ڈائجسٹ 37 اردو بازار کراچی۔
ام عمیرہ نے ڈرگ روڈ سے لکھا ہے۔

اگلے ماہ میری شادی ہے پتا نہیں اور جہاں میں شادی ہو کر جاؤں گی وہاں سے کوئی رابطہ برقرار نہ رکھ سکوں گی یا نہیں۔ پیاری سی ماڈل اس گری میں بھی اپنی خوب صورت جیولری، میک اپ اور ہیوی لباس میں دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ "پیارے نبی کی پیاری باتیں" اس بار موقع محل کے لحاظ سے بہت زبردست رہا۔ کاش مسلمان یہ جان سکیں کہ ایک انسان کا نقل پوری انسانیت کا نقل ہے۔

"محمود ریاض سے ملاقات" کے کیا کہنے۔ ایسا محسوس ہوا کہ وہ ہمارے روبرو موجود ہیں۔

"سجاد نواز سے باتیں" آپ کی تعارفی تمہید سے ہم نے بھی سو فیصد اتفاق کیا۔ دستک اس بار کوئی خاص نہ تھا۔

عالیہ بخاری کے ناول نے بالآخر رفتار چڑھنی لی بہت مزہ آیا پڑھ کر۔

نادلٹ میں فائزہ افتخار جی نے "داسی ڈھولن یاردی"

میں کمال کر دیا۔ اس ماہ کا بیسٹ ناولٹ رہا۔ زہرہ ممتاز نے بھی اچھا لکھا لیکن کیا کوئی ماں ایسا بھی کر سکتی ہے؟ افسانے تینوں ہی اچھے تھے۔ سیما بنت عاصم اور متعالم تناوش صاحبہ کو مبارک باد۔

ناولٹ میں ”آشنائیاں کیا کیا“ اسماء قادری نے یقیناً ”اس ناول کو لکھنے میں بہت محنت کی ایک بہت اچھی کاوش تھی یہ گو کہ بہت طویل ہو گیا تھا مگر کہیں بھی بڑھ کر بورت محسوس نہیں ہوتی ویل ڈن اسماء صاحبہ! کنیز نبوی کے ناول ”تشنگی کا سفر“ جس کو بے جا طویل کیا گیا جبکہ ماروی کی کہانی اور ہوری رہی، مطلب نہ اس کی تالی نے اس کی والدہ کی کہانی سنائی اور نہ ماروی کے کردار کو کھل کر بیان کر سکیں۔

کوشش اچھی تھی اور کہانی کا پلاٹ بھی نیا سا لگا یعنی انہوں نے سندھ کلچر کو حصہ بنایا اپنے ناول کا۔ اتنی جدوجہد کے بعد تو بیسی اینڈ ہونا چاہیے تھا نہ کہ ایسا رونے والا۔

ام عمیرہ! بے حد معذرت کہ آپ کے پچھلے خط شامل نہ ہو سکے۔ ہماری جانب سے شادی کی دلی مبارکباد اور دعائیں زندگی کا یہ موڈ آپ کے لیے بہت سی خوشیاں لے کر آئے۔ آمین۔

متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف و تحقید ان سطور کے ذریعے پنچا رہے ہیں۔

کنیز نبوی کے ناول میں اینڈ رونے والا نہیں تھا۔ یہ تو زندگی کی عمومی سچائیاں ہیں۔ ماروی کی کہانی اور ہوری نہیں رہے گی۔ آپ جلد ہی ماروی کی مکمل کہانی پڑھیں گی۔

نیر پور آزاد کشمیر سے ربیعہ حسین شریف لائی ہیں

اس ماہ کا شعاع اول سے آخر تک زبردست رہا۔ سلسلے وار ناول تو چھائے ہوئے ہیں۔ تینوں ناولٹ اس قدر خوب صورتی سے آگے بڑھ رہے ہیں کہ کوئی تشنگی محسوس نہیں ہوتی۔ ”داسی ڈھولن“ میں گل نے بون کر بہت اچھا کیا بہت خوب ایسا سر کی تو ایسی کی تھی! اس سے اچھا تو کم از کم صغیر احمد تھا۔۔۔ مکمل ناول دونوں نے رسالے کو چار چاند لگا دیے۔ بہت خوب! کیونکہ دونوں میں پیغام تھا۔۔۔ افسانوں میں سب سے زبردست بلکہ اس پورے شعاع کی جان ”دس فیصد“ تھا ماشاء اللہ! اس سے میں نے اتنا کچھ سیکھا کہ میں بتا نہیں سکتی۔ پلیز مجھے بتائیے کہ ایک ناول تھا جس کے کردار ”زارون ہارون“ ثانیہ ”شاید جہیں سسٹرز میں سے

کسی نے لکھا تھا پلیز بتائیے کب اور کس رسالے میں چھپا اور دو سرائیڈ ریاض کی ایک کہانی تھی ”صوفی دادا“ تیمور عائشہ ”جس کے کردار تھے“ یہ بھی کب اور کس رسالے میں شائع ہوا! ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ یہ دونوں کہانیاں دوبارہ شائع کریں۔

☆ پیاری ربیعہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے جن کہانیوں کے بارے میں آپ نے دریافت کیا ہے۔ ان کے مصنفین کے نام اور کہانیوں کے عنوان بتانے سے قاصر ہیں۔ ہر ماہ بے شمار کہانیاں نظر سے گزرتی ہیں۔ صرف کرداروں کے نام سے کسی کہانی کے بارے میں بتانا مشکل ہے۔ اگر ہماری قارئین کو ان کہانیوں کے نام معلوم ہوں تو بتادیں۔

لاہور سے شازیہ ملک شریف لائی ہیں۔

ویسے تو ماڈل بہت خوب صورت تھی مگر گرمیوں میں ٹائٹل ہلکے پھلکے دیا کریں۔ ہمیشہ کی طرح سارا شمارہ ہی زبردست تھا۔ سلسلے وار کہانیاں کچھوے کی رفتار سے ریک رہی ہیں۔ کچھ تو تیزی لائیں۔ افسانوں میں سب سے زیادہ قاتلہ رابعہ کا افسانہ پسند آیا کنیز نبوی نے بہت اچھا لکھا۔

☆ شازیہ ملک! ہمیں افسوس ہے کہ ٹائٹل آپ کو پسند نہیں آیا۔ ہم اسے مزید بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔

آپ نے صحیح لکھا ”اسٹارٹس“ سے ناظرین کی دلچسپی اب نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔ لیکن ہمارے چینل بھی کسی طرح اسٹارٹس سے پیچھے نہیں ہیں۔

انٹرویو کے سلسلے میں آپ کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے۔ فی الحال پوری کرنے سے قاصر ہیں۔

زنیہ اور نایاب نے یہ ای میل ہمیں سیالکوٹ سے بھیجی ہے، لکھتی ہیں۔

میری آپ کو میل کرنے کی وجہ نمرو احمد کا ”قراقرم“ تاج محل“ ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ پریشہ کا کردار فرضی ہے۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ یہ کہانی تو ماہ ہومر کی ہے میں نے نیٹ پر سرچ کیا تھا۔ آپ نمرو سے یہ ضرور پوچھیے گا۔ خبر میں تو بتایا گیا ہے کہ تو ماہ ہومر مڑو لو کلا نمب کر رہا تھا تو اسے

اور پریشہ کہاں سے آگئیں؟ اس ماہ کی بہترین کہانی کنیز نبوی کی تھی۔ کیا خوب صورت لکھا اور شاہ لطیف کی بیتوں نے تو کہانی کو چار چاند لگا دیے اور افسانوں میں سب سے اچھا سیما بنت عاصم کا ”دس فیصد“ تھا۔ سلسلے وار ناولٹ تینوں ہی اچھے لگے۔ خاص طور پر ”زرد موسم“ اسے تو کتابی شکل میں ضرور آنا چاہیے کیونکہ اس کے کردار ہم اپنے ارد گرد دیکھتے ہیں یا تو ”داسی ڈھولن یا روٹی“ میں یا سر کے ساتھ بھی برا ہونا چاہیے۔ اور ہاں ٹائٹل گرل کیا ماریہ ہے؟ باقی پورا شمارہ بہت اچھا تھا۔

☆ زنیہ اور نایاب! یاد آوری کا شکریہ۔ ٹائٹل پر عذرا صدیق کی تصویر تھی۔ نمرو نے ایک ایسے موضوع پر ناول لکھا جس پر پہلے کبھی نہیں لکھا گیا۔ انہوں نے بہت خوب صورتی سے موضوع سے انصاف کیا۔ قارئین نے بے حد پسند کیا، اب یہ سوال کہ کہانی سچی تھی یا جھوٹی پریشہ تھی یا نہیں، بے معنی لگتے ہیں؟

اسلام آباد سے سدرہ ایاز اپنی ای میل کے ساتھ رونق افروز ہیں۔

اس بار محمود ریاض صاحب کا انٹرویو بڑھ کر آنکھیں نم ہو گئیں۔ ”زرد موسم“ بڑھ کر راحت آئی کو داد دینے کے لیے الفاظ کم بڑجاتے ہیں، شکر ہے کہ ایمین کو عقل تو آئی۔ ”دیوار شب“ میں ایک ہی وقت میں معاشرے کی کتنی ہی خامیاں گنوا تی ہیں۔ یہ منفرد انداز صرف اور صرف عالیہ بخاری ہی کا کام ہے۔ کنیز نبوی نے محبت کی ایک نئی تعریف سے روشناس کروایا اور بے اختیار آنکھیں بھیگ گئیں۔ نجانے ”داسی ڈھولن یا روٹی“ میں انجام کیا ہو گا۔ مجھے سوچ کر بہت ڈر لگتا ہے۔ خیر بانی اس بار پورا پرچا شاندار رہا۔ البتہ کچھ مہینوں سے شاعری کا انتخاب پسند نہیں آ رہا۔

☆ سدرہ ایاز آوری کا شکریہ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔ امید ہے آئندہ بھی اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

رینالہ فورڈ سٹرکٹ اوکاڑہ سے صبا افضل بیٹ اپنی ای میل کے ساتھ تشریف لائی ہیں، لکھتی ہیں۔

اس بار ٹائٹل گرل دیکھ کر مایوسی ہوئی۔ اس کے بعد اسکی چیز دیکھے ان میں ”آشنائیاں کیا کیا“ کے اسکی چیز اچھے لگے۔ اس کے بعد حمد و نعت سے دل کو تروتازہ کیا۔ ”پیاری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں“ پڑھ کر ہمارے علم میں اضافہ ہوا۔ مکمل ناول میں اسماء قادری کا ناول بہت زبردست تھا اور کنیز نبوی کا ”تشنگی کا سفر“ بھی بہت اچھا تھا۔ ”داسی ڈھولن یا روٹی“ میں شکر ہے کہ گل کو تھوڑی عقل تو آئی۔ لیکن اب اس نے یہ کیوں کہا کہ وہی زمین کو کہیں لے کر گئی تھی؟ اور چھو کا انجام تو بہت اچھا ہوا۔ زہرہ ممتاز کا ”اندھیرے میں اجالا“ بہت اچھا لگا۔ سلسلے وار ناولٹ میں ”زرد موسم“ راحت جی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ افسانوں میں ”مکافات عمل“ اور ”دس فیصد“ بہت ہی اچھے تھے۔ میں اور اسکی چیز بنا کر بھیجوں تو آپ شائع کریں گی؟

☆ صبا! ہمیں افسوس ہے کہ آپ نے جو اسکی چیز بنا کر بھیجے تھے۔ وہ شائع نہیں ہو سکتے۔ آپ مزید اسکی چیز بھیجواتیں۔ دراصل اس کے لیے باقاعدہ تربیت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ خاص قسم کے قلم اور انک سے بنائے جاتے ہیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

سورق کی شخصیت	
ماڈل	_____ مونا لیزا
میک اپ	_____ روزی بولی پارلر
ٹرانسپورٹ	_____ موسیٰ رضا

ماہنامہ خواتین: انجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے رچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نسل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی نیوی چینل یا ڈراما ڈرامائی تنظیم اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔



کچھ یادیں کچھ باتیں مرثیہ خان

شاہین رشید

ابتدائی زندگی

میں 26 دسمبر 1962ء کو پشاور میں پیدا ہوئی۔ میرا نام میرے والدین نے رکھا اور میرے نام کا مطلب ”سمندر سے تعلق رکھنے والی“ ہے۔ ویسے بھی میرا نام بہت یونیک ہے اور میں نے دیکھا ہے کہ اس زمانے میں بھی ”مرثیہ“ نام کی لڑکیاں بہت کم ہیں۔ میری بنیاد سے یہ خواہش رہی ہے کہ میں سب سے منفرد ہوں۔ چنانچہ نام کے معاملے میں تو میں منفرد ہوں ہی۔ کام کے معاملے میں بھی میں نے اپنی انفرادیت قائم رکھی ہوئی ہے۔ ہم دوی بہن بھالی ہیں۔ میں بڑی ہوں اور بھائی چھوٹا اس کا نام ”زرک“ ہے۔ بھائی کو بھی پیار سے کئی ناموں سے پکارا جاتا ہے لیکن مجھے میری ماں ”ماڈی“ اور میرے والد ”پتی“ کہہ کر پکارتے ہیں۔

میرے والد کا نام ”رحمت خان“ ہے جبکہ والدہ کا نام ”ایتا“ ہے۔ والد فضائیہ میں ”ایئر وائس مارشل“ کے عہدے پر فائز رہ چکے ہیں۔ میری والدہ کا تعلق برطانیہ سے ہے۔ میرے والدین کی لومیرج تھی اور انہوں نے ایک انتہائی بھرپور اور خوشحال زندگی گزاری اور اس بات کو

جھوٹ ثابت کر دکھایا کہ لومیرج کامیاب نہیں ہوتیں اور یہ بات بھی سچ ثابت ہوئی کہ جوڑے اللہ تعالیٰ خود بناتا ہے۔ یہ انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ میری والدہ میرے چچا کی کلاس فیلو تھیں اور ایک مرتبہ میرے چچا سے ملنے انڈیا آئی تھیں جہاں ان کی ملاقات میرے والد محترم سے ہوئی دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کیا اور اللہ کا بنایا ہوا جو زامین پر مکمل ہوا۔

بچپن

بچپن بہت اچھا گزرا، چونکہ ابا ہمارے ایئر فورس میں تھے تو بہت ساری جگہیں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ میری تعلیم اس لیے مختلف اسکولوں میں ہوئی کہ کبھی اس شہر تو کبھی اس شہر، لیکن بھائی کے لیے والدین نے یہ عظیمی کی کہ اسے بورڈنگ میں داخل کرادیا تاکہ اس کی پڑھائی متاثر نہ ہو، بھائی چھٹیوں میں گھر آتا تھا اس کے ساتھ شرارتیں کرنے اور لڑنے جھگڑنے کو بہت دل چاہتا تھا لیکن میں ایسا کچھ نہیں کرتی تھی کیونکہ میرے دل میں یہی خیال آتا تھا کہ ہائے میرا بھائی چند دنوں کے لیے تو آیا ہے اب اس معصوم سے کیا لڑنا جھگڑنا۔ میں پڑھائی میں زیادہ اچھی نہیں

تھی اور شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ کبھی اس شرار کو کبھی اس شہر اور چونکہ ہمارے گھر میں پڑھائی کی بہت اہمیت تھی اس لیے میں نے بھی گریجویشن کر ہی لیا۔ گریجویشن میں نے لی ای سی ایچ ایس کراچی سے کیا۔ جیسا کہ میں نے بتایا کہ بچپن بہت اچھا گزرا۔ شہر شہر گھومنے کی وجہ سے سیاحت کی شوقین بھی ہو گئی تھی لیکن جب بہت چھوٹی تھی تو گڑبڑوں سے کھیلتا ان کے گھر بنانا۔ دوستوں کے ساتھ شرارتیں کرنا مجھے بہت اچھا لگتا تھا اور ان شرارتوں کی وجہ سے اکثر میں اپنے والدین سے مار بھی خوب کھایا کرتی تھی۔ امی زیادہ تر ڈانٹی تھیں جبکہ ابا زیادہ تر مارتے تھے۔ امی نے مجھے مارنے کے لیے ایک بڑا سا ڈنڈا رکھا ہوا تھا مگر مجھے اس سے مارا کبھی نہیں مگر میں اس ڈنڈے سے ڈرتی بہت تھی۔ امی کی اور بھی بہت سی سختیاں تھیں کہ گھر کو صاف ستھرا رکھوں، اپنا خیال رکھوں، صاف ستھری رہوں مگر یہ سب کچھ مجھ سے کہاں ہوتا تھا۔ بس اسی وجہ سے امی تو زیادہ تر ناراض ہی رہتی تھیں۔

یادگار لمحے

بہت سے یادگار لمحے ہیں۔ مثلاً ”سمندر کے کنارے گلی ریت پر بیٹھ کر چھوٹے چھوٹے گھروندے بنانا۔ پھر انہیں خود ہی توڑ دینا۔ کبھی گھروندے بنانا پھر مٹی کے کھلونے بنا کر ان گھروں میں سجانا اور جب پانی کی لہر آکر سب کچھ اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی تھی تو دیر تک رونا کہ ایسا کیوں ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ ہمارا گھر چھوٹی سی پہاڑی پر ہوا کرتا تھا، اس وقت ابا بیس کمانڈر تھے ان دنوں سیکڑ پر جنگ ہو رہی تھی تو ابا کہتے تھے کہ گھر میں رہا کرو۔ مگر مجھے کہاں چین تھا۔ میں گولہ باری میں بھی گھومتی رہتی تھی۔ تب مجھے یاد ہے کہ ابا نے ایک دن مجھے بہت مارا تھا کہ اب میں تمہیں گھر سے باہر نہ دیکھوں۔ بچپن کی وہ مار مجھے آج تک یاد ہے۔ تو ایسی چھوٹی موٹی یادیں تو بہت ساری ہیں اور یہی یادیں تو انسان کا سرمایہ ہوتی ہیں۔ انہیں کبھی بھی اپنے ذہن سے فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

ٹی وی پر آمد

باوجود اس کے کہ میں نے بچپن میں بہت ڈانٹ مار کھائی ہے میرے اندر کی شرارتوں میں تھوڑی کمی تو آگئی مگر ختم نہیں ہوئی، بس شرارتوں کے لیے کسی کے چنگی

بھرنے کی دیر ہوتی ہے اور میرا شرارتوں، بھرا بچپن اور اندر کی شرارتی لڑکی جاگ جاتی ہے۔ میٹرک کرنے کے بعد تھوڑی سمجھ دار ہوئی تو طبیعت میں پتا نہیں کہاں سے سنجیدگی آگئی اور میں زیادہ بولتی بھی نہیں تھی۔ شاید ایسا سب لڑکیوں کے ساتھ ہوتا ہے کہ جب وہ جوانی کی سیڑھی پہ قدم رکھتی ہیں تو ان میں نہ جانے کہاں سے سنجیدگی اور بردباری آجاتی ہے مگر میں نے دیکھا ہے کہ ایسا زیادہ عرصہ نہیں ہوتا بلکہ ایک آدھ سال کے بعد ہی لڑکی اپنی روشنی میں واپس آجاتی ہے۔ شاید اس کے اندر جو اچانک تبدیلی آتی ہے وہ اسے تھوڑا سا سنجیدہ بنا دیتی ہے۔

تو جب میری طبیعت میں سنجیدگی آئی تو مجھے ”راشد منہاس“ میں کام کرنے کی پیشکش آگئی۔ چونکہ میں فوجیوں کی زندگی کے کافی قریب رہ چکی تھی شاید اس لیے مجھے یہ کردار آفر ہوا تھا۔ مجھے کوئی شوق نہیں تھا اس فیلڈ میں آنے کا، لیکن والدین کی وجہ سے میں نے اس فیلڈ میں آنے کے لیے رضامندی دی مگر اس شرط کے ساتھ کہ ایک ہی ڈرامے میں کام کروں گی پھر نہیں۔ مگر جب کام کیا اور پچان ملی تو دل چاہا کہ مزید کام کروں۔ اس کے بعد حسینہ معین صاحبہ کے ڈراموں میں کام کرنے کا موقع ملا اور ڈراموں میں وہ کردار کیے جو میری سحر کے بہت قریب تھے اور ہیں۔ ڈراموں کے علاوہ ہوسٹنگ کے پروگرام بھی پرائیویٹ چینل اے آر وائی سے کافی کیے۔ آج کل اپنے میاں صاحب کے ساتھ پروڈکشن میں ہوں۔

شادی

لڑکیوں کے لیے شادی بہت ضروری ہے۔ ابتداء میں وہ اس بات کو نہیں سمجھتیں لیکن شادی کے بعد یا بہت عرصہ غیر شادی شدہ رہنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ ایک لڑکی کے لیے شادی کتنی ضروری ہے۔ بے شک بیٹی والدین پر بوجھ نہیں ہوتی اور اگر وہ خود کما رہی ہو تب بھی کسی پہ بوجھ نہیں ہوتی۔ مگر پھر بھی۔۔۔ میرا بھی شادی کا کوئی ارادہ اور خواہش نہیں تھی، میں تو اپنے گھر میں اپنے جانوروں کے ساتھ بہت خوشگوار زندگی گزار رہی تھی۔ والدین کہتے بھی تھے کہ شادی کر لو مگر میں ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیا کرتی تھی۔

لیکن جب میری ملاقات جلیل اختر سے ہوئی تو احساس ہوا کہ شادی نہ کرنا کسی کو اپنا لاف پٹرن نہ بنانا کتنی بڑی

غزل قر



کام سے بہت سیکھا۔ میرا مقصد محض آدھا آٹھنے کی تفریح دینا نہیں تھا بلکہ باتوں باتوں میں تاریخ اقدار محبت اور اخلاقیات سے متعارف کروانا تھا۔ مجھے بارہ اسلامی مہینے یاد نہیں ہوتے تھے اس لیے میں نے ”بارہ مہینے اسلامی مہینے کے یاد رکھیں۔“ بنایا۔ میرے بنائے گیت اب بھی لوگوں کو یاد ہیں۔ یہ میرے لیے بہت بڑی بات ہے۔ میرے خیال سے مجھے اسی کام کے لیے چنا گیا اس کے لیے میں نے کلاسیکل ٹوک ملی نغموں غرضیکہ ہر رنگ میں نئی اختراع لائی چاہی اور اس میں جتنی کامیابی ملی وہ اللہ کی دین ہے۔“ (دوسروں کے لیے راہ نکالنے والوں کو خدا ایسے ہی نوازتا ہے۔)

خراج تحسین

اقبال بانو اب اس دنیا میں نہیں رہیں لیکن ان کی غزل، سر ملی آواز کی تائیں، سننے والوں کو ان کی یاد دلاتی رہیں گی۔ موسیقی کے ممتاز سرسرح ڈاکٹر عمر عادل ان کے حوالے سے یاد تازہ کرتے ہیں کہ ”ٹھہری گانے میں انہیں کمال حاصل تھا۔ ایسی آواز صدیوں بعد جنم لیتی ہے۔ بیگم اختر کے بعد



ناہنہ روزگار

بعض لوگوں کو مٹی کو سونا بنانے کا فن آتا ہے۔ جہاں جاتے ہیں جھنڈے گاڑتے ہیں۔ سہیل رانا بھی فن موسیقی کی تاریخ کے ایسے ہی چراغ ہیں جنہوں نے ہر میدان میں اپنی صلاحیتوں سے روشنی بھیری۔ فلم ”دورا با ارمان“ احسان میرے ہم سفر اول دیوانہ کے گانے آج بھی کانوں کو بھلے لگتے ہیں جو ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کا ثبوت ہیں۔ نازیہ حسن، زوہیب حسن، محمد علی شہبکی، امجد حسین، مونا سسٹرز، عدنان سمیع خان، صدیقہ کیالی جیسے نام ان کی بدولت منظر عام پر آئے۔ اس حوالے سے وہ کہتے ہیں۔ ”پرانی کماوت ہے کہ پتھروں کے ڈھیر سے چاہیں تو گر جا بنائیں یا قلعہ، بات صرف ان پتھروں کی ترتیب کی ہے۔ میں نے اس کلیسے کو موسیقی پر لاگو کیا۔ سات سروں سے آپ سمجھتی بھی بنا سکتے ہیں۔ ملی نغمہ بھی اور بچوں کا گیت بھی۔ حقیقت میں میں نے بچوں کے لیے

اور میں بھی ان کے ساتھ کام کر داتی ہوں کیونکہ ہم دونوں کی سوچ ایک ہی ہے۔ ہم دونوں کا مشترکہ بینک اکاؤنٹ ہے اور خرچ کے معاملے میں ہم بالکل بھی فضول خرچ نہیں ہیں بلکہ بہت سوچ سمجھ کر خرچ کرتے ہیں کیونکہ ہمیں اندازہ ہے کہ کمانا کتنا مشکل کام ہے۔ کیونکہ ہم دونوں کی فیلڈ بھی ایک ہی ہے۔

مزاج

میرے بارے میں تو آپ سب کو معلوم ہے کہ میں فس مکھ طبیعت کی مالک ہوں لیکن ایسا نہیں ہے کہ سب سے ہی اس انداز میں بات کروں۔ میں کسی سے جلدی فری نہیں ہوتی اور جس سے میری دوستی ہو جاتی ہے پھر اس کو چھوڑتی نہیں ہوں۔ میری طبیعت میں غصہ ہے۔ مگر بہت زیادہ نہیں اور عموماً اس وقت غصہ آتا ہے جب کوئی کام میری مرضی کے خلاف ہو رہا ہوتا ہے۔ جلیل بھی مزاج کے بہت اچھے ہیں انہیں بھی غصہ کم آتا ہے اور کسی سے دیر تک تو ناراض رہ ہی نہیں سکتے اور مجھ سے تو ناراض ہونے کا تصور بھی نہیں کرتے۔

جو گزر گیا سو گزر گیا

جی ہاں۔ میرا بھی یہی نظریہ ہے کہ جو گزر گیا سو گزر گیا۔ حال کی فکر کرنی چاہیے۔ مستقبل کو اللہ پر چھوڑ دینا چاہیے۔ وہ جو کچھ کرے گا ہمارے حق میں بہتر ہی کرے گا۔ میں نے اپنی زندگی میں جو فیصلے کیے مجھے ان پر کوئی پچھتاوا نہیں کیونکہ میرا کیا ہوا کوئی فیصلہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ میں نے اپنے آپ کو بہت مصروف رکھا ہوا ہے۔ اس لیے تنہائی میں بیٹھ کر فضول باتیں سوچنے کا مجھے ٹائم ہی نہیں ملتا۔ شوہر کی مصروفیت نے میرے جسم میں جستی سی بھری ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ میں ایک اچھی اداکارہ، اچھی ہوسٹ، اچھی خاتون خانہ اور اچھی بیوی ہوں۔ اچھی اداکارہ اور اچھی ہوسٹ میں خود اپنے آپ کو نہیں کہہ رہی بلکہ یہ میرے ناظرین مجھے کہتے ہیں اور اپنی بیوی اور اچھی خاتون خانہ کا خطاب میرے شوہر نے مجھے دیا ہے۔



بے وقتی ہے۔ 1989ء میں میری شادی ہوئی۔ بچے نہیں ہیں میرے پاس۔ یہ اللہ کی دین ہے وہ جس کو نوازے۔ مجھے اپنے کتوں اور بلیوں سے بہت پار ہے۔ وہ میرے ساتھ میرے بیڈ پر میری اولاد کی طرح بیٹھی ہوئی ہوتی ہیں۔

جلیل اختر سے میری ملاقات 1987ء میں میری ایک دوست کے گھر ہوئی۔ میں اپنی دوست کی مفتی میں گئی ہوئی تھی۔ وہاں جلیل بھی آئے ہوئے تھے۔ دعا سلام ہوئی اور آہستہ آہستہ دوستی پروان چڑھتی رہی۔ میں نے محسوس کیا کہ جلیل بہت ہی ذہین ہیں۔ انداز گفتگو اور خیالات بہت عمدہ ہیں۔ میں آہستہ آہستہ ان سے بے انتہا متاثر ہوتی گئی۔ انسان جب ایک دوسرے کے قریب رہتا ہے تو اسے اس کی زیادہ قدر نہیں ہوتی، لیکن جب وہ اس سے دور ہوتا ہے اور میان میں فاصلہ آجاتا ہے تب احساس ہوتا ہے کہ ہم تو ایک دوسرے کے لیے ہیں۔ اس کا احساس مجھے اس وقت شدت سے ہوا جب میں انیسویں ڈیزاکننگ کا کورس کرنے انگلینڈ گئی جب تک میں انگلینڈ میں رہی جلیل سے بات چیت ہوتی رہتی تھی۔ فون بھی کتنا بہترین ذریعہ ہے ایک دوسرے سے بات چیت کرنے کا۔ دلوں کا حال بتانے کا۔ ان دو سالوں میں ہماری آپس میں اچھی خاصی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی اور جب میں پاکستان آئی تو میں نے خود جلیل سے کہا کہ ”میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔“

والدین کو اپنی پسند بتائی تو وہ اس بات پر راضی نہیں تھے۔ مگر پھر وہ کسی نے سچ کہا ہے کہ والدین کے لیے اولاد سے بڑھ کر کوئی نہیں ہوتا۔ اور یوں سب کی رضامندی سے ہماری شادی ہو گئی۔ آج 19 سال ہو گئے ہیں ہماری شادی کو اور اللہ کا شکر ہے کہ ہم بہت مطمئن اور بہت اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔ جلیل ہر لحاظ سے ایک بہترین شوہر ہیں۔ وہ بہت اچھے انسان ہیں۔ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ میرا بہت خیال رکھتے ہیں اور میرے کام کی بھی بہت تعریف کرتے ہیں نہ صرف تعریف کرتے ہیں بلکہ مزید کچھ کرنے کے لیے میری حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں۔ جلیل کی سب سے اچھی عادت یہ ہے کہ دیر تک گھر سے باہر رہنے کی عادت نہیں ہے۔ بات کو سمجھتے ہیں اور بہت کمبر وازنگ ہیں۔ جلیل ایک بہت اچھے ڈائریکٹر ہیں

★ لال مسجد میں بہت سی عورتیں اور بچے مارے گئے تھے۔ اگر اکبر گنجی کے قتل کی تحقیقات ہوئیں تو عدالت میں جا کر گواہی دوں گا کہ اکبر گنجی معاملات طے کرنے پر رضامند ہو چکے تھے لیکن مشرف کے حکم پر ان کے خلاف کارروائی کی گئی۔

(چوہدری شجاعت حسین)

★ راہول گاندھی نے اچھوت لوگوں کی ہستی میں کچھ وقت گزارا اس کے بعد دو گھنٹے تک نماتے رہے۔

(مایا دتی اچھوت لیڈر)



پھرتی

راحت فتح علی خان باکمال گلوکار ہیں اور ان دنوں سرحد کے دونوں جانب مقبول بھی خاصے ہیں۔ اس لیے اپنی شہرت کو خوب کیش کر رہے ہیں۔ اچھی آفر قبول کرنے میں ذرا دیر نہیں لگاتے۔ گزشتہ دنوں ایسی ہی پھرتی انہوں نے اس وقت دکھائی جب بڑوسی ملک سے فلم ”لو آج کل“ کے لیے موسیقار پریم اور ہدایت کار امتیاز علی نے انہیں ایمر جنسی میں گانے کی پیش کش کی۔ جسے محض دو گھنٹے میں یہاں کے اسٹوڈیو میں ریکارڈ کر کے بذریعہ ای میل وہاں روانہ بھی کر دیا گیا۔ اس سے ایک بات تو ثابت ہوئی کہ چاہے زلزلہ آئے یا طوفان ہمارے فنکار وہاں کی آفرز کو ”نعمت“ سے کم نہیں سمجھتے۔ اس لیے معیار اور عزت نفس کسی چیز کی پروا بھی نہیں کرتے۔ آخر گھر بیٹھے آیا مال کسے برا لگتا ہے۔

بنانے کا ہے اور اس کام میں شوہر ریمبو ان کے ساتھ ساتھ ہیں۔ صاحب کا کہنا ہے کہ ان دنوں وہ اسکرین پر کام کر رہی ہیں اس کے بعد ہی ہدایت کار سمیت دیگر فنکاروں کا تعین بھی ہو گا۔ یوں لگتا ہے کہ جویریہ سعود کے کامیاب تجربے نے انہیں جو صلہ بخشا ہے۔ جس میں شہرت بھی ہے اور پیسہ بھی لیکن بھولی بھالی گھر گھرتی کرنے والی صاحبہ کو ابھی اس چکا چوند سے نبرد آزما ہونے کے لیے تربیت کی ضرورت ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ لینے کے دینے پڑ جائیں۔

پابندی

پاکستانی کرکٹ پر مایوسی کا موسم بدستور طاری ہے۔ ساتھ لاہور نے چیمپئن ٹرافی کا انعقاد نامکمل بنایا تو تھا ہی اب 2011ء کے کرکٹ ورلڈ کپ سے بھی محروم کر دیا ہے۔ جس سے سب سے زیادہ فائدہ بڑوسی ملک بھارت کو ہوا ہے۔ ظاہر ہے پاکستان مخالف کیمپ میں بھارت بھی شامل تھا۔ ایشیائی ممالک نے مشکل کی اس گھڑی میں پاکستان کا ساتھ دینے کے بجائے مجرمانہ خاموشی میں عافیت جانی۔ اس معاملے کے متعلق سابق ٹیسٹ کرکٹر معین خان کا کہنا ہے کہ بھارت نے جس طرح پاکستان کے مفاد کو نقصان پہنچایا ہے اس پر بورڈ کو چاہیے کہ وہ آئی سی ایل کھیلنے والے تمام کھلاڑیوں پر سے پابندی اٹھائے۔ ویسے بھی یہ پابندی سابقہ چیئرمین ڈاکٹر نسیم اشرف نے بھارتی بورڈ کے دباؤ میں آکر لگائی تھی۔ آئی سی سی نے پابندی کو ہر ملک کا اندرونی معاملہ قرار دے دیا ہے۔ جس کے بعد ان پر پابندی رکھنے کا کوئی جواز نہیں ہے (ممکن ہے قومی حیثیت پر لگنے والی اس چوٹ پر انتظامیہ کے سوائے جذبات جاگ ہی جائیں۔ آخر معجزات اسی دنیا میں ہوتے ہیں)

کچھ ادھر ادھر سے

★ تمام مسلمان بھارت سے دفع ہو جائیں۔
(اندر گاندھی کا نواسہ ارون گاندھی)
★ پاکستانی عام ذرون حملوں کو نہ دیکھیں، امریکی امداد کو دیکھیں۔
(گورنر پنجاب سلمان تاثیر)
★ مخدوم جاوید ہاشمی نے این آر او کے تحت کسی رعایت سے انکار کر دیا۔ این آر او کے بعد بھی وہ قید میں رہے۔
(عبدالقادر حسن)



رہنے کے دوسرے طریقے بھی ہیں جو فن کاروں کو خوب ازیر رہتے ہیں۔ گزشتہ دنوں سعدیہ امام کی اداکار فیصل قہرشی سے شادی کی خبریں خوب گردش میں رہیں۔ جس پر فیصل تو چپ رہے لیکن سعدیہ امام نے ہنستے ہوئے کہا۔ میری شادی اور فیصل کے ساتھ؟ ایسا کس طرح ممکن ہے؟ وہ تو بالکل میرے بھائیوں کی طرح ہے (منہ بولے بھائی بنانے کی عادت گئی نہیں) شادی ہو رہی ہے لیکن میری نہیں بلکہ میری بہن کی۔ ابھی میری شادی کی عمر نہیں ہے۔ (خیر سے ابھی تو آپ کے دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے) ابھی مجھے بہت کچھ کرنا ہے۔ میری زندگی میں ابھی شادی کی گنجائش نہیں مگر میرا اسکیڈل امریکی صدر اوباما کے ساتھ بنایا جاتا تو کچھ بات بھی تھی۔ (اوباما نے تو اپنے ہم نسل اور ہم وطن کو عزت دی آپ بھی یہ اعزاز یہاں کے کسی بندے کو بخش دیں۔)

نئی تازی

پاکستانی فلم نگری میں مستقل مندی چھائی ہے۔ اسی لیے زیادہ تر فنکاروں نے چھوٹی اسکرین پر جگہ بنائی ہے۔ اور وہ جو عرصے سے سینما اسکرین سے غائب ہیں نئی انٹرنی وی وی پر دینا چاہتے ہیں۔ اب ماضی کے مقبول اداکار صاحبہ کو بھی لیس جو دوبارہ سے شو بیز کی دنیا میں قدم رکھنے والی ہیں۔ گمرے کے سامنے نہیں بلکہ پیچھے یعنی جویریہ سعود کی طرح ان کا ارادہ بھی ذاتی پروڈکشن ہاؤس میں ڈراسے

ٹھہری گانے والیوں میں انہی کا نام لیا جاتا تھا۔ اپنے وقت کے بہترین موسیقار ماسٹر عنایت حسین، بابا اے چشتی نے ان کے لیے زبردست دھنیں ترتیب دیں اور نامور شعراء نے ان کے لیے شعر کہے۔ قتل شفائی اپنی ہر فلم میں ان کے لیے ایک خاص گانا لکھتے تھے جو ٹھہری انگ میں ہوتا تھا۔ فیض احمد فیض کی نظم ”ہم دیکھیں گے“ نے ان کے لیے شہرت دی، بلکہ فیض احمد فیض کو بھی عام لوگوں میں متعارف کروایا۔ بعد میں فیض صاحب نے ان کے لیے دشت تہائی بطور خاص لکھی۔

انہیں فارسی کی بے شمار غزلیں ازیر تھیں۔ مجھے ان کی موت کا غم اس لیے بھی زیادہ ہے کیونکہ وہ میری مرضیہ بھی تھیں۔ وہ اپنی پرانی یادیں میرے سامنے ڈھرائی رہتی تھیں۔ جن اداروں کے لیے انہوں نے بے مثل گانے گائے ان کی بے جسی پر شدید افسوس ہوتا ہے۔ جس قدر جزئیات سے اقبال بانو کے دور کے فنکار کام کرتے تھے آج کل کے گلوکاروں میں دیکھنے کو بھی نہیں ملتا۔ فاسٹ فوڈ میوزک کے اس دور میں یوں لگتا ہے کہ ہر چیز روبہ زوال ہے۔“ (موجودہ موسیقی پر اس سے بہتر تبصرہ ہو بھی نہیں سکتا)

اسکیڈل

سعدیہ امام ان دنوں پس منظر میں ہیں لیکن منظر عام پر



موسم کے پکوان

خارہ جیلانی

آدھی پیالی
ایک پیالی
دو عدد
کھانے کے دو تہچے
ایک عدد (نکڑے کر لیں)
تھوڑا سا
کھانے کے چار تہچے
4 عدد (کتری ہوئی)

حسب ذائقہ
چائے کا ڈیڑھ تہچہ
چائے کے چار تہچے
چائے کا ایک تہچہ
(پھینٹ لیں)
ایک پیالی
تلنے کے لیے

چنے کی دال
ریشہ دار مرغی
ابے آلو
لیموں کارس
ابلا انڈا
ہرا دھنیا
کاشی چیز
سبز مرچیں

نمک
رائی کے دانے
چلی گارلک سوس
سیاہ مرچ (کٹی ہوئی)
انڈا ایک عدد
ڈبل ردنی کا چورا
تیل

ترکیب :

بھنگی ہوئی دالوں کو اتا بایں کہ تقریباً "گل جائیں۔ پھر انہیں موٹا موٹا پیس لیں۔ ابلی ہوئی مرغی کے ریشے کر لیں۔ انڈے، تیل اور چورے کے علاوہ تمام اجزاء ملا کر کباب بنالیں۔ پھینٹے ہوئے انڈے میں ڈبو کر چورے میں پیسٹ کر گرم تیل میں تل لیں۔ اور سبز چٹنی کے ساتھ سرو کریں۔

آلو اور دال کے لفیڈ پر اٹھے

ضروری اجزاء :
موگ کی دال
آلو
آٹا
ہرا دھنیا
آدھی پیالی
دو عدد
دو پیالی
چند پتے

دال پوری

ضروری اجزاء :
آنے کے لیے

آٹا یا میدہ
تیل
نمک
نیم گرم پانی

بھرائی کے لیے

ابلی موگ دال
سبز دھنیا
سبز مرچیں
سرخ مرچ
سرخ مرچ پاؤڈر
نمک
پکلی سبز مرچیں
گرم مسالا پاؤڈر

ترکیب :

دال میں تھوڑا سا پانی ڈال کر گلا لیں۔ جب ٹھنڈی ہو جائے تو بھرتہ سا بنا لیں، اب تمام مسالا بھرائی والا اس میں شامل کر کے دال دو حصوں میں کر لیں۔ آنے یا میدے میں تمام اشیاء ملا کر گوندھ لیں۔ تھوڑی دیر رکھنے کے بعد چھوٹے چھوٹے پیڑے بنا لیں۔ اب ہر پیڑے کو ہتھلی پر پھیلا کر اس میں تھوڑی سی دال بھر کر دوبارہ پیڑا بنا لیں۔ اب حسب پسند تیل کر گرم تیل میں یہ پوریاں تل لیں۔ چٹنی یا اچار کے ساتھ دال بھری پوریاں بہت مزہ دیں گی۔

دال کے مزیدار کباب

ضروری اجزاء :
موگ کی دال
آدھی پیالی

تہمت الصیور

ہیں۔ ایک طبقے کا خیال ہے کہ ان کا تعلق مصر سے تھا۔ دوسرے کا خیال ہے کہ یہ بائبل میں پیدا ہوئے اور ان کا تعلق دجلہ و فرات کے دو آب سے موجودہ کوفہ ان کا وطن تھا اور اسی پر اکثریت کا اتفاق ہے۔

حضرت ادریس علیہ السلام کو بہت سے علوم حاصل تھے، انہیں علم نجوم، علم ریاضی، فن کتابت، کپڑے بننے کا فن، ناپ تول کے آلات اور اسلحہ سازی کے فن کا علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کیا گیا تھا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک فرشتہ آپ کے ساتھ 300 سال رہا اور کائنات کی تمام اشیاء کا علم آپ کو سکھایا۔ آپ کے پیروکاروں میں چند ایسے لوگ بھی موجود تھے جنہوں نے ایک شخص کو سائے کی طرح آپ کے ساتھ دیکھا۔ اسے خلوت میں بھی دیکھا گیا اور جلوت میں بھی، انہوں نے اس کو باتیں کرتے ہوئے نہیں دیکھا، ایسا لگتا تھا کہ یہ شخص گونگا بہرہ ہے، مگر تجلیے میں اس کے ہونٹوں کو ہتے دیکھا گیا۔ اس سے زیادہ عجیب بات یہ دیکھنے میں آئی کہ جس حصے میں حضرت ادریس علیہ السلام بیٹھے ہوتے تھے یہ شخص نمل بھی رہا ہے، کچھ بول بھی رہا ہے، مگر اس کی آواز باہر نہیں آرہی، یہ شخص گھنٹوں ٹھٹھا رہتا اور اس کے چہرے پر گھٹکن کے آثار تک نظر نہ آتے، حضرت ادریس علیہ السلام شاگرد لگتے تھے اور یہ شخص ان کا معلم، لوگوں نے اس شخص کے بارے میں حضرت ادریس علیہ السلام سے سوال کیے، مگر ان کے جواب نہیں ملے۔

حضرت ادریس علیہ السلام اللہ کے حکم پر اپنے پیروکاروں کے ساتھ ہجرت کر کے مصر تشریف لے آئے۔ مصر میں کم و بیش سترہ زبانیں رائج تھیں، ان تمام زبانوں کا جاننا نہایت مشکل تھا، مگر آپ کے پیروکار حیران تھے کہ آپ کو ان تمام زبانوں پر عبور حاصل تھا، آپ نے اپنے پیروکاروں کو جو تعلیم دی وہ نہایت حیرت انگیز ہے۔ آپ کے طالبہ جب کامل دماہر قرار پائے، انہوں نے تقریباً دو سو شہر آباد کیے، ان میں ”رہا“ نامی شہر اپنے آثار کی وجہ سے آج بھی موجود ہے۔

التمبرہ کا غار

التمبرہ اسپین کا ایک بہت ہی قدیم شہر ہے۔ اس کی وجہ شہرت اس میں موجود ایک تاریخی غار ہے، جسے التمبرہ کے غار کے نام سے پکارا جاتا ہے، اس غار کی وجہ شہرت اس میں موجود مختلف جانوروں کی دیدہ زیب تصاویر ہیں، التمبرہ کے غار میں قریب قریب ایک سو ستر جانوروں کی تصاویر صحیح سالم حالت میں موجود ہیں۔ غار کے سب سے کھلے حصے میں جہاں چھت چار پانچ فٹ اونچی ہے، چھت پر پندرہ گز لمبا ایک منظر دکھایا گیا ہے، یہ ایک ہرنا اور تین ارنا بھیمنوں کی جنگ کا منظر ہے، صرف دو گھوڑے اور دو سور ہرن کے حامی ہیں اور ہرن فتح حاصل کر چکا ہے، یہ تصویر پتھر کے زمانے کی مصوری کا ایک شاہکار ہے۔

اس غار میں مکمل طور پر اندھیرا ہوتا ہے اور اس اندھیرے میں اتنی حسین تصویریں بنانا آج کے ترقی یافتہ دور کے انسان کو حیرت میں ڈال دیتا ہے، مگر اس غار میں سے ایسی چیزیں بھی ملی ہیں۔ جن سے اس زمانے کے مصور چراغ کا کام لیتے تھے۔ ان تصویروں میں تین رنگ سرخ، زرد اور سیاہ استعمال ہوئے ہیں اور یہ تصویر صرف انسانی انگلیوں اور درخت کی شاخوں سے بنائی گئی ہیں۔

تصویروں کا باریک کام ہڈی کی تلی پتلی تیلیوں سے لیا گیا ہے، ماہرین کا خیال ہے کہ التمبرہ کی یہ تصویریں آج سے تین ہزار سے لے کر چالیس ہزار سال پرانی ہیں۔ ان کی خوبصورتی کو لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے، ان کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ مناظر بالکل حقیقی ہیں اور ہزاروں سال گزرنے کے باوجود ان کی خوبصورتی ماند نہیں پڑی اور آج کا ترقی یافتہ انسان بھی ایسے شاہکار بنانے سے عاجز ہے۔

مصباح گل۔ سرگودھا

حضرت ادریس علیہ السلام

حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے حضرت شیث علیہ السلام کی چھٹی نسل سے حضرت ادریس علیہ السلام پیدا ہوئے۔ حضرت ادریس علیہ السلام کے کئی نام ہیں، یونانی زبان میں انہیں ”ہرس“ عبرانی میں ”حنوک“ عربی میں ”انفوع“ اور قرآن کی زبان میں ادریس (علیہ السلام) کے نام سے پکارا گیا ہے۔ ان کے دطن کے بارے میں کافی اختلافات پائے جاتے



ہرا دھنیا	چائے کے دو چمچے	ہری مرچ (کسری ہوئی)
بیٹھا سوڈا	حسب ضرورت	لیموں کا رس
تیل	حسب ذائقہ	نمک
لال مرچ (پسی ہوئی)	چائے کا آدھا چمچ	سیاہ مرچ پاؤڈر
دھنیا (پسا ہوا)	چائے کا آدھا چمچ	چائیز نمک
نمک	حسب ضرورت	تیل
اجوائن		ترکیب :
ہری مرچ		آنے میں تھوڑا نمک ڈال کر گوندھ لیں۔ آلو کو ابال کر
پیاز		چھیل کر کچل لیں۔ دال کو ابال کر آلو کے ساتھ اچھی طرح
تین ڈلی (کچی پسی ہوئی)		ملائیں۔ ہرا دھنیا، ہری مرچ، لیموں کا رس، سیاہ مرچ پاؤڈر،
		چائیز نمک اور نمک بھی ملا دیں۔ جب اچھی طرح مکس
		ہو جائے تو آنے کے چھوٹے چھوٹے پیڑے بنا کر ایک
		پیڑے کے اوپر آلو اور دال کا آمیزہ رکھیں، دوسرے پیڑے
		کو اس کے اوپر رکھیں پھر کنارے دبا کر روٹی کی طرح تیل
		لیں۔ تو سے پر تیل ڈال کر پراٹھے کی طرح کھی لگا کر سینک
		لیں۔ تیار ہونے پر رائتے کے ساتھ پیش کریں۔

سب سے پہلے بھیگی ہوئی مونگ کی دال کو بریل پر یا بلینڈر پر پیس لیں۔ پھر اس میں سوڈا، نمک، اجوائن، تھوڑی سی لال مرچ اور آدھا گرم مسالا ملا کر خوب اچھی طرح ہاتھ سے پھینٹ لیں۔ تھوڑی دیر کے لیے رکھ دیں۔ ایک پتلی میں تیل گرم کریں۔ کچی پسی پیاز ڈال کر ہلکی گلابی کر لیں، پھر ہلدی، دھنیا، مرچ، گرم مسالا، اورک، لہسن ڈال کر لگا سا بھونیں اور تین سے چار پیالی پانی ڈال دیں۔ اب ایک کڑاہی لے کر تیل گرم کریں۔ دال کے پکوڑے مل لیں۔ جب سنہری مائل ہو جائیں تو تیار سالن میں ڈال دیں۔ جب سب پکوڑے شامل ہو جائیں تو ایک پیالی میں پانی شامل کریں۔ ہر مسالا ڈال کر ہلکی آدھ پر دم بر رکھ دیں۔ جب تیل اوپر آجائے تو منگورے تیار ہیں۔ منگورے ہمیشہ چھوٹے تلیں کیونکہ سالن میں یہ پھولتے ہیں۔

مونگ کی دال کے منگورے

ضروری اجزا :	ایک پیالی
مونگ کی دال	چائے کا ایک چمچ
ہلدی	چائے کا ایک چمچ
گرم مسالا (پسا ہوا)	کھانے کا ایک چمچ
اورک لہسن (پسا ہوا)	

ادارہ
خصوصی



میں ایک چمچہ شمد ملا کر اچھی طرح پھینٹ لیں اور اسے اپنے چہرے پر لگا کے تھوڑی دیر چھوڑ دیں۔ پھر منہ دھولیں۔ آپ دیکھیے گا کہ آپ کا چہرہ کتنا نرم و ملائم اور تروتازہ ہو جائے گا۔ آپ چاہیں تو فیس واش کی پوری ٹوب کسی برتن میں نکال لیں اور اس سے آدھی مقدار شمد ملا کر پھینٹ لیں اور اسے کسی بول میں بند کر کے فریج میں رکھ لیں اور روزانہ اسی سے منہ دھوئیں، اگر آپ اسے اپنی عادت بنا لیں گی تو پھر آپ خود دیکھیں گی کہ آپ کا چہرہ کتنا نکھر جائے گا۔

☆ اس کے علاوہ آپ جو کھا لے لیں اور اس میں سوکھا دودھ برابر مقدار میں ملا کر پانی سے پیسٹ بنا لیں اور اس پیسٹ کو چہرے پر لگا کر چھوڑ دیں۔ تھوڑی دیر بعد منہ دھولیں، پھر دیکھیں چہرے پر کتنا نکھر آتا ہے۔

اگر آپ کو اپنے چہرے کی جلد مستقل طور پر صحت مند اور خوبصورت بنانا ہے تو آپ ان چند باتوں پر سختی سے عمل کریں۔

☆ پانی آپ کے جسم کے لیے ایک ٹانک کا کام کرتا ہے

چہرے اور جلد کی نگہداشت

شخصیت کے نکھار کے لیے دو چیزیں زیادہ اہم ہیں ایک آپ کا چہرہ اور آپ کے بال، لہذا ان دونوں کی دیکھ بھال لازمی ہے، مہینے میں ایک بار کم از کم فیشل کریں اور بالوں کی نگہداشت کے لیے ان میں تیل لگانے کے ساتھ مناسب تراش خراش کرائی رہیں۔ تراش خراش ان معنوں میں کہ وقت کے ساتھ اور عدم توجہی کے باعث بالوں کی نوکیں پھٹ جاتی ہیں اور ان کے دو منہ بن جاتے ہیں جو بالوں کی صحت کے لیے خاص طور پر نقصان دہ ہیں۔ اس لیے مہینے میں ایک بار نوکوں کی تراش خراش لازمی ہے۔ پھر ہفتے میں ایک دو بار تیل لگانا بھی ضروری ہے۔ اس طرح آپ کے بال اندر سے صحت مند ہوں گے۔ جبکہ اگر آپ گھر سے روزانہ باہر نکل رہی ہیں تو ان کی مناسب صفائی بھی ضروری ہے۔ لہذا روزانہ انہیں کسی اچھے شیمپو سے دھولیا کریں۔

بے رونق بالوں کے لیے

اگر آپ کے بال روکھے اور بے رونق ہیں یا ان میں خشکی ہے تو آپ اس طریقے سے ایک پیسٹ بنائیں۔

☆ کھانے کے چار چمچے دہی میں کھانے کے دو چمچے سرسوں یا زیتون یا کھوپرے کا تیل اچھی طرح ملا لیں، پھر انہیں بالوں کی جڑوں میں اور چاروں طرف اچھی طرح لگا کر ایک گھنٹہ چھوڑ دیں، اس کے بعد اسے کسی اچھے شیمپو سے دھولیں۔ اگر آپ ہفتے میں ایک بار یہ طریقہ آزمائیں تو آپ کے بالوں کی رونق بدلتی جائے گی اور یہ بوشہ صحت مند اور چمکدار نظر آئیں گے، اگر ان میں خشکی ہوگی تو وہ بھی ختم ہو جائے گی۔

جلد کی خوبصورتی کے لیے

چہرے کی جلد کو خوبصورت اور صحت مند بنانے کے لیے ایک مفید نسخہ یہ ہے کہ آپ دو بڑے چمچے فیس واش

زندگی باقی ہے۔
تو فرشتے نے جواب دیا کہ۔

”آپ میرے بازوؤں پر بیٹھ جائیں، میں آپ کو موت کے فرشتے کے پاس لے جاؤں گا، وہ آپ کو اس کا جواب بہتر طور پر دے سکتا ہے۔“ چنانچہ آپ اس کے بازوؤں پر بیٹھ گئے اور وہ انہیں لے اڑا۔ جب وہ چوتھے آسمان سے گزر رہے تھے تو دوسری طرف سے موت کا فرشتہ زمین کی طرف آ رہا تھا، دونوں کا آمنہ سامنا ہوا تو موت کے فرشتے نے پوچھا: ”کہاں کا قصد ہے؟“ دوسرے فرشتے نے جواب دیا: ”کہ میں تیری طرف ہی جا رہا تھا، جسے اور نہیں علیہ السلام نے اپنی عمر معلوم کرنے پر مامور کیا ہے، اس کا نعمت بھی کو ہو گا۔“

موت کے فرشتے نے کہا: ”جناب اور میں علیہ السلام اس وقت کہاں ہیں؟“ فرشتے نے کہا: ”میرے بازوؤں پر سوار موت کے فرشتے نے کہا۔“

”ابھی ابھی مجھے بارگاہ الہی سے یہ حکم ہوا کہ اور میں علیہ السلام کی روح چوتھے آسمان پر قبض کر لوں، مجھے حیرت ہوئی یہ کیسے ممکن ہے، جبکہ اور میں زمین پر ہیں۔“

اسی وقت اور میں علیہ السلام کی روح موت کے فرشتے نے قبض کر لی۔ حضرت اور میں علیہ السلام کے بارے میں کسی کو نہ بتا چل سکا کہ وہ کہاں گئے، آپ کی چوتھے آسمان پر موجودگی کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شب اسراء کے واقعہ سے تصدیق ہوئی ہے۔

آپ کی غیر موجودگی میں آپ کی قوم کے لوگ گریہ و زاری کرتے رہتے تھے۔ ایک دن ان کے پاس ایک شخص آیا اس نے سب کو رونے سے منع کیا اور کہا کہ۔

”میں تمہارے باپ کی سی ایک صورت بنا رہا ہوں، تم اس کو شب و روز دیکھتے رہو، اس طرح تمہارا غم جاتا رہے گا اور تم سب خوش رہو گے۔“

اس شخص نے کچھ عرصے بعد حضرت اور میں علیہ السلام کی بہترین شبیہ تیار کر دی اور بالکل حضرت اور میں علیہ السلام جیسی تھی۔ لوگ اس شبیہ کی پرستش کرنے لگے اور یوں رفتہ رفتہ دنیا میں بت پرستی عام ہو گئی۔ حضرت اور میں علیہ السلام کی شبیہ تیار کرنے والا شخص ابلیس یعنی کہ شیطان تھا۔ حضرت اور میں علیہ السلام کی عمر کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ آپ 365 سال زندہ رہے۔ (داؤد اعلم)

صائمہ بدر کھلاہٹ ہری پور

انسانوں نے سلائی کا فن بھی اور میں علیہ السلام سے سیکھا۔ علم نجوم کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ حضرت اور میں علیہ السلام کے ذریعے ہی رائج ہوا۔ انہیں ”ہرمیس الرامسہ“ بھی کہتے ہیں، جس کا مطلب ہے علم نجوم کا استاد اور ”کیونکہ ہرمیس نامی شخص یونان میں مشہور منجم گزرا ہے، مصر میں جو اہرام پائے جاتے ہیں ان کی تعمیر میں جس فن سے کام لیا گیا ہے حضرت اور میں علیہ السلام اس کے بانی ہیں۔ اسے علم ”جر تفل“ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کے ذریعے بڑی اور بھاری چیزوں کو بلندی پر لے جایا جاسکتا ہے، اور مصر کے بادشاہوں نے اس علم سے خوب فائدہ اٹھایا، آپ نے یہ علم مصر کے معماروں کو بخش دیا۔ اس لیے وہاں یہ علم عام ہو گیا، اور وہ خطہ ”ممقس“ کہلایا اور یہاں دنیا کی عظیم الشان عمارتیں تعمیر کی گئیں، جنہیں اہرام کا نام دیا گیا، آج بھی ان عمارتوں کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی تعمیر میں غیر انسانی ہاتھ ہیں، یہاں دیواروں پر جو تحریریں ملتی ہیں، وہ آثار قدیمہ کے ماہرین کے لیے حیران کن ہے۔

ماہرین آثار قدیمہ نے ہمیں جو کچھ بتایا، آج نسل انسانی میں اس کی تائید و تردید کرنے والا کوئی بھی موجود نہیں ہے، لیکن اس بات پر سب ہی کا اتفاق ہے کہ ان عمارتوں کی تعمیر میں غیر انسانی ہاتھ ہیں اور یہ غیر انسانی مخلوق وہی فرشتہ یا فرشتے ہیں، جس کا ذکر پچھلی سطور میں کیا جا چکا ہے۔

ان کی قوم کے لوگ شاندار دینی و دنیاوی زندگی گزار رہے تھے۔ عبادت کا سلسلہ بھی جاری و ساری تھا، اللہ کے حضور قربانیاں بھی دی جا رہی تھیں، سال میں کئی عیدیں بھی منائی جاتی تھیں۔

دنیا کو اس قوم پر رشک تھا اور اس قوم کے لوگ زمانے کے استاد مانے جاتے تھے، آپ کے عہد کے مصوروں نے آپ کی شبیہ تیار کی اور آپ کا حلیہ محفوظ کیا اور آپ کی زندگی کے مختلف ادوار کو پتھروں میں محفوظ کر دیا، اور ان ہی سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا رنگ گندمی، قد و قامت پورا، سر پر بال کم تھے۔ داڑھی گھنی اور خوبصورت تھی، چہرے پر ملامت اور رنگ و روپ و چہرے کے خطوط بہت خوبصورت تھے۔

آپ کی وفات کا واقعہ بھی عجیب ہے، آپ نے ایک دفعہ اپنے رفیق فرشتے سے پوچھا کہ۔ ”ابھی میری کتنی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ پریم کوالٹی، نارل کوالٹی، کمپریڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

آپ سب سے پہلے خوب سارا پانی پینے کو اپنی عادت بنائیں۔ آپ کا جسم اندر سے صحت مند ہوتا ہے تو آپ کی جلد چمک اٹھتی ہے۔

☆ پیٹ کی گرمی، ہمیشہ چہرے پر دانوں کی صورت میں نمودار ہوتی ہے، لہذا آپ دن بھر میں خوب سارا پانی پیئیں، کم از کم بارہ سے اٹھارہ گلاس۔ اس کے علاوہ آپ اپنی غذا میں سبزی اور پھل کا استعمال بڑھادیں، کچی سبزی زیادہ سے زیادہ استعمال کریں۔ اس طرح آپ کے چہرے کی جلد کو اندر سے ایک طاقت ملے گی اور یہ دانوں اور داغ دھبوں سے پاک ہو جائے گی۔

گھریلو نسخے

چہرے اور بالوں کو خوبصورت اور تندرست بنانے کے لیے چند گھریلو نسخے پیش خدمت ہیں۔

☆ چہرے کی رنگت صاف کرنے کے لیے ایلویرا کے رس میں بیسن ملا کر پیسٹ بنالیں اور ہفتے میں دو سے تین بار لگائیں۔ جب یہ پیسٹ آپ کی جلد پر اچھی طرح جذب ہو جائے تو تازہ پانی سے منہ دھولیں۔ اسے لگانے کے بعد سکون سے آنکھیں بند کر کے لیٹ جائیں، کسی سے بات نہ کریں۔

☆ بالوں کو لمبا کرنے کے لیے میتھی دانہ، ماش کی دال اور سکا کالی تینوں کو ملا کر پاؤڈر بنالیں۔ رات بھر بھگو میں صبح نہانے سے ایک گھنٹہ پہلے سر پہ لگا کر اچھی طرح مساج کریں اور صاف پانی سے دھولیں۔ یہ عمل ہفتے میں کم از کم دو بار ضرور کریں، پھر نتیجہ دیکھیں۔

میک اپ کے ضروری نکات

میک اپ کرنے سے پہلے اس کے ضروری اور اہم نکات کو ضرور بد نظر رکھیں تاکہ آپ کا میک اپ زیادہ خوب صورت اور موثر دکھائی دے۔ مثلاً

☆ لپ اسٹک اور نیل پائش ہم رنگ استعمال کیجئے۔ اس سے میک اپ کے باوجود شخصیت میں وقار پیدا ہوگا۔ یعنی شخصیت مزید دلکش محسوس ہوگی۔ آنکھوں کا میک اپ گہرا ہے تو لپ اسٹک بھی گہرے رنگ کی استعمال کریں تو زیادہ بہتر لگتی ہے۔

☆ ہاتھ، پیروں اور گردن کی مکمل صفائی کے بغیر کیا جانے والا میک اپ بے تاثر نظر آتا ہے، عید سے ایک دن

قبل ہاتھوں اور پیروں کی صفائی پر توجہ دیں۔

☆ ہاتھوں اور پیروں کے ناخن بھی ایک دو روز پہلے تراش لیں۔ نیم گرم پانی میں ڈبھول، لیموں کارس اور سیسپو ملائیں، اب اس میں دس منٹ پیروں کو ڈبو کر رکھنے کے بعد صاف کریں پھر تھانوں سے رگڑ کر پیروں کو دھولیں۔ اس کے بعد لیموں کے ٹکڑے لیجئے انہیں چینی لگائیں اور ہاتھوں، بازوؤں اور کھنٹیوں کو رگڑیں، اس عمل سے جلد کی رنگت نکھر جائے گی۔

☆ اگر آپ کے میک اپ کے سامان میں بلش ہے تو کوئی بات نہیں، آپ لپ اسٹک استعمال کرتے ہوئے اس طرح کہ اپنی ہتھیلیوں پر لپ اسٹک لیں لپ اسٹک پر تھوڑی سی کولڈ کریم کے ساتھ ملا کر ایک جان کر لیں۔ اب اسے بلشر کی جگہ بخوبی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

☆ اگر آپ چاہتی ہیں کہ عید کے دن آپ کے چمکدار نظر آئیں تو ایک دن پہلے بالوں میں کنڈیشننگ کیجئے۔ بال دھو کر ان میں جڑوں سے سروں تک کنڈیشننگ لگائیں اور ٹھنڈے پانی سے بال دھولیں۔ قدرتی ہوا میں خشک ہونے دیں اور سر لٹکا کر بالوں میں گردن سے ماتھے کی جانب برش کریں اس عمل سے سر کا دوران خون بڑھے گا اور بہن چمک دار جائے اور خوب صورت نظر آئیں گے۔

